www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

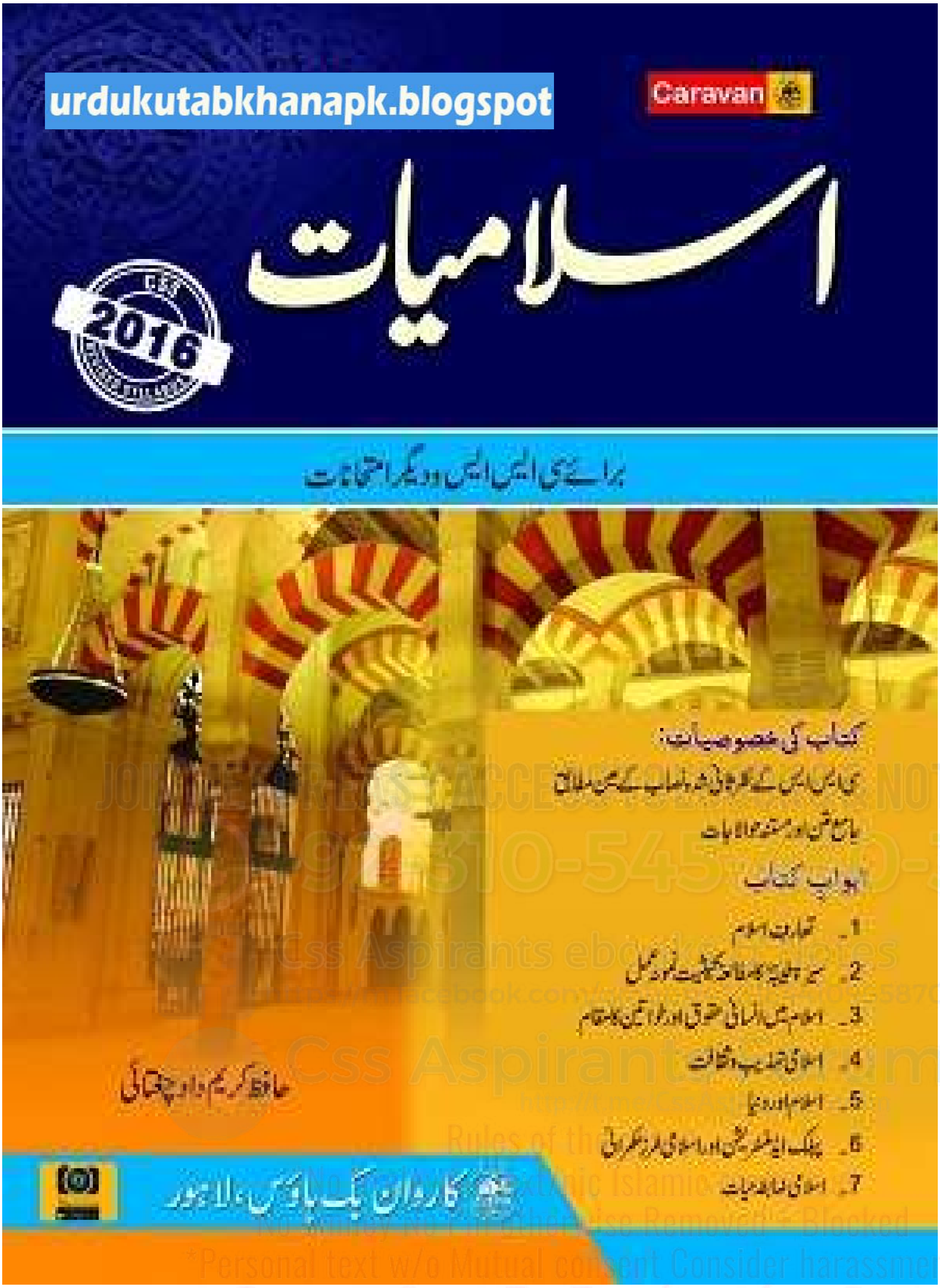

اردو کتب خانہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسلامیات (لازمی)

برائے سی ایس ایس و دیگر امتحانات

حافظ کریم داد چغتائی

کاروان بک ہاؤس
2-Kutchery Road, New Anarkali Lahore. Ph: 042-37212091, 37122955, 37352296
e.mail:caravanbookslhr@gmail.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نصاب اسلامیات (لازمی) برائے سی ایس ایس

نظرثانی شدہ

1- تعارف اسلام

- تصور اسلام
- انسانی زندگی میں دین کی اہمیت
- دین اور مذہب میں فرق
- اسلام کے نمایاں پہلو
- اسلامی عقائد کے انفرادی واجتماعی زندگی پر اثرات اور اساس دین/دین کی بنیادیں
- اسلامی عبادات کے روحانی، اخلاقی اور سماجی اثرات

2- سیرت طیبہ کا مطالعہ بہ حیثیت نمونہ عمل

- انفرادی زندگی
- سفارت کار
- معلم انسانیت
- سپہ سالار اور جنگی منصوبہ ساز
- پیغمبر امن

3- اسلام میں انسانی حقوق اور خواتین کا مقام ومرتبہ

- انسانی حقوق اور اسلام میں خواتین کا مقام ومرتبہ
- وقار انسانی (مرد وخواتین کا انسانی وقار، عزت واحترام)

4- اسلامی تہذیب وثقافت

- معانی اور اہم اجزا
- سماج اور انسانی شخصیت کی تعمیر میں تہذیب کا کردار
- اسلامی تہذیب کے نمایاں اوصاف

(توحید، تزکیہ نفس، انسانی عزت ووقار، مساوات، سماجی انصاف، اخلاقی اقدار، صبر وبرداشت، قانون کی حکمرانی)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

-5 اسلام اور دنیا

- اسلامی تہذیب کے مغرب اور مغرب کے اسلامی تہذیب پر اثرات
- جدید دنیا میں اسلام کا مقام
- اسلام اور عصر حاضر کے چیلنجز
- انتہا پسندی کا فروغ

-6 پبلک ایڈمنسٹریشن اور اسلامی طرز حکمرانی

- پبلک ایڈمنسٹریشن کا اسلامی تصور
- اچھے طرز حکمرانی کے لئے قرآنی تعلیمات
- قرآن وسنت اور فقہ کی روشنی میں طرز حکمرانی کا تصور اور عمل درآمد کا طریقہ کار
- اسلامی نظام حکمرانی کا ڈھانچہ (شوری، مقننہ، اسلامی قانون کے ماخذ)
- خلفاء راشدین کا طرز حکمرانی
- حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکومتی عہدے داروں کے نام خطوط
- سرکاری ملازمین کی ذمہ داریاں
- اسلام میں احتساب کا نظام

-7 اسلامی ضابطۂ حیات

- اسلامی نظام کی نمایاں خصوصیات
- سماجی نظام، سیاسی نظام، اقتصادی نظام، عدالتی نظام، انتظامی نظام
- اجماع اور اجتہاد کے اصول وضوابط

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

فہرست

(ابواب کے مطابق)

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1	تعارف اسلام	01-108
2	سیرت طیبہ کا مطالعہ بحیثیت نمونۂ عمل	109-171
3	انسانی حقوق اور اسلام میں خواتین کا مقام	172-204
4	اسلامی تہذیب اور ثقافت	205-239
5	اسلام اور دنیا	240-286
6	پبلک ایڈمنسٹریشن اور اسلامی طرز حکمرانی	287-405
7	اسلامی ضابطۂ حیات	406-490

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تفصیلی فہرست

(عنوان کے مطابق)

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1	باب اول: تعارف اسلام	1
	اسلام کا تصور	2
	انسانی زندگی میں دین کی اہمیت	3
	مذہب اور دین میں فرق	7
	اسلام کے نمایاں پہلو	13
	اسلامی عقائد کے انفرادی و اجتماعی زندگی پر اثرات	21
	توحید اور اس کے اثرات	24
	عقیدہ توحید اور اس کے اثرات	29
	عقیدہ رسالت اور ختم نبوت	32
	عقیدہ آخرت اور اس کے اثرات	58
	ارکان اسلام	62
	اسلام میں عبادات کا تصور	62
	روحانی، اخلاقی اور سماجی اثرات	63
	نماز اور اس کے اثرات	64
	زکوۃ اور اس کے اثرات	72
	روزہ اور اس کے اثرات	82
	حج اور اس کے اثرات	92
2	باب دوم: سیرت طیبہ بحیثیت نمونہ عمل	106
	انفرادی زندگی	107
	بطور سفارت کار	121

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

130	پیغمبر امن	
136	سپاہ سالار اور جنگی منصوبہ ساز	
152	معلم انسانیت	
171	باب سوم: انسانی حقوق اور اسلام میں خواتین کا مقام	3
172	اسلام میں انسانی حقوق	
172	حجۃ الوداع	
172	انسانی تاریخ میں پہلا انسانی حقوق کا منشور	
175	اسلام میں بنیادی حقوق	
180	اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق	
185	اسلام میں خواتین کے حقوق	
193	وقار انسانی (مرد اور خواتین کا انسانی وقار، عزت واحترام)	
203	باب چہارم: اسلامی تہذیب وثقافت	4
204	تہذیب کے معانی اور اہم اجزاء	
211	سماج اور انسانی شخصیت کی تعمیر میں تہذیب کا کردار	
213	اسلامی تہذیب کے نمایاں اوصاف	
221	توحید	
222	تزکیہ نفس	
224	انسانی عزت ووقار	
227	مساوات	
232	سماجی انصاف	
233	اخلاقی اقدار	
236	صبر وبرداشت/رواداری	
237	قانون کی حکمرانی	
239	باب پنجم: اسلام اور دنیا	5
240	اسلامی تہذیب کے مغرب اور مغرب کے اسلامی تہذیب پر اثرات	

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

	جدید دنیا میں اسلام کا مقام	259
	تہذیبوں کا تصادم	270
	اسلام اور عصر حاضر کے چیلنجز	275
	انتہا پسندی کو فروغ	281
6	باب ششم: اسلام میں پبلک ایڈمنسٹریشن کا تصور اور اسلامی طرز حکمرانی	288
	پبلک ایڈمنسٹریشن سے کیا مراد ہے؟	289
	پبلک ایڈمنسٹریشن کا اسلامی تصور	290
	اچھے طرز حکمرانی کے لئے قرآنی تعلیمات	291
	قرآن وسنت اور فقہ کی روشنی میں طرز حکمرانی کا تصور اور عمل درآمد کا طریقہ کار	291
	اسلامی نظام حکمرانی کا ڈھانچہ (شوریٰ، مقننہ، اسلامی قانون کے ماخذ)	298
	خلفائے راشدین کا طرز حکمرانی	356
	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طرز حکمرانی	364
	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکومتی عہدیداروں کے نام خطوط	387
	1- عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ (گورنر مصر) کے نام خط	387
	2- عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ (گورنر مصر) کے نام خط	387
	3- ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ (گورنر کوفہ) کے نام خط	387
	4- ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ (سپہ سالار شام) کے نام	388
	5- ابوعبیدہ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما (سپہ سالاران شام) کے نام	389
	6- عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ (گورنر عراق) کے نام	389
	7- معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ (گورنر شام) کے نام	389
	8- سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ (گورنر عراق) کے نام	389
	9- ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ (سپہ سالار شام) کے نام	389
	10- ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ (سپہ سالار شام) کے نام	389
	حضرت علی رضی اللہ عنہ کا طرز حکمرانی	390
	حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکومتی عہدیداروں کے نام خطوط	392

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

	1- مالک الاشتر رضی اللہ عنہ (گورنر مصر) کے نام	392
	2- اپنے ایک عامل کے نام	401
	3- زیاد بن ابیہ (نائب گورنر بصرہ) کے نام	401
	4- زیاد بن ابیہ (نائب گورنر بصرہ) کے نام	401
	5- عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ (گورنر بصرہ) کے نام	401
	6- ایک عامل زکوۃ کے نام	402
	7- قثم بن عباس رضی اللہ عنہ (گورنر مکہ) کے نام	402
	8- عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ (گورنر بصرہ) کے نام	402
	9- محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ (گورنر مصر) کے نام	403
	سرکاری ملازمین کی ذمے داریاں	404
	اسلام میں احتساب کا نظام	405
7	باب ہفتم: اسلامی ضابطۂ حیات	408
	اسلام کا سماجی نظام	415
	سیاسی نظام	424
	اسلامی نظام کی نمایاں خصوصیات	430
	اقتصادی نظام	452
	عدالتی وقانونی نظام	464
	اخلاقی نظام	465
	اجماع اور اجتہاد کے اصول وضوابط	480
	اجماع کے اصول وضوابط	482
	اجتہاد کے اصول وضوابط	483
	سابقہ CSS پیپرز 2016-2006	491

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

باب 1: تعارف اسلام

آؤٹ لائن

- تصور اسلام
- انسانی زندگی میں دین کی اہمیت
- دین اور مذہب میں فرق
- اسلام کے نمایاں پہلو
- اسلامی عقائد کے انفرادی و اجتماعی زندگی پر اثرات اور اساس دین/دین کی بنیادیں

توحید اور اس کے انسانی زندگی پر اثرات

رسالت اور ختم نبوت

آخرت اور اس کے انسانی زندگی پر اثرات

- اسلامی عبادات کے روحانی، اخلاقی اور سماجی اثرات

نماز اور اس کے اثرات

زکوٰۃ اور اس کے اثرات

روزہ اور اس کے اثرات

حج اور اس کے اثرات

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تصورِ اسلام

اسلام کے لغوی معنی اطاعت، جھکنے، سرتسلیم خم کرنے اور مکمل سپردگی کے ہیں۔ اس کے دوسرے لفظی معنی امن، سلامتی اور آشتی کے ہیں۔ اسلام وہ دین ہے جو خدا کی حاکمیت کی بنیاد پر ایک پورا ضابطۂ زندگی پیش کرتا ہے، اور انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ اسے قبول کرے اور اس کی پیروی کرے کیوں کہ خدا کے قانون کے آگے جھکنے اور اس کی اطاعت کرنے کا نام اسلام ہے اور اس میں یہ حقیقت بھی پوشیدہ ہے کہ خدا کی بندگی اور اطاعت کے نتیجے میں زندگی کا جو نقشہ ابھرے گا وہ امن، سلامتی اور آشتی کی نعمتوں سے مالا مال ہوگا، اس میں قلب کو اطمینان حاصل ہوگا اور انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں حقیقی امن اور سکون قائم ہوگا نیز اس زندگی کے بعد بھی انسان کو اس ابدی زندگی میں سلامتی اور آشتی میسر آئے گی۔

Syed Ameer Ali elaborates the concept of Islam as: "The essence of the ethical principles involved and embodied in Islam is thus summarized in the second chapter of the Koran :

> "There is no doubt in this book -- a guidance to the pious, who believe in the Unseen, who observe the prayers, and distribute (charity) out of what We have bestowed on them and who believe in that which We have commissioned thee with, and in that We commissioned others with before thee, and who have assurance in the life to come; -- these have received the direction of their Lord."

The principal bases on which the Islamic system is founded are:

a. A belief in the unity, immateriality, power, mercy, and supreme love of the Creator;

b. Charity and brotherhood among mankind;

c. Subjugation of the passions;

d. The outpouring of a grateful heart to the Giver of all good; and

e. Accountability for human actions in another existence.

The grand and noble conceptions expressed in the Quran of the power and loves of the Deity surpass everything of their kind in any other language. The unity of God, His immateriality, His majesty, His mercy, form the constant and never-ending theme of the most eloquent and soul-stirring passages. The flow of life, light, and spirituality never ceases. But throughout there is no trace of dogmatism. Appeal is made to the inner consciousness of man, to his intuitive reason alone."

اسلام کسی ایسے مذہب کا نام نہیں ہے جو صرف انسان کی نجی اور انفرادی زندگی کی اصلاح کا داعی ہو اور جس کا کل سرمایۂ حیات کچھ عبادات، چند اذکار اور مٹھی بھر رسوم پر مشتمل ہو بلکہ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو خدا اور اس کے آخری نبی ﷺ کی ہدایت کی روشنی میں زندگی کے تمام شعبوں کی تعمیر اور صورت گری کرتا ہے اور زندگی کے ہر پہلو کو ہدایت الٰہی کے نور سے منور کرتا ہے خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، معاشرتی ہو یا تمدنی، مادی ہو یا روحانی، معاشی ہو یا سیاسی اور ملکی ہو یا بین الاقوامی۔ اسلام کی اصل دعوت یہ ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کا قانون جاری و ساری ہو اور دل کی دنیا سے لے کر تہذیب و تمدن کے ہر گوشے تک خالق حقیقی کی مرضی پوری ہو۔

علامہ اقبال "اسلامی ثقافت کی روح" پر گفتگو کرتے ہوئے محدود مذہبی نقطۂ نظر اور اسلام کے انقلابی نقطۂ نظر کا فرق بڑی خوبی سے واضح کرتے ہیں۔ ایک صوفی بزرگ واقعۂ معراج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

محمد عربی بر فلک الافلاک رفت و باز آمد واللہ اگر من رفتمے ہر گز نیامدمے۔

محمد عربی ﷺ آخری آسمان پر گئے اور واپس آ گئے۔ قسم خدا کی اگر میں (اس معرفت و بلندی پر) گیا ہوتا تو کبھی واپس نہ آتا۔

یہ ایک جملہ محدود مذہبی نقطۂ نظر اور انبیا کے انقلابی نقطۂ نظر کے فرق کو واضح کر دیتا ہے۔ جس شخص کے پیش نظر صرف اپنی ذات کی اصلاح اور خود کو روحانی رفعتوں اور بلندیوں سے آشنا کرنا ہو وہ حق باری تعالیٰ تک پہنچنے کو اپنا منتہیٰ سمجھے گا اور اس اونچے مقام کو حاصل کرنے کے بعد دنیا کی طرف لوٹنا اور زمانے کے تلاطم میں داخل ہونا گوارا نہیں کرے گا۔ لیکن اس کے برعکس نبی کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس بلندی پر پہنچنے کے بعد آب و گل کی دنیا کی طرف واپس آتا ہے اور جو معرفت اور روشنی اسے حاصل ہوتی ہے اس کی مدد سے ایک نئی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ وہ تاریخ ساز قوتوں پر غلبہ حاصل کرتا ہے اور انسانی تہذیب وتمدن کی تشکیل جدید کا انقلابی کام انجام دیتا ہے۔ خدا نے اپنے انبیا اس لیے بھیجے کہ وہ ہدایت ربانی کے نور سے پوری دنیا کو منور کر دیں اور دین حق کی راہنمائی میں ایک نیا انسان اور ایک نیا معاشرہ قائم کریں۔ تمام انبیا اسی مشن کو لے کر آئے اور اس کام کو اپنی آخری، مکمل ترین اور معیاری شکل میں ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ نے انجام دیا۔ اسلام زندگی سے فرار کی نہیں، زندگی کی تعمیر کی تعلیم دیتا ہے اور پوری زندگی کو سنوارنے کے لیے ہدایت کا ایک مکمل نظام بھی پیش کرتا ہے۔ ہدایت کے اسی نظام کا نام دین اسلامی نظریۂ حیات یا اسلامی آئیڈیولوجی ہے۔

انسانی زندگی میں دین کی اہمیت

ا۔ فطری ضرورت:

مذہب ایک فطری اور جبلی ضرورت ہے جیسے کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

فَاَقِمْ وَجْھَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا فِطْرَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا

''اپنا منہ سب سے موڑ کر دین حنیف کی طرف کر لو یہی وہ فطرت ہے جس پر اللہ نے انسان کو پیدا فرمایا۔''

حدیث شریف میں آیا ہے:

کل مولود یولد علی الفطرۃ

ہر بچہ مسلم فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ روحانی ضرورت:

انسان اپنی پیدائش کے لحاظ سے روح اور جسم کا مرکب ہے ایک طرف جسم اور روح کے رشتے کو قائم رکھنے کے لئے مادی ضروریات اور جسمانی وسائل پیدا فرمائے تو دوسری طرف روحانی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجنے کا انتظام کیا اور انسان کو اس سلسلے میں اکیلا نہیں چھوڑا کہ وہ اندھیرے میں گمراہ پھرے۔ فرمایا:

وَاِنْ مِّنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَافِیْھَا نَذِیْرٌ

''اور کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا ہادی نہ آیا ہو۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۳۔ معاشرتی ضرورت:

انسان فطرتاً مدنی الطبع ہے لہٰذا بہتر معاشی زندگی بسر کرنے کے لیے اسے درست قوانین وضوابط کی ضرورت ہے اگر معاشرتی زندگی کے لیے کوئی اصول اور ضابطہ نہ ہو تو معاشرہ انتشار وخلفشار کا شکار ہو جاتا ہے لہٰذا مذہب انسان کی معاشرتی ضرورت بھی پوری کرتا ہے۔

۴۔ حیات کائنات کے مسائل:

ہر سمجھ دار انسان زندگی کی حقیقت، زندگی بعد الموت کی حقیقت، کائنات کی ماہیت، اس کا آغاز اور اختتام غرض پوری کائنات میں انسان کی حیثیت اور مرتبہ کے متعلق کوئی نہ کوئی تصور ضرور رکھتا ہے لیکن مذہب نے ان مسائل کا حل پیش کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی اور درست ہے مذہب نے زندگی کے مسائل کا مکمل حل بتایا ہے۔

۵۔ سکون قلب کا ذریعہ:

مذہب سے دوری اور دینی اقدار سے بیزاری نے آج تہذیب یافتہ اور ترقی پسند انسان کو دماغی اذیت اور پریشانی سے دوچار کیا ہے۔ انسان امن وآرام تلاش کرنا چاہتا ہے مذہب نے ایک ہی بات میں اس پریشانی کا حل پیش کر دیا ہے:

"اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ"

''بے شک دلوں کو اطمینان اللہ کی یاد سے ہوتا ہے۔''

۶۔ انسانیت کی فلاح:

"قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ"

''تحقیق کامیاب ہو گئے وہ لوگ جو اپنی نمازوں میں عاجزی کرتے ہیں۔''

۷۔ رہنمائے عقل:

دین عقل کی رہنمائی کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا"

''کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے ہیں۔''

حدیث پاک میں ہے:

"دین المرء عقله ومن لا دین له لا عقل له"

۸۔ بعد الموت کا تصور:

دین بعد الموت کا تصور بھی پیش کرتا ہے، فرمان الٰہی ہے:

كُلَّمَا اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَا اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا"

''جب بھی ڈالی جائے گی اس میں فوج تو پوچھے گا ان سے ان کا رب کہ کیا تمہارے پاس ڈرانے والے نہ آئے تھے کہیں گے ہاں مگر ہم نے ان کو جھٹلا دیا۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۹۔ توحید کا تصور:

قرآن پاک میں ہے:

"وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ"

ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر ہم نے وحی اس کی طرف کی یہ کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں پھر تم میری ہی عبادت کرو۔

۱۰۔ شرف انسانیت:

قرآن مجید بیان کرتا ہے:

"وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ"

"ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی۔" یعنی اسلام نے انسان کو اس کے مقام سے روشناس کرایا۔"

۱۱۔ وحدت انسانیت:

قرآن مجید بیان کرتا ہے:

"کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً"

سب لوگ ایک ہی جماعت اور امت میں تھے۔

حدیث پاک میں ہے:

"الخلق عیال الله"

"ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔" (بیہقی۔ کتاب الایمان)

۱۲۔ مساوات:

حدیث شریف میں آتا ہے:

"لا فضل لعربی علی عجمی"

"عربی کو عجمی پر شرف نہیں"

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ.

بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے عزت والا وہ ہے جو تقویٰ والا ہے۔

۱۳۔ رواداری:

اسلام رواداری کا قائل ہے، اس لیے فرمایا: "لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ"

"دین میں زبردستی نہیں"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۱۴۔ امن عالم:

مذہب اسلام امن و آشتی کا پیغام دیتا ہے، فرمان الٰہی ہے:

"وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ"

''اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔''

۱۵۔ نفس کا تزکیہ:

قرآن مجید میں تزکیہ نفس کرنا بھی دین کا کام بتایا گیا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے مومنین پر احسان کیا ہے کہ ان میں انہی میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیا جو انہیں آیات پڑھ کر سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی علیم دیتا ہے۔'' (آل عمران۔۱۶۴)

۱۶۔ علم کی ترقی:

علم کو عروج اور ترقی بخشنا بھی دین کا کام ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ"

''ہم نے تمہارے لیے شب و روز اور سورج چاند کو مسخر کر دیا۔''

۱۷۔ ادیان عالم میں اسلام کی عظمت:

اسلام دین فطرت ہے اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اسلام دین رحمت ہے اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے اس لیے اس دین کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اللہ پاک فرماتے ہیں:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

بے شک اللہ کے نزدیک پسندیدہ دین اسلام ہے اور فرمایا

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ

''کہ جو اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو تلاش کرے گا اس کے اس دین کو ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔''

خلاصہ یہ کہ اسلام ہی وہ دین ہے جو لوگوں کے لیے امن و آتشی کا پیامبر بن سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مذہب ہر انسان کی ضرورت ہے اس لیے پوٹارک (POTARK) کہتا ہے:

" کسی انسان نے کوئی بستی نہیں دیکھی جس میں مذہب نہ ہو"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دین اور مذہب میں فرق

مذہب کا ارتقا

مذہب کے آغاز کے بارے میں اس وقت دو تصورات پائے جاتے ہیں۔ ایک ارتقائی تصور اور دوسرا وہ تصور جو خود مذاہب نے پیش کیا ہے۔

مذہب کے ارتقائی تصورات کی رو سے انسان کی ابتدا گمراہی اور لاعلمی سے ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ انسانوں نے مشرکانہ خدا پرستی اور توحید پرستی اختیار کرلی۔ اس عمل کی تفصیلات میں کافی اختلافات ہیں مثلاً کچھ کا خیال ہے کہ اس کی ابتدا آباؤاجداد کی محبت سے ہوئی اور کچھ دوسرے مذہب کی ابتدا مظاہر فطرت مثلاً رعد و برق کے خوف سے کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسان نے ابتدا میں اپنی جہالت کی وجہ سے مظاہر فطرت کی پرستش شروع کر دی اس لیے کہ ابتدا میں اس کی زندگی و موت کا دارومدار بہت حد تک ان پر تھا؛ مثلاً زلزلے، طوفان، سیلاب، آتش فشانیاں وغیرہ۔ لیکن جیسے جیسے اس کا علم بڑھتا گیا اس نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ یہ خدائی قوتیں نہیں رکھتے۔ ابتدا میں لوگوں نے ہر چیز کو دیوتا بنالیا تھا لیکن علمی ترقی کے ساتھ ساتھ خداؤں کی تعداد کم ہونے لگی یہاں تک کہ صرف ایک خدا رہ گیا۔

اس کے برخلاف مذہبی نقطۂ نظر یہ ہے کہ خدا نے جب انسان کو اس دنیا میں بھیجا تو ساتھ ہی اس کی تمام جسمانی ضروریات کی طرح اس کی روحانی ضروریات (ہدایت) کا بھی سامان کیا۔ پہلا شخص جسے خدا نے بھیجا ہدایت یافتہ بلکہ پیغمبر تھا۔ اس کے بعد بھی لوگوں میں جب گمراہی پھیلی تو خدا نے پھر پیغمبر بھیجے جنہوں نے دنیا کو راہ ہدایت دکھائی۔ اس اعتبار سے توحید قدیم ہے اور شرک جدید۔ اس وقت دنیا میں جتنے بڑے بڑے مذاہب ہیں (عیسائیت، یہودیت، اسلام وغیرہ) ان کے داعی خدا کے پیغمبر ہی تھے اور اس بنا پر ابتداً ان کی تعلیمات، جزوی فرق کو چھوڑ کر، یکساں تھیں۔ بعد میں (اسلام کو چھوڑ کر) ہر مذہب کے پیروؤں نے اپنے اپنے مذہب میں ترامیم کرلیں۔

علم الانسان کی جدید تحقیق کے بعد بہت سے مغربی ماہرین بھی اب ارتقائی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر مذہبی نقطۂ نظر کو ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

پروفیسر شمٹ کے کہنے کے مطابق:

> ''علم شعوب وقبائل انسانی کے پورے میدان میں اب پرانا ارتقائی مذہب بالکل بے کار ہو گیا ہے۔ نشوونما کی مرتب کڑیوں کا وہ خوش نما سلسلہ جو اس مذہب نے پوری آمادگی کے ساتھ تیار کیا تھا اب ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے اور نئے تاریخی رجحانوں نے اسے اٹھا کر پھینک دیا ہے۔''

یہی مصنف ایک اور جگہ لکھتا ہے:

> ''اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انسان کے ابتدائی تصور کی اعلیٰ ترین ہستی فی الحقیقت توحیدی اعتقاد کا خدائے واحد تھا اور انسان کا دینی عقیدہ جو اس سے ظہور پذیر ہوا وہ پوری طرح ایک توحیدی دین تھا۔''

مذہب کی تعریف

مذاہب عالم کی کثرت اور ان میں عقائد و اعمال کے تنوع کی وجہ سے مذہب کی کوئی جامع مانع تعریف کرنا مشکل ہے۔ اس کی مختصر اور سادہ ترین تعریف ای۔ بی۔ ٹیلر نے کی ہے: ''مذہب روحانی موجودات پر اعتقاد کا نام ہے''۔ اس تعریف کی رو سے ہم دنیا کے بے شمار مذاہب کا جوہر سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن کئی مذاہب ایسے بھی ہیں (مثلاً ابتدائی بدھ مت اور کنفیوشی مت) جن میں ایمان وعقائد کی چنداں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اہمیت نہیں اور جن کو ہم زیادہ سے زیادہ ایک بااخلاق زندگی گزارنے کا ضابطہ کہہ سکتے ہیں۔ غالباً اسی کے پیش نظر میتھو ارنلڈ نے مذہب کو جذبات سے متاثر اخلاق یا جذباتی اخلاق کہا ہے۔ پروفیسر وائٹ ہیڈ لکھتے ہیں "مذہب اعتقاد کی اس قوت کا نام ہے جس سے انسان کی اندرونی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ مذہب ان صداقتوں کے مجموعہ کا نام ہے جن میں یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ انسانی کردار میں انقلاب پیدا کر دیں یہ شرط ہے کہ انہیں خلوص کے ساتھ قبول کیا جائے اور بصیرت کے ساتھ سمجھا جائے۔"

دین اور مذہب

جواب: مذہب کے لغوی معانی:

مذہب عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں راستہ، طریقہ، اعتقاد، مسلک، مشرب۔

مذہب کے مترادفات:

ہندی میں مذہب کے مترادف پنتھ، دھرم اور مت وغیرہ کے ہیں۔ انگریزی میں اسے Religion کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

مذہب مغربی مفکرین کے نزدیک:

مغربی مفکرین نے مذہب کی تعریفات یہ کی ہیں:

1- کانٹ کا کہنا ہے:

"ہر فریضہ کو خدائی حکم تصور کرنا مذہب ہے۔"

2- کال ورٹن کے نزدیک:

"انسان نے قوت کا نام مذہب رکھ لیا ہے جس کے متعلق اس نے یہ عقیدہ بنالیا ہے کہ اس مذہب کے زور سے وہ کائنات کو مسخر کرے گا۔"

3- پروفیسر وائٹ ہیڈ کہتا ہے:

(ا) انسان جو بھی اپنی ذات کی تنہائی سے کرتا ہے "مذہب کہلاتا ہے۔"

(ب) مذہب عقیدہ کی اس طاقت کا نام ہے جس سے انسان کو روحانی پاکیزگی ملتی ہے۔

4- بقول شوپنھار:

"مذہب موت کے تصور سے وابستہ ہے۔"

5- ولیم جیمز کا خیال ہے:

"انفرادی اشخاص کے عالم انتہائی کے وہ جذبات، اعمال اور تجربات، جن کے ذریعے وہ خیال کریں کہ ان کا رشتہ اس چیز سے ہے جسے اپنی دانست میں خدا کہتے ہیں، مذہب کہلائے جاتے ہیں۔"

6- ہاف ڈنگ کی سوچ ہے:

"مذہب اقدار کی مداومت کا نام ہے۔"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

7- برونائٹ ہیڈ کہتا ہے:

"مذہب عقیدہ کی اس طاقت کا نام ہے جو نہ صرف انسان میں بلکہ اس کے کردار میں انقلاب پیدا کردیتی ہے، مگر شرط یہ کہ اس کو خلوص کے ساتھ قبول کرلیا جائے اور بصیرت کے ساتھ سمجھ لیا جائے۔"

8- اوسپسکی کہتا ہے:

مذہب ایک انسانی تصور ہے، جس قسم کی انسان کی اپنی سطح ہوگی، اس قسم کا اس کا مذہب ہوگا۔"

9- سالمن رینش کے نزدیک:

"مذہب ان اعتقادات کے مجموعہ کا نام ہے، جو ہماری قدرتی استعداد کے آزادانہ استعمال میں حائل ہوں۔"

10- پروفیسر جیمز ایچ لیوبا کہتا ہے:

(ا) مذہب اس کوشش کا نام ہے جو انسان زندگی کے حقیقی مقاصد کے ادراک کے لیے کرتا ہے۔

(ب) مذہب اس احسان کا نام ہے، جو کسی پاک، بلندتر اور ان دیکھی ذات کا وجود انسان کے دل ودماغ میں پیدا کرتا ہے۔

(ج) مذہب ایک روحانی اور نفسی حالت ہے، جس کی بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ انسان اور کائنات میں باہم ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

11- میکس کلر کے نزدیک:

مذہب ایک ایسی ذہنی صلاحیت کا نام ہے، جس سے انسان غیر محدود طاقت کا ادراک کرسکتا ہے۔

12- فرانڈرچ کے نزدیک:

ہر انفرادی چیز کو ایک عظیم کل کا جز تصور کرنا اور ہر محدود شئے کو لامحدود کا نمائندہ قرار دینا مذہب ہے۔

مذہب کا اصطلاحی مفہوم:

مذہب ایک ایسا راستہ ہے، جس پر چل کر منزل مقصود تک رسائی حاصل کرلی جاتی ہے۔ (A PATH TO WALK ON IT)

مذہب کی قرآنی تعلیمات:

مذہب ان ہدایات اور احکامات کا نام ہے، جو ضرورتوں کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے اپنے بندوں پر اتارے جس پر چل کر انسان اس دنیا اور آخرت کی زندگی کے کام سنوار سکتا ہے۔ یعنی مذہب انسان کی روح اور جسم کے تمام تقاضوں کی تکمیل کا نام ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ.

"اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں اور آخرت میں بھلائی دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔"

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ مذہب کا تعلق روح و جسم دونوں سے ہے۔ اسلام میں دین اور دنیا کی دوئی (Dhality) کا تصور بالکل غلط ہے۔ اللہ کا دین انسانی زندگی کا ایک مکمل دستور حیات ہے۔ نظام زندگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے قرآن مجید نے اس مطلب کو دین، ملت، سبیل، شریعت، ہدایت، صراط اور طریق کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دین کے لغوی معانی:

عربی لغت کے اندر دین کے مندرجہ ذیل معانی بیان کیے گئے ہیں:

-1	بدلہ	-2	مہتر وغلبہ	-3	تدبیر	-4	مجبوری
-5	گناہ	-6	پرہیزگاری	-7	نافرمانی	-8	فرمانبرداری
-9	ذلت	-10	حساب	-11	قدرت	-12	ملکیت
-13	حکم	-14	مذہب	-15	ملت	-16	حالت
-17	عادت	-18	سیرت				

مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ اور دین:

مولانا فرماتے ہیں ''سامی زبانوں کا ایک پرانا مادہ ''دان'' اور ''دین'' ہے جو بدلہ اور مکافات کے معنوں میں بولا جاتا تھا اس کے علاوہ آئین وقانون کے معنوں میں بھی بولا جانے لگا۔ چنانچہ عبرانی اور آرامی میں اس کے کئی مشتقات ملتے ہیں۔ آرامی زبان ہی سے غالباً یہ لفظ قدیم ایران میں بھی پہنچا اور پہلوی میں ''دینیہ'' نے شریعت وقانون کا مفہوم پیدا کرلیا۔ خورداوستا میں ایک سے زیادہ موقع پر یہ لفظ مستعمل ہوا ہے اور زردشتیوں کی پرانی ادبیات میں انشاء وکتابت کے آئین وقواعد کو بھی ''دین دبیرہ'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ زردشتیوں کی ایک مذہبی کتاب کا نام ''دین کارت'' ہے جو غالباً نویں صدی مسیحی میں عراق کے ایک موبد نے مرتب کی پس عربی میں ''الدین'' کے معنی بدلہ اور مکافات کے ہیں خواہ اچھائی کا ہو خواہ برائی کا۔

قانون اور مذہب کے لئے بھی ''الدین'' کا لفظ مستعمل ہوا کیونکہ مذہب کا بنیادی اعتقاد مکافات عمل کا اعتقاد ہے اور قانون کی بنیاد تعزیر وسیاست پر ہے۔ سورۂ یوسف میں جہاں پر واقعہ بیان ہوا کہ ''حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے پاس روک لیا تھا وہاں فرمایا''

مَا كَانَ لِيَاْ خُذَ اَخَاهُ فِیْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ''

یہاں پر بادشاہ مصر کے دین سے مقصود اس کا قانون ہے۔

لہٰذا ''دین ایک مکمل قانون کا نام ہے جو کسی انسان کا قائم کردہ نہیں بلکہ خدا تعالیٰ نے وحی کے ذریعے حضرت محمد ﷺ پر نازل کیا ہو اس دین کا نام اسلام ہے اسلام ایک نظام حیات ہے اس لیے اس کو دین کہنا ہی درست ہے۔

لفظ دین کا قرآن میں استعمال:

-1 اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ قف

بے شک اللہ کے نزدیک پسندیدہ دین اسلام ہے۔ اور فرمایا:

-2 هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ لا

وہی ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث کیا تا کہ اسے تمام ادیان پر غالب کردے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

3- اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط

آج کے دن میں نے تم پر اپنا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت مکمل کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند فرمایا۔

مذہب اور دین میں فرق:

مغربی مفکرین نے مذہب کی جو تعریفات کی ہیں وہ اسلامی نقطۂ نظر سے مختلف ہیں اسلام کے نزدیک دین اور مذہب دو مختلف اشیاء ہیں ان میں سے دین کو کل کی حیثیت حاصل ہے اور مذہب اس کی جزو ہے دین ایک مکمل قانون ہے جو انسانی زندگی کے لئے ضابطہ حیات مقرر کرتا ہے دین ایک ایسا قانون ہے جو حضرت محمد ﷺ پر بذریعہ وحی لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے نازل ہوا یہ دونوں زندگیوں کے لئے مشعل راہ ہے اس پر چل کر انسان دنیا و آخرت میں کامیاب ہو سکتا ہے جبکہ

مذہب ایک شاخ کا نام ہے جو فقہ پر مشتمل ہے دین اسلام میں مہارت رکھنے والے اور قانون کی تشریح کرنے والوں نے قرآن و سنت کی روشنی میں جو اصول مقرر کیے ان کا نام مذہب ہے۔ اسلام میں چار مذاہب مشہور ہیں:

1- حنفی 2- مالکی 3- شافعی 4- حنبلی

مختصر یہ کہ ہر فقیہہ کا اپنا مسلک مذہب کہلاتا ہے۔

دین کا مفہوم:

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

دین کا لفظ کلام عرب میں مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے لیکن اس کے سارے استعمالات کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ چار بنیادی تصورات کی ترجمانی کرتا ہے، یعنی

(ا) غلبہ و تسلط، کسی ذی اقتدار کی طرف سے۔

(ب) اطاعت اور بندگی، صاحب اقتدار کے آگے جھک جانے والے کی طرف سے۔

(ج) قاعدہ و ضابطہ اور طریقہ جس کی پابندی کی جائے۔

(د) محاسبہ اور فیصلہ اور جزا و سزا۔ قرآن کی زبان میں لفظ دین ایک پورے نظام زندگی کی نمائندگی کرتا ہے۔ جس کے اجزائے ترکیبی یہ چار ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کا اقتدار اعلیٰ؛

۲۔ اس حاکمیت کے مقابلے میں تسلیم و اطاعت؛

۳۔ وہ مکمل نظام فکر و عمل جو اس حاکمیت کے زیر اثر ہے؛

۴۔ جزا و سزا جو اقتدار اعلیٰ کی طرف سے اس نظام کی وفاداری و اطاعت یا اس سے سرکشی و بغاوت کے صلے میں دی جائے۔

قرآن 'دین' کو ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے اور اس کی زبان میں اس سے مراد ایک ایسا نظام زندگی ہے جس میں انسان کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت و فرماں برداری قبول کرے۔ اس کے حدود و ضوابط و قوانین کے تحت زندگی بسر کرے۔ اس کی فرماں برداری پر عزت، ترقی اور انعام کا امیدوار ہو اور اس کی نافرمانی پر ذلت و خواری اور سزا سے ڈرے۔ حاکمیت کا یہ مقام خدائے واحد کو حاصل ہے اور اسلام وہ دین ہے جو اس حاکمیت کی اساس پر قائم ہے اور جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے صحیح طریقۂ زندگی قرار دیا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً ط (المائدہ۔۳)

ترجمہ: ''آج ہم نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لیے 'اسلام' (بحیثیت) دین پسند کیا۔''

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران۔۹۹)

ترجمہ: ''بے شک خدا کے نزدیک تو اصل دین 'اسلام' ہے۔''

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْناً فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ ج (آل عمران۔۸۵)

ترجمہ: ''اور جو 'اسلام' کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا اس سے وہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسلام کے نمایاں پہلو
تصورِ اسلام کی امتیازی خصوصیات
اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات

اسلامی نظریۂ حیات کیا ہے؟

مکمل ضابطۂ زندگی کی حیثیت سے اسلامی تعلیمات کے دو پہلو ہیں: ایک طرف اسلام زندگی کی بنیادی حقیقتوں پر روشنی ڈالتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ اس کائنات کی حقیقت کیا ہے، اس میں انسان کا اصل مقام کیا ہے، زندگی کا مقصد کیا ہے اور جو اساسی قانون اس میں کارفرما ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ اسلام بنیادی عقائد کی شکل میں زندگی کی حقیقتوں سے انسان کو روشناس کراتا ہے اور کائنات اور حیات کے بارے میں اسے صحیح زاویۂ نظر عطا کرتا ہے۔ دوسری طرف اسلام زندگی کا مفصل قانون پیش کرتا ہے تاکہ انسان افراط اور تفریط سے بچ کر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اعتدال و توازن کی بنیادوں پر استوار کرے اور کامیاب و کامران رہے۔ عقائد اور ضابطۂ عمل کے اس مجموعے کا نام 'اسلامی نظریۂ حیات' ہے اور علوم عمرانی کی اصطلاح میں عقائد اور ضابطۂ عمل کے اسی مجموعے کو 'آئیڈیولوجی' کہا جاسکتا ہے۔ جدید عمرانی لٹریچر میں یہ لفظ ایک ایسے ضابطۂ فکر و عمل اور اجتماعی پروگرام کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے جو اپنی فکری اور فلسفیانہ بنیادیں رکھتا ہو اور سیاست اور تمدن و معاشرت کے لیے بھی ایک واضح لائحۂ عمل پیش کرتا ہو۔

'لغت فلسفہ' میں ڈاکٹر جارج بواس اس کی یہ تعریف کرتے ہیں:

''عام نظریات کا کوئی ضابطہ یا کوئی ایسا پروگرام جس کی اساس فکر و فلسفہ پر ہو۔''

اس طرح مشہور ماہر لسانیات ویبسٹر اس کی یہ تعریف کرتا ہے:

''کسی تہذیبی، سیاسی یا معاشرتی تحریک کے عام منصوبے یا لائحۂ عمل کا علمی بیان۔''

ان تعریفات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نظریۂ حیات سے کسی تحریک یا نظام تمدن کی فکری بنیادیں اور ان سے ماخوذ تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی پروگرام و لائحۂ عمل مراد ہے اور جب ہم 'اسلامی نظریۂ حیات' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس سے وہ نظام فکر اور وہ تہذیبی اور تمدنی لائحۂ علم مراد ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ نظریۂ حیات کی اصل خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ اپنے خاص نظام فکر کی روشنی میں زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق رہنمائی کرتا ہے اور جس طرح ہار کے موتیوں کو ایک سرشتہ باہم منسلک کر دیتا ہے اسی طرح ہر نظریۂ حیات کی ایک مشترک روح زندگی کے تمام شعبوں کے پروگراموں کو جوڑ کر ایک وحدت بنا دیتی ہے۔ ہر شعبے میں یہی ایک روح اور فکر کارفرما ہوتی ہے۔ اس طرح ایک مکمل ضابطۂ فکر و عمل رونما ہوتا ہے جس میں زندگی کی حقیقی وحدت جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں حیاتِ انسانی کے تمام پہلوؤں میں یک رنگی اور ہم آہنگی رونما ہوتی ہے اور اس یک رنگی سے زندگی میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں ایمان اور عمل صالح دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ آتا ہے اور ایک کے بغیر دوسرا در اصل نامکمل رہتا ہے۔

ا۔ الہامی نظام حیات:

اسلامی نظریۂ حیات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا نظام حیات پیش کرتا ہے جو محض عقل انسانی کی کوششوں کا نتیجہ نہیں بلکہ ربانی ہدایت پر مبنی ہے۔ اسلام کسی انسان کے ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ اسی خالق کی طرف سے آیا ہوا نظام حیات ہے جس نے زمین و آسمان اور خود انسان کو پیدا کیا ہے اور جو ماضی، حال اور مستقبل سے بہ خوبی واقف ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

یہ کائنات کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ اس کا ایک خالق ہے جس نے انسان کو یہاں اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے۔ اس نے جہاں انسان کی مادی اور جسمانی ضروریات کی تکمیل کا سامان کیا ہے وہیں اس کی روحانی، اخلاقی اور تمدنی ضروریات کی تکمیل کا بھی پورا خیال رکھا ہے۔ اسی مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے بار بار انبیا و رسل بھیجے کہ وہ الہامی ہدایت کی روشنی میں انسانوں کو صحیح راستہ دکھائیں۔ قرآن میں اس کو اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان کہا گیا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے مومنین پر احسان کیا ہے کہ ان میں انہی میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیا جو انہیں آیات پڑھ کر سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی علیم دیتا ہے۔'' (آل عمران۔۱۶۴)

پیغمبر کا کام ایک طرف تو یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب لوگوں تک پہنچائیں اور دوسری طرف یہ کہ وہ خود ان تعلیمات کو اپنی زندگی میں اپنا کر لوگوں کے سامنے اس کا نمونہ پیش کریں۔ اسی لیے اسلامی نظام حیات کے اولین ماخذ دو ہیں ایک قرآن اور دوسرا سنت رسول اللہ ﷺ۔ قرآن ہمارے پاس کتاب کی شکل میں موجود ہے اور سنت کو ہم قرآن، تواتر، احادیث اور عمل صحابہ کے ذریعے سے معلوم کرتے ہیں۔

اسلامی نظریۂ حیات کی یہی خصوصیت اسے باقی تمام نظریات سے مختلف اور ممتاز کر دیتی ہے۔ اس نظام میں کسی کے لیے اپنی طرف سے کسی بات کے بڑھانے گھٹانے کی گنجائش نہیں۔ اس کے تمام بنیادی اصول غیر متبدل ہیں، اگر ساری دنیا کے مسلمان مل کر بھی ان اصولوں میں کوئی تغیر کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اسلام وہ کچھ ہے جو مسلمان کرتے ہیں، تو یہ بالکل غلط بات ہے۔ اگر ساری دنیا کے مسلمان مل کر بھی کوئی ایسا کام کریں جس کا جواز قرآن یا سنت سے نہ ملتا ہو تو وہ عمل اسلامی نہ ہوگا۔

الہامی ہدایت کا دعویٰ تو تمام مذاہب کرتے ہیں لیکن موجودہ دور میں اسلام کے سوا کسی الہامی مذہب کی تعلیمات محفوظ نہیں، کچھ تو اس وجہ سے کہ وہ مذاہب اس زمانے کے ہیں جب تحریر کے ذریعے چیزیں محفوظ نہ ہو سکتی تھیں، اور کچھ اس وجہ سے کہ بعد میں ان مذاہب کے پیروؤں نے ان میں بے شمار تبدیلیاں کر دیں اور اپنی من مانی چیزیں داخل کر دیں۔ ان میں سے کوئی مذہب اپنی اصل شکل میں محفوظ نہیں، اس بنا پر درحقیقت اسلام موجودہ دنیا کا واحد الہامی مذہب ہے۔

۲۔ ایک مکمل ضابطۂ زندگی:

اسلام کی سب سے نمایاں اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ زندگی کا نہایت منظم ضابطہ ہے۔ حیات انسانی کا کوئی گوشہ خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، قومی ہو یا بین الاقوامی، معاشی ہو یا سیاسی، معاشرتی ہو یا قانونی، اسلام کی ہدایات سے محروم نہیں رہا۔ اکثر اوقات یہ غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ مذہب انسان کا شخصی اور انفرادی معاملہ ہے۔ دوسرے مذاہب کے بارے میں تو یہ بات صحیح ہو سکتی ہے لیکن اسلام ان معنوں میں مذہب نہیں۔ قرآن میں اس کے لیے 'دین' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے جس کے معنی ہیں مکمل ضابطۂ ہدایت اور اس اعتبار سے اسلام کو محض نماز روزہ تک محدود کر دینا صحیح نہیں۔ اس بات کو اچھی طرح نہ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت سے اچھے بھلے لوگ جو نماز روزہ کے پابند ہیں اپنی زندگی کے دوسرے شعبوں میں اسلام کے نفاذ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ قرآن نے کہا ہے:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ

ترجمہ: ''اے اہل ایمان، اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔'' (البقرہ۔۲۰۸)

اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک مسلمان کی زندگی کا ہر رخ خدا کی مرضی کے مطابق متعین ہوتا ہے اور وہ اپنی زندگی کے ہر دائرے میں، اپنے سارے افعال واعمال میں اور اپنے کل معاملات وتعلقات میں خدا کی ہدایت کی پیروی کرنے والا ہوتا ہے۔ اس کی خلاف ورزی کو شیطان کی پیروی قرار دیا گیا ہے اس لیے کہ شیطان ابتداً خدا کا پرستار تھا لیکن جب اسے ایک ایسا حکم دیا گیا جو اس کے نفس پر گراں گزرا (یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا) تو اس نے انکار کر دیا اور گمراہی کا شکار ہوا۔

۳۔ ایمان اور نفس کی اصلاح:

اسلامی نظریۂ حیات کی تیسری خصوصیت ایمان ہے، ایمان خدا پر، اس کے رسولوں پر اور زندگی بعد موت پر۔ یہی ایمان اس کی فکری اور فلسفیانہ بنیاد ہے۔

درحقیقت انسان اپنے شعور ہی کی بنا پر جمادات ونباتات اور حیوانات سے ممیز ہے، درختوں کے نشوونما کا ایک راستہ متعین ہے او وہ اس سے بھی نہیں ہٹ سکتے، دریاؤں کے بہنے کا ایک قانون متعین ہے اور وہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ حیوانات اپنی جبلتوں کے تابع ہیں، لیکن ان سب کے برخلاف انسان کو شعور اور ارادہ کی دولت سے نوازا گیا ہے۔

اسلامی نظریۂ حیات انسان کے اس شعور اور آزادی کے اعتراف پر مبنی ہے۔ اس لیے اس کا نقطۂ آغاز ایمان ہے۔ ایمان سے مراد فکر ونظر اور دل ودماغ کی تبدیلی ہے تاکہ انسان کا زاویۂ نگاہ اور سوچنے کا انداز بدل جائے اور وہ اپنی پوری زندگی کو خدا کی اطاعت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے سرگرم ہو جائے۔

خدا کی ہدایت سے ہٹ کر جتنے بھی فلسفے وضع کیے گئے ہیں ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی میں محض خارج کی تبدیلی سے انقلاب لانا چاہتے ہیں اور انسان کے اندرونی سے تعرض نہیں کرتے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے فساد خون کا تو علاج نہ کیا جائے اور پھوڑے پھنسیوں پر پھاہے لگا لگا کر مرض دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے برخلاف اسلام بنیاد کی تعمیر پر زیادہ زور دیتا ہے۔ وہ دل ودماغ سے غیر اللہ کی عقیدت ومحبت ختم کر کے ایمان کو خدا کے لیے خالص کر لیتا ہے اور پھر جب ایمان پیدا ہو جاتا ہے اور سوچنے کا انداز اور فکر ونظر کے زاویے بدل جاتے ہیں تو انسان کی پوری شخصیت بدل جاتی ہے۔

۴۔ دین ودنیا کی وحدت:

اسلامی نظریۂ حیات کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس نے دین ودنیا کی اس مصنوعی علیحدگی کو ختم کر دیا جو مختلف مذاہب میں رائج ہے۔ اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدائی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان دنیوی علائق سے کنارہ کشی اختیار کرے۔ اکثر مذاہب میں ترک دنیا کی تعلیم ملتی ہے۔ لیکن اسلام میں ترک دنیا کی بڑی شدت سے مخالفت کی گئی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

لا رهبانية فى الاسلام

ترجمہ: ''اسلام میں ترک دنیا کا کوئی مقام نہیں۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نہ صرف یہ کہ اسلام میں ترک دنیا کی ممانعت ہے بلکہ ان اعمال کو جنہیں عام طور پر دنیاوی اور مادی سمجھا جاتا ہے، مثلاً اکتساب رزق و عیال، اسلام نے باعث اجر وثواب بتایا ہے، ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ ''جو شخص والدین کے لیے محنت کرتا ہے وہ اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے، اہل وعیال کے لیے محنت کرتا ہے وہ بھی اللہ کے لیے کام کرتا ہے اور جو اپنی ذات کو فقر وفاقہ سے بچانے کے لیے کام کرتا ہے وہ بھی اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے۔'' جو کام اللہ کی مرضی کے مطابق اور اس کی راہ میں کیا جائے 'عبادت' ہے لہٰذا طلب رزق اور پرورش عیال بھی اپنے وسیع مفہوم میں عبادت ہی میں مصروف ہونا باعث اجر اور ان سے غفلت برتنا باعث عذاب ہے۔

اپنی دنیاوی بہتری سے غفلت برتنا اور یہ سمجھنا کہ اس طرح انسان اپنی آخرت سنوار رہا ہے، غلط ہے۔ جن مذاہب نے یہ تعلیم دی ان کے بارے میں صحیح کہا گیا ہے کہ وہ مذاہب عوام کی افیون ہیں۔ اسلام نے اس کے برخلاف حکم دیا ہے کہ

وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا

ترجمہ: ''اور دنیا سے اپنا حصہ لینا نظر انداز نہ کرو (نہ بھولو)۔'' (القصص۔ ۷۷)

اسلام یہ بتاتا ہے کہ دنیوی زندگی اور اخروی زندگی دونوں کی اصلاح ضروری ہے، ان میں سے کسی کو بھی ترک نہیں کیا جا سکتا اور ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کو جو دعا سکھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

ترجمہ: ''اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بہترین اجر دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔'' (البقرہ)

اسلام نے جو ہمہ گیر نظام زندگی پیش کیا ہے وہ انسان کی دنیاوی فلاح کا بھی اتنا ہی ضامن ہے جتنا آخروی فلاح کا۔ اگر انسان اس دنیاوی زندگی کو الہامی ہدایت کے تحت گزارے تو دنیاوی زندگی کا یہ سنوار آخروی زندگی کے سنوار کا راستہ ثابت ہوگا۔

۵۔ انفرادیت یا اجتماعیت:

اسلام کی ایک اور اہم امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اجتماعیت اور انفرادیت کے درمیان بڑا توازن قائم رکھتا ہے۔ وہ ہر انسان کو فرداً فرداً ذمہ دار ٹھہرا کر خدا کے سامنے مسئول بناتا ہے، ان کے بنیادی حقوق کی ضمانت دیتا ہے، ان کی شخصیت کے نشوونما کے مواقع فراہم کرتا ہے اور اس خیال کی شدت سے مخالفت کرتا ہے کہ افراد کی شخصیت، اجتماعیت یا ریاست میں گم ہو جانی چاہیے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝

ترجمہ: ''اور جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی تو وہ اسے اپنی نگاہوں کے سامنے پائے گا اور جس نے ذرہ برابر بھی برائی کی تو وہ اسے بھی دیکھے گا۔'' (سورہ الزلزال)

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ

ترجمہ: ''اس کے لیے (فائدہ مند) وہ ہے جو اس نے کمایا ہے اور وہ (اسی گناہ کا بوجھ) برداشت کرے گا جس کا خود اکتساب ہوگا۔'' (البقرہ۔ ۲۸۶)

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اسلام، افراد میں اجتماعی ذمہ داری کا احساس پیدا کرتا ہے، افراد کو ریاست اور سماج کی شکل میں منظم کرتا ہے اور ان کو حکم دیتا ہے کہ وہ معاشرے کی بھلائی کے لیے کام کریں۔ رہبانیت یا معاشرے سے الگ تھلگ رہنے کو اسلام نے پسند نہیں کیا۔ نماز کے لیے جماعت

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گیا ہے کہ با جماعت ہوتا کہ مسلمانوں میں سماجی تنظیم (ڈسپلن) پیدا ہو سکے۔ مالداروں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ زکوٰۃ ادا کریں اور قرآن میں مسلمانوں کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ ان کی دولت میں فقراء اور مساکین کا بھی حصہ ہوتا ہے (۱۹:۵۱)۔ مسلمانوں پر فریضۂ جہاد عائد کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت پڑنے پر افراد سے اسلام اور اسلامی ریاست کے تحفظ کے لیے جان کی قربانی بھی طلب کی جا سکتی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

كلكم راع و كلكم مسؤل عن رعيته

ترجمہ: ''تم میں سے ہر ایک چرواہے (کی مانند ہے) اور ہر ایک سے اس کے گلے کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی۔''

ایک اور حدیث میں ارشاد ہوا کہ ''مل جل کر رہو، ایک دوسرے سے مت کٹو، دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرو، مشکلات پیدا نہ کرو۔''

ایک اور حدیث میں تہدید کی گئی کہ ''وہ مسلمان نہیں جو اپنا پیٹ بھرے لیکن اس کا پڑوسی بھوکا رہ جائے۔''

مختصراً اسلام نہ تو فرد کو نظر انداز کرتا ہے اور نہ سماج کو، وہ ان دونوں میں توازن اور تناسب قائم کر کے ہر ایک کو اس کا حق دلواتا ہے۔

۶۔ مکمل توازن:

اوپر کے صفحات میں اسلامی نظریۂ حیات کی جن خصوصیات کا ہم نے تذکرہ کیا ہے ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس نظریے کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کے درمیان ایک حسین توازن پایا جاتا ہے۔ تاریخ کے طالب علم اس بات سے واقف ہیں کہ دنیا میں مفکر، فلسفی اور مصلح تو ہزاروں لاکھوں ہوئے ہیں لیکن ان کی تعلیمات میں یک رخا پن ہے۔ کسی نے روحانی پہلو پر زور دیا ہے تو مادی پہلو کو نظر انداز کر دیا اور کسی نے مادی پہلو پر توجہ صرف کی ہے تو اخلاقی پہلو کو چھوڑ دیا۔ کسی نے معاشیات کو زندگی کی اساس قرار دیا ہے اور کسی نے نفسیات اور جنس کو۔ کسی نے دنیا کے ترک کی تعلیم دی ہے اور کسی نے دنیا میں کھو جانے کی۔ غرض انسان جس چیز میں سب سے زیادہ ناکام رہا ہے وہ حقیقی توازن کا قیام ہے۔

نظری حیثیت سے اگر غور کیا جائے تو توازن کا مسئلہ ہے بھی بڑا نازک اور پیچیدہ۔ انسان میں اتنی جبلتیں اور محرکات کارفرما ہیں اور وہ ایک دوسرے سے اس طرح مصادم اور متناقض ہیں کہ وہ ان کے درمیان حقیقی توازن قائم نہیں کر سکتا۔ وحی کی ضرورت خصوصیت سے اس لیے ہے کہ اس کے ذریعہ وہ حدود معلوم ہو جاتی ہیں جن کی بنا پر زندگی کے تمام شعبوں اور اس کے متضاد مطالبوں کے درمیان توازن اور توافق قائم ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ط

ترجمہ: ''ہم نے اپنے رسول واضح نشانیاں دے کر بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب (قانون حیات) اور میزان (عدل) نازل کیا تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔'' (الحدید۔۲۵)

''قسط'' دراصل انصاف اور توازن کو کہتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں عدل و توازن صرف الہامی ہدایت ہی کے ذریعے سے قائم ہو سکتا ہے۔ اسلام نے دین اور دنیا کے درمیان توازن قائم کیا ہے اور کسی ایک کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

حضورؐ کا ارشاد ہے: ''میں تو سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، عائلی زندگی بھی گزارتا ہوں، اس اللہ سے ڈرو۔ تمہارے نفس کا تم پر حق ہے، تمہاری آنکھوں کا تم پر حق ہے، تمہارے اہل و عیال کا تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا تم پر حق ہے۔ ہر حق اس کے حق دار کو ادا کرو (میری ہدایت یہ ہے کہ) روزہ بھی رکھو، افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھا کرو اور سویا بھی کرو۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اس طرح اسلام نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے درمیان حسین ترین توازن قائم کیا اور ایک طرف فرد کی شخصیت کے نشوونما کا سامان کیا تو دوسری طرف اسے اجتماعی ذمہ داری کے ایک نظام میں منظم کر دیا، زندگی کے سارے شعبوں کے متعلق مفصل ہدایات دے کر ان تمام شعبوں اور گوشوں کے درمیان اعتدال اور توازن قائم کر دیا۔ اسلام نے وسائل کے استعمال میں کنجوسی اور اسراف دونوں کی ممانعت کر کے معاشی زندگی پر اعتدال کی روش کی تلقین کی۔ اور پوری زندگی کے لیے حضور ﷺ نے یہ ہدایت دی کہ

خیر الامور اوسطها

ترجمہ: ''ہر ایک کام میں اوسط اور درمیانہ درجہ بہت ہی اچھا ہے۔''

آپ ﷺ نے مزید فرمایا کہ اعتدال نبوت کا ایک حصہ ہے۔ یہ امتیاز صرف اسلامی نظریے کو حاصل ہے کہ اس نے زندگی کے تقاضوں کو پورا کیا اور ان میں اعتدال اور توازن قائم کیا تا کہ انسانی زندگی اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ ترقی کر سکے اور کہیں بھی اس میں یکہ رخا پن اور بے اعتدالی نہ پیدا ہو۔

۷۔ سادہ اور عقلی مذہب:

اسلام ان مذاہب میں سے ہے جن میں ضمیات کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اس کی تعلیمات سادہ اور قابل عمل ہیں۔ توحید، رسالت اور زندگی بعد موت اس کے بنیادی عقائد ہیں اور عقل و وجدان دونوں ان کی تائید میں ہیں۔ اسلام میں پیشہ ور پادریوں کا کوئی گروہ نہیں ہے۔ اس کی رسوم وعبادات اس درجہ سادہ اور قابل فہم ہیں کہ انہیں ہر شخص سرانجام دے سکتا ہے۔ خدا اور اس کے بندے کے درمیان کسی واسطے کی ضرورت نہیں، ہر شخص خدا کی کتاب سے براہ راست استفادہ کر کے یہ جان سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے کن باتوں کا مطالبہ کیا ہے۔

اسلام اندھی بہری اطاعت کا مطالبہ نہیں کرتا۔ قرآن میں لوگوں کو بار بار اس بات پر ابھارا گیا ہے کہ وہ تفکر اور تعقل کی قوتوں کو استعمال کریں۔ مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ خدا سے دعا کریں ''رب زدنی علما'' (اے اللہ! میرے علم کو وسیع کر)۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ ''وہ لوگ جو عقل سے کام نہیں لیتے جانوروں سے بھی بدتر ہیں'' (۹:۴۴)۔ آنحضرت ﷺ نے حصول علم کی بڑی تاکید کی ہے۔ مثلاً آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہر مسلمان پر حصول علم فرض ہے'' اور یہ کہ ''جو شخص حصول علم کی خاطر گھر سے نکلتا ہے خدا کی راہ میں چلتا ہے۔'' انہی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ عرب جو حضور رسالت مآب ﷺ سے قبل جاہل اور وحشی تھے، دیکھتے ہی دیکھتے علم اور تہذیب کے علم بردار بن گئے۔ ان علوم میں بے شمار وہ ہیں جو محض کتاب اللہ کے رہین منت ہیں، مثال کے طور پر قرآن کی تفسیر کے ساتھ ساتھ علم لغت اور بلاغت اور اعجاز القرآن پیدا ہوا۔ قرآن میں جن مقامات کا ذکر ہوا ہے ان کی تفتیش کے سلسلے میں علم جغرافیہ کو ترقی ہوئی۔ قرآن میں بے شمار تاریخی واقعات کا ذکر ہے، جن کی تحقیق کی وجہ سے علم تاریخ کا چرچا ہوا۔ اسی طرح منطق، بلاغت، فقہ وغیرہ کے علوم کو بڑی ترقی ہوئی۔ غرض، دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں نے قرآن سے فیض حاصل کرتے ہوئے علوم وفنون کی تاریخ میں ایک نیا باب کھول دیا اور سب سے بڑھ کر دنیا کو استقرائی طریقے سے روشناس کیا، یہی وجہ ہے کہ اس دور میں جسے یورپ کی تاریخ میں تاریک دور کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے علم وتہذیب کی شمعیں صرف مسلمانوں کی وجہ سے روشن رہیں۔

۸۔ ثبات اور تغیر:

اسلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ثبات اور تغیر کے درمیان کامل توازن قائم کیا گیا ہے۔ انسانوں نے آج تک بے شمار فلسفے وضع کیے ہیں لیکن کوئی فلسفہ بھی ایسا نظام فکر وعمل پیش نہ کر سکا جو اپنے اصول معاشرت پیش کرے جو دوامی اور ابدی ہوں اور دوسری طرف انسانی معاشرے کی بدلتی ہوئی ضروریات کو بھی پورا کرتے ہوں۔ انسان کے لیے محض اپنی فکر اور تجربے کی بنا پر ایسے اصول پیش کرنا ممکن بھی نہیں؛ زمان ومکان کی جو مجبوریاں انسان کو لاحق ہیں ان کی بنا پر وہ اس کے لیے نااہل ہے۔ یہ اسلامی نظریۂ حیات کی خصوصیت ہے کہ جہاں وہ ایک طرف زندگی کے ابدی اصول

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پیش کرتا ہے وہیں انسانی معاشرے میں جو فطری تغیرات آتے رہتے ہیں ان سے پیش آمدہ مسائل کا حل بھی فراہم کر دیتا ہے۔

قرآن وسنت کے دیے ہوئے اصول ابدی ہیں، پوری انسانیت بھی متفقہ طور پر ان میں کوئی تبدیلی کرنا چاہے تو نہیں کر سکتی اس لیے کہ یہ ہدایت خالق کی طرف سے ہے:

لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ط

ترجمہ: ''اللہ کی باتوں میں تبدیلی نہیں ہوتی۔'' (یونس:۶۴)

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا O (الاحزاب:۶۲)

ترجمہ: ''تم خدا کی سنت میں تبدیلی نہ پاؤ گے۔''

یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظریۂ حیات ابدی صداقت کا حامل ہے اور اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی بدلتی ہوئی ضروریات کا کیسے ساتھ دے۔ اس کا جواب مختصراً یہ ہے:

(الف) اسلام نے وہ بنیادی اور اساسی اصول دیے ہیں جو ہر زمانے کے لیے ہیں اور چوں کہ وہ اصول انسانی فطرت کے مطابق ہیں لہٰذا جب تک خود انسانی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ان اصولوں میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔ اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کچھ ضوابط کے ماتحت ہے اور تہذیبوں کے عروج و زوال اور ماہ و سال کی آمد و رفت کے باوجود حیات انسانی بیادی حقیقتیں ایک ہی ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو رہی ہے اور چونکہ اسلام انہی بنیادی اصولوں کے مطابق ہے لہٰذا اس کے قوانین میں کسی تبدیلی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(ب) لیکن یہ اصول صرف انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیادیں فراہم کرتے ہیں اور ان اساسی اداروں کو قائم کرتے ہیں جن پر زمان و مکان کے تغیرات کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ رہیں وہ چیزیں جن کا تعلق وقت، موسم اور مقامی حالات وغیرہ سے ہے ان سے یہ تعرض نہیں کرتے، اور ہر زمانے کے لوگوں کو شریعت کی مجموعی تعلیمات کی روشنی میں تفصیلات طے کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام نے لباس میں ستر کا تعین کر دیا ہے، اسراف سے منع کیا ہے اور چند دیگر حدود مقرر کر دی ہیں۔ اب ان حدود کی روشنی میں ہر زمانے اور ہر ملک کے لوگ حسب پسند لباس اختیار کر سکتے ہیں۔ اسی طرح معاشرت، معیشت اور سیاست میں بھی بنیادی اصول اور اساسی ادارے قائم کرنے کے بعد شریعت مسلمانوں کو آزاد چھوڑ دیتی ہے کہ پیش آنے والے مسائل کو اسلام کی مجموعی ہدایت کی روشنی میں اپنے اجتہاد سے طے کریں۔

(ج) اسلامی نظریۂ حیات کی اصل دلچسپی انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے ہے۔ قرآن انسان کی ہدایت کے لیے آیا ہے، طبیعات و کیمیا کے مسائل بیان کرنے کے لیے نہیں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظریۂ حیات علوم طبعی کے مسائل سے تعرض نہیں کرتا اور انہیں انسان کے تجربے اور مشاہدے پر چھوڑ دیتا ہے۔ جہاں کہیں اس قسم کا کوئی ذکر ہوا ہے وہ تذکیر اور موعظت کے لیے ہے نہ کہ کسی طبعی اصول کو فی نفسہ بیان کرنے کے لیے۔ اسلامی نظریۂ حیات کے اس طرز فکر نے مذہب اور سائنس کے درمیان اس قسم کے تصادم کے امکانات ہمیشہ کے لیے ختم کر دیے ہیں جو یورپ میں رونما ہوا تھا۔

مندرجہ بالا بحث سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں ثبات اور تغیر کے تقاضوں کو کس مناسبت اور خوبی سے پورا کیا گیا ہے، اور اسی بنا پر یہ نظریۂ حیات بالاتر ہے۔

۹۔ اصلاحی اور انقلابی تحریک:

اسلامی نظریۂ حیات محض ایک نظری اور فلسفیانہ نظام نہیں ہے جو اسلام قبول کرنے والوں کے صرف ذہنوں میں رہے بلکہ ایک اصلاحی اور انقلابی تحریک بھی ہے جس کا مطالبہ یہ ہے کہ اسے دنیا میں رائج کیا جائے اور غلبہ اور اقتدار خدا کے دین کو حاصل ہو:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ○

ترجمہ: ''وہی (پاک ذات) ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ اسے تمام دیگر ادیان پر غلبہ عطا کرے خواہ یہ مشرکین کو کتنا ہی نا گوار کیوں نہ گزرے۔''

(الصف۔۹)

نبی اکرم ﷺ نے دنیا کے سامنے محض ایک پیغام پیش کر دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نظام کو قائم کرنے کے لیے، جس کے آپ ﷺ داعی تھے، مسلمانوں کو ایک اجتماعی زندگی میں منظم کیا، خود ان کی زندگیوں میں یہ دین قائم کیا اور ان پر یہ فریضہ عائد کیا کہ پوری دنیا میں اس دین کو قائم کریں۔ امت مسلمہ کا یہی فریضہ ہے جسے قرآن نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر (نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا) کے نام سے موسوم کیا ہے:

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ

ترجمہ: ''تم وہ بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے میدان میں لائی گئی ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو۔'' (آل عمران۔۱۱۰)

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی نظریہ حیات اپنے قیام کے لیے ایک نظام بھی ترتیب دیتا ہے اور اس طرح ایک ایسی اجتماعی ہیئت قائم کرتا ہے جو ایک طرف اس کے سماجی پروگرام کی تنفید کرے اور دوسری طرف پوری انسانیت کے سامنے اس کی دعوت کو پیش کرے۔ اسلامی تحریک ایک تبلیغی اور تعلیمی ادارہ ہے اور جو ریاست اور نظم یہ قائم کرتا ہے وہ بھی اصلاً معلم اور داعی الی الحق کے فرائض انجام دیتا ہے۔

اس طرح اسلام محض ایک مذہب نہیں بلکہ ایک اصلاحی اور انقلابی تحریک ہے جو نیکیوں کو قائم کرنے اور بدی کو روکنے کی جدوجہد کرتی ہے اور نہ ا کیا، زمین پر سے ظلم، ناجائز انتفاع، جبر وتشدد اور فحاشی وگمراہی کو مٹا کر گلشن حیات کو اچھائیوں سے بھر دیتی ہے اور ایک ایسا نظام قائم کرتی ہے جس میں حضرت عیسی علیہ السلام کے الفاظ میں، زمین اپنے خزانے اگل دیتی ہے اور آسمان اپنی برکتیں برسانے لگتا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسلامی عقائد کے انفرادی واجتماعی زندگی پر اثرات اور اساس دین/دین کی بنیادیں

اسلام کے بنیادی عقائد

عقیدہ سے مراد:

عقیدہ سے مراد گروہ گانٹھ نیز کسی بات پر پختہ یقین کر لینا ہے مثلاً یہودی اس بات پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ ہندو آواگون پر پختہ یقین رکھتے ہیں یعنی مرنے کے بعد روح اپنے کرموں (اعمال) کے مطابق بار بار جنم لیتی ہے اگر اچھے کام کیے ہوں تو انسان کی جون میں اور برے کام کیے ہیں تو اپنے سے کم ذات یا جانوروں کی جون میں انسان جنم لیتا رہتا ہے۔ بدھ مت کے نزدیک دیندار کی منزل مقصود یہ ہے کہ وجود کی قید سے نکل کر سراپا راحت عدم وجود (نروان) میں پہنچ جائے۔ فرد ایسے عناصر سے بنا ہے جو اس سے پہلے موجود تھے اور پھر اس کے مرنے پر منتشر ہو جاتے ہیں اور جو دوبارہ اسی شکل میں مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ پارسی ثنویت کے قائل ہیں یعنی ان کے نزدیک دنیا میں نیک و بد دو قوتیں کارفرما ہیں یزداں اور اہرمن۔

ان عقائد میں خالق کائنات پر الزامات لگانے سے گریز نہیں کیا گیا کہیں حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہا گیا ہے تو کہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب کہ اہل اسلام کا پختہ اور غیر متبدل عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اپنی ذات اور صفات میں یکتا ہے ساری مخلوق اسی کے حکم کے تابع ہے اور کسی بھی انسان کو اس پر کوئی اختیار نہیں وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے پتا بھی اس کے حکم کے بغیر ہل نہیں سکتا۔ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے وہ اس کا خالق اور مالک ہے اور زمین و آسمان کا غیب صرف اسی کو ہے۔

بدھ اور ہندو عقیدۂ آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کے خیال کے مطابق اللہ تعالیٰ انسان کو کیسے دوبارہ زندہ کرے گا جب کہ وہ خاک میں مل کر خاک ہو چکا ہوگا لیکن اسلام اس کی نفی کرتا ہے۔

اسلام کے بنیادی عقائد:

جہاں تک بنیادی عقائد کا سوال ہے تو اسلام کے بنیادی عقائد کی تعداد پانچ ہے یعنی

1- اللہ تعالیٰ پر ایمان 2- رسولوں پر ایمان 3- فرشتوں پر ایمان

4- آسمانی کتابوں پر ایمان 5- آخرت پر ایمان

یہ وہ بنیادی عقائد ہیں کہ اگر ایک مسلمان ان میں سے کسی ایک کو بھی تسلیم نہ کرے تو وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ان بنیادی عقائد پر صمیم قلب کے ساتھ ایمان لانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

عن عمر بن الخطاب قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم حين سئل عن الإيمان ان تؤمن بالله وملائكته وكتبه ورسله واليوم الاخر وتؤمن بالقدر خيره وشره.

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ سے جب ایمان کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو ایمان رکھے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور یوم آخر پر اور تو ایمان رکھے اچھی اور بری تقدیر پر (مسلم)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اس حدیث شریف میں رسول کریم ﷺ نے ایمان کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ اسے اجزائے ایمان یا بنیادی عقائد بھی کہا جاتا ہے۔ ایمان لانے یا ایمان رکھنے سے مراد ہے پختہ یقین اور اعتقاد رکھنا، اعتماد اور بھروسہ کرنا۔ حدیث زیر تشریح کے مطابق مومن کے لیے چھ حقیقتوں پر پختہ یقین رکھنا ضروری ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ اللہ پر ایمان:

اسلام میں ایمان کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے چنانچہ قرآن حکیم میں اخروی نجات کے لیے دو چیزوں کو ضروری قرار دیا گیا ہے، ایمان اور عمل صالح اور ہر جگہ ایمان کو عمل صالح پر مقدم رکھا گیا ہے اور کئی مقامات پر واضح طور پر بیان فرمایا گیا ہے کہ ایمان کے بغیر اعمال کی کوئی وقعت اور حیثیت نہیں اور اجزائے ایمان میں سب سے اہم ایمان باللہ ہے۔ اللہ پر ایمان ہوگا تو باقی پانچ حقیقتوں پر بھی ہوگا اور اگر اللہ پر ایمان نہیں تو کسی بھی حقیقت پر ایمان نہیں کیونکہ فرشتے، کتابیں اور رسول اسی کے ہیں اور آخرت میں بھی اسی نے جزا و سزا دینی ہے۔

اللہ پر ایمان رکھنے سے مراد ہے اس کے وجود کو حقیقت یقین کرنا، صرف اسی کو کائنات کا خالق، مالک اور مدبر اور لائق عبادت ماننا اور اس کے سوا کسی اور کو معبود نہ ماننا۔ اس کی ان تمام اعلیٰ صفات پر یقین رکھنا جن کا قرآن حکیم میں ذکر آیا ہے اور یہ یقین رکھنا کہ جیسے وہ اپنی ذات میں یکتا ہے ویسے ہی اپنی صفات میں بھی یکتا ہے۔ اس کی قدرت لامحدود ہے اور اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مومن میں اللہ کا یہ شعور بہت واضح طور پر ہر وقت موجود رہنا چاہیے اور اس پر ہمیشہ مکمل بھروسہ رکھنا چاہیے کہ وہ ہر نیک کام میں اور مشکل کی ہر گھڑی میں اس کی مدد کرے گا اور اس کے سوا اس کا کوئی اور مددگار نہیں ہے۔

۲۔ فرشتوں پر ایمان:

فرشتے اللہ تعالیٰ کی نورانی مخلوق ہیں۔ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں، اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتے ہیں اور اس کے احکام بجالاتے ہیں۔ اللہ کی اس طاقتور مخلوق پر ایمان رکھنے سے نیک انسان کو مزید حوصلہ ملتا ہے کیونکہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم پر اس کے نیک بندوں کی مدد کرتے ہیں اور اس کے دشمنوں کو تباہ کرتے ہیں۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار ہیں اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے کے پابند ہیں۔ وہ اللہ کے معاون و مددگار نہیں ہیں صرف ان فرائض کو ادا کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ ان کے ذمے لگاتا ہے، جیسے کائنات کی تمام اشیاء اپنا اپنا کردار ادا کر رہی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے ذمے لگایا ہے۔ اسی طرح فرشتے بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ فرشتوں پر ایمان رکھنے سے انسان کا روحانیت کی طرف میلان بڑھتا ہے اور مادی اشیاء پر انحصار نہیں کرتا۔

۳۔ آسمانی کتابوں پر ایمان:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک محدود دائرے میں آزادی اور اختیار بخشے ہیں اور اسے استعمال کرنے کے لیے اسے عقل بھی عطا کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان پر مزید عنایت فرماتے ہوئے اس کی راہنمائی کے لیے اپنی کتابیں نازل فرمائیں۔ قرآن حکیم میں تورات، زبور اور انجیل کا ذکر آیا ہے۔ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ سابقہ آسمانی کتابیں تبدیلی کی وجہ سے مکمل طور پر محفوظ نہیں رہ سکتیں۔ سابقہ آسمانی کتابوں پر ایمان رکھنے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ یقین کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم سے پہلے بھی اپنے بندوں کی راہنمائی کے لیے کتابیں نازل فرمائی تھیں۔

۴۔ رسولوں پر ایمان:

بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے وقفے وقفے سے ہر قوم میں نبی اور رسول بھیجے جو انہی میں سے تھے تاکہ وہ لوگوں کے سامنے اعلیٰ سیرت و کردار کا عملی نمونہ پیش کریں۔ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی و رسول ہیں۔ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور آپ ﷺ کو جو شریعت عطا کی گئی ہے اس نے تمام سابقہ شریعتوں کو منسوخ کر دیا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۵۔ آخرت پر ایمان:

انسان کو چونکہ آزادی اور اختیار عطا ہوا ہے اس لیے وہ ایک ذمہ دار اور باشعور مخلوق ہے اور اپنے اعمال کے لیے اس ہستی کے سامنے جواب دہ ہے جس نے اسے آزادی واختیار اور عقل وشعور بخشے ہیں۔ قیامت کے روز تمام انسانوں کو پھر سے زندہ کر کے اٹھایا جائے گا ان کے اعمال کا حساب ہوگا، اچھے اعمال کا اچھا اجر ملے گا اور برے اعمال کی سزا ملے گی۔

۶۔ تقدیر پر ایمان:

تقدیر پر ایمان سے مراد یہ یقین رکھنا ہے کہ کائنات میں ہونے والے تمام واقعات اللہ تعالیٰ کے ایک طے شدہ اور مقررہ نظام اور اس کی سکیم کے تحت ہو رہے ہیں نہ کہ خود بخود اور اس کی مرضی ومشیت کے بغیر۔ تقدیر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کا علم ہے، اللہ ہر چیز پر قادر اور اسے ہر چیز کا علم ہے، جو کچھ ہوا، جو ہو رہا ہے اور جو کچھ ہوگا سب اس کے علم میں ہیں۔ درخت کا ایک پتا بھی گرتا ہے تو اس کے علم میں ہوتا ہے۔ انسان کو جو کچھ بھی دکھ یا سکھ آتا ہے اللہ کے علم میں ہے۔ اچھی یا بری تقدیر انسان کے دکھ یا سکھ کے حوالے سے ہے۔ تقدیر پر ایمان رکھنے سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنی محنت سے فراہم کردہ مادی اسباب و وسائل پر اعتماد یا گھمنڈ نہ کرنے لگے۔ وہ اپنی محنت کے پھل کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت پر بھروسہ رکھے۔ یہ واضح رہے کہ اسلام انسان کو تقدیر پرست ہرگز نہیں بناتا۔ قرآن حکیم میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ کوشش اور جدوجہد کرنا انسان کے ذمے ہے اور اسے اسی کے مطابق پھل ملے گا۔ ارشاد ہے:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى

''اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔''

لہٰذا انسان پر لازم ہے کہ وہ بھرپور جدوجہد کرے اور اسے یہ جاننے کی نہ حاجت ہے اور نہ اسے کوشش کرنی چاہیے کہ اس کی تقدیر میں کل کو کیا ہونا لکھا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی سیرت پاک ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے آپ ﷺ اللہ کے پیارے رسول ﷺ تھے۔ آپ ﷺ تقدیر پر بھروسہ کر کے بیٹھ نہیں رہے تھے بلکہ ساری زندگی سخت جدوجہد کر کے گزاری۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں کو حکم دیا تھا کہ جس قدر ہو سکے جنگ کا سازوسامان تیار رکھا جائے۔ لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لائے، جدوجہد کرے اور اللہ تعالیٰ پر پورا بھروسہ رکھے کہ وہ نیکی کے کام میں اس کی مدد کرے گا اور اسے نیک عمل کا اجر دے گا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

عقیدہ توحید اور اس کے انسانی زندگی پر اثرات

توحید

معنی و مفہوم:

توحید کا لفظ وحد (و ح د) سے نکلا ہے، اس کا لفظی معنی ہے ایک کرنا، ایک ٹھہرانا، ایک بنانا۔ توحید کا اصطلاحی مفہوم ہے اللہ کو ایک ماننا۔

۱۔ اس کی ذات میں، کہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے، اس کی ذات کے سوا کوئی اور ذات نہیں جو خدائی میں اس کے ساتھ شریک ہو، خدائی میں اللہ کی ذات یگانہ و یکتا ہے۔

۲۔ اس کی صفات میں، کہ وہ اپنی ہر صفت میں بے مثال ہے، یگانہ و یکتا ہے، اس کے سوا کوئی اور ذات نہیں جس میں اللہ جیسی صفات یا کوئی ایک صفت پائی جاتی ہو۔

۳۔ اس کے افعال میں، کہ وہ تنہا اس کائنات کا مالک ہے، صرف اسی کا اس پوری کائنات میں تصرف ہے، کوئی اس کے افعال میں نہ اس کا شریک کار ہے اور نہ ہی معاون اور مددگار۔

۴۔ اس کی عبادات میں، کہ عبادت کے لائق صرف اللہ ہے۔

۱۔ وحدانیت:

یعنی اِلٰہ (معبود) صرف ایک ہے اور وہ ہے اللہ۔ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (البقرہ۔۱۶۳) "اور تمہارا خدا ایک ہے، اس رحمٰن و رحیم کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔" قرآن حکیم میں بار بار اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ خدا تو صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے اللہ۔ عرب کے مشرکین کو یہی تو اعتراض تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سب خداؤں کو چھوڑ کر صرف ایک خدا بتا رہے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ (صٓ، ۵:۳۸)

کیا اس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے! خدائی صرف ایک کی ہو ہی سکتی ہے۔ ایک ملک میں بیک وقت دو حکمران نہیں ہو سکتے تو کائنات کے خالق و مالک دو خدا کیسے ہو سکتے ہیں؟ قرآن حکیم میں ایک سے زیادہ خداؤں کی نفی کی گئی ہے:

۱۔ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ (الانبیاء، ۲۲:۲۱)

"اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو ضرور ان دونوں (یعنی زمین و آسمان) کا نظام بگڑ جاتا۔"

۲۔ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ط (المومنون، ۹۱:۲۳)

"اللہ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا ہے اور کوئی دوسرا خدا اس کے ساتھ نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے۔"

اللہ تعالیٰ نے وحدانیت کی شہادت دی ہے اور فرشتے اور اہل علم بھی اس پر گواہ ہیں:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا ۢ بِالْقِسْطِ ؕ (آل عمران،۳:۱۸)

اللہ نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور فرشتے اور سب اہل علم بھی انصاف کے ساتھ اس پر گواہ ہیں۔

۲۔ ذات الٰہیہ کا تصور:

انسان کا جذبۂ تجسس ذات الٰہیہ کے متعلق کئی سوالات اٹھاتا ہے کہ جس ہستی کو ہم نے خدا مانا ہے وہ کیسی ہے کب سے ہے، کہاں ہے؟ وغیرہ، تاکہ ذہن میں اس کا ایک واضح اور مثبت تصور قائم کر سکیں۔ لیکن ہمارے وسائل ادراک، حواس خمسہ، ذات الٰہیہ کا ادراک نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ماوراء، غیر مرئی اور لطیف ہے جبکہ وسائل ادراک کی رسائی صرف عالم طبیعات تک محدود ہے۔ ذات الٰہیہ کی کوئی مثال بھی نہیں دی جا سکتی کیونکہ مثال کائنات کی کسی چیز کی ہی دی جا سکتی ہے اور کائنات اور مخلوق ہے جبکہ اللہ کائنات کا خالق ہے۔ تو خالق کے لیے مخلوق کی مثال کیونکر دی جا سکتی ہے۔

ذات الٰہیہ کے بارے میں اسی لیے ارشاد ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (الشوریٰ،۴۲:۱۱)۔ ''اس کے مثل کوئی چیز نہیں ہے۔'' وہ بے مثل ہے، بے مثال ہے، اسے آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (الانعام،۶:۱۰۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ذات الٰہیہ کے دیدار کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس کی بابت ارشاد باری تعالیٰ ہے: (ترجمہ) ''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا، اے میرے رب! مجھے اپنا دیدار بخش دے، فرمایا، تو مجھے نہیں دیکھ سکتا، ہاں ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھ اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو تو مجھے دیکھ لے گا۔ چنانچہ اس کے رب نے جب پہاڑ پر تجلی کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام غش کھا کر گر پڑے۔'' (الاعراف،۷:۱۴۳)

ذات الٰہیہ زمان، مکان، جہت، صورت، جسم، تغیر، تاثر اور انتقال (منتقل ہونا) سے کامل طور پر پاک ہے۔ وہ واجب الوجود ہے، یعنی ایک ایسا وجود جو بہر حال تھا، ہے اور رہے گا۔ قائم بالذات ہے۔ اللہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا: هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ج (الحدید،۵۷:۳)، ''وہی اول ہے وہی آخر، وہ ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی (کائنات میں اسی کے نور کا ظہور ہے، اس طرح وہ ظاہر ہے) ہر جگہ موجود ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ایسا نہیں ہوتا کہ تین آدمیوں میں سرگوشی ہو اور ان کے درمیان چوتھا اللہ نہ ہو، یا پانچ آدمیوں کے میں سرگوشی ہو اور ان میں چھٹا اللہ نہ ہو، سرگوشی کرنے والے خواہ اس سے کم ہوں یا زیادہ، جہاں کہیں بھی وہ ہوں اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔'' (المجادلہ،۵۸:۷) وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ق،۵۰:۱۶)۔ ''ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔'' وہی ایک ذات ہے کہ جسے بقاء حاصل ہے: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (العنکبوت،۲۹:۸۸)، ''ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے۔''

۳۔ صفات الٰہیہ کا تصور:

اسلام نے صفات الٰہیہ کا جو تصور دیا وہ جلال و اکرام والی ذات الٰہیہ کے شایان شان ہے جیسے ذات الٰہیہ بے مثال ہے ویسے ہی صفات الٰہیہ بھی بے مثال ہیں۔ اللہ کی صفات سب سے برتر اور اعلیٰ ہیں: وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى (النحل،۱۶:۶۰)۔ اس کے نہایت اچھے اچھے نام ہیں: وَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (طٰہٰ،۲۰:۸)۔ اللہ اسم ذات ہے اور باقی اسمائے حسنیٰ اس کی صفات ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں اور لامحدود ہیں اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ خالق (پیدا کرنے والا) ہے، رب (پالنے والا) ہے، رحیم (بار بار رحم کرنے والا) رحمان (بے حد رحم کرنے والا)، الودود (پیار کرنے والا)، الوھاب (بہت عطا کرنے والا) الجبار (جبروت والا) العزیز (زبردست۔ غلبہ والا)، القھار (غالب، جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں ہو سکتا)، المتکبر (اپنی بڑائی دکھانے والا)، المنتقم (سزا دینے والا)، الحی (زندہ اور دوسروں کو زندگی بخشنے والا)، القیوم (قائم رہنے والا اور دوسروں کو قائم رکھنے والا) السمیع (سننے والا)، البصیر (دیکھنے والا) الحکیم (حکمت والا) ہے۔

وہ قادر مطلق ہے، اس کی قدرت کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے: اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ'' (فاطر،۳۵:۱) ''یقیناً اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

توحید کے لازمی تقاضے

۱۔ اللہ سے محبت ہر محبت پر غالب ہو
۲۔ ہر نیکی اللہ کی رضا کے لیے کی جائے
۳۔ صرف اللہ کی عبادت کی جائے
۴۔ صرف اللہ کا خوف رکھے
۵۔ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگے
۶۔ صرف اللہ پر بھروسہ رکھے
۷۔ اللہ کا شکر گزار رہے
۸۔ شرک اور شائبہ شرک سے بچے
۹۔ اللہ ہی کے قانون کی پیروی کرے

توحید کے اثبات میں دلائل

ذات الٰہیہ کی حقیت (کنہ) کو پانا انسان کے بس کی بات نہیں ہے، البتہ کائنات، انسانی تاریخ اور خود انسان کے نفس میں آیات الٰہیہ بکثرت موجود ہیں جو ذات الٰہیہ کی طرف راہنمائی کرتی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ. (حٰمٓ السجدہ، ۴۱: ۵۳)

ترجمہ: ”ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی۔“

قرآن مجید میں بار بار آیات الٰہیہ کے مشاہدے اور مطالعے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے تاکہ ذہن انسانی کو ذات الٰہیہ کے تصورات کا راستہ مل جائے۔ ان آیات الٰہیہ کی حیثیت فلسفیانہ یا منطقی دلائل کی نہیں ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ فلسفیانہ یا منطقی دلائل سے ذات الٰہیہ کا مثبت تصور قائم کرنے میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ توحید کا تصور انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ”اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بنا کر پوچھا تھا، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا، کیوں نہیں! ہم نے اس کی گواہی دی۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر تھے۔“
(الاعراف، ۷: ۱۷۲)

پھر اللہ تعالیٰ یاد دہانی کے لیے انبیاء و رسل مبعوث فرماتا رہا، تمام انبیاء اور رسولوں نے توحید ہی کی تعلیم دی۔ آیات الٰہیہ کا مطالعہ انسانی فطرت میں موجود تصور توحید کو اجاگر کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں توحید کے اثبات کے لیے بکثرت الٰہیہ بیان کی گئی ہیں، چند مثالیں درج ذیل ہیں:

(الف) کائنات میں آیات الٰہیہ:

پوری کائنات اور اس میں موجود نظم و ربط اللہ کی بہت بڑی نشانی ہے جو اس حقیقت کی طرف راہنمائی کرتی ہے کہ ضرور اس وسیع کائنات کی تخلیق اور تدبیر کسی ایک قادر مطلق خدا کا کام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

۱۔ ترجمہ: ”یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے بدلنے میں اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کو نفع دینے والی چیزیں لیے سمندر میں چلتی ہیں اور پانی میں جو اللہ اوپر سے نازل کرتا ہے پھر اس کے ذریعے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اس (زمین) میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، اور ہواؤں کے پھرنے میں اور آسمان اور زمین کے درمیان مسخر بادل میں نشانیاں ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔“ (البقرہ، ۱۶۴)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۲۔ ترجمہ: ''اور تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے۔ ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان سے ہم تمہیں پاکیزہ دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے۔'' (النحل ۱۶:۶۶)

(ب) انسان کے اپنے نفس میں آیات الٰہی:

عالم طبیعات کے علاوہ خود انسان کے اپنے نفس میں بے شمار آیات الٰہیہ موجود ہیں، مثلاً:

۱۔ ترجمہ: ''تو انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اچھلنے والے سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔'' (الطارق ۔۸۶:۵تا۷)

۲۔ ترجمہ: ''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس کی بیویاں بنائیں تا کہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کر دی، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا ہے اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا ہے، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں دانشمندوں کے لیے۔'' (الروم ،۳۰:۲۱تا۲۲)

(ج) تاریخ انسانی میں آیات الٰہیہ:

انسانی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جو توحید کی طرف ہماری راہنمائی کرتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ایسے بعض واقعات کو آیات الٰہیہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً قوم نوح علیہ السلام کا غرق ہونا، عاد اور ثمود اور دوسری قوموں پر عذاب الٰہی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آگ کے الاؤ میں ڈالا جانا اور زندہ و سلامت رہنا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور معجزات وغیرہ۔

توحید کی اہمیت

توحید کے بارے میں قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر اور متعدد طریقوں سے اس کا بیان ہوا ہے مثلاً

-1 لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (اللہ کے سوا کوئی بھی الٰہ نہیں ہے) یہ الفاظ قرآن حکیم میں بارہ مقامات پر آئے۔

-2 لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (اس اللہ کے سوا کوئی بھی الٰہ نہیں ہے) یہ عبارت قرآن حکیم میں تیس مرتبہ آئی ہے۔

-3 اللہ تعالیٰ اپنے بارے میں تین مقامات پر فرماتے ہیں لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا یعنی میرے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

-4 اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ تم سب کا اللہ ایک ہی ہے یہ عبارت قرآن حکیم میں چھ مرتبہ آئی ہے۔

-5 اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ بات صرف یہ ہے کہ اللہ ہی اکیلا الٰہ ہے۔

پورے قرآن حکیم میں اسم اللہ 2696 بار آیا ہے لفظ الٰہ 125 مقامات پر اور لفظ اٰلِهَةٌ (الٰہ کی جمع) کل 36 مرتبہ آیا ہے۔

-6 عقیدہ توحید انسان کے تمام اعمال پر اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ اس سے انسان کو نیکی کرنے اور برائیوں سے بچنے کا سبق ملتا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یقین کی کمزوری سے دین کمزور ہو جاتا ہے۔ عبادات، اخلاقیات، معاملات، حقوق و فرائض، محبت، شفقت، آداب و اطوار، آداب مجلس غرض کہ تمام صالح اعمال کا دارومدار ہی عقیدہ توحید کی پختگی پر ہے۔

-7 توحید کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ توحید ہی تمام اخلاق فاضلہ کا سرچشمہ ہے۔

-8 عقیدہ توحید کی بدولت کائنات کے مطالعہ کا موقع ملتا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

توحید کی فضیلت:

توحید کی فضیلت کے بارے میں حضورﷺ نے مختلف مقامات پر فرمایا۔ مثلاً

توحید کی فضیلت کے بارے میں حضورﷺ نے فرمایا:

1- حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں حضورﷺ نے فرمایا: جو شخص شہادت دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور شہادت دے کہ حضرت محمدﷺ اس کے بندے اور اس کے رسولﷺ ہیں اور شہادت کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور یہ بھی شہادت دے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہیں جو کہ بھیجا اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہ السلام کی طرف اور وہ (عیسیٰ علیہ السلام) اس کی طرف سے روح ہے اور اس کی بھی شہادت دے کہ جنت اور دوزخ حق ہیں اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو بہر حال جنت میں داخل کر دے گا اگرچہ اس کے اعمال کیسے ہی ہوں۔

بخاری و مسلم میں حضرت عتبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا اقرار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ کے عذاب کو حرام کر دیتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضورﷺ سے یہ سنا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابن آدم علیہ السلام! اگر تو میرے پاس گناہوں سے پوری زمین بھر کر لے آئے لیکن اس میں شرک نہ ہو تو میں اسی مقدار میں بخشش کی بارش کردوں گا۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ رسولﷺ اللہ سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے پروردگار مجھے ایسی چیز بتا جس سے تیری یاد کروں اور تجھ سے دعا کیا کروں فرمایا: اے موسیٰ علیہ السلام لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پڑھا کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے پروردگار اسے تو تیرے سب بندے پڑھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ اگر ساتوں آسمان اور ان کے باشندے اور ساتوں زمینیں بجز میرے ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیئے جائیں اور دوسرے پلڑے میں صرف لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ رکھ کر وزن کیا جائے تو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ والا پلڑا بھاری ہوگا۔

ان احادیث سے اللہ کے فضل و کرم کی وسعت، توحید کے اجر و ثواب کی کثرت اور توحید بطور گناہوں کے کفارہ کا اظہار ہوتا ہے۔

اسلام میں عقیدہ توحید تمام عقائد دینیہ کی اصل اور بنیاد ہے۔ قرآن حکیم کا اصل پیغام توحید ہے۔ قرآن حکیم کے بیان کے مطابق تمام سابقہ انبیاء و رسل کی تعلیمات کا مرکز و محور بھی توحید ہی تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے اٹھنے والے تمام انبیاء مثلاً حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سب نے خالص توحید پر ایمان لانے کی دعوت دی اور ہر قسم کے شرک سے منع کیا۔ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور رسول، امام الانبیاء و سید المرسل حضرت محمدﷺ نے بھی توحید کی ہی تعلیم دی اور ہر طرح کے شرک کی نفی کی۔

کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک توحید پر ایمان نہ لے آئے۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہے بغیر کوئی شخص اسلام میں داخل نہیں ہو سکتا۔

ایمان لانے کے بعد نیک اعمال کرنے والے ہی جنت میں داخل ہوں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ج هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (البقرہ،۲:۸۲)

ترجمہ: ''اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے وہی جنتی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

ایک حدیث مبارک میں حضور ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام کے حوالے سے بتایا ہے کہ حضور ﷺ کی امت میں سے جو شخص فوت ہوا اور اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہو وہ جنت میں داخل ہوگا۔

توحید کے مقابلے میں شرک ہے۔ شرک کو قرآن مجید میں ظلم عظیم قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس گناہ کو معاف نہیں فرمائے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے، اس کے سوا ہر گناہ جس کے لیے وہ چاہے گا معاف کر دے گا۔

اگر توحید پر ایمان نہ ہو تو اور اللہ کے ساتھ شرک کیا جائے تو تمام نیک اعمال اکارت جائیں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اُولٰٓئِکَ لَمْ یُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ط

ترجمہ: ''یہ لوگ ایمان نہیں لائے پس اللہ نے ان کے سارے اعمال ضائع کر دیے۔''

ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ انبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام، اسحٰق علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام، داؤد علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام، ایوب علیہ السلام، یوسف علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، ہارون علیہ السلام، زکریا علیہ السلام، یحییٰ علیہ السلام، الیاس علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، الیسع علیہ السلام، یونس علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی فضیلت کا ذکر فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا ہے:

وَلَوْ اَشْرَکُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (الانعام،۶:۸۸)

ترجمہ: ''اور اگر انہوں (یعنی مذکورہ انبیاء) نے شرک کیا ہوتا تو ان کا سب کیا کرایا غارت ہو جاتا ہے۔''

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ختم المرسلین ﷺ تک ہر نبی کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر یہ واضح کر دیا تھا کہ جو شخص توحید پر ایمان نہیں رکھے گا اور شرک کرے گا اس کے تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْکَ وَاِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکَ ج لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ وَلَتَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ

ترجمہ: ''اور (اے نبی ﷺ! آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ) آپ ﷺ کی طرف اور آپ ﷺ سے پہلے (تمام انبیاء) کی طرف یہ وحی بھیجی جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو یقیناً تمہارا عمل ضائع ہو جائے گا اور تم خسارے میں رہو گے۔''

انسانی زندگی پر توحید کے اثرات

افکار و نظریات کا انسان کی عملی زندگی سے گہرا تعلق ہوتا ہے بلکہ وہ انسان کے اعمال کا محرک ہوتے ہیں، جیسی سوچ ہوتی ہے ویسا ہی عمل ہوتا ہے۔ عقیدۂ توحید سے بھی انسان کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ دیگر کسی بھی نظریے کا دائرۂ اثر محدود ہوتا ہے۔ یعنی زندگی کے کسی ایک پہلو یا چند پہلوؤں کو متاثر کرتا ہے جبکہ توحید کا تصور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر خوشگوار اثرات مرتب کرتا ہے۔ توحید پر ایمان لانے سے انسانی زندگی یکسر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بدل جاتی ہے۔ انسان کا خود اپنے بارے میں نقطۂ نظر، دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلقات اور کائنات کے ساتھ اس کے تعلق سب میں اہم تبدیلی ہوتی ہے۔ عقیدۂ توحید سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر جو اثرات ترتیب پاتے ہیں۔ ان میں سے چند اثرات درج ذیل ہیں:

توحید کے انفرادی زندگی پر اثرات

۱۔ خودداری اور عزت نفس:

توحید پر ایمان رکھنے والا خودداری اور عزت نفس کا مالک ہوتا ہے۔ چونکہ وہ نفع ونقصان، عزت ودولت، زندگی اور موت، غرض ہر چیز کا مالک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو سمجھتا ہے اس لیے وہ کسی اور کے آگے نہ ہاتھ پھیلاتا ہے اور نہ سر جھکاتا ہے۔ وہ کائنات کی ہر چیز کو اللہ کی مخلوق سمجھتا ہے جسے اللہ نے اس کے فائدے کے لیے پیدا کیا ہے۔ کائنات کی کوئی چیز تعظیم اور سجدے کے لائق نہیں بلکہ انسان ہی تمام مخلوقات میں اشرف و افضل ہے۔

۲۔ آزادی وحریت:

عقیدہ توحید انسان کو کائنات کی ہر چیز کی بندگی سے آزادی اور نجات دلا دیتا ہے۔ سورج چاند، ستارے، آسمان، پہاڑ، درخت، سانپ، آگ، زمین کسی بھی چیز کو دیوی نہ دیوتا سمجھتا ہے اور نہ ہی اسے لائق تعظیم مانتا ہے۔ وہ ہر مخلوق کی بندگی اور غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ یہ تمام چیزیں تو اللہ کی مخلوق ہیں، ان کی کوئی عظمت اور کبریائی نہیں۔ عظمت اور کبریائی صرف اللہ کے لیے ہے۔ ان تمام چیزوں کو تو اللہ تعالیٰ نے انسان کے فائدے اور نفع کے لیے پیدا کیا ہے۔ انسان کو ان چیزوں کے لے پیدا نہیں کیا۔ بقول علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

توحید پر ایمان رکھنے والا کسی انسان کو بھی اپنا خدا نہیں مانتا خواہ وہ انسان کتنی ہی طاقت اور وسائل کا مالک کیوں نہ ہو۔ وہ کسی انسان کی نہ بندگی کر سکتا ہے اور نہ ہی غلامی وہ تو اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (حکم صرف اللہ کا ہے) پر ایمان رکھتا ہے۔

۳۔ عجز وانکسار:

عقیدۂ توحید انسان کو کائنات میں سب سے اونچا مقام بھی دیتا ہے اور اسے تمام مخلوقات کی بندگی وغلامی سے آزادی دلا کر خودداری اور عزت نفس کا مالک بھی بناتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں عجز وانکساری بھی پیدا کرتا ہے۔ اس میں کبھی تکبر پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ کبریائی (بڑائی) صرف اللہ کے لیے ہے۔ اللہ ہی اکبر ہے، انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ تو اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا ہے۔ توحید پر ایمان رکھنے والا کبھی کسی صورت میں خود کو دوسرے انسانوں کا رب یا خدا نہیں سمجھتا وہ تو دوسرے انسانوں پر حکومت کرنے کے اختیار (اقتدار اعلیٰ) کا مالک بھی صرف اللہ تعالیٰ کو مانتا ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ عزت اور ذلت اللہ کے قبضے میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ اس کے برعکس توحید پر ایمان نہ رکھنے والا شخص یہ سمجھ کر متکبر بن جاتا ہے کہ اس کا مال ودولت، اس کی حکومت اس کا بلند مرتبہ اس کی اپنی محنت اور قابلیت کی وجہ سے ہے۔

۴۔ شجاعت واستقامت:

توحید پر ایمان رکھنے والا بہادر اور جری ہوتا ہے کیونکہ وہ کائنات کی کسی چیز کو نفع ونقصان کا مالک نہیں سمجھتا، وہ کسی مخلوق سے نہیں ڈرتا۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (البقرہ:۲۶۲)، "نہ انہیں کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔" اہل ایمان کی صفت ہے، اس کا ایمان ایسے خدائے واحد پر ہوتا ہے جو قادر مطلق ہے جس کی قدرت سے باہر کوئی چیز نہیں، اس کی مدد اور تائید پر بھروسہ رکھتے ہوئے وہ اپنے راستے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میں آنے والی بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرا جاتا ہے کیونکہ اس کا ایمان ہے کہ اللہ کے سوا کوئی طاقت اسے موت نہیں دے سکتی اور اللہ اس کے ساتھ ہے، تو پھر بھلا وہ کسی چیز سے کیوں ڈرنے لگا۔ تاریخ گواہ ہے کہ توحید پر پختہ ایمان رکھنے والے بار ہا اپنے سے کئی گنا بڑے لشکروں سے ٹکرا گئے اور فتح مند ہوئے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ایمان رکھتے ہیں کہ فتح و نصرت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ دنیوی اسباب سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ توحید پر ایمان نہ رکھنے والا دنیوی اسباب پر بھروسہ رکھتا ہے اور جب انہیں اپنے حریف کے مقابلے میں کم پاتا ہے گھبرا کر ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ بقول اقبال رحمۃ اللہ علیہ

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

۵۔ اعلیٰ نصب العین اور تصورات:

توحید پر ایمان رکھنے والے کا نصب العین بہت اونچا اور اس کے تصورات بہت اعلیٰ ہوتے ہیں۔ اس کا نصب العین دنیوی مال و متاع حاصل کر کے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنا نہیں ہوتا، بلکہ ایسے کام کرنا ہوتا ہے جن سے اس کی آخرت سنور جائے اور اس کا خدا راضی ہو جائے چونکہ اس کا خدا بے مثل و بے مثال ہے، اپنی ذات میں بھی اور صفات میں بھی، اس کی تمام صفات بہت اعلیٰ ہیں۔ اس کا علم، حلم، رحم، کرم، کبریائی، قدرت، جبروت، قدس، جمال، جلال غرض تمام صفات بے نظیر ہیں اور مومن تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ (اللہ کے اخلاق اپناؤ) کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنے اندر ان صفات کو پیدا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اس لیے دنیا کی چیزیں اس کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ یوں وہ فی الواقع دنیا اور اس کی چیزوں کا حکمران بن جاتا ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کو یوں بیان کیا ہے:

قہاری و جباری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اس کے مقابلے میں کافر اور مشرک کا نصب العین صرف دنیوی زندگی اور دنیا کا مال و متاع ہی ہوتا ہے اس لیے وہ ان کا اسیر اور غلام ہو کے رہ جاتا ہے۔ اس کا نصب العین اور تصورات نہایت معمولی اور گھٹیا ہوتے ہیں۔

۶۔ رجائیت:

مومن کا نقطۂ نظر ہمیشہ Optimistic ہوتا ہے۔ وہ مشکل ترین حالات میں بھی کبھی مایوس نہیں ہوتا، کیونکہ اس کا ربط و تعلق ایسے خدا کے ساتھ قائم ہے جو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے جس کے لیے کوئی کام مشکل نہیں ہے۔ توحید پر ایمان رکھنے والا لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ”تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ“ کی ہدایت پر عمل کرتا ہے۔

۷۔ اطمینان قلب:

توحید پر ایمان رکھنے سے انسان کو اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اللہ کی رضا پر راضی رہتا ہے اور ہر کام میں اللہ کی حکمت پر یقین رکھتا ہے۔ وہ کبھی کسی مالی یا جانی نقصان پر غم سے نڈھال، زندگی سے بیزار نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ یقین رکھتے ہوئے مطمئن اور پرسکون رہتا ہے کہ اس میں ضرور کوئی حکمت ہوگی۔ جسے میں فی الحال سمجھنے سے قاصر ہوں اور اللہ کے کسی فعل کو حکمت سے خالی نہیں سمجھتا اور نہ ہی اللہ کو ظالم سمجھتا ہے۔ اس کا ایمان ہے کہ اللہ رحیم، رحمٰن، رؤف اور حکیم ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۸۔ تقویٰ اور پرہیزگاری:

اللہ پر ایمان رکھنے سے انسان میں برائیوں سے پرہیز کرنے اور نیکیاں کرنے کا میلان پیدا ہوتا ہے۔ جس کا یہ ایمان ہو کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے۔ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ سب کچھ سن رہا ہے اور انسان کو اللہ سے محبت بھی ہو، دل میں اس کا خوف بھی ہو، وہ شخص برائی کا ارتکاب کیونکر کر سکتا ہے۔ جب انسان کو یقین ہو کہ وہ قانون کی گرفت سے مکمل طور پر محفوظ رہے گا تو اس وقت اللہ کا خوف ہی اسے برائی سے بچا سکتا ہے۔ توحید پر ایمان رکھنے والا یقین رکھتا ہے کہ اللہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ تو دلوں کے بھید بھی جانتا ہے۔

اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ط (البقرہ:۲۸۴)

ترجمہ: ''تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے تم اسے ظاہر کرو یا چھپاؤ۔ اللہ تم سے ان کا حساب لے گا۔''

انسان کی اجتماعی زندگی پر اثرات

۱۔ وحدت انسانی:

خدا کی وحدت سے بنی نوع انسان کی وحدت پیدا ہوتی ہے جبکہ خداؤں کی کثرت سے بنی نوع انسان میں تفریق و انتشار پیدا ہوتا ہے۔ متعدد اور مختلف خداؤں پر ایمان رکھنے اور ان کی پرستش کرنے سے تو انسان مختلف گروہوں اور قوموں میں ہی تقسیم ہوں گے۔

۲۔ اخوت اور مساوات:

توحید ابنائے آدم کو اخوت اور مساوات کا درس دیتی ہے۔ خدا ایک ہے۔ اسی ایک خدا نے آدم کو پھر حوا علیہما السلام کو پیدا کیا۔ سب انسان آدم اور حوا علیہما السلام کی اولاد ہیں۔ سب ایک ہی ماں اور باپ کی اولاد ہیں تو ظاہر ہے کہ سب رشتۂ اخوت میں باہم منسلک ہیں اور سب بحیثیت انسان مساوی ہیں۔ کسی بھی وجہ سے دوسرے انسانوں پر برتری حاصل نہیں۔ رنگ، زبان، وطن، نسل، کوئی بھی چیز برتری کی وجہ نہیں بن سکتی۔

۳۔ عالمگیر معاشرہ:

توحید سے ایک عالمگیر معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے۔ اگر دنیا بھر کے تمام انسان صرف ایک خدا (جو مرئی اور محسوس نہیں) پر ایمان لے آئیں تو مختلف وجوہات کی بنا پر قائم ہونے والی موجودہ گروہ بندیاں ختم ہو سکتی ہیں۔

۴۔ عالمی امن:

عالمی امن کی خواہش آج کے انسان کی شاید سب سے بڑی خواہش ہے۔ انتہائی مہلک اسلحہ کے انباروں اور دو عالمی جنگوں کی تباہ کاریوں نے جنگ کے خوف کی وجہ سے انسان کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ اگر دنیا بھر کے تمام انسان توحید پر ایمان لا کر اپنے وضع کردہ ان جھوٹے امتیازات کو ختم کر کے اخوت و مساوات کا ماحول قائم کر لیں تو عالمی امن کے قیام کی یہ خواہش پوری ہو سکتی ہے۔

رسالت

معنی و مفہوم:

رسالت (رسالۃ) کے لغوی معنی ہیں پیغام، پیغام پہنچانا۔ رسول کے لغوی معنی ہیں پیامبر، قاصد، ایلچی۔ مرسَل کا معنی ہے رسول بنا کر بھیجا ہوا۔ دینی اصطلاح میں رسالت کا معنی ہے اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچانا اور رسول کا معنی ہے اللہ کا پیغام پہنچانے والا۔ نبی کا لغوی معنی ہے خبر دینے والا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نُبُوَّت (نُبُوَّةٌ) کا لفظی معنی ہے خبر دینا۔ نبی اور رسول اور نبوت اور رسالت ہم معنی اصطلاحیں ہیں۔ صرف اتنا فرق ہے کہ رسول صاحب شریعت و کتاب ہوتا ہے جبکہ نبی کے لیے صاحب شریعت و کتاب ہونا ضروری نہیں۔

رسول صرف اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک نہیں پہنچاتا بلکہ وہ اللہ کے احکام پر خود عمل کر کے دکھاتا ہے اور لوگوں کی سیرت کی تعمیر (تزکیہ) بھی کرتا ہے۔ رسالت کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور حضرت محمد ﷺ پر آ کر ختم ہو گیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد کوئی نبی اور رسول نہیں آئے گا۔

رسالت پر ایمان کی اہمیت:

عقیدۂ رسالت اسلام کے ان بنیادی عقائد میں شامل ہے جن پر ایمان لانا ضروری ہے جس کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔ رسالت پر ایمان سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ سے پہلے جتنے بھی انبیاء و رسل مبعوث فرمائے سب کو برحق مانا جائے (ان میں سے چند کا قرآن حکیم میں ذکر ہوا ہے)، بحیثیت رسول ان میں کوئی تفریق نہ کی جائے اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ کا آخری رسول اور نبی مانا جائے، آپ ﷺ کی شریعت پر عمل کیا جائے جس نے سابقہ شریعتوں کو منسوخ کر دیا ہے۔

رسالت کی ضرورت:

دو حقیقتیں ایسی ہیں کہ ان سے انکار ممکن نہیں۔

(۱) انسان میں نیک اور بد ہر دو قسم کے عمل کی صلاحیت موجود ہے۔

(۲) صلاحیتوں کے اعتبار سے انسان پیدائشی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ بعض بہت ذہین ہوتے ہیں بعض کم ذہین، بعض جسمانی طور پر بہت طاقتور ہوتے ہیں اور بعض کمزور۔ علیٰ ہذا القیاس۔ ہوتا یہ ہے کہ زیادہ اور بہتر صلاحیتیں رکھنے والوں پر جب بدی کا جذبہ غالب آ جاتا ہے تو وہ اپنی بہتر صلاحیتوں کے زور پر ان لوگوں پر اپنی سیادت اور برتری قائم کر لیتے ہیں جو یا تو کمتر صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں یا پھر جن میں نیکی کا جذبہ غالب ہوتا ہے اور وہ اس کے تحت شرافت سے کام لیتے ہیں۔ برتری قائم کر لینے والے بڑائی اختیار کر لیتے ہیں (قرآنی اصطلاح میں مستکبرین) وسائل رزق پر قبضہ کر کے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں، دوسروں کو وسائل رزق سے محروم کر کے انہیں کمزور سے کمزور کرتے چلے جاتے ہیں (قرآنی اصطلاح میں مستضعفین) اور انہیں مغلوب کر کے ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور یہ لوگ بالکل بے بس ہو جاتے ہیں۔ مستکبرین لوگوں کو کمزور بنانے اور کمزور رکھنے کے لیے جس ہتھکنڈے کا سب سے زیادہ استعمال کرتے ہیں وہ مسخ شدہ مذہب ہوتا ہے۔ وہ شرک کو رواج دے کر لوگوں کو گروہ در گروہ تقسیم کرتے چلے جاتے ہیں۔ مذہبی پیشواؤں کو ساتھ ملا کر نئے سے نئے مذہبی رسوم و رواج کے ذریعے ان کمزور لوگوں کا مزید استحصال کرتے ہیں۔

ایسے حالات میں اللہ رب العالمین اپنے کمزور بندوں پر ترس کھا کر ان میں اپنا رسول مبعوث کرتا ہے جو توحید کے پرچم تلے سب کو اکٹھا کر کے انہیں منظم کرتا ہے۔ ان میں ظالم متکبرین کے چنگل سے نجات پانے کی جدوجہد کرنے کا عزم پیدا کرتا ہے، خود ان کی قیادت کرتا ہے متکبرین اس کی سخت مزاحمت کرتے ہیں لیکن بالآخر اللہ کے فضل و کرم سے حق غالب آ جاتا ہے متکبرین شکست کھا کر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں اور مستضعفین کو عزت اور سیادت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہی ہے خلاصہ قرآن حکیم میں بیان کردہ انبیاء و رسل کے قصص کا۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

۱۔ "ہم نے نہیں بھیجا کسی بستی میں ڈرانے والا مگر اس بستی کے دولت مند لوگوں نے کہا، تمہیں جس پیغام کے ساتھ بھیجا گیا ہے ہم اس سے منکر ہیں اور انہوں نے کہا، ہم زیادہ مال اور اولاد والے ہیں اور ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔ (سبا،۳۴:۳۴-۳۵)

۲۔ "وہ بولے، کیا ہم تجھ پر ایمان لائیں جبکہ تیری پیروی تو سب سے رذیل لوگوں نے کی ہے۔" (الشعراء،۲۶:۱۱۱)۔ یہ بات حضرت نوح

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

علیہ السلام سے ان کی قوم کے سرداروں نے کہی تھی۔

۳۔ ''اس (یعنی صالح علیہ السلام) کی قوم کے سرداروں نے جنہوں نے بڑائی اختیار کر رکھی تھی کمزور بنائے گئے ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے تھے، کہا: کیا تم جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کی طرف سے رسول ﷺ ہے؟ انہوں نے جواب دیا: یقیناً جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ متکبرین نے کہا جس چیز پر تم ایمان لائے ہو ہم اس کے منکر ہیں۔ (الاعراف، ۷: ۷۵-۷۶)

۴۔ یقیناً فرعون زمین میں بہت بڑھ چڑھ گیا اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا ان میں سے ایک گروہ کو وہ کمزور کرتا تھا، اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتا، یقیناً وہ فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا، (القصص، ۲۸، ۴)

۵۔ اس کی قوم کے ان سرداروں نے جو بڑے بنے بیٹھے تھے، کہا: ''اے شعیب علیہ السلام! ہم ضرور تجھے اور تجھ پر ایمان لانے والوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کریں گے یا تو ہمارے مذہب میں واپس آ جا۔'' (الاعراف، ۷: ۸۸)

۶۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت اس قوم میں ہوئی جس کے بادشاہ نے بڑائی اور سرکشی کی انتہا کر دی تھی، وہ حاکم مطلق ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا رب ہونے کا بھی مدعی تھا۔

۷۔ جن و انس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذریت، ۵۱، ۵۶)

ترجمہ: ''اور نہیں پیدا کیا میں نے جنوں اور انسانوں کو سوائے اس کے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

اللہ تعالیٰ کی بندگی، اطاعت اور عبادت کس طرح کی جائے یہ بتانے کے لیے انبیاء و رسل مبعوث ہوئے۔

۸۔ ایسا نہیں ہوا کہ بندگی اور اطاعت کے جو طریقے (شریعت) سب سے پہلے رسول کے ذریعے بتائے گئے بعد میں آنے والے تمام رسولوں نے بعینہ وہی طریقے بتاتے ہوں بلکہ شریعت بدلتی رہی ہے۔ پہلی شریعت کو منسوخ کر کے نئی شریعت کے ساتھ نیا رسول بھیجنے کی ضرورت اس لیے پیش آتی رہی کہ انسان کے تمدنی و تہذیبی حالات تغیر پذیر رہے۔ کچھ عرصے کے بعد نئے تقاضے پیدا ہو جاتے تھے جن کو پورا کرنے کے لیے نئی شریعت کی ضرورت ہوتی۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر یہ فضل نہ فرماتا تو انسانی تہذیب جمود کا شکار ہو کر زوال پذیر ہو جاتی اور انجام کار نابود ہو جاتی۔

رسالت بنی نوع انسان پر اللہ کا احسان ہے:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کا برا بھلا، نیکی، بدی سمجھا دی ہوئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (الشمس، ۹۱: ۸)

ترجمہ: ''پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اسے الہام کر دی۔''

اس کے بعد انسان کا استحقاق نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ انبیاء و رسل کے ذریعے اس کی رہنمائی کا انتظام فرماتا۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر خاص لطف و کرم ہے کہ اس نے رسول مبعوث فرمائے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے بھی قرآن حکیم میں اسے اپنا احسان بتایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''اللہ نے تو مومنین پر احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک رسول بھیجا ہے۔'' (آل عمران، ۳: ۱۶۴)

یہ احسان حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت کا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کی بابت ارشاد ہے:

ترجمہ: ''اور ہم ان لوگوں پر احسان کرنا چاہتے تھے جن کو زمین میں کمزور بنا دیا گیا تھا۔'' (القصص، ۲۸: ۵)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہر قوم میں رسول بھیجا گیا:

اللہ تعالیٰ کا یہ احسان کسی ایک قوم کے لیے مخصوص نہیں تھا بلکہ اس نے ہر قوم میں رسول بھیجا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۱) وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا (النحل،۱۶: ۳۶)

ترجمہ: "اور ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجا ہے۔"

(۲) وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس،۱۰: ۴۷)

ترجمہ: "اور ہر قوم کے لیے رسول ہے۔"

(۳) وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (الرعد،۱۳: ۷)

ترجمہ: "اور ہر قوم کے لیے ایک رہنما ہے۔"

قرآن حکیم میں صرف ایک خاص خطے میں مبعوث ہونے والے ان چند رسولوں کا ذکر کیا گیا ہے جن سے قرآن مجید کے اولین مخاطبین یعنی عرب آشنا تھے۔

رسول کی خصوصیات

ا۔ بشریت:

رسول بشر ہوتا ہے اور اسی قوم کے مردوں میں سے ہوتا ہے۔ جس قوم میں وہ مبعوث ہوتا ہے وہ کوئی فوق البشر ہستی نہیں ہوتا، نہ ہی وہ فرشتوں یا جنات کے گروہ سے ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰی ط

ترجمہ: "اور (اے نبی ﷺ!) آپ ﷺ سے پہلے ہم نے جو رسول بھیجے تھے وہ سب بھی انسان ہی تھے اور انہی بستیوں کے رہنے والوں میں سے تھے اور ان کی طرف ہم وحی بھیجتے رہے ہیں۔"

سابقہ اقوام (قوم نوح، عاد اور ثمود اور ان کے بعد کی قوموں) نے اپنے رسولوں سے کہا تم تو ہماری ہی طرح کے بشر ہو، تمام رسولوں کی طرف سے ایک ہی جواب تھا:

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَمُنُّ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ط (ابراہیم،۱۴: ۱۱)

ترجمہ: "ان سے ان کے رسولوں نے کہا، ہم کچھ نہیں مگر تمہارے ہی جیسے انسان، لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے۔"

لوگوں کو ہمیشہ یہ اچنبھا لگتا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا رسول بنا کر بھیج دیا اور یہ بات ان کے ایمان لانے میں رکاوٹ بنتی ہے۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یوں دیا ہے۔

ترجمہ: "لوگوں کے پاس جب بھی ہدایت آئی تو اس پر ایمان لانے سے ان کو کسی چیز نے نہیں روکا سوائے ان کی اس بات نے کہ "کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیج دیا؟" ان سے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کہیے، اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے کسی فرشتے کو ہی رسول بنا کر اتارتے۔" (بنی اسرائیل، ۱۷: ۹۴-۹۵)

۲۔ رسول غیر معمولی صفات کا مالک ہوتا ہے:

اگرچہ رسول بشر ہی ہوتا ہے لیکن غیر معمولی صلاحیتوں اور ممتاز اوصاف حمیدہ کا مالک ہوتا ہے، ویسی صلاحیتیں اور اوصاف دوسرے انسانوں میں نہیں پائے جاتے۔ وہ انتہائی پرکشش شخصیت کا مالک ہوتا ہے، لوگوں کا بے حد خیر خواہ ہوتا ہے بچپن سے ہی اعلیٰ کردار کا مالک ہوتا ہے، بڑا صاحب عزیمت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے جب منصب رسالت پر سرفراز فرماتا ہے اس کے بعد وہ اپنے مشن کو انجام دینے کے لیے اپنی جان تک کی قربانی سے دریغ نہیں کرتا۔ وہ صبر واستقامت میں بے مثال ہوتا ہے۔ بڑی سے بڑی مشکلات اس کے پائے استقلال کو ڈگمگا نہیں سکتیں۔

رسول کی بصیرت وفراست بھی غیر معمولی ہوتی ہے۔ اللہ کی دین سے اسے ان چیزوں کا بھی علم ہوتا ہے جو عام انسانوں سے اوجھل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان سے ایسے کام سرزد ہوتے ہیں جو عام لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں اور جن کے کرنے سے عام انسان عاجز ہوتے ہیں (یعنی معجزات)۔ رسول کا منصب بہت عظیم اور کٹھن ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے اللہ تعالیٰ رسول کو اعلیٰ صلاحیتیں ودیعت کرتا ہے۔

۳۔ رسالت وہبی منصب ہے اکتسابی نہیں:

رسالت کا منصب وہبی ہے یعنی اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے یہ منصب عطا کرتا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ اس منصب جلیل پر کسے سرفراز کرتا ہے۔ کوئی انسان یہ منصب اپنی محنت اور جدوجہد سے حاصل نہیں کر سکتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

(۱) اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (الحج، ۲۲: ۷۵)

ترجمہ: "اللہ منتخب کرتا ہے رسول اپنے فرشتوں میں سے اور انسانوں میں سے۔"

(۲) اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ط (الانعام، ۶: ۱۲۴)

ترجمہ: "اللہ بہتر جانتا ہے کہ اسے اپنی رسالت کسے سونپنی ہے۔"

پس رسالت کا منصب کسی نسل، قوم یا قبیلہ کی میراث نہیں ہے جیسا کہ بنی اسرائیل کو زعم باطل تھا۔ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ اللہ نے ہر قوم میں رسول بھیجا۔ اللہ تمام انسانوں کا رب ہے پھر اس نعمت کے لیے وہ کسی ایک قوم کو مخصوص کیوں کرتا۔

۴۔ رسول معصوم ہوتا ہے:

ہر نبی اور رسول ولادت سے لے کر وفات تک گناہوں اور خطاؤں سے معصوم ہوتا ہے۔ اس کی ساری زندگی اللہ تعالیٰ کی خصوصی نگہداشت میں گزرتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ظاہر ہے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مخاطب کر کے فرمایا:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا (الطور ۵۲: ۴۸)

ترجمہ: "اور اپنے رب کا فیصلہ آنے تک صبر کیجئے یقیناً آپ ہماری نگہداشت میں ہیں۔"

رسول نفسانی خواہشات اور باہر سے شیطان کے حملوں سے محفوظ ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے بے پناہ اخلاقی وروحانی قوت ودیعت کی ہوتی ہے نیز وہ مسلسل اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہوتا ہے۔ وحی اور الہام کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی ہدایات اسے مسلسل وصول ہوتی رہتی ہیں۔

۵۔ ہر رسول پر ایمان لانا ضروری ہے:

رسول جس قوم میں مبعوث ہوتا ہے اس قوم کے ہر فرد پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اس پر ایمان لائے، جو ایمان نہیں لائے گا وہ کافر قرار پائے گا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دنیا اور آخرت میں عذاب کا مستحق ہوگا۔ بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے بھی ضروری ہے سابقہ تمام رسولوں پر ایمان لائیں، یعنی انہیں برحق رسول مانیں۔ ان میں تفریق و امتیاز نہ کریں۔ بعض کو رسول ماننے اور بعض سے انکار کرنے والے کافر ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ترجمہ: ''یقیناً جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض سے انکار کرتے ہیں اور اس (یعنی ایمان اور کفر) کے مابین راہ پکڑنا چاہتے ہیں وہی ہیں پکے کافر اور ہم نے (ایسے) کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔

مسلم ہونے کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے مسلمان تو تمام انبیاء و رسل پر ایمان رکھتے ہیں لیکن یہودی نہ حضرت عیسیٰ پر ایمان رکھتے ہیں، نہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر۔ اسی طرح عیسائی حضرت محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان نہیں رکھتے۔ مسلمان تو یہی کہتے ہیں کہ: لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرہ، ۲۸۵) ''ہم اس کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔''

۶۔ رسول کی اطاعت ضرور ہے:

رسول اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ لوگ اس کی کامل اطاعت کریں، جس کام کے کرنے کا حکم دے وہ کریں اور جس سے منع کرے اس سے باز رہیں۔ اگر لوگ رسول کی اطاعت نہ کریں تو اس کی بعثت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اور اطاعت کے بغیر ایمان لانا بے سود اور لاحاصل ہے۔ اگر اطاعت نہ کریں گے تو لوگوں کی زندگی کیسے سنورے گی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ط (النساء،۴:۶۴)

ترجمہ: ''اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا سوائے اس لیے کہ اللہ کے اذن کی بناء پر اس کی اطاعت کی جائے۔''

رسول کی نافرمانی کرنے والا عذاب الٰہی کا مستوجب ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''اور جو نافرمانی کرے گا اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی اور اس کی حدود سے تجاوز کرے گا وہ اسے آگ میں ڈال دے گا جس میں وہ مقیم رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔''

۷۔ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے:

رسول لوگوں کو جن اوامر و نواہی کی تعلیم دیتا ہے وہ سب اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ رسول اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔ ہر بات اللہ کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىO اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم،۵۳:۳-۴)

ترجمہ: ''اور وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا یہ تو ایک وحی ہے جو اسے وحی کی جاتی ہے۔''

پس رسول ﷺ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ج (النساء،۴:۸۰)

ترجمہ: ''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

منصب رسالت

انبیاء علیہم السلام کے منصب اور ان کے درجے کے بارے میں اچھی خاصی غلط فہمیاں رہی ہیں اور بعض حلقوں میں اب بھی ہیں۔ ایک طرف تو یہ خیال تھا کہ انبیاء درجۂ بشریت سے بلند، فرشتے یا خدا ہوتے ہیں، یا کم از کم خدائی میں تھوڑے بہت شریک ہوتے ہیں۔ حالانکہ انبیائے کرام نے خود ہمیشہ اس کی تردید کی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا:

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّىْ مَلَكٌ.

ترجمہ: ''میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے قبضے میں خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔'' (ھود۔۳۱)

اسی طرح بعض انبیا کو ان کی قوموں نے خدا کا بیٹا بنا لیا۔ حالانکہ انہوں نے بھی اعلان کر دیا تھا:

اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ ط اٰتٰنِىَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِىْ نَبِيًّا ۝

ترجمہ: ''میں اللہ کا بندہ ہوں اور اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا ہے۔'' (مریم۔۳۰)

آنحضرت ﷺ نے یہ دیکھ کر کہ پچھلی امتوں نے اپنے انبیا کی تعظیم و تکریم میں غلو کرتے کرتے انہیں خدائی کے مرتبے تک پہنچا دیا، اس بات کا بڑا خیال رکھا کہ کوئی شخص آپ کی ایسی بے جا تعظیم نہ کرے جس سے فتنہ پیدا ہو۔ کئی بار لوگوں نے آپ کو سجدہ کرنے کی اجازت چاہی لیکن آپ ﷺ نے سختی سے روک دیا، اور بار بار خدا کے سامنے اپنی بندگی اور بے چارگی کا اعلان کیا۔

ایک طرف تو انبیا کے مرتبے میں اس درجہ غلو کیا گیا انہیں خدائی تک پہنچا دیا گیا۔ دوسری طرف ایک گروہ نے رسالت کے درجے کو اس قدر کم سمجھا کہ رسول کی حیثیت ایک ڈاکیہ یا نامہ بردار سے زیادہ نہ رہی۔ انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ نبی کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اللہ کی کتاب انسانوں تک پہنچا دے اور بس لیکن اگر رسولوں کا کام اتنا ہی ہوتا تو خدا یہ کام دوسروں سے بھی لے سکتا تھا۔ آخر اس کے لیے یہ کیا مشکل تھا کہ لوگوں پر لکھی لکھائی کتابیں نازل کر دیتا یا فرشتوں کے ذریعے کتب بھیج دیتا لیکن چونکہ شہادت حق کا کام بڑا وسیع ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل بھیجے۔ ان انبیاء کی ذمہ داریاں اور ان کے مناصب کیا تھے، اس سلسلے میں ہم قرآن سے رہنمائی حاصل کریں گے کہ اس نے انبیا کی کیا حیثیت بیان کی ہے۔

۱۔ قابل اطاعت:

قرآن کی رو سے نبی کی مکمل اطاعت اور پیروی ضروری ہوتی ہے اور ایسا سمجھنا شرط ایمان ہے۔ دین و شریعت کے دائرے میں نبی جو کچھ بھی کہتا ہے ایک مومن کا فرض ہے کہ اس کی تعمیل میں چون و چرا نہ کرے اور مصلحت خواہ اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے یہ ہر صورت یقین رکھے کہ وہ خیر ہی خیر ہے اور سراپا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ط

ترجمہ: ''ہم نے جس رسول کو بھی بھیجا اسی لیے بھیجا کہ اذن خداوندی کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔'' (النساء۔۶۴)

پھر یہ اطاعت بھی صرف ظاہر کی حد تک نہیں ہونی چاہیے، بلکہ دل کی رضا کے ساتھ ہونی چاہیے۔ نبی آخر الزماں ﷺ کے حق اطاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا○

ترجمہ: ''پس نہیں، اے نبی! تمہارا رب گواہ ہے کہ یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے جب تک وہ آپس کے تمام معاملات میں تمہیں حاکم نہ بنائیں اور پھر تمہارے فیصلے پر بلا کسی دلی تنگی کے آمادگی کے ساتھ سرِ تسلیم خم نہ کر دیں۔'' (النساء۔۶۵)

اور یہ بات عقل کے مطابق بھی ہے اس لیے کہ اگر انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کے احکام کو جاننے کا واحد ذریعہ نبی ہے تو نبی کی کامل اطاعت اور پیروی کے بغیر اللہ کی اطاعت اور بندگی کی کوئی شکل رہ ہی نہیں جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی نے اپنی دعوت کے ساتھ یہ مطالبہ کیا:

فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ ج

ترجمہ: ''اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔'' (الشعراء۔۱۳۱)

اس دعوت سے اس حقیقت کا اظہار مطلوب ہے کہ تقویٰ اور بندگی کی راہ صرف رسول کی اطاعت ہی سے معلوم ہو سکتی ہے اور صرف رسول ہی بتا سکتا ہے کہ خدا کے احکام کیا ہیں اور ان احکام پر کس طرح عمل کیا جانا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بار بار اطیعوا اللہ (اللہ کی اطاعت کرو) کے ساتھ ساتھ اطیعوا الرسول (رسول کی اطاعت کرو) کا بھی حکم آیا ہے۔ نبی دین و شریعت کے دائرے میں جو کچھ کہتا ہے وہ سب کا سب اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہ حقیقت نبی کی حیثیت کو اور بھی اہم بنا دیتی ہے کیوں کہ ایسی صورت میں نبی کی اطاعت نبی کی اطاعت نہیں رہ جاتی بلکہ خدا کی اطاعت بن جاتی ہے، جیسا کہ فرمایا بھی گیا:

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ط

ترجمہ: ''جس نے رسول کی اطاعت کی اسی نے خدا کی اطاعت کی۔'' (النساء۔۸۰)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ نبی کا ایک بڑا اہم منصب ''مطاع'' کا ہے۔ وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کی کامل اطاعت کی جانی چاہیے، ایسی اطاعت جس میں نہ کوئی قید و شرط ہو نہ کوئی بے دلی۔ جو شخص نبی کا مقام اس سے نیچے سمجھتا ہے وہ صحیح معنوں میں نبی پر ایمان نہیں رکھتا اور بالکل نہیں جانتا کہ نبوت کسے کہتے ہیں۔

۲۔ شارحِ کتاب اللہ:

اللہ تعالیٰ کی شریعت چونکہ ہمیشہ رہنے کے لیے ہے لہٰذا کتاب اللہ میں زیادہ تر زور اصول و مبادی پر دیا گیا ہے اور اللہ کے پیغمبر کے ذمے یہ کام کیا گیا ہے کہ وہ ان کی تشریح و توضیح کریں۔

سورۂ نحل میں ارشاد کیا گیا ہے کہ:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ

ترجمہ: ''اور ہم نے یہ ذکر (قرآن) تمہاری طرف اس لیے نازل کیا ہے تاکہ لوگوں کے لیے تم اس ہدایت کو واضح کر دو، جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔'' (آیت۔۴۴)

یہ بات ظاہر ہے کہ تشریح و توضیح خود کتاب کے الفاظ پڑھ کر سنا دینے سے نہیں ہوتی بلکہ تشریح کرنے والا اس کے الفاظ سے زائد بھی کچھ کہتا ہے تاکہ سننے والا کتاب کا مطلب پوری طرح سمجھ جائے۔ اسی طرح اگر کتاب میں کسی عملی مسئلے کا ذکر ہو تو بسا اوقات شارح کو عملی مظاہرے کے ذریعے سے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مطلب سمجھانا پڑتا ہے۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں انبیاء معصوم ہوتے ہیں، اسی بنا پر ان کی یہ تشریح و تعبیر خطا سے بالاتر اور ہمیشہ کے لیے حجت ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے لوگ قرآن کی تشریح اور اس سے احکام اخذ کرنے کا جو کام کریں گے ضروری نہیں کہ وہ صحیح ہی ہو، وہ حجت نہیں ہوگا۔

۳۔ معلم ومربی:

آنحضرت ﷺ کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ج

ترجمہ: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان فرمایا ہے کہ خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔'' (آل عمران۔۱۶۴)

اور دیگر متعدد مقامات پر اس مفہوم کی آیات وارد ہوئی ہیں ان ساری آیات میں جو بات مشترک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو صرف قرآن کی آیت سنا دینے کے لئے نہیں بھیجا تھا بلکہ اس کے ساتھ بعثت کے تین اور مقاصد تھے:

۱۔ لوگوں کو آپ ﷺ ''کتاب'' کی تعلیم دیں۔

۲۔ اس کتاب کے منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں۔

۳۔ افراد کا بھی اور ان کی اجتماعی ہیئت کا بھی تزکیہ کریں یعنی اپنی تربیت سے ان کی انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کو دور کریں اور ان کے اندر اچھے اوصاف اور بہتر نظام اجتماعی کونشو ونما دیں۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اللہ پڑھ کر سنانے کے علاوہ نبی کے جو فرائض ہیں ان میں کتاب وحکمت کی تعلیم بھی ہے اور جب یہ تعلیم آپ کے فرائض نبوت میں سے ہے تو یہ بات بدیہی ہے کہ اسی تعلیم کو پیغمبرانہ حیثیت حاصل ہوگی اور اس کی تعمیل امت مسلمہ کے لئے فرض ہوگی۔ آپ ﷺ کی اسی زبانی تعلیم اور عملی مظاہرے کو صحابہ اور تابعین نے اپنی روایات اور عمل کے ذریعے محفوظ رکھا اور وہ 'احادیث وسنن' کے نام سے موسوم ہوا۔

۴۔ پیشوا اور نمونہ تقلید:

اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا اور ہادی ورہنما بنایا ہے یعنی نبوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی ذات مجسم ہدایت و راہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لیے خاص ہو جاتی ہے۔ ان کی بعثت اسی لیے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی راہنمائی فرمائیں اور ان کو ضلالت و گمراہی سے بچائیں۔ وہ جس امت میں مبعوث ہوتے ہیں، اس کے سامنے ہدایت وراہنمائی کے دو چراغ (کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ) روشن ہوتے ہیں جن کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے۔ سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ O قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ O

ترجمہ: ''اے نبی کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور اللہ غفور ورحیم ہے۔ کہو کہ اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی پھر اگر وہ منہ موڑتے ہیں تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔'' (آیات۔۳۱،۳۲)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسی طرح سورہ احزاب میں کہا گیا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ

ترجمہ: ''تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ تقلید موجود ہے۔ ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کی امید رکھتا ہے۔'' (آیت۔۲۱)

ان دونوں آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود اللہ تعالی نے اپنے رسول کو پیشوا مقرر کیا تھا اور ان کی پیروی اور تقلید کو مسلمانوں کے لیے لازم قرار دیا ہے۔ یہ آیات اسی بات کی طرف واضح رہنمائی کرتی ہیں جو آپ ﷺ نے اپنے آخری خطبوں میں سے ایک میں حجۃ الوداع کے موقع پر کہی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وسنتی

ترجمہ: ''میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں اللہ کی کتاب اور اپنی سنت (یعنی عملی زندگی)۔''

جو مسلمان آپ ﷺ کے عہد مبارک میں تھے ان کے تو سامنے ہی آپ ﷺ کی زندگی تھی لیکن آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی آپ ﷺ کی زندگی سنت کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے اور قرآن کریم کے بعد ہماری ہدایت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔

۵۔ شارع اور قانون ساز:

سورۂ اعراف میں نبی ﷺ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ

ترجمہ: ''وہ ان کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور بندھن (غیر الٰہی قوانین) اتار دیتا ہے جو ان پر چڑھے ہوئے تھے۔'' (آیت۔۱۵۷)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے نبی ﷺ کو تشریعی اختیارات عطا کیے ہیں۔ اللہ کی طرف سے امر و نہی اور تحلیل و تحریم صرف وہی نہیں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے بلکہ جو کچھ نبی ﷺ نے حلال و حرام قرار دیا ہے اور جس چیز کا حضور ﷺ نے حکم دیا ہے یا جس سے منع کیا ہے وہ بھی اللہ کے دیے ہوئے اختیارات سے ہے اس لیے وہ بھی قانون خداوندی کا حصہ ہے۔ یہی بات سورہ حشر میں بڑی صراحت سے ارشاد ہوئی ہے:

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

ترجمہ: ''جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے منع کر دے، اس سے رک جاؤ، اور اللہ سے ڈرو، بلاشبہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔'' (الحشر آیت۔۷)

۶۔ قاضی اور حکم:

قرآن میں بے شمار جگہوں پر اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ اللہ تعالی نے نبی ﷺ کو قاضی و حکم مقرر کیا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ

ترجمہ: ''اے نبی، ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ لوگوں کے درمیان تم فیصلے کرو جیسا کہ اللہ تمہیں دکھائے۔'' (النساء۔۱۰۵)

مومنین کی صفات میں سے ایک صفت یہ بتائی گئی ہے کہ جب رسول کے فیصلے کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا (سمعنا و اطعنا)۔ اسی طرح ایک اور جگہ بیان کیا گیا ہے کہ مومنین کی شان یہ ہے کہ جب اللہ کا رسول کسی معاملے میں انہیں کوئی حکم دے دے تو وہ اسے بسر و چشم تسلیم کر لیتے ہیں اور ان کے دل میں فیصلے کے خلاف ذرا بھی تنگی نہیں ہوتی۔

انبیا کے گوناں گوں مناصب میں سے یہ صرف چند تھے جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ قرآن میں ان کے علاوہ بتایا گیا ہے کہ انبیا ہادی (رہنما)، نذیر (ڈرانے والے)، داعی (خدا کی طرف دعوت دینے والے)، مبشر (خوش خبری سنانے والے)، مبلغ (خدا کے احکام پہنچانے والے)، مزکی (برائیوں سے پاک کرنے والے)، سراج منیر (روشن چراغ) بھی تھے۔

امام الانبیا ﷺ کا مقام ومرتبہ

نبی کریم ﷺ کے خصائص و امتیازات وہ ہیں جو آپ ﷺ کو دیگر تمام انبیاء علیہم السلام سے ممتاز کرتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ رسول یا نبی ہونے کی حیثیت میں کسی قسم کی تفریق روا نہیں، جیسا کہ قرآن کریم نے اہل ایمان کا شیوہ بتلایا کہ وہ اعلان کرتے ہیں:

لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ.

یعنی ہم اس کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

لیکن قرآن حکیم نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ بعض رسولوں کو اللہ تعالیٰ نے دیگر رسولوں پر فضیلت عطا فرمائی اور ان کے درجات کو بلند فرمایا، ارشاد ہوتا ہے:

تِلۡكَ الرُّسُلُ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ مِنۡهُمۡ مَّنۡ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعۡضَهُمۡ دَرَجٰتٍ (البقرہ:253)

یعنی یہ رسول ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت عطاء کی ہے۔ ان میں بعض وہ ہیں جو اللہ سے ہم کلام ہوئے اور اس نے ان میں سے بعض کے درجات کو بلند کیا ہے۔

اس آیت میں حضور ﷺ کی دیگر انبیاء پر فضیلت اور بلندی درجات کی طرف اشارہ ہے۔

آپ ﷺ کے خصائص و امتیازات جو ذیل میں بیان ہو رہے ہیں آپ ﷺ کی فضیلت کا سبب ہیں۔

حضور ﷺ کی بعثت کا مقصد:

اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تکمیل کے لیے جس کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی تھی اور جسے اسلام کی صورت میں حضور ﷺ کے ہاتھوں پایہ تکمیل تک پہنچایا گیا۔ یہ (اسلام) بنی نوع انسان کے لیے ایک ایسا ضابطہ ہے جو قیامت تک انسانوں کی رہبری و راہنمائی کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعَا (سورہ الاعراف آیت 158)

ترجمہ: یعنی اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

یعنی حضور ﷺ اپنی بعثت سے لے کر یوم قیامت تک ہر قوم، ہر قبیلے، ہر نسل اور ہر زمانے کے لیے مبعوث فرمائے گئے۔

سورۂ القلم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍO فَسَتُبْصِرُ وَیُبْصِرُوْنَO بِاَیِّکُمُ الْمَفْتُوْنُ.
(آیت 4-5-6)

ترجمہ: ''بے شک آپ ﷺ اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں۔ پس تم بھی عنقریب دیکھ لو گے اور وہ (کفار و مشرکین) بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے خبطی وسودائی کون تھا۔''

اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی سیرت مبارکہ کا یہ سرٹیفکیٹ عطا کر کے تمام انبیاء پر آپ ﷺ کو فضیلت بخشی۔

اسوۂ حسنہ:

حضور ﷺ چونکہ رحمت اللعالمین اور ساری دنیا کے لیے معلم اخلاق بنا کر بھیجے گئے تھے اس لیے آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ اخلاق کریمانہ کا بہترین نمونہ تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ. (سورۂ احزاب آیت 21)

ترجمہ: ''بلاشبہ رسول اللہ ﷺ (کی ذات مبارکہ) میں تمہارے لیے ایک بہترین نمونہ عمل موجود ہے۔''

اس آیت مبارکہ کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ حضور ﷺ نے جو اعمال اور افعال اس دنیا میں انجام دیے ان پر ہم بھی عمل کریں تا کہ راہ ہدایت پا کر ہماری بخشش کا کچھ سامان بن سکے۔ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ امور اختیاریہ میں ایسے بن جاؤ اور ایسے ہو کر آؤ جیسے جناب رسول اللہ ﷺ کا اخلاق ہے۔ گویا حق تعالیٰ نے ہمارے پاس ایک نمونہ بھیج دیا ہے اور گویا فرما دیا کہ تفصیلاً کہاں تک بیان کریں کہ یہ صفت پیدا کرو وہ صفت چھوڑ دو ہم ایک نمونہ بھیج دیتے ہیں ایسے بن جاؤ یعنی اپنے اخلاق، عادات، کھانا پینا، بیٹھنا، اٹھنا، چلنا پھرنا، وضع طرز اور چال ڈھال ایسا ہو جیسا کہ حضور ﷺ کا ہے۔

حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

و انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق.

ترجمہ: اور مجھے تو اخلاقِ کریمانہ کے اتمام کے لے مبعوث کیا گیا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب آپ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

کان خلقه القرآن.

ترجمہ: ''آپ ﷺ کا اخلاق تو قرآن حکیم ہے۔''

اللہ تعالیٰ ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ (سورہ الانبیاء آیت 107)

ترجمہ: ''(اے نبی ﷺ) ہم نے تم کو صرف اس لیے بھیجا کہ تم تمام جہانوں کے لیے رحمت ہو۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آپ ﷺ کی حیات طیبہ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عرب کے معاشرۂ جاہل میں جب اخلاق حسنہ کے بارے میں لوگ جانتے تک نہ تھے تو آپ ﷺ کو "امین" اور "صادق" کے القابات سے نوازا گیا۔ نبوت ملنے کے بعد آپ ﷺ کے اخلاق جوہر روشن سے روشن تر ہوتے گئے۔ غرض آپ ﷺ کی سیرت پاک میں اوصاف اخلاق پورے طور پر تابناک نظر آتے ہیں۔

حضور ﷺ سے وابستگی کی بنیادیں:

ہر اس شخص پر یہ لازم ہے جو خود کو مسلمان کہتا ہے، حضور ﷺ پر ایمان لانے کے لیے ایمان، اطاعت، اتباع اور محبت کو بنیاد بنائے۔

حضور ﷺ پر ایمان لانا:

حضور ﷺ پر ایمان لانا رسالت کو تسلیم کرنے کی پہلی کڑی ہے۔ یعنی حضور ﷺ کو صادق اور امین ماننے اور یہ جانے کہ آپ ﷺ کا ہر فعل، قول اللہ کے حکم کے عین مطابق ہے اور حضور ﷺ کا فرمان اللہ کا فرمان ہے، کیونکہ آپ ﷺ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے تھے سوائے اس کے جو آپ ﷺ پر وحی کیا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ سورۂ الحدید آیت 28 میں فرماتے ہیں:

ترجمہ: تم رسول ﷺ پر ایمان لاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی رحمت سے دو حصے عطا کرے گا۔"

حضور ﷺ کو آخری نبی تسلیم کرنا بھی مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے۔

اطاعت رسول ﷺ:

سورۂ النساء آیت 80 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ

ترجمہ: جس نے حضور ﷺ کی اطاعت کی تو بے شک اس نے اللہ کی اطاعت کی۔"

حضور ﷺ سے اطاعت کی صورت کیا ہے اس ضمن میں ابوداؤد نے بروایت عوف ابن مالک یہ حدیث نقل کی ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے اس عہد پر بیعت لی کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور پانچ وقت کی نماز کو پابندی سے ادا کریں گے اور اپنے امراء کی اطاعت کریں گے اور کسی انسان سے کسی چیز کا سوال نہ کریں گے۔"

یہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے دلوں میں آنحضرت ﷺ کی محبت وعظمت اور جذبہ اور اطاعت کا اثر تھا۔ سورۂ انفال آیت 20 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ لَا تَوَلَّوۡا عَنۡہُ

ترجمہ: "اے ایمان والو! اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی مت کرو۔"

سورۂ حشر آیت 7 میں فرمایا:

وَ مَاۤ اٰتٰىکُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡہُ ٭ وَ مَا نَہٰىکُمۡ عَنۡہُ فَانۡتَہُوۡا ج

ترجمہ: "اے ایمان والو! اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی مت کرو۔"

ان قرآنی آیات سے معلوم ہوا کہ جب تک اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضور ﷺ کی اطاعت نہ کی جائے انسان ہرگز مسلمان نہیں ہوسکتا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اتباع:

سورہ آل عمران کی آیت 31 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اے رسول ﷺ! کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ کے ساتھ محبت رکھتے ہو تو میری فرمانبرداری کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا۔''

اس آیت کریمہ سے یہ مراد ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرتا ہے اسے حضور ﷺ کی فرمانبرداری کرنا بھی لازمی ہے۔

حضور ﷺ خود فرماتے ہیں:

''تم میں کوئی بھی اس وقت تک کامل مومن نہیں بن سکتا جب تک اس کی خواہشات اس شریعت کے تابع نہ ہوں جسے میں لے کر آیا ہوں۔''

حضور ﷺ کے اس فرمان کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ حضور ﷺ کا فرمان بھی اللہ کا فرمان ہے اس لیے اس فرمان کی اطاعت کی جائے جو آپ ﷺ ساتھ لائے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص میری امت کے بگاڑ کے زمانے میں میرے طریقے پر چلے گا اس کو سو شہیدوں کے برابر اجر اور انعام ملے گا۔''

''میرا ہر امتی جنت میں جائے گا سوائے اس کے جو انکار کردے۔''

عرض کیا گیا کہ انکار کرنے والا شخص کون ہوگا؟ ارشاد فرمایا:

''جو شخص میری اطاعت کرے گا جنت میں جائے گا اور جو میری نافرمانی کرے گا وہ انکار کرنے والا ہوگا۔''

محبت:

حضور ﷺ سے محبت کرنا بھی ہر مسلمان کے ایمان کا جزو ہے۔ خود حضور ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اسے اپنے والدین، اپنی اولاد اور دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ میں محبوب نہ ہوجاؤں۔''

ایک اور مقام پر حضور ﷺ نے فرمایا:

''جس نے میری سنت کو محبوب سمجھا اس نے مجھے محبوب سمجھا۔''

ان احادیث مبارکہ کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب تک حضور ﷺ سے ہر مسلمان اپنے والدین، اولاد اور دنیا کے تمام لوگوں سے، جن سے وہ ملاپ رکھتا ہے، زیادہ محبت نہیں رکھتا، اس وقت تک وہ مسلمان کہلانے کا حق دار نہیں۔ گویا حضور ﷺ کی محبت سب کی محبت پر مقدم ہے۔

رسالت محمدی کی امتیازی خصوصیات

تمام رسول برحق ہیں اور اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے بعض رسولوں کو بعض پر فضیلت بخشی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ م

ترجمہ: ''یہ رسول ہیں جن میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسی طرح ہر رسول کی رسالت بھی برحق ہے لیکن حضرت محمد ﷺ کی رسالت میں کچھ خصوصیات ایسی ہیں جو کسی دوسرے رسول کی رسالت میں نہیں پائی جاتیں۔ مثلاً

۱۔ عالمگیریت:

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے جتنے بھی رسول مبعوث ہوئے ان کی رسالت اپنی اپنی قوم کے لیے مختص تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام سب اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آل فرعون کی طرف بھیجا گیا تاکہ بنی اسرائیل کو ان کے مظالم سے نجات دلائیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی بنی اسرائیل کی طرف بھیجا گیا تھا لیکن حضور ﷺ کی بعثت پورے بنی نوع انسان کے لیے ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۱) قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف، ۷:۱۵۸)

ترجمہ: "(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجئے، اے لوگو! یقیناً میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔"

(۲) وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۤفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا، ۳۴:۲۸)

ترجمہ: "اور ہم نے آپ ﷺ کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔"

(۱) ترجمہ: "وہی ہے جس نے امیوں میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا وہ انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے جبکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے اور (اس رسول کی بعثت) ان دوسرے لوگوں کے لیے بھی ہے جو ابھی ان سے نہیں ملے ہیں۔"

(الجمعہ، ۶۲:۳)

رسول کریم ﷺ نے صرف عربوں کو ہی دین کی تبلیغ نہیں کی تھی بلکہ آپ ﷺ نے اردگرد کے ملکوں کے بادشاہوں کو بھی خطوط لکھ کر اسلام کی دعوت دی تھی۔ آپ ﷺ نے مصر، حبشہ اور ایران کے بادشاہوں کے نام تبلیغی خطوط کے ساتھ اپنے قاصد بھیجے تھے۔ آپ ﷺ سے پہلے کسی رسول کی بابت نہ تو قرآن حکیم میں اور نہ ہی بائبل میں کوئی ذکر اس امر کا نہیں ملتا کہ ان کی بعثت اپنی قوم کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی تھی۔ اس بات کا بھی کہیں ذکر نہیں ملتا کہ کسی رسول نے اپنی قوم کے سوا دوسرے لوگوں کو بھی دین کی دعوت دی ہو۔

۲۔ ختم نبوگت:

حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ نبوت و رسالت کا جو سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا تھا وہ آپ ﷺ پر ختم ہو گیا، آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی یا رسول قیامت تک نہیں آئے گا۔ آپ ﷺ کی رسالت قیامت تک تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ط

(الاحزاب، ۳۳:۴۰)

ترجمہ: "محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں۔"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اوپر سورہ والجمعہ کی آیت ۳ کا ترجمہ دیا گیا ہے۔اس سے بھی ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کی رسالت نہ صرف آپ ﷺ کے مبارک زمانے کے لوگوں کے لیے تھی بلکہ بعد کے زمانے والوں کے لیے بھی۔

حضور ﷺ نے متعدد احادیث میں صراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں اور آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی اور رسول نہیں آئے گا۔اس مضمون کی چند احادیث درج ذیل ہیں:

(۱) وانا العاقب الذی لیس بعدہ نبی (بخاری، مسلم کتاب الفضائل، باب اسماء النبی)

اور میں وہ عاقب ہوں کہ جس کے بعد کوئی نبی نہیں۔

(۲) "نبی ﷺ نے فرمایا: بنی اسرائیل کی قیادت انبیاء کیا کرتے تھے۔ جب بھی کوئی نبی وفات پاتا دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا، مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا، خلفاء ہوں گے۔" (بخاری، کتاب المناقب، باب ذکر من بنی اسرائیل)

(۳) نبی ﷺ نے فرمایا: میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور خوب حسین وجمیل بنائی مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی خوبی پر حیرت کا اظہار کرتے تھے اور کہتے تھے یہ اینٹ کیوں نہیں رکھی گئی۔ تو وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔" (بخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین)

(۴) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یقیناً رسالت اور نبوت کا سلسلہ منقطع ہوگیا پس میرے بعد نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی (ترمذی، کتاب الرؤیا، باب ذہاب النبوۃ)

(۵) وانا آخر الانبیاء وانتم آخر الامم. (ابن ماجہ، کتاب الفتن) "اور میں آخری نبی ہوں اور تم آخری امت ہو۔"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک پوری امت کا اس امر پر اجماع رہا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں، آپ ﷺ کے بعد اگر کوئی شخص نبوت کا دعوی کرے تو وہ بالکل جھوٹا ہے۔

۳۔ تکمیل دین:

دین کے بنیادی اصول وعقائد تو تمام رسولوں کے ایک ہی تھے لیکن شریعت ارتقاء پذیر رہی ہے۔ نئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نئے شرعی احکام آتے رہے ہیں تا آنکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت میں دین کی تکمیل ہوگئی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

3- اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ

ترجمہ: "آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی۔"

ختم نبوت کا منطقی تقاضا بھی یہی بنتا ہے کہ آپ ﷺ کی رسالت میں اللہ کے دین کی تکمیل ہو جائے اور ارتقاء کا جو عمل شروع ہوا تھا وہ اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ جائے۔ پس اب قیامت تک کے انسانوں کے لیے یہ دین ہدایت ربانی کا کام دیتا رہے گا۔

۴۔ تمام انبیائے حضور ﷺ پر ایمان لانے کا عہد کر رکھا تھا:

حضور علیہ الصلوۃ والسلام اگرچہ بعثت کے لحاظ سے آخری نبی ہیں لیکن آپ ﷺ کا نور اللہ تعالیٰ نے ازل ہی سے پیدا کر رکھا تھا۔ عالم مثال میں جب سب انبیاء علیہم السلام کی ارواح جمع ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ میں تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دوں گا۔ پھر اگر ایک رسول (ﷺ) تشریف لائیں، آپ ﷺ تم سب کی تصدیق کریں گے تم اقرار کرو کہ تم آپ ﷺ پر ایمان لاؤ گے اور آپ ﷺ کی مدد کرو گے۔ سب انبیاء نے اللہ تعالیٰ سے اس بات کا پختہ عہد کیا۔ (آل عمران، ۸۱)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جس قدر انبیاء دنیا میں تشریف لائے وہ جناب رسالت مآب ﷺ کے بارے میں پیشگوئی کر کے آئندہ لوگوں کو تلقین کر گئے کہ آپ ﷺ جب تشریف لائیں تو ضرور مدد کرنا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آپ ﷺ کی تشریف آوری کی بشارت دی تھی اور آپ ﷺ کا اسم گرامی تک بتا دیا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''اور جب عیسیٰ بن مریم نے کہا، اے بنی اسرائیل! یقیناً میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں تورات کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اور جس کا نام احمد ہوگا۔''

(الصف، ۶۱:۶)

۵۔ قرآن وسنت کی بے مثال محفوظیت:

سابقہ رسولوں پر اتاری ہوئی صرف چند کتابیں آج موجود ہیں لیکن وہ بھی اس حال میں کہ ان میں کثرت سے تبدیلیاں اور اضافے کیے جا چکے ہیں۔ ان کا ہر ایڈیشن پہلے سے مختلف ہوتا ہے۔ ان کو ماننے والے بھی یہ یقین نہیں رکھتے کہ یہ اللہ کی اتاری ہوئی کتابیں ہیں۔ رسالت محمدی کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ آپ ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب قرآن مجید بالکل اس شکل میں موجود ہے جس میں یہ اتاری گئی تھی۔ اس میں زیر زبر تک کی تبدیلی نہیں ہو سکی۔ چونکہ یہ کتاب قیامت تک انسانوں کے لیے ہدایت ربانی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت بھی اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"یقیناً ہم نے ہی ذکر (یعنی قرآن حکیم) کو نازل کیا ہے اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

قرآن حکیم کے علاوہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی سنت بھی مکمل طور پر محفوظ ہے۔ پس دنیا بھر کے انسان پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ کی پیروی کر سکتے ہیں۔

۶۔ تحریف سے پاک کتاب اور دین:

حضور ﷺ کا پانچواں امتیاز یہ ہے کہ دین اسلام جو قرآن وسنت پر مبنی ہے۔ ہر قسم کی تحریف یعنی لفظی ومعنوی اور لسانی اور زبانی تحریف نے ان ادیان کا حلیہ بگاڑ دیا۔ قرآن مجید نے پہلی الہامی کتب میں تحریف کا تذکرہ متعدد مقامات پر کیا ہے اور خود ان کتب کے ماننے والے محققین نے بھی تحریف کا اقرار کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ لا وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ج

وہ کلام کو اس کے مواقع سے بدل دیتے ہیں اور جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی اس میں سے کچھ بھلا بیٹھتے ہیں۔

یہ امتیاز دین محمد کا ہے کہ قرآن مجید جو سرچشمہ ہدایت ہے۔ ہر قسم کی تحریف سے پاک ہے، کیونکہ اللہ نے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہے؛ تاکہ آخری کتاب ہونے کے سبب قیامت تک کے انسانوں کو ہدایت فراہم کرتی رہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ

بے شک ہم نے ذکر (قرآن مجید) کو نازل کیا اور ہم خود اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۷۔ مستند سیرت رسول:

اب اس خصوصیت کو دیکھیے جس میں رسول اللہ ﷺ تمام انبیاء اور پیشوایان مذاہب میں ممتاز و یکتا نظر آتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی لائی کتاب کی طرح آپ ﷺ کی سیرت بھی محفوظ ہے جس سے ہم زندگی کے ہر دور میں رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ بچپن سے لے کر آخری سانس تک جتنے لوگوں نے آپ ﷺ کو کسی چیز کا حکم دیتے ہوئے سنا یا کسی چیز سے منع کرتے ہوئے سنا جن کی ایک عظیم تعداد نے سب کچھ یاد رکھا اور بعد کی نسل تک اسے پہنچایا۔ بعض محققین کے نزدیک ان لوگوں کی تعداد نے سب کچھ یاد رکھا اور بعد کی نسل تک اسے پہنچایا۔ بعض محققین کے نزدیک ان لوگوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچتی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جو روایات بعد کی نسلوں تک پہنچی تھیں، ان کے بارے میں ابتداء ہی میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔

۸۔ الہامی کتب اور انبیاء کی بشارتوں کے مصدق:

آپ ﷺ کی بعثت کا انتظار تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء اور ان کی وساطت سے ان کی امتوں سے حضور ﷺ پر ایمان لانے اور نصرت کا وعدہ لیا تھا۔ ارشاد ربانی ہے:

> وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ (آل عمران 81)
>
> ''اور جب اللہ نے نبیوں سے عہد لیا کہ جو کچھ میں نے تمہیں کتاب اور حکمت سے دیا ہے، پھر تمہارے پاس وہ نبی آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا۔ اللہ نے کہا کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرے عہد کا بوجھ لیتے ہو؟ انہوں نے کہا ہم اقرار کرتے ہیں۔ پس گواہ رہو اور میں تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔

قرآن مجید نے سابقہ انبیاء اور الہامی کتب کی بعض بشارتوں کا ذکر کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت میں آنحضور ﷺ کا اسم گرامی بھی بیان ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

> وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِىْ مِنْۢ بَعْدِى اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ (الصف:6)
>
> ترجمہ: ''اور میں خوشخبری دینے والا ہوں، اس رسول کی جو میرے بعد آئیں گے۔ ان کا اسم گرامی احمد ہوگا۔''

۹۔ سیرت کی جامعیت وہمہ گیری:

حضور ﷺ کا ایک اور امتیاز آپ ﷺ کی سیرت کی جامعیت اور ہمہ گیری ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

> لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:21)
>
> یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔

حضور ﷺ کی حیات طیبہ سے ہر انسان کو زندگی کے ہر شعبے میں ہدایت و راہنمائی ملتی ہے۔ آپ ﷺ کا بچپن جوانی کی حالت میں تھا، ہر قسم کی بچگانہ آلائشوں سے پاک تھا جو نسل انسانی کے تمام بچوں کے لئے نمونہ عمل ہے۔ آپ ﷺ کی جوانی گرد و پیش کی تمام برائیوں سے محفوظ تھی جو ہر دور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کے جوانوں کے لئے بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔ اس دور میں صداقت و امانت کی بناء پر صادق و امین کہلائے۔ تجارت میں امانت و دیانت کے اصول کو اپنا کر قیامت تک کے مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے روشن مثالیں قائم کیں۔

دعوت حق میں مصائب و مشکلات کا ثابت قدمی سے مقابلہ کر کے آنے والی نسلوں کے لئے قابل تقلید نمونہ عمل پیش فرمایا۔ مدنی زندگی میں سربراہ مملکت کی حیثیت میں مختلف پہلوؤں سے وہ نمونہ پیش فرمایا جو قیامت تک کے انسانوں کے لیے رہنمائی کی حیثیت رکھتا ہے۔

آنحضور ﷺ کی ذات گرامی میں وہ تمام اخلاقی اوصاف موجود تھے جو انبیاء سابقین میں فرداً فرداً پائے جاتے تھے۔ انسانی ذہن میں جو خوبی آسکتی ہے، وہ آپ ﷺ کی ذات میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

مختصر یہ کہ مختلف طبقات انسانی کو اپنی ہدایت کے لئے جن نمونوں کی ضرورت ہو سکتی ہے، وہ سب محمد ﷺ کی مثالی زندگی میں موجود ہیں۔ یہ سب آپ ﷺ کا امتیاز ہے، جو دیگر انبیاء کو اس درجہ حاصل نہ تھا۔

۱۰۔ سراج منیر:

رسول اکرم ﷺ سراج منیر (روشن کرنے والا سورج) ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّآ أَرْسَلْنَـٰكَ شَـٰهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا O وَّدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا (الاحزاب:46-45)

۱۱۔ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کا درود:

حضور ﷺ کا بہت بڑا اعزاز و امتیاز یہ ہے کہ اللہ اور اس کے فرشتے آپ ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَـٰٓئِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ط يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (الاحزاب:56)

بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو تم بھی ان پر درود و سلام بھیجو۔

۱۲۔ صاحب خلق عظیم:

آپ ﷺ کی ایک اور خصوصیت آپ ﷺ کا صاحب خلق عظیم ہونا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (القلم:4)

بے شک آپ ﷺ خلق عظیم کے مالک ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے خود فرمایا: مجھے مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہے۔

تمام انبیاء میں کسی نہ کسی خلق اور خوبی کی خصوصیات موجود ہیں اور آپ ﷺ کی ذات پاک جملہ انبیاء کے تمام اخلاق کی جامع ہے۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ آپ ﷺ کے اخلاق میں جامعیت اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ذات مبارک میں حضرت نوح رحمۃ اللہ علیہ کی سرگرمی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نرم دلی، حضرت یوسف علیہ السلام کی سی درگزر، حضرت داؤد علیہ السلام کی سی فتوحات،

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حضرت ایوب علیہ السلام کا سا صبر، حضرت سلیمان علیہ السلام جیسی سطوت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسی خاکساری، حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سا زہد، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سی سبک روی بکمال طور پر تھی اور رحمۃ اللعالمینی کا نور تمام رنگوں سے بڑھ کر تھا۔

۱۳۔ عطیہ کوثر:

آپ ﷺ کو حوض کوثر عطا کی گئی ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (الکوثر:1)

ہم نے آپ (ﷺ) کو کوثر عطا کی۔ یہ خصوصیات کسی اور نبی کے لئے نہیں ہے۔ یہ فخر آپ ﷺ ہی کے لیے ہے۔

1- امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک لفظ ''کوثر'' دنیا اور آخرت کی تمام بھلائیوں کا جامع ہے۔

2- اس سے مراد ایسی نبوت کاملہ اور ریاست عامہ اور ہدایت جامعہ ہے جو پہلے کسی کو نہ دی گئی ہو۔

3- کوثر سے مراد وہ اخلاق حمیدہ ہیں جو صرف آپ ﷺ کی ذات بابرکات میں ہی پائے جاتے ہیں اور کسی کے پاس نہیں ہیں۔ آخرت کی نعمتوں میں حوض کوثر، نہر کوثر اور مقام محمود کا عطیہ ہے۔

۱۴۔ مقام محمود:

رسالت محمد ﷺ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز رسول اللہ ﷺ کو اپنے خاص فضل و کرم سے مقام محمود پر فائز فرمائیں گے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا

(اے نبی ﷺ) رات کو تہجد پڑھو۔ یہ تمہارے لئے نفل ہے، امید ہے کہ تمہارا رب تمہیں مقام محمود پر فائز کردے۔

۱۵۔ شفاعت عظمیٰ:

آنحضرت ﷺ کی ایک خصوصیت اور امتیاز شافع محشر ہونا ہے۔ روز قیامت جب جلال الٰہی کا آفتاب پوری تمازت پر ہوگا اور گناہگار انسانوں پر امن و سکون کا کوئی سایہ نہیں ہوگا اور وہ گھبراہٹ کے عالم میں تمام انبیاء کے پاس فرداً فرداً جائیں گے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے حساب کتاب کی استدعا فرمائیں تو تمام انبیا انکار کر دیں گے کہ آج ہمیں کلام کا یارا نہیں ہے۔ اس وقت فخر موجودات، باعث خلق کائنات، سید اولاد آدم اور امام الانبیا ﷺ ہاتھوں میں لوائے حمد اور سر پر تاج شفاعت عظمیٰ سجائے بنی نوع انسان کی دستگیری فرمائیں گے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ''میں سب سے پہلے شفیع ہوں گا جس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ قیامت کے دن میں امام الانبیاء اور بنی آدم کا نمائندہ بنوں گا، اس پر فخر نہیں اور روز محشر مجھے شفاعت عظمیٰ اور مقام محمود عطا کیا جائے گا اور اس پر فخر نہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آخرت

معنی ومفہوم:

آخرۃ (اردو میں آخرت) مؤنث ہے آخر کی اور یہ ضد ہے اولی کی۔ جیسے آخر کی ضد اول ہے۔ آخرۃ کا معنی ہے بعد میں آنے والی۔ ہماری اراضی زندگی کو قرآن حکیم میں الحیوۃ الدنیا کہا گیا ہے، یعنی قریب ترین زندگی یا صرف اَلْاُوْلٰی کہا گیا ہے۔ یعنی پہلی یا ابتدائی (زندگی) موت کے بعد کی زندگی کو آخرہ اور عقبی کہا گیا ہے۔ عقبی کا معنی ہے پیچھے آنے والی۔

اسلام کا تصور آخرت

اسلام میں آخرت کا نہایت واضح تصور دیا گیا ہے۔ قیامت برپا ہوگی، یہ ساری کائنات ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ مرے ہوئے تمام انسانوں کو دوبارہ زندگی دے کر اٹھایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے حضور سب کی پیشی ہوگی۔ دنیا میں کیے گئے اعمال کا حساب ہوگا، جس کی نیکیاں زیادہ ہوں گی وہ انعام پائے گا اور جس کے برے اعمال زیادہ ہوں گے وہ سزا پائے گا۔ اسلام کے تصور آخرت کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

۱۔ انسان کی اس ارضی یا دنیوی زندگی کا خاتمہ (موت سے) اس کی زندگی کا مکمل خاتمہ نہیں بلکہ یہ تو ایک زندگی سے دوسری زندگی میں تحویل وتبدیلی ہے۔ مرنے سے صرف انسان کا جسم فنا ہوتا ہے اس کی روح فنا نہیں ہوتی۔

۲۔ یہ دنیوی زندگی، بہت محدود مدت کی اور عارضی ہے جبکہ اخروی زندگی دائمی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ز وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ

ترجمہ: ''اے میری قوم یہ دنیا کی زندگی تو چندروزہ ہے، ہمیشہ کے قیام کی جگہ تو آخرت ہے۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ربانی ہے:

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ط وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ م لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (المؤمن،۴۰:۳۹)

ترجمہ: ''اور یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا۔ اصل زندگی تو دار آخرت ہے، کاش یہ لوگ علم رکھتے۔''

۳۔ دنیوی زندگی آخرت کی کھیتی ہے۔ (مزرع الاخرۃ) یہاں انسان جو کچھ بوئے گا اس کی فصل آخرت میں کاٹے گا۔ یعنی یہاں جو بھی عمل کرے گا اس کی جزا یا سزا آخرت میں ملے گی۔

۴۔ یقیناً آخرت اس دنیوی زندگی سے بہتر ہے۔ ''وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى'' ''اور یقیناً آخرت تیرے لیے اولیٰ بہتر ہے۔ (الضحیٰ ،۹۳:۴) ایک اور مقام پر دنیا کی زندگی کا آخرت کے ساتھ یوں موازنہ کیا ہے:

وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ط وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ (الرعد،۱۳:۲۶)

ترجمہ: ''یہ لوگ دنیوی زندگی پر خوش ہیں حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں ایک متاع قلیل کے سوا کچھ نہیں ہے۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

رسول کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگر دنیا کی اہمیت وقدر مچھر کے برابر بھی ہوتی تو کافر کو اس کی دنیا سے پانی کا ایک گھونٹ بھی میسر نہ آتا۔

۵۔ آخرت میں نجات اور کامیابی کا دارومدار صرف اور صرف ایمان اور عمل صالح پر ہے۔ اس کے سوا وہاں کوئی چیز کام نہ آئے گی۔ نسل، قربت داری، دولت، جاہ وحشمت وغیرہ کوئی چیز بھی کام نہ آئے گی۔

۶۔ انسان کے اعمال کو ترازو میں رکھ کر تولا جائے گا۔ ایک طرف نیکیاں اور ایک طرف برائیاں اگر نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوا تو انعام ملے گا اور اگر برائیوں کا پلڑا بھاری ہوا تو سزا ملے گی۔

۷۔ جو شخص انعام کا مستحق قرار پائے گا وہ جنت میں داخل ہوگا اور سزا کے حقدار کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

جنت اور جہنم:

جنت اخروی زندگی میں نیکوکاروں کا مقام ہے اور جہنم ان کا ٹھکانہ ہے جن کے برے اعمال نیکیوں کے مقابلے میں زیادہ ہوں گے۔ جنت کی زندگی دائمی ہے۔ جہنم کی زندگی کے بارے میں بزرگوں کی رائے یہ ہے کہ اہل ایمان اپنے گناہوں کی سزا پا کر آخر کار جہنم سے نجات حاصل کر کے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ کفار اور مشرکین ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ کیونکہ قرآن حکیم میں ان کی بابت متعدد مقامات پر یہی بتایا گیا ہے۔ (خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا. وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے)

جنت میں انسان کو وہ سب کچھ حاصل ہوگا جس کی اس کے دل میں خواہش پیدا ہوگی۔ ارشاد ربانی ہے: وَفِيْهَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ. ''اور اس جنت میں ہر چیز وہ ہوگی جس کی دل خواہش کریں گے اور جو آنکھوں کو لذت دینے والی ہوگی۔'' ایک اور جگہ ارشاد ہے: وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ، ''اور تمہارے لیے جنت میں وہ سب کچھ ہوگا جس کی تمہارے دل خواہش کریں گے اور تمہارے لیے اس میں وہ کچھ ہوگا جس کی تم تمنا کرو گے۔'' (حم السجدہ، ۴۱:۳۱) قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر بڑے دلکش انداز میں جنت کا نقشہ کھینچا ہوا ہے۔ گھنے باغات، ان کے نیچے بہتی نہریں، پانی کی اور شہد کی نہریں، معتدل موسم، ہر قسم کے میوے، پھل، چاندی کے برتن، شیشے کے جام، حوریں اور غلمان یہ سب چیزیں وہاں موجود ہوں گی۔ احادیث مبارکہ میں آیا ہے کہ جنتیوں کو سب سے بڑا انعام یہ ملے گا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا۔

قرآن حکیم میں جہنم کی ہولناکیوں کو بھی جا بجا بیان کیا گیا ہے۔ جہنم کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ جہنم کی بھڑکائی ہوئی آگ بدن کو چھوتی ہوئی دل تک پہنچے گی۔ جہنم کی آگ میں وہ نہ جئیں گے اور نہ مریں گے۔ وہ آگ کھال کو ادھیڑ دینے اور کبھی نہ بجھنے والی ہے۔ جہنم میں لوگوں کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا جو آنتوں کو کاٹ دے گا۔ اور کھانے کو خاردار جھاڑ کے سوا کچھ نہ ملے گا۔

عقیدۂ آخرت پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے:

کسی مسلمان کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اسلام کے پانچویں اصول آخرت پر یقین نہ رکھتا ہو۔ اسلام میں قیامت یا آخرت کے عقیدے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے تمام تر اعمال کے اچھے اور بُرے ہونے کا دارومدار اسی عقیدے پر ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

> ''وہ لوگ یقیناً خسارے میں رہیں گے جو (بروز قیامت) خدا کے سامنے حاضر ہونے کے منکر ہیں اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور قیامت کا انکار کیا ان کے تمام اعمال ضائع ہو گئے۔''

مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق آخر یہ کائنات فنا ہو جائے گی پھر حکم خداوندی سے مردے زندہ ہو کر بارگاہ الٰہی میں پیش ہوں گے اور ان

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کے اعمال کے مطابق سزا و جزا کا فیصلہ ہوگا اس کے برعکس مشرکین کا کہنا ہے کہ ان کے اعمال خواہ کچھ بھی ہوں اگر قیامت آگئی تو ان کے دیوی دیوتا ان کو چھڑا لیں گے۔ اسی روز ان کی یہ غلطی بھی دور ہو جائے گی کہ ان کا دیوی دیوتاؤں پر اعتماد سراسر جھوٹا تھا۔ وہاں تو ہر ایک کو وہی کچھ ملے گا جو اس نے خود کیا تھا۔ قرآن حکیم کی متعدد آیات میں آخرت کا ذکر آیا ہے۔

سورہ القیامہ آیت 8 اور 9 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اور چاند بے نور ہو جائے گا اور چاند اور سورج ملا کر ایک کر دیئے جائیں گے۔

سورہ الانشقاق آیت 3 میں اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ہیں:

''اور جب زمین پھیلا دی جائے گی اور جو کچھ اس کے اندر ہے اسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی یعنی نظام کائنات میں کشش ثقل کے خاتمے سے زمین کا وزن ہلکا ہو جائے گا اور دیگر تبدیلیوں کے باعث وہ پھیل جائے گی۔''

سورہ انفطار آیت 1 اور 2 میں ہے:

''جب آسمان پھٹ جائے گا اور تارے گر پڑیں گے۔''

ایک اور سورہ میں قیامت کے رونما ہونے کی شہادت ان الفاظ میں دی گئی ہے:

''جب زمین کی دھجیاں اڑ جائیں گی اور چاند گہنا جائے گا اور سورج چاند اکٹھے کیے جائیں گے۔''

عقیدۂ آخرت کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمان کی عملی زندگی کا بنیادی محرک یہی عقیدہ ہے۔ کیونکہ اسلام انسان کی اُخروی زندگی کو حقیقی زندگی اور اس کی کامیابی کو حقیقی کامیابی سمجھتا ہے۔

یوم آخرت پر ہی ہر انسان کے ہاتھ میں وہ فہرست تھما دی جائے گی جس میں اس کے اچھے اور برے اعمال درج ہوں گے۔

یوم آخرت کی ضرورت کیوں پڑی:

یعنی یوم آخرت کی ضرورت اس لیے بھی محسوس کی گئی کہ بعض انسانوں کے جرائم اور بعض کی نیکیاں تعداد اور نوعیت کے لحاظ سے ایسی ہوتی ہیں کہ اس کی مختصر مدت حیات میں ان کا پورا بدلہ ہی نہیں دیا جا سکتا۔ فرعون، ہلاکو خان اور ہٹلر جیسے لوگوں کو جنہوں نے لاکھوں افراد کو ہلاک و برباد کیا دنیا کا سکون لوٹا اور ان کے جرائم کے مساوی کوئی سزا ان کو مختصر مدت میں نہیں دی جا سکتی تھی اور کیا انسانیت کی فلاح کے لیے پیغمبر علیہم السلام نے جو مشقتیں کیں اور جن کی کوششوں سے لاتعداد افراد ضلالت و گمراہی سے نکل کر صراط المستقیم پر آئے ان محنتوں کا پورا پورا صلہ اس دنیا کی محدود زندگی میں ممکن تھا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ ایسے افراد کے اعمال کا پورا صلہ تو ایک ایسے ہی جہاں میں دیا جا سکتا تھا جو قید وقت سے آزاد ہو لہٰذا قیامت اسی ضرورت کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

یوم آخرت کو اللہ تعالیٰ انسانوں سے پوچھیں گے کہ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ (سورہ مومن آیت 16) یعنی (بولو) آج کے روز کس کی بادشاہت ہے۔ اس سے محض یہ جتلانا ہی مقصود ہوگا کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں جاہ و جلال، مال و دولت، اولاد اور اچھی صحت دی تو اس وقت تو اے انسان تو نے اللہ کے احکامات کی ذرہ بھر بھی پروانہ کی اور حقوق العباد کا ذرہ بھر بھی دھیان نہ رکھا اور تم ہماری گرفت سے بالکل بے پرواہ تھے اور تجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ ایک نہ ایک دن تم نے ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے آج تمہیں ہمارے عذاب سے کون بچا سکے گا اور جب قہر خداوندی کے خوف سے سب کی زبانیں گنگ ہو جائیں گی اور کوئی جواب نہیں ملے گا تو جواب نہ ملنے پر اللہ تعالیٰ خود ہی ارشاد فرمائیں گے: لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ یعنی (آج کے دن بادشاہت) تو اسی خدائے واحد کی ہے جس کے قبضے سے کوئی چیز باہر نہیں (سورہ مومن آیت 16) آخرت کے روز کسی انسان کی چرب زبانی، چالاکی، غلط بیانی، سخن سازی اور چاپلوسی اس کے کسی کام نہ آئے گی کیونکہ اس روز زبانوں پر مہر لگی ہوگی اور ہاتھ اور پاؤں گواہی دیں گے۔ لہٰذا ہر شخص کو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اُخروی زندگی کو دنیوی زندگی پر ترجیح دینی چاہیے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا دنیا کی زندگی عارضی ہے اور آخرت کی زندگی نہ ختم ہونے والی اس لیے آخرت کو زیادہ ترجیح دیں۔ لیکن بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت نے دنیوی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھ رکھا ہے اور انہیں آخرت کی کوئی فکر نہیں۔

عیسائی عقیدۂ آخرت پر یقین رکھتے ہیں لیکن ہندوؤں کا کہنا ہے کہ انسان موت کے بعد بالکل ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی روح ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہو جاتی ہے اس عقیدے کو آواگون کہتے ہیں۔

الغرض کہ دنیا کو آخرت پر قربان کر دینے کی روش انسان کو قربانی اور ایثار کا ایسا پیکر بنا دے گا جو اپنے معاشرے کے لیے بہت بڑی نعمت ہو گی اور جس معاشرے کے تمام افراد یہ روش اختیار کر لیں گے وہ معاشرہ صحیح معنوں میں اسلامی معاشرہ ہو گا جس میں کسی کو نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ ہی حزن۔

ترجمہ: ''اور اللہ نے تمہیں زمین سے عجب طرح اگایا ہے۔ پھر وہ تمہیں اس میں لوٹا دے گا
اور تمہیں ایک (نئی) پیدائش میں نکال کھڑا کرے گا۔'' (سورہ نوح 17-18)

بعض مفسرین نے آخرت کو دارالآخرت یعنی (آخری گھر) بھی کہا ہے۔ جو موجودہ گھر یعنی دنیا کی ضد ہے نیز اسے دارالبقاء اور دارالقضا کے نام بھی دیئے گئے ہیں۔

آخرت کو نہ ماننے کے نتائج:

1- غیر ذمہ دارانہ رویہ:

جو شخص عقیدۂ آخرت کا منکر ہے اس میں غیر ذمہ داری کا عنصر نمایاں ہو جاتا ہے کیونکہ وہ یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ دنیاوی زندگی کے بعد کوئی اور زندگی نہیں اس لیے وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں لاپرواہی اور بے اعتنائی برتنے لگتا ہے۔ دوسرے انسانوں کو حرص و ہوس، بداخلاقی اور ظلم و ستم کا نشانہ بنانے کے علاوہ وہ حلال و حرام اور نیکی اور بدی میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا۔ غیر ذمہ دارانہ رویہ اپنانے کی وجہ سے انسان نہ صرف دنیا میں ذلیل و خوار ہوتا ہے بلکہ اس کی اُخروی زندگی بھی جہنم بن جاتی ہے۔

2- تنگ نظری:

عقیدۂ آخرت پر یقین نہ رکھنے والا شخص ہمیشہ تنگ نظر اور متعصب ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے دل میں کسی شخص کے لیے ہمدردی، محبت اور شفقت کے جذبات معدوم ہو جاتے ہیں اور جب اس قسم کی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے تو وہ ہر شخص کو تعصب کی عینک سے دیکھتا ہے اور مخلوق خدا کی خدمت کرنے کی بجائے خود غرضی، لالچ، بخل، بغض و عناد، بداخلاقی اور ہوس کو اپنا ذاتی حق خیال کرتا ہے۔

3- دنیا کی محبت:

جو شخص عقیدۂ آخرت پر یقین نہیں رکھتا اس کا مقصد و مطلوب دنیاوی زندگی بن جاتی ہے اور اخروی زندگی بے معنی سی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے وہ اپنی ساری تگ و دو، دنیاوی زندگی کی آسائشوں کے حصول کے لیے کرتا ہے اور جھوٹی شان و شوکت بنانے کے لیے جائز و ناجائز ہر قسم کے ذرائع اختیار کرتا ہے۔ رشوت، چور بازاری، ناجائز منافع خوری اور ذخیرہ اندوزی اس کے نزدیک جرم نہیں ہیں لیکن وہ یہ کام اکیلا نہیں کرتا بلکہ اپنے دیگر ساتھیوں کو ایسا کرنے کی ترغیب دیتا ہے تاکہ وہ خود کو تنہا محسوس نہ کرے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

4- رسالت کا تصور بے معنی:

عقیدۂ آخرت پر یقین نہ کرنے والے کو رسالت کا تصور بھی بے معنی سا لگتا ہے کیونکہ رسالت ہی کے ذریعے لوگوں کو ہدایت اور راہنمائی ملی اور تعلق باللہ قائم کرنے کا موقع میسر آیا۔ اگر نیکی کی جزا اور برائی کی سزا نہ ہو تو پھر رسولوں اور نبیوں کی ضرورت نہیں پڑتی حالانکہ ہر نبی نے اپنی امت کو جنت میں جانے کی خوشخبری سنائی اور اس کے ساتھ ساتھ دوزخ کے عذاب سے بھی ڈرایا۔

5- سرکشی اور نافرمانی:

جو شخص عقیدۂ آخرت پر یقین نہیں رکھتا وہ دنیا والوں سے بھی محبت نہیں کرتا اسے نہ تو محاسبے کا خوف ہوتا ہے اس لیے کہ اس کے خیال کے مطابق یوم آخرت نہیں آئے گا اس طرح وہ شخص سرکشی اور نافرمانی کو ہی اپنے لیے بہتر خیال کرتا ہے۔

6- اعمال کا ضائع ہو جانا:

اللہ تعالیٰ عقیدۂ آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کی عبادت و ریاضت ضائع کر دیتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ریا کو پسند نہیں کرتا اور اسے تو صرف وہی اعمال پسند آئیں گے جو اس کی رضا اور اخروی مقصد کے تحت کیے جائیں۔

عقیدۂ آخرت کی اہمیت:

اگر چہ سب سے اہم اور بنیادی عقیدہ توحید ہی ہے لیکن اگر آخرت کا عقیدہ نہ ہو تو نیک کام کرنے پر انعام کی امید اور برے کام کرنے پر سزا کا خوف نہ ہو تو پھر انسان کو کسی چیز پر ایمان لانے یا نیکی کرنے کی کیا ضرورت باقی رہ جائے گی۔ ایسے اعلیٰ طبیعت کے انسان تو بہت کم ہوتے ہیں جو خود نیکی Virtue کو ہی اس کا اجر سمجھ کر نیکی برائے نیکی کریں یا حقائق اور صداقتوں کو صرف اس لیے مان لیں کہ وہ بس حقائق اور صداقتیں ہیں۔ اس لیے ان کو ماننا ہی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں عقیدۂ آخرت (ایمان بالآخرۃ) کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

ا۔ توحید اور آخرت کا یکجا ذکر:

اسلام کے بنیادی عقائد تو پانچ ہیں لیکن قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر صرف ان دو عقائد یعنی توحید اور آخرت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان دو عقائد کو کس طرح اہمیت دی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: "بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے (نبی کریم ﷺ پر) اور یہودی، عیسائی اور صابی (ان میں سے) جو بھی اللہ پر اور آخرت پر ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور انہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ رنج۔" (البقرۃ ۲:۶۲)

یہی مضمون سورہ المائدہ (۵:۶۹) میں بھی بیان ہوا ہے۔

۲۔ آخرت پر دلائل:

قرآن حکیم میں جہاں آخرت پر ایمان لانے پر اتنا زور دیا گیا ہے وہاں اس کے ساتھ ساتھ آخرت کو حق ثابت کرنے کے لیے دل کو اپیل کرنے والے دلائل بھی دیے گئے ہیں اور منکرین آخرت کی باتوں کی تعدید بھی کی گئی ہے۔ اس سے بھی اس کی اہمیت کا پتا چلتا ہے۔ مثال کے طور پر چند آیات کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔

ا۔ "کیا تم نے یہ خیال کر لیا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں؟" (المومنون ۲۳:۱۱۵)

۲۔ وہی ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے۔ پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اس کے لیے آسان تر ہے۔" (الروم ۳۰:۲۷)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۳۔ انسان کہتا ہے کہ کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں۔ کہہ دیجئے کہ ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو اول بار پیدا کیا تھا اور وہ تخلیق کے ہر کام کو خوب جانتا ہے۔" (یسین ۳۶: ۷۸، ۷۹)

۳۔ جنت و جہنم کا تفصیلی بیان:

قرآن حکیم میں جا بجا جنت و جہنم کے نقشے کھینچے گئے ہیں تاکہ لوگوں کا آخرت پر ایمان مضبوط ہو۔ اس سے بھی آخرت کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔

۴۔ منکر آخرت کے سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے:

کوئی شخص کتنا ہی نیکوکار ہو اگر وہ آخرت پر یقین نہیں رکھتا تو اس کے سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور آخرت میں اسے ان کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ط

ترجمہ: "اور جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کو اور آخرت کی پیشی کو جھٹلایا ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے۔"

ایک اور مقام پر ارشاد ربانی ہے:

ترجمہ: "یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی نشانیوں اور اس کے حضور پیشی کو ماننے سے انکار کیا، لہٰذا ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے، قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے۔" (الکہف، ۱۸: ۱۰۵)

۵۔ دردناک عذاب:

جو شخص آخرت پر ایمان نہ رکھے اسے دردناک عذاب کی سزا ملے گی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا

(بنی اسرائیل، ۱۷: ۱۰)

ترجمہ: "اور قرآن یہ خبر دیتا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

انسانی زندگی پر عقیدہ آخرت کے اثرات

عقیدۂ آخرت کے انسانی زندگی پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں جن میں سے چند اہم اثرات درج ذیل ہیں:

۱۔ زندگی کی مقصدیت پر یقین:

عقیدۂ آخرت کا سب سے بڑا اور اہم فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی دنیوی زندگی کو با مقصد سمجھنے لگتا ہے۔ وگرنہ اسے یہ زندگی بالکل عبث اور بے مقصد معلوم ہو۔ اگر اخروی زندگی نہ ہو تو پھر یہ دنیوی زندگی، یعنی پیدا ہونا، جوان ہونا، کھانا پینا، مصائب برداشت کرنا اور پھر مر جانا۔ یہ بالکل واہیات اور فضول (Absurd) سا عمل محسوس ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگر کوئی زندگی بسر کرے گا بھی تو محض فطرت کے جبر کے تحت، جیسے حیوان اور دوسرے جاندار زندگی بسر کرتے ہیں لیکن سخت اذیت کے ساتھ، کیونکہ دوسرے حیوانات کے برعکس انسان ایک ذی شعور جاندار مخلوق ہے۔

۲۔ احساس ذمہ داری:

آخرت پر یقین رکھنے سے انسان میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اسے معلوم ہوگا کہ وہ اپنے اعمال کے لیے اپنے خالق و مالک کے سامنے جوابدہ ہے۔

۳۔ نیکی سے رغبت اور برائی سے اجتناب:

یہ امر واقع ہے کہ بیشتر لوگوں کے لیے برائی میں کشش ہوتی ہے اور نیکی کا کام ان کے لیے گراں ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ انسان کو اللہ نے بری فطرت پر پیدا نہیں کیا۔ پھر بھی مذکورہ امر واقع اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔ عقیدۂ آخرت کے سوا کوئی اور ایسی چیز نہیں جو انسان کو مؤثر طریقے سے نیکی کی طرف رغبت دلائے اور برائی سے اس کو باز رکھے۔ یہ صحیح ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ زیادتی کرنے سے اس لیے بھی باز رہتا ہے کہ جواباً اس کے ساتھ زیادتی ہو جائے گی۔ اگر اس کا ستم رسیدہ اس قابل نہ ہو کہ انتقام لے سکے تو اتنا تو ہوگا کہ معاشرے میں زیادتی کرنے کے رجحان کو فروغ ملے گا جس کے نتیجے میں کوئی طاقتور اس کے ساتھ زیادتی کرے گا۔ اس سوچ کے نتیجے میں بننے والے قوانین کے سہارے چلنے والے معاشرے بھی دنیا میں آج موجود ہیں اور خاصے اچھے بھی ہیں لیکن قوانین کے ہمیشہ چور دروازے (Loop Holes) بھی ہوتے ہیں لہٰذا جب بھی قانون کی گرفت میں نہ آسکنے کا یقین ہوگا۔ برائی کا ارتکاب ہوگا۔ اس لیے نیکی کی رغبت اور برائی سے نفرت پیدا کرنے میں قوانین اتنے مؤثر نہیں ہیں جتنا عقیدۂ آخرت مؤثر ہے۔ یہ اللہ کے حضور میں پیش ہو کر جوابدہی کا عقیدہ ہے اور اللہ سے انسان کا کوئی عمل پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ پھر نیک عمل کی جزا کا لالچ اور بدی کی سزا کا خوف بھی ہوگا۔

۴۔ حوصلہ وہمت:

عقیدۂ آخرت انسان میں یہ حوصلہ وہمت پیدا کرتا ہے کہ وہ اچھے کام کرتا چلا جائے خواہ دنیا میں ان اعمال صالحہ کا اسے کوئی اجر ملے یا نہ ملے۔ بعض اوقات حالات ایسے بھی بن جاتے ہیں کہ معاشرے میں اعمال صالحہ مثلاً دیانت داری، ایثار، ہمدردی، خدمت خلق وغیرہ کی نہ صرف یہ کہ قدر نہیں ہوتی بلکہ ایسا کرنے والوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ ان کے لیے اس معاشرے میں زندگی بسر کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں عقیدۂ آخرت انسان کو حوصلہ وہمت عطا کرتا ہے۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ اس کے کیے ہوئے اعمال صالحہ رائیگاں نہیں جائیں گے۔ آخرت میں اسے ان کا پورا پورا اجر مل جائے گا اور اصل زندگی تو آخرت کی ہی ہے۔

۵۔ صبر و تحمل:

زندگی پھولوں کی سیج نہیں، یہاں کانٹے بھی ہیں۔ خوشحالی اور تنگدستی، پیدائش اور موت، صحت اور بیماری، رفاقت اور فراق، اعضاء کی سلامتی اور معذوری بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ انسان پر زندگی کے کسی مرحلے پر ایسے مصائب بھی ٹوٹتے ہیں کہ زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ ایسے حالات میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

عقیدۂ آخرت انسان کو صبر وتحمل عطا کرتا ہے کہ حقیقی اور دائمی زندگی تو آخرت کی ہے۔ یہ مصائب تو اس کی آزمائش کے لیے ہے۔ اگر وہ صبر وتحمل سے ان کو برداشت کرلے گا تو اسے آخرت میں اس کا اجر ملے گا۔

۶۔ جرأت وشجاعت:

آخرت پر ایمان سے انسان کے اندر یہ یقین پیدا ہوجاتا ہے کہ اخروی زندگی اس دنیوی زندگی سے بہتر ہے۔ یہ عارضی ہے وہ دائمی ہے۔ اس لیے اس عارضی اور گھٹیا زندگی کی قیمت پر بھی اگر اس کی عقبیٰ سنور جائے تو یقیناً یہ سودا منافع کا ہے گھاٹے کا نہیں۔ اس لیے وہ اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ اس سے اس کے اندر بے مثال جرأت اور شجاعت کا وصف پیدا ہوتا ہے اور اگر یہ عقیدہ ہو کہ صرف یہی زندگی ہے اور اس کے بعد مکمل فنا ہے تو انسان اپنی جان سے بے حد پیار کی وجہ سے بزدل بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام کے صفحات، شجاعت اور سرفروشی کے واقعات سے بھرے ہوئے ملتے ہیں۔

۷۔ دیگر اوصاف حمیدہ:

عقیدۂ آخرت سے صرف حوصلہ وہمت، صبر وتحمل اور جرأت وشجاعت کے اوصاف ہی پیدا Develop نہیں ہوتے بلکہ دیگر تمام اوصاف حمیدہ اور اخلاق حسنہ بھی پیدا ہوتے ہیں جن کی اسلام نے تعلیم دی ہے مثلاً ایثار، اخلاص، رحم، محبت، رواداری، سخاوت، حلم اور بردباری، تقویٰ اور پرہیزگاری، تواضع اور انکسار وغیرہ۔ اس طرح انسان اعلیٰ اوصاف سے متصف ہو کر انسانیت کے اعلیٰ وارفع درجے پر فائز ہوجاتا ہے۔

۸۔ محرک عمل نہ کہ افیون:

یہ بات اچھی طرح واضح ہوجانی چاہیے کہ اسلام نے آخرت کا جو تصور دیا ہے وہ انسان کے اندر عمل اور جدوجہد کی تحریک پیدا کرتا ہے نہ یہ کہ افیون بن کر اسے سلا دے۔ وہ ظلم واستحصال کو سہنے کی نہیں، اس کے خلاف لڑنے کی تعلیم دیتا ہے۔ دنیا کو حقیر جان کر محرومیوں پر راضی ہوجانا نہیں سکھاتا، بلکہ دنیا میں بھرپور زندگی بسر کرنے اور اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے پر ابھارتا ہے۔ غفلت کی نیند سونے اور مردہ دل بننے کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ چاق وچوبند اور ہوشیار اور سرگرم عمل رہنے کی امنگ پیدا کرتا ہے۔ دنیوی زندگی آخرت کی کھیتی ہے۔ یہاں اعمال صالحہ کے بیج اگر نہیں بوئیں گے تو آخرت میں پھل کس چیز کا پائیں گے؟ اور اعمال صالحہ سے مراد گوشہ نشین ہو کر عبادت میں مصروف رہنا نہیں، رہبانیت تو اسلام میں حرام ہے۔ پیغمبر اسلام کی حیات طیبہ ہی اسوۂ حسنہ ہے اور آپ ﷺ نے ساری زندگی لوگوں کے درمیان بسر کی ہے (سوائے غار حرا میں کچھ عرصہ غور وفکر کرنے کے لئے)۔ آپ ﷺ تو سراپا عمل تھے۔ آپ ﷺ نے بھرپور زندگی بسر کی۔ ساری زندگی بدی کے خلاف جہاد کیا۔ لہٰذا ظلم واستحصال، حقوق کے غصب کو برداشت کرنا اور بدی کو فروغ پانے کی اجازت دینا یا تماشائی بن کر اس کے فروغ کو دیکھنا قطعاً نیکی نہیں، بلکہ اپنے اور دوسروں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنا اور بدی اور ظلم واستحصال کے خلاف لڑنا نیکی ہے۔

اسلامی عبادات کے روحانی، سماجی اور اخلاقی اثرات

اسلامی طریقہ عبادت دنیا کا واحد طریقہ عبادت ہے کہ جس کو اپنا کر ایک مسلمان کی رح کو تسکین ملتی ہے اور اس کا اوڑھنا اور بچھونا سب اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے حصول کے لیے ہوتا ہے۔

اسلامی عبادات ہی ایک شخصیت کی تعمیر سیرت میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ محض رسم کا کوئی جامد مجموعہ نہیں بلکہ ادائیگی کیا عتبار سے اس کی دو قسمیں ہیں:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

1- عبادات کو خشوع و خضوع سے ادا کرنا جیسا کہ سورہ المومنون کی آیت 2 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝

ترجمہ: ''وہ (مومن) جو اپنی نمازوں میں عاجزی اختیار کرتے ہیں۔''

سورہ الزمر آیت 23 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَ قُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ

ترجمہ: ''جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں ان کے جسموں کے رونگٹے اس کے پڑھنے سے کھڑے ہو جاتے ہیں پھر ان کے چمڑے اور دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف جھک جاتے ہیں۔''

2- دوسری قسم یہ ہے کہ عبادات کو جسم کی سطح پر ادا کیا جائے نہ کہ محض فکری سطح پر نیز ریاکاری شامل نہ ہو۔ اصل عبادت تو یہ ہے کہ ایک مسلمان کی زبان اور جسم کے اعضاء بھی پوری طرح حرکت میں ہوں۔

سورہ الرعد آیت 28 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ؕ

ترجمہ: ''جو ایمان لائے ہیں اور ان کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہوں ان کو ہدایت دیتا ہے پس سمجھ لو کہ اللہ کی یاد ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں۔''

اس کا مفہوم یہ ہے کہ عبادت خشوع و خضوع کے ساتھ کی جائے جس میں ریاکاری اور نمائش کا عنصر شامل نہ ہو۔

اسلام میں عبادت کا مقصد یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے آگے اپنی عاجزی کا اظہار کرے اور اس کے احکام کی بجا آوری کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرے۔ سورۂ حج آیت 77 میں ہے:

وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ

ترجمہ: ''اور اپنے رب کی عبادت کرو۔''

اللہ تعالیٰ قرآن پاک کی سورہ الشوریٰ آیت 13 میں فرماتے ہیں:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے دین کا وہی راستہ مقرر کیا جس کا حکم دیا اس نے نوح علیہ السلام کو اور جو وحی کیا ہم نے آپ ﷺ کی طرف اور جس کا حکم دیا ہم نے ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو کہ قائم رکھو اس دین کو اور آپس میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اختلاف نہ کرو، مشرکین پر وہ بات گراں گزری ہے جس کی طرف آپ ﷺ ان کو بلاتے ہیں۔ اللہ جسے چاہے اپنی طرف چن لیتا ہے اور اس کو راہ دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔''

قرآن حکیم کی اس واضح ہدایت کی روشنی میں حضور ﷺ نے فرمایا:

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے، یعنی اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ﷺ ہیں، نماز قائم کرنا، زکوۃ دینا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔''

مذکورہ صدر آیت قرآنی اور حدیث نبوی ﷺ سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر رکھی گئی ہے۔ لہٰذا اگر اس میں سے کوئی بھی ستون مکمل نہ ہو تو عمارت مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ان کی ادائیگی ضروری ہے۔

اسلام کے یہی وہ اصول خمسہ ہیں جن میں ترقی و تقدم کے وہ تمام اصول بند ہیں جن کی پابندی سے مسلمان زندہ رہ سکتے ہیں اور ترقی کر سکتے ہیں۔ ان عبادات اسلامی کا مقصد اگرچہ اللہ کے ساتھ تعلق قائم کرنا اور زاد آخرت جمع کرنا ہے اور دنیاوی وجاہت، ثروت ان کا مقصود نہیں۔ چونکہ وہ ساتھ کے ساتھ جسم کی مادی ضرورتیں بھی پوری کرتے ہیں۔ اس لیے ان فرائض خمسہ اسلامیہ کی پابندی سے مسلمان وہ تمام انفرادی و اجتماعی اور سیاسی و معاشی خوبیاں حاصل کر سکتے ہیں جن کی آج ان کو ضرورت ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ارکان اسلام

عن عبدالله بن عمر رضی الله عنهما قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم بنی الاسلام علی خمس شهادة أن لا اله الا الله وأن محمدا عبده ورسوله وإقام الصلوة وإيتاء الزكوة وحج البيت وصوم رمضان.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہا، فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: اسلام کی بنیاد پانچ (ارکان) پر رکھی گئی ہے، اس گواہی پر کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں اور نماز قائم کرنے اور زکوۃ دینے اور بیت اللہ کا حج کرنے اور رمضان کے روزے رکھنے پر (متفق علیہ)

اس حدیث میں اسلام کو ایک عمارت سے تشبیہ دے کر فرمایا کہ اس عمارت کی بنیاد پانچ ارکان یا ستونوں پر رکھی گئی ہے۔ مراد یہ ہے کہ:

(۱) جن پانچ چیزوں کا ذکر فرمایا گیا ہے دین اسلام میں ان کی اہمیت ایسی ہے کہ جیسے کسی عمارت کے لیے اس کے ان ستونوں کی ہوتی ہے جن پر وہ قائم ہوتی ہے، اگر وہ ستون ڈھا دیے جائیں تو ساری عمارت دھڑام سے نیچے آ گرے گی اور ملبے کا ڈھیر بن جائے گی۔ کسی ایک ستون کو بھی گرا دیا جائے تو عمارت قائم نہ رہ سکے گی۔ اسی طرح جو شخص ان پانچ ارکان اسلام میں سے کسی ایک رکن کو بھی ترک کر دے گا تو اس کا دین سلامت نہ رہے گا یعنی وہ مسلمان نہ ہوگا۔

(۲) عمارت میں ستونوں کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں اگر وہ بہت سی چیزیں نہ ہوں تو خالی ستون ہوں گے اور انہیں عمارت نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح ارکان اسلام کے علاوہ اور بہت سے دینی احکام و تعلیمات ہیں، مثلاً حلال و حرام کے بارے احکام ہیں، ان پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔

حدیث میں جن پانچ ارکان اسلام کا ذکر فرمایا گیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ توحید و رسالت کی گواہی:

اس سے مراد یہ ہے کہ اس امر کی دل تصدیق کرے اور زبان سے اس کا اقرار و اظہار کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اپنی ذات و صفات میں وحدہ لاشریک لہ ہے، وہ تمام کائنات کا خالق، مالک اور مدبر ہے، قادر مطلق ہے اور اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔ مسلمان پر لازم ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کرے اور صرف اسی سے مدد مانگے اور اسی پر بھروسہ رکھے۔ کوئی مخلوق اس لائق نہیں کہ انسان اس کی پوجا کرے یا اس سے مدد مانگے۔ اسے عقیدۂ توحید کہتے ہیں، اس پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔ دوسری گواہی اس امر کی ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام اللہ کے بندے اور رسول ﷺ ہیں۔ حضور ﷺ کی رسالت پر ایمان لانے سے مراد ہے:

(۱) آپ ﷺ کے ذریعے جو ہمیں دین اسلام ملا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

(۲) آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں، آپ ﷺ سے محبت اللہ کی محبت کا ذریعہ ہے، آپ ﷺ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔

گواہی ایسی چیز کی دی جاتی ہے جس کو آنکھوں سے دیکھا ہو یا جس کا علم دوسرے حواس کے ذریعے حاصل کیا ہو یعنی جس کا یقینی اور ناقابل تردید علم حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ لطیف ہے، اسے ہماری آنکھیں نہیں پا سکتیں (لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ) لیکن اس کے وجود کا ادراک ہر انسان کے دل میں موجود ہے اور مظاہر فطرت اس کے وجود کا پتا دیتے ہیں اس لیے ایک سلیم الفطرت اور قلب سلیم رکھنے والے شخص کو وجود باری تعالیٰ پر اتنا پختہ یقین ہوتا ہے جیسا کسی آنکھوں دیکھی چیز کے وجود پر ہوتا ہے۔ کلمۂ شہادت، اشهد أن لا اله الا الله واشهد ان محمدا عبده ورسوله" میں گواہی دینا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں'' یا کلمہ طیبہ، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھنے والے شخص کا دل وجود باری تعالیٰ اور حضور ﷺ کی رسالت پر پختگی کے ساتھ جما ہوا ہونا چاہیے۔ توحید و رسالت کو حضور ﷺ نے اسلام کے ارکان خمسہ میں پہلا رکن شمار کیا ہے۔ یہ اہم ترین رکن ہے اس گواہی کے بعد ہی کوئی شخص اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ اگر زبان سے اس گواہی کا اظہار اور دل سے اس کی تصدیق نہ ہو تو باقی چار ارکان پر عمل بالکل بے معنی و بے وقعت ہے۔ جو شخص توحید و رسالت کی یہ گواہی دے دے اسے وہ تمام حقوق حاصل ہو جائیں گے جو ملت اسلامیہ کے باقی تمام افراد کو ہوں گے اور اس پر وہ سب فرائض عائد ہوں گے جو دیگر افراد ملت پر ہیں۔

۲۔ صلوٰۃ (نماز):

قرآن مجید صلوٰۃ قائم کرنے کا حکم اور ذکر سینکڑوں مقامات پر آیا ہے۔ یہ ایسی عبادت ہے کہ جس کے ذریعے دن میں پانچ مرتبہ مسلمانوں کا اپنے رب سے تعلق قائم ہوتا ہے۔ نماز قائم کرنے سے مراد ہے اسے پانچوں بار وقت کی پابندی کے ساتھ باجماعت اور خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کیا جائے۔ حضور قلب اور دھیان بہت ضروری ہے۔ نماز پڑھتے وقت یہ کیفیت ہو تو احسن ہے کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں ورنہ کم از کم یہ احساس ہونا چاہیے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ نماز میں انسان اللہ تعالیٰ سے چپکے چپکے باتیں کرتا ہے (مناجات)۔ اس سے انسان کے دل کو سکون، قرار، حوصلہ، ڈھارس اور تقویت ملتی ہے اور روح کو لطافت اور بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ ''بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔'' نماز کے بہت سے معاشرتی فوائد بھی ہیں، لوگوں کا پانچ وقت ایک دوسرے سے میل جول ہوتا ہے، اس سے باہمی محبت پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ ایتاء زکوٰۃ:

یہ مالی عبادت ہے۔ مسلمان اپنی حلال کمائی میں سے اللہ کے حکم کے تحت زکوٰۃ ادا کرتا ہے۔ زکوٰۃ سال کے بعد مقررہ مقدار میں مال (نصاب) رکھنے پر فرض ہوتی ہے۔ اس کا نصاب یہ ہے: سونا (7½) تولے، چاندی (52½) تولے، نقدی اور مال تجارت کی قیمت اگر سونے یا چاندی کی مذکورہ مقدار کے برابر ہو۔ ان سب پر (2½) فیصد کی شرح سے زکوٰۃ عائد ہوگی۔ اونٹ کا نصاب ۵ عدد، گائے وغیرہ کا تیس (۳۰) عدد، بھیڑ بکری کا چالیس (۴۰) عدد ہے۔ ان کی زکوٰۃ کی الگ الگ شرحیں مقرر ہیں۔ زرعی پیداوار خواہ کتنی بھی اس پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے قدرتی ذرائع سے کھیتی سیراب ہو تو عشر یعنی پیداوار کا دسواں حصہ اور مصنوعی ذریعہ (کنویں، ٹیوب ویل وغیرہ) سے آبپاشی کی گئی ہو تو بیسواں حصہ زکوٰۃ لاگو ہوتی ہے۔

۴۔ بیت اللہ کا حج:

پوری عمر میں ایک بار بیت اللہ کا حج فرض ہے بشرطیکہ استطاعت ہو (مالی حالت اور تندرستی کے لحاظ سے)، اور اس عرصے کے لیے پیچھے گھر والوں کی ضروریات کے لیے مالی وسائل موجود ہوں۔ حج سے مراد ہے مقررہ ایام میں خانہ کعبہ کی زیارت اور چند مخصوص رسوم ادا کرنا جنھیں مناسک کہتے ہیں۔ مناسک حج میں احرام باندھنا، تلبیہ، طواف، صفا و مروہ کے درمیان سعی، منیٰ میں پڑاؤ، رمی جمرات وغیرہ شامل ہیں لیکن سب سے اہم وقوف عرفات ہے، کہ یہ اگر رہ جائے تو حج رہ جاتا ہے خواہ باقی سارے مناسک ادا کر لیے ہوں۔ حج مالی اور جسمانی ہر دو قسم کی عبادت ہے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے انسان اپنا مال خرچ کرتا ہے اور اپنے اہل و عیال اور وطن سے دور ہو کر جسمانی صعوبتیں بھی جھیلتا ہے۔ حج سے مسلمانوں کو انفرادی طور پر روحانی فوائد و ثمرات کے ساتھ اجتماعی فوائد بھی بہت سے حاصل ہوتے ہیں اس سے ان کی قوت، اتحاد اور یکجہتی کا اظہار ہوتا ہے۔ مختلف علاقوں سے آئے ہوئے مسلمانوں میں میل جول پیدا ہوتا ہے جس سے بہت سے معاشرتی و اقتصادی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

۵۔ صوم رمضان:

اس سے مراد ہے رمضان کے مہینے میں صبح سے لے کر غروب آفتاب تک عبادت کی نیت کے ساتھ کھانے پینے اور مباشرت سے پرہیز کرنا۔ یہ بدنی عبادت اللہ تعالیٰ سے اخلاص کا بھرپور مظاہرہ ہے۔ اس سے تقویٰ، ضبط نفس کے اعلیٰ اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ نیز جفاکشی اور مشقت اٹھانے کی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تربیت ہوتی ہے۔روزہ ہر بالغ، عاقل مسلمان پر فرض ہے۔

وفی حدیث جبریل قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الإسلام أن تشهد أن لا اله الا الله وأن محمدا رسول اله وتقیم الصلوة وتؤتی الزکوة وتصوم رمضان وتحج البیت ان استطعت الیه سبیلا.

حدیث جبریل علیہ السلام میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تو گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور کہ یقیناً محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور تو نماز قائم کرے اور زکوۃ ادا کرے اور رمضان میں روزے رکھے اور بیت اللہ کا حج کرے اگر تو اس کی طرف سفر کی استطاعت رکھے (متفق علیہ)

صلوۃ (نماز)

نماز اسلام کا دوسرا ستون ہے اور یہ اسلام کے عملی ارکان میں شامل ہے۔ اسلام میں نماز کو جو اہمیت دی گئی ہے وہ کسی دوسرے عمل کو نہیں دی گئی۔ ہمارے ہاں صلوٰۃ کے لیے لفظ نماز استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ فارسی زبان کا لفظ ہے اور ایران میں اسلام کی آمد سے قبل جسمانی عبادت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ تاہم عربی میں صلوٰۃ اس کا ہم معنی ہے۔ جس کا مطلب ہے دعا مغفرت رحمت اور درود۔ چونکہ اس میں یہ ساری باتیں آجاتی ہیں اس لیے نماز کی نسبت یہ لفظ زیادہ موزوں ہے۔ شرعی اصطلاح میں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھنا، دعا کرنا اور قرب حاصل کرنا ہے اور ان عوامل کا حصول ہی انسان کو اللہ تعالیٰ کے تابع بنا دیتا ہے۔

معنی و مفہوم:

صلوٰۃ کے لغوی معنی ہیں نیک تمنا۔ دعا۔ تعریف۔ دینی اصطلاح میں اس سے مراد اسلام کی وہ مخصوص عبادت ہے جو رسول کریم ﷺ نے مخصوص ہیئت کے ساتھ خود ادا کی اور اپنی امت کو سکھائی۔ صلوٰۃ، قیام، رکوع، سجدہ، تشہد، تسبیح، ثناء، قرأت اور دعا وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ اردو اور فارسی میں اس مخصوص عبادت کو نماز کہتے ہیں۔

اقامت صلوۃ:

قرآن حکیم میں اقامت صلوٰۃ کا حکم آیا ہے۔ مذکورہ بالا حدیث شریف میں بھی اقامت صلوٰۃ کو ارکان اسلام میں سے ایک رکن بتایا گیا ہے۔ اقامت صلوٰۃ سے مراد ہے نماز کو وقت کی پابندی کے ساتھ، باجماعت اور تمام شرائط و آداب کے ساتھ ادا کرنا۔

اہمیت صلوۃ:

پانچ وقت کی نماز ہر عاقل اور بالغ مسلمان پر فرض ہے۔ نماز پہلی تمام امتوں پر بھی فرض رہی ہے۔ قرآن پاک و حدیث میں اقامت صلوٰۃ کی سخت تاکید کی گئی ہے۔

(الف) ازروئے قرآن:

قرآن حکیم میں اقامت صلوٰۃ کا ذکر بارہا آیا ہے۔ کہیں تو مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو (علاوہ اور نیکیوں کے) نماز قائم کرتے ہیں۔ کہیں نماز قائم کرنے والوں کے لیے اجر و انعام کا ذکر کیا گیا ہے۔ تقریباً بارہ مقامات پر حکم دیا گیا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ: نماز قائم کرو۔

ایک جگہ (البقرہ ۲،۲۳۸:) حکم ہے۔

حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ: تم نمازوں کی نگہداشت کرو۔

اہل جنت دوزخ والوں سے پوچھیں گے کہ تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے آئی تو وہ دوزخ میں پھینکے جانے کی ایک وجہ یہ بتائیں گے۔

قَالُوْا لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ (المدثر ۷۴،۴۳:)

ترجمہ: ''ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے۔''

نماز سے غفلت برتنے والے نمازیوں کے لیے عذاب کی وعید آئی ہے (سورہ ماعون)

(ب) ازروئے حدیث:

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

۱۔ آدمی اور کفر و شرک کے درمیان ترک صلوٰۃ ہے۔

۲۔ نماز دین کا ستون ہے۔ جس نے اس کو ترک کیا اس نے دین کو گرادیا۔

۳۔ جس دین میں نماز نہیں اس میں کوئی بھلائی نہیں۔

۴۔ جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑی اس نے کفر کیا۔

مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ

۵۔ قیامت کے روز سب سے پہلے نماز کے بارے میں باز پرس ہوگی (اَوَّلُ مَا سُئِلَ، سُئِلَ عَنِ الصَّلٰوۃ)

نماز باجماعت کی فضیلت:

قرآن پاک میں نماز کی تعریف اور بجا آوری کا حکم آیا ہے۔ اس کے ادا کرنے میں سستی اور کاہلی کو منافقت کی علامت قرار دیا گیا۔

وَاِذَا قَامُوْا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی لا (نساء آیت 142)

ترجمہ: ''اور اس کے ترک کو کفر کی نشانی بتایا گیا۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ O لا (الروم آیت 142)

ترجمہ: ''اور نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔''

نماز کے دوام اور اس کی حفاظت پر جس طرح بے شمار آیات مبارکہ اور احادیث نبویہ ﷺ میں احکامات آئے ہیں اسی طرح فرض نماز کو باجماعت ادا کرنے کا حکم بھی دیا گیا۔ فرمان باری تعالیٰ ہے: ارکعوا مع الراکعین ۔ یعنی نماز پڑھنے والوں کے ساتھ مل کر نماز ادا کرو۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے بھی متعدد مرتبہ باجماعت نماز ادا کرنے کا حکم دیا اور جو لوگ مسجد میں آکر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں ان کے بارے میں فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تحقیق میں ارادہ کرتا ہوں کہ لکڑیاں جلانے کا حکم دوں پھر نماز کے لیے اذان دینے کا حکم دوں پھر کسی آدمی کو کہوں کہ وہ امامت کرائے پھر میں ان لوگوں کے پاس جاؤں جو نماز کے وقت مسجد میں نہیں آتے اور ان کے گھروں کو ان کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اوپر جلا دوں۔'' اس قدر آپ ﷺ نے سختی فرمائی کہ مسجد میں آ کر نماز ادا نہ کرنے والوں کو آپ ﷺ ان کے گھر سمیت جلانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے بغیر کسی عذر کے نماز چھوڑنے والوں کو بھی اس طرح سخت وعید فرمائی۔ فرمایا: کہ جو شخص اذان سن کر بغیر عذر بیماری یا خوف کے مسجد میں نہ آئے تو اس کی وہ نماز قبول نہ ہوگی۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا واجب ہے اور بغیر کسی عذر کے اس کو چھوڑنا جائز نہیں۔ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اگر چہ نابینا تھے مگر نبی کریم ﷺ نے اذان سننے کے بعد ان کو مسجد میں ضرور آنے کا حکم دیا۔

جہاں ایک طرف حضور اکرم ﷺ نے جماعت کے ساتھ ملنے کی اس قدر سختی فرمائی وہاں آپ ﷺ نے با جماعت نماز ادا کرنے والوں کی بھی بڑی فضیلت بیان کی۔ فرمایا: جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا اکیلے پڑھنے سے ستائیس درجے زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔ ایک دوسری حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا تنہا پڑھنے سے پچیس درجہ زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔ مسلمان جب اچھی طرح وضو کرتا ہے اور مسجد میں با جماعت نماز ادا کرنے کے ارادہ سے باہر نکلتا ہے تو اس کے ہر قدم پر اس کو ایک نیکی ملتی ہے اور ایک گناہ معاف ہوتا ہے۔ پھر جب وہ نماز ادا کرتا ہے تو فرشتے اس کے لیے رحمت اور بخشش کی دعائیں مانگتے ہیں اور جب تک وہ نماز کے انتظار میں بیٹھتا ہے گویا وہ نماز ہی کی حالت میں ہوتا ہے۔ (متفق علیہ)

مسجد میں جماعت کے ساتھ آ کر نماز ادا کرنے کے اور بھی بے شمار فائدے ہیں۔ پانچوں وقت مسلمان جب آپس میں ملیں گے تو ایک دوسرے کے حالات سے آگاہی ہوگی۔ باہمی رنجشیں اور کدورتیں دور ہوں گی۔ اتفاق و اتحاد اور محبت و الفت میں اضافہ ہوگا۔ دوسروں کو عبادت میں دیکھ کر خود کو بھی زیادہ شوق ہوگا۔ خانہ خدا کی برکت سے شیطان کی شیطانیت سے ممکن حد تک بچ سکیں گے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

یعنی جس جگہ تین آدمی ہوں اور جماعت سے نماز ادا نہ کریں ان پر شیطان کا غلبہ ہو جاتا ہے پس تم جماعت کو لازم پکڑو۔

ایک اور حدیث مبارکہ میں با جماعت نماز کی فضیلت اس طرح بیان کی گئی کہ

جو شخص صبح و شام کو مسجد میں نماز کے لیے جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں ضیافت تیار کریں گے۔ جتنی مرتبہ بھی وہ صبح یا شام کو جائے گا۔ (متفق علیہ)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

جس نے دو ٹھنڈی نمازیں (یعنی فجر اور عصر) پابندی سے با جماعت ادا کر لیں وہ جنت میں داخل ہوگیا۔ (متفق علیہ)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

ولو انكم صليتم فى بيوتكم كما يصلى هذا المتخلف فى بيته لتركتم سنة نبيكم ولو تركتم سنة نبيكم لضللتم ولقد رايتنا و ما يتخلف عنها الا منافق معلوم النفاق. (مسلم)

ترجمہ: ''اگر تم تنہا اپنی نمازوں کو گھروں میں پڑھو گے تو تم اپنے نبی ﷺ کے جاری کیے ہوئے طریقہ کو چھوڑ دو گے۔ اگر تم اپنے نبی ﷺ کے طریقہ کو چھوڑو گے تو تم گمراہ ہو جاؤ گے اور معذوری کے سوا جماعت چھوڑنے والا منافق ہے۔''

اس طرح جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا صغیرہ گناہوں کو بھی مٹا دیتا ہے۔ جس طرح حدیث شریف میں آتا ہے ایک شخص نے کسی اجنبی عورت کا بوسہ لیا وہ گھبرایا ہوا حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا مجھے حد لگایئے۔ آپ ﷺ نے واقعہ دریافت کیا تو اس نے بتلایا کہ میں

andpk.blogspot.com

نے ایک اجنبی عورت کا بوسہ لے لیا حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ذرا ٹھہر جاتے میں عصر کی نماز کا وقت ہوگیا اور جماعت کھڑی ہوگئی۔ نماز سے فارغ ہوکر اس نے پھر کہا مجھے حد لگا یئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: فرض نماز با جماعت ادا کرنے سے تمہارا گناہ معاف ہوگیا۔ اس نے خوش ہوکر کہا یہ معافی کیا میرے لیے خاص ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ ہر مسلمان کے لیے عام ہے اور اسی عموم کو بیان کرنے کے لیے آیت کریمہ **ان الحسنات یذھبن السیئات** نازل ہوئی۔

ایک اور حدیث مبارکہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ پانچوں نمازیں (ایک نماز سے دوسری نماز تک) اور جمعہ سے لے کر جمعہ تک اور رمضان سے لے کر رمضان تک درمیان میں (کی ہوئی خطاؤں) کا کفارہ ہیں جبکہ کبیرہ گناہوں سے دور رہا جائے۔

یہ حقیقت ہے کہ روزانہ پابندی کے ساتھ پانچوں وقت مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا اتنا عظیم دین کا کام (عبادت) ہے کہ جو مسلمان اس کی پابندی کر لیتا ہے اس کے لیے اور دین کے کاموں میں پابندی آسان ہو جاتی ہے اور جو مسلمان پنج وقتہ نماز کی پابندی نہیں کر سکتے وہ دین کے کاموں (عبادتوں) کی پابندی نہیں کر سکتے اور فرض عبادتوں کو ترک کرنے کے مجرم اور گنہگار ہوتے ہیں۔

خدائے عزوجل اسی لیے ارشاد فرماتے ہیں:

وَاسْتَعِينُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ ۝ لا الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (البقرہ آیت 45-46)

ترجمہ: ''اور تم ہر کام میں صبر اور نماز کے ساتھ مدد حاصل کرو۔ بلاشبہ نماز پڑھنا بہت زیادہ گراں ہے سوائے ان لوگوں کے جن کو یقین ہے کہ (مرنے کے بعد) ان کو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونا ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

شاعر کہتا ہے۔

روز محشر کہ جاں گداز بود
اولیں پرسش نماز بود

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں تمام صوبوں کے والیوں (گورنروں) کے پاس ذیل کا فرمان بھیجا تھا:

ان اھم امور دینکم الصلوۃ فمن حافظ علیه فھو لغیرھا احفظ ومن ضیعھا فھو لغیرھا اضیع.

ترجمہ: بلاشبہ تمہارے دین کے کاموں میں سب سے اہم نماز ہے جس شخص نے نماز کی پابندی کر لی وہ اور کاموں کی آسانی سے پابندی کر سکے گا جس شخص نے نماز کو ضائع کر دیا وہ دوسرے کاموں کو بھی آسانی کے ساتھ ضائع کر دے گا۔

مذکورہ بالا تمام آیات کریمہ اور احادیث مبارکہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز با جماعت ادا کرنا واجب اور باعث فضیلت ہے۔ شرعی عذر خوف یا بیماری کے علاوہ تنہا فرض نماز ادا نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانان عالم کو اس فریضہ کی بجا آوری کرنے کی توفیق عطا فرمائے کیونکہ نماز میں ہی ہماری پریشانیوں اور مسائل کا حل ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول ﷺ کو جب کوئی پریشانی یا مسئلہ درپیش ہوتا تو آپ ﷺ فوراً نماز پڑھنے لگ جاتے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مقاصد نماز

۱۔ مقصد حیات کی یاد دہانی:

انسان کی پوری زندگی کو عبادت میں تبدیل کرنے کے لیے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ذہن میں یہ شعور ہر وقت تازہ رہے کہ وہ خدا کا بندہ ہے۔ یہ ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی حواس سے بالاتر ہے لیکن گمراہی کی طاقتیں ہر سمت پھیلی ہوئی ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ انسان کو بار بار اس بات کی یاد دہانی کی جاتی رہے کہ اسے اپنی زندگی ایک مخصوص انداز سے گزارنی ہے۔ یہ نماز کا سب سے بڑا فائدہ ہے۔ جیسے ہی آپ صبح کو اٹھیں وہ آپ کو یہ بات یاد دلاتی ہے۔ دن کے کام کاج کے ہنگاموں سے دو بار کھینچ کر لاتی ہے اور اسی چیز کو یاد دلاتی ہے۔ شام اور رات کو جب تفریح یا آرام کا وقت ہوتا ہے تو نماز آپ کو آگاہ کرتی ہے کہ تم خدا کے بندے ہو، شیطانی نفس کے بندے نہیں ہو۔ نماز کی اسی خصوصیت کی بنا پر قرآن میں اسے "ذکر" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس کے معنی یاد دھانی کے ہیں۔

۲۔ فرض شناسی:

چونکہ انسان کے سپرد یہ کام ہوا ہے کہ وہ ہر قدم پر خدا کے احکام کو بجالائے لہٰذا ضروری ہے کہ اس میں فرض شناسی اور مستعدی پیدا ہو بلکہ اس کی فطرت ثانیہ بن جائے۔ مثال کے طور پر فوج کو دیکھیے، وہاں کن کن طریقوں سے فرائض کو سمجھنے اور ادا کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ رات دن میں کئی بار بگل بجایا جاتا ہے، سپاہیوں کو ایک جگہ جمع ہونے کا حکم دیا جاتا ہے، ان سے قواعد کی پابندی کرائی جاتی ہے! آخر کس لیے؟ اس لیے کہ سپاہیوں میں فرض شناسی پیدا ہو اور جو لوگ ان صفات سے محروم ہوں ان کی آزمائش ہو جائے تا کہ ان کی اصلاح کی کوشش ہو یا بالاخر ان کو فوج سے نکال دیا جائے۔

دنیوی فوج کے لیے کام کا وقت تو کبھی برسوں میں آتا ہے، تب بھی قواعد روزانہ کرائی جاتی ہے، لیکن اسلام کی تیار کردہ فوج تو ہر وقت برسر کار ہے۔ اسے زندگی کی ہر آن شیطانی قوتوں سے لڑنا ہے، فرائض بجالانے ہیں، حدود اللہ کی حفاظت کرنی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی فوج کے لیے زیادہ سخت تنظیم، تربیت اور آزمائش کی ضرورت ہے اور انہی مقاصد کے تحت نماز دن اور رات میں پانچ بار فرض کی گئی ہے تا کہ ایک طرف تو مسلمانوں کی تربیت ہو اور دوسری طرف سچے اور جھوٹے مسلمانوں میں امتیاز ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ

بین العبد وبین الکفر ترک الصلوة

ترجمہ: "بندے اور کفر کے درمیان ترک صلوۃ واسطہ ہے"۔

یعنی ترک صلوۃ وہ پل ہے جسے پار کر کے آدمی ایمان سے کفر کی طرف جاتا ہے۔

۳۔ تعمیر سیرت:

نماز کا تیسرا اہم کام یہ ہے کہ وہ انسان کی سیرت کو اس خاص ڈھنگ پر تیار کرتی ہے جو اسلامی زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری ہے۔

دنیا میں ہر جگہ جیسا کام کسی جماعت کو کرنا ہوتا ہے اسی کے لحاظ سے اس کی تربیت کی جاتی ہے۔ مثلاً سول سروس کا مقصد ملک کا انتظام کرنا ہوتا ہے لہٰذا وہاں سارا زور نظم مملکت کی صلاحیت پیدا کرنے پر دیا جاتا ہے، سپاہیوں کا کام جنگ کرنا ہوتا ہے اس لیے انہیں اسلحے کا استعمال سکھایا جاتا ہے اور اطاعت امیر اور تنظیم کی تربیت دی جاتی ہے۔ اسلام کا مقصد ایک ایسی جماعت کی تیاری ہے جس کا مقصد اولین نیکی کو قائم کرنا اور بدی کو مٹانا ہے اور جسے سیاست، عدالت، تجارت، صنعت، صلح و جنگ غرض یہ کہ ہر شعبۂ زندگی میں خدا کے قوانین کی پابندی کرنی ہے اور انہیں پوری دنیا میں نافذ کرنے کی ذمہ داری سنبھالنی ہے۔ یہ عظیم کام اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک انسان میں خدا کا خوف، اس کی محبت اور اس کی خوشنودی کی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

خواہش نہ پیدا ہو اور جب تک آدمی یہ جان نہ لے کہ خدا حاکم اعلیٰ ہے اور ہر انسان اس کے سامنے جواب دہ ہے۔ مسلمان اسلام کے طریقے پر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا جب تک کہ اسے یقین نہ ہو کہ خدا ہر جگہ ہر حال میں اسے دیکھ رہا ہے، اس کی ہر ہر حرکت سے باخبر ہے، اندھیرے میں بھی اس کو دیکھتا ہے، تنہائی میں بھی اس کے ساتھ ہے اور اس کے دل میں جو نیت چھپی ہوئی ہے اس کو بھی وہ جانتا ہے۔ یہی یقین انسان کو خدا کے احکام کی اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی کے لیے تیار کرتا ہے، اور نماز کا مقصد یہ ہے کہ وہ اسی یقین کو بار بار انسان کے ذہن میں تازہ کرے۔

نماز کا ارادہ کرنے کے ساتھ ہی روح کی تربیت اور اسلامی سیرت کی تعمیر کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور پھر ایک ایک حرکت، ایک ایک فعل اور ایک ایک قول جو نماز سے متعلق ہے کچھ اس طور پر رکھا گیا ہے کہ اس سے خود بہ خود انسان کی سیرت اسلام کے سانچے میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ط

ترجمہ: ''یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔'' (العنکبوت۔ ۴۵)

اسی بنا پر نماز قدیم ترین زمانے سے انبیا کی تعلیمات کا جزو رہی ہے۔ جتنے انبیا خدا کی طرف سے آئے ہیں ان سب کی شریعت میں نماز اولین رکن اسلام تھی۔ اسلامی تحریک میں جب بھی کبھی زوال آیا نماز کا نظام تربیت ٹوٹ جانے کی وجہ ہی سے آیا کیوں کہ اسلام کے طریقے پر چلنے کے لیے اسلامی سیرت ضروری ہے، اور اسلامی سیرت نماز کے نظام تربیت ہی سے بنتی ہے اور جب یہ نظام ٹوٹے گا تو سیرتیں بگڑ جائیں گی اور اس کا لازمی نتیجہ زوال و انحطاط ہوگا۔

۴۔ ضبط نفس:

تعمیر سیرت کے ساتھ نماز انسان میں ضبط نفس کی طاقت بھی پیدا کرتی ہے۔ نماز میں دعاؤں اور تسبیحوں کے ساتھ اوقات کی پابندی طہارت وغیرہ کی شرائط اور جسمانی حرکات کا جوڑا اسی لیے لگایا گیا ہے کہ انسان اپنے نفس پر پوری طرح قابو یافتہ رہے، اور اسے اپنے ارادے کے تحت چلانے میں مشتاق ہو جائے۔ صبح کا وقت ہے، نیند آ رہی ہے، آرام طلب نفس کہتا ہے پڑے رہو، اب کہاں اٹھ کر جاؤ گے، نماز کہتی ہے کہ وقت آ چکا ہے۔ سیدھی طرح اٹھو، وضو کرو، جاڑے کا موسم ہے تو ہوا کرے، پانی گرم نہیں ہے، نہ سہی، ٹھنڈا ہی پانی استعمال کرو اور چلو مسجد کی طرف۔ ان دو مطالبات میں سے اگر کسی نے نفس کے مطالبے کو پورا کر دیا تو اس کا نفس اس سے جیت گیا ورنہ اس نے نفس پر قابو پالیا۔ اسی طرح ظہر، عصر، مغرب، عشا ہر وقت نفس کسی نہ کسی مشغولیت، فائدے، نقصان، لطف، لذت، مشکلات وغیرہ کے بہانے ڈھونڈتا ہے لیکن نماز ہر وقت تازیانہ بن کر آ جاتی ہے اور آپ کی اونگھتی ہوئی قوت ارادی کو جگاتی ہے۔ اگر آپ نماز کا مطالبہ پورا کرتے رہے تو آپ خواہشات نفس کا زور توڑ دیں گے، ان پر حکم داں ہو جائیں گے اور آپ میں یہ طاقت پیدا ہو جائے گی کہ اپنے علم و ارادے کے مطابق انہیں تبدیل کر سکیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ نماز چھوڑ کر آدمی خواہشات نفس کا پیرو بن کر گمراہ ہو جاتا ہے:

فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِھِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّھَوٰتِ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا ۝ لا

ترجمہ: ''پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات نفس کی پیروی اختیار کر لی، لہٰذا عنقریب وہ گمراہی میں مبتلا ہوں گے۔'' (مریم۔ ۵۹)

یہاں تک ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ نماز کے فوائد و منافع کا صرف ایک پہلو ہے، یعنی یہ کہ نماز افراد کو کس طرح تیار کرتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ نماز

(۱) آدمی کے ذہن میں اس حقیقت کو تازہ رکھتی ہے کہ وہ دنیا میں خود مختار نہیں ہے بلکہ اللہ رب العالمین کا بندہ ہے اور اسی حیثیت سے کام کرتا ہے؛

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

(۲) انسان کو فرض شناس بناتی ہے؛

(۳) فرض شناس اور فرض ناشناس میں تمیز کا ذریعہ بہم پہنچاتی ہے؛

(۴) خیالات کا ایک پورا نظام ترتیب دیتی ہے تاکہ اس کی سیرت پختہ ہو سکے؛

(۵) انسان میں یہ قوت پیدا کرتی ہے کہ وہ اپنے عقیدے اور بصیرت کے مطابق جس طرز عمل کو صحیح سمجھتا ہے اس پر عمل کر سکے: اور

(۶) بندے کو رب کے قریب لاتی ہے اور اس کے قلب کو پاکیزگی اور روح کو بالیدگی عطا کرتی ہے۔

نماز کے روحانی، اخلاقی اور سماجی اثرات

نماز کے روحانی و اخلاقی اثرات

نماز کی ادائیگی سے انسان کی روحانی زندگی پر بھی اثر پڑتا ہے صبح کے وقت جب کہ تمام فضا میں سکوت طاری ہوتا ہے کائنات کی ہر شے بزبانِ حال اپنے خالق و مالک کی حمد و ثنا میں مصروف ہوتی ہے پرندے اپنے میٹھے اور سریلے راگ الاپتے ہیں تو انسان کی روح خود بخود اپنے پیدا کرنے والے کی طرف کھنچتی ہے اور اس میں ایک عجیب کیفیت و سرور پیدا ہوتا ہے چونکہ اس وقت ایک نورانی منظر سے روح پر وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے اس لیے خالق فطرت نے حکم دیا کہ انسان اس وقت ذکر الٰہی میں مصروف ہو اور روحانی غذا حاصل کرے۔

صبح کی نماز سے فراغت کے بعد انسان اپنے دنیاوی کاروبار میں لگ جاتا ہے او ایک بجے تک اس طرح مصروف رہتا ہے اور اسے ضرورت ہوتی ہے کہ تھوڑی سی دیر کے لیے اپنا کام چھوڑ کر آرام کرلے تاکہ آدھے دن کی تھکاوٹ دور ہو جائے اس موقع پر انسان ظہر کی نماز ادا کرتا ہے تاکہ وہ اپنے کاروباری مشاغل کے ساتھ ساتھ روحانی غذائی ضرورت سے بھی غافل نہ رہے۔ ظہر اور عصر کی نمازوں کے دوران انسان کو پھر کام کرنے کی اجازت ہے۔ عصر کی نماز بھی روحانی غذا حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ عصر کے بعد مغرب کے وقت بھی روحانی غذا دی جاتی ہے تاکہ مادی غذا کی اصلاح و شکر یہ ادا ہو سکے اور سونے سے پہلے عشاء کے وقت یاد خداوندی سے رات بھر روحانیت کا اثر رہتا ہے۔

از روئے حدیث ہر نماز کو پڑھتے وقت یہ خیال کرنا چاہیے کہ یہ میری آخری نماز ہے ممکن ہے کہ اس کے بعد موت آجائے اور پھر انسان کو نماز پڑھنا بھی نصیب نہ ہو۔

۱۔ اللہ تعالیٰ سے رابطہ:

نماز سے انسان کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق استوار ہو جاتا ہے۔ وہ پانچ وقت اللہ تعالیٰ کے حضور میں عبادت کرنے، قرآن پاک پڑھنے اور دعا کرنے سے اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوتا ہے اور رابطہ قائم کرتا ہے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:

اِنَّ اَحَدَکُمْ اِذَا صَلّٰی یُنَاجِیْ رَبَّهٗ

ترجمہ: یقیناً تم میں سے کوئی شخص جب نماز پڑھتا ہے تو (گویا) اپنے رب سے چپکے چپکے بات کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے مسلسل رابطہ رہنے سے بہت سے فیوض و برکات حاصل ہوتے ہیں۔ روح کو بالیدگی، دل کو تقویت اور سہارا اور ذہن کو سکون ملتا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۲۔ گناہ جھڑتے ہیں:

نماز پڑھنے سے انسان کے گناہ جھڑتے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مرتبہ ایک درخت کی ایک خشک ڈالی کو ہلایا جس سے اس کے پتے جھڑنے لگے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے ساتھ کھڑے تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: جب ایک مسلمان اچھی طرح وضو کرتا ہے اور پانچ نمازیں پڑھتا ہے تو اس کے گناہ اسی طرح جھڑ جاتے ہیں جیسے یہ پتے۔

۳۔ برائیوں سے اجتناب:

ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ (العنکبوت ۲۹:۴۵)

ترجمہ: بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔

۴۔ بے حیائی اور بُرے کاموں سے پرہیز:

یوں تو نماز کے بہت سے فوائد ہیں لیکن ان میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ نماز انسان کو بے حیائی اور برے کاموں سے بچاتی ہے۔ بے حیائی اور بے کاموں میں ظلم بھی شامل ہے۔ اس لیے انسان اس سے بھی بچتا ہے۔ اگر کوئی نمازی باقاعدگی سے مسجد میں جاتا ہے اور ایک روز نہ جائے تو سبھی اس کی خیریت دریافت کرتے ہیں۔

۵۔ وقت کی پابندی:

پنج وقتہ نماز ادا کرنے سے یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ انسان وقت کا پابند ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ ہر کام بروقت کرتا ہے کیونکہ جو لوگ وقت کی پابندی نہیں کرتے وہ دوسروں کے سامنے آنے سے گریز کرتے ہیں۔

۶۔ صحت مندی:

جو شخص پنج گانہ نماز ادا کرتا ہے اس کے تمام جسمانی اعضاء درست رہتے ہیں اور نمازی خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے اور سستی اور کاہلی اس کے نزدیک تک نہیں پھٹکتی اور وہ ہر وقت چاق و چوبند رہتا ہے۔

۷۔ فرض شناسی کا جذبہ:

نمازی کے اندر فرض شناسی کا جذبہ نہ صرف پیدا ہوتا ہے بلکہ بڑھتا ہے اور انسان ہر لحہ اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ جس سے نہ صرف نمازی کو از خود فائدہ پہنچتا ہے بلکہ دوسرے لوگ بھی اس کی تقلید کر کے مثالی معاشرے کو تشکیل کرنے کا باعث بن سکتے ہیں۔

۸۔ سرخروئی کا حصول:

جو شخص پنج گانہ نماز ادا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی دنیا اور آخرت کو بہتر بنا دیتا ہے جس کے نتیجے میں انسان اللہ تعالیٰ کے آگے سرخرو ہو جاتا ہے۔

نماز کے سماجی اثرات

۱۔ باہمی دکھ درد و خوشیوں میں شریک:

نماز کا فائدہ یہ بھی ہے کہ نمازی ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد اور خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں اور مشکل میں پھنسے ہوئے نمازی کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۲۔ باہمی مساوات کا عمل:

جب نمازی کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو جاتے ہیں تو غریب امیر، بڑے چھوٹے، جوان اور عمر رسیدہ کی تمیز ختم ہو جاتی ہے اور اس طرح کوئی بھی شخص خواہ کسی حال میں بھی ہو خود کو دوسروں سے کسی طور پر بھی کم نہیں سمجھتا۔

۳۔ اطاعت امیر کا تصور:

نماز کی ادائیگی سے انسان کے دل میں اطاعت امیر کا عنصر نمایاں طور پر ابھر آتا ہے اور وہ ادب و آداب سے آشنا ہوتا ہے اور اسے اس عمل سے نہ صرف مساوات کا سبق ملتا ہے بلکہ دوسروں کے سامنے اسلام کی اجتماعی شان کا اظہار ہوتا ہے اور اسلامی عبادات کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

۴۔ قوم ایک پلیٹ فارم پر:

پنج گانہ نماز کی ادائیگی کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ نمازی ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر باہمی مسائل کو حل کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں چونکہ نماز میں تمام مسلمانوں کو قبلہ رو ہو کر کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا ہے اس لیے اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ مسلمانوں کا مرکز ایک ہی ہے۔

زکوٰۃ

معنی و مفہوم:

زکوٰۃ کے لغوی معنی ہیں پاک کرنا، نمو پانا، افزائش۔ دینی اصطلاح میں زکوٰۃ سے مراد مقررہ حد سے زیادہ مال رکھنے والوں سے مقررہ شرح سے مال وصول کر کے اسے مقررہ مصارف پر خرچ کرنا ہے۔ زکوٰۃ کے اصطلاحی مفہوم میں مذکورہ دونوں لغوی معنی موجود ہیں۔ زکوٰۃ سے مال پاک بھی ہوتا ہے اور اس میں برکت بھی آتی ہے۔

زکوٰۃ کی فرضیت:

زکوٰۃ ہر اس عاقل اور بالغ مسلمان پر فرض ہے جو

۱۔ مقررہ حد کے مال (نصاب) کا مالک ہو۔

۲۔ اس مال پر اس کو تصرف حاصل ہو (یعنی وہ اسے استعمال میں لا سکتا ہو)

۳۔ اس مال پر پورا سال گزر گیا ہو۔

۴۔ اس مال میں نمو یعنی بڑھنے کی صلاحیت ہو۔

نوٹ: بنیادی ضرورت کی اشیاء مثلاً رہائشی مکان، لباس اور اسباب وغیرہ پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی۔

لغوی اعتبار سے زکوٰۃ کا مطلب ہے پاک کرنا۔ لیکن شرعی اصطلاح میں اس سے مراد اپنے مال میں سے ایک مقررہ حصہ ایک معین طریقے سے ہر سال راہ خدا میں دینا۔ قرآن پاک کی سورہ توبہ آیت 103 میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا.

ترجمہ: "(اے نبی ﷺ) لوگوں کے مال سے صدقہ وصول کیجیے یہ صدقہ ان کے مال کو طاہر اور پاکیزہ بنادے گا۔"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

انبیائے کرام علیہ السلام پر زکوٰۃ واجب نہیں کیونکہ انبیاء گناہوں سے پاک ہوتے ہیں اس آیت کریمہ سے دل کی پاکیزگی اور تزکیہ نفس کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔

فلسفہ زکوٰۃ

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرضیت زکوٰۃ کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں: تشریع زکوٰۃ میں دو بڑی مصلحتیں ہیں ایک کا مقصد تزکیہ نفس ہے کیونکہ انسان کی اصل جبلت میں حرص اور بخل ودیعت رکھے گئے ہیں۔ بخل ایک قبیح ترین عادت ہے جس سے انسان کو آخرت میں نقصان ہوتا ہے جس میں بخل نے جڑ پکڑ لی وہ جب مرتا ہے تو اس کا دل مال و دولت کے ساتھ وابستہ اور اس کی طرف نگران ہوتا ہے یہی بات اس کے لیے عذاب کا موجب بنتی ہے۔ جب آدمی زکوٰۃ کی مشق کرتا ہے اور اس کا عادی بن جاتا ہے تو اس کا نفس بخل کی بری عادت سے پاک ہو جاتا ہے اور یہ بات اس کے لیے آخرت میں نہایت مفید ثابت ہوتی ہے۔ نیز جب کسی مسکین محتاج کو کوئی شدید ضرورت پیش آتی ہے اور تدبیر الٰہی کا اقتضا یہ ہوتا ہے کہ اس کی وہ حاجت پوری کر دی جائے تو کسی ذی استعداد صاحب استطاعت کے دل میں اس کی اعانت اور دستگیری کا الہام کیا جاتا ہے اور اس کا قلب فراخدلی کے ساتھ اس کو قبول کر لیتا ہے۔ اس سے اس کو انشراح روحانی حاصل ہوتا ہے اور رحمت الٰہی کے اس مقام پر فائز ہونے کی اس میں استعداد پیدا ہو جاتی ہے اور یہ بات اس کے تزکیہ نفس کے لیے مفید ہے۔

دوسری مصلحت کا مقصود نظام مدنیت کو بہتر طریقے پر قائم رکھنا ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ مدنیت خواہ کتنے ہی چھوٹے پیمانے پر ہو کمزور اور اپاہج اشخاص اور ارباب حاجت غریبوں، مسکینوں پر مشتمل ہوتی ہے نیز حوادث اور آفات ارضی وسماوی کا ہر ایک قوم کسی نہ کسی صورت میں نشانہ بنتی ہے۔ بنا بریں اگر اس بات کا التزام نہ ہو کہ غریبوں اور مسکینوں اور ارباب حاجت کی دستگیری کی جائے تو اس کا نتیجہ قوم کی ہلاکت ہوگا اس لیے یہ ضروری قرار پایا اور آپ ﷺ نے یہ سنت قائم کی کہ ان کے وصول کرنے کا اہتمام حکومت کرے۔

زکوٰۃ کے وجوب کی مذہبی حیثیت کے بعد ایک مسلمان کے لیے یہ ضروری نہیں رہ جاتا کہ وہ اس کے دیگر فوائد جاننے کے بعد ہی ایمان لائے۔ بلکہ ایک مسلمان کی شان یہی ہے کہ وہ جب یہ سمجھ لے کہ یہ اسلام کا مطالبہ ہے، خدا کا حکم ہے اور پیارے پیغمبر ﷺ کا فرمان ہے تو وہ بے چون و چرا اس پر عمل کرے۔ اس کی شان یہ ہے کہ وہ کہے **سمعنا و اطعنا** ہم نے سن لیا اور مان لیا، تاہم اس کی تسلی اور اطمینان قلب کے لیے مناسب ہے کہ زکوٰۃ سے حاصل ہونے والے دیگر دنیوی فوائد پر کچھ تھوڑی بہت روشنی ڈال دی جائے۔ زکوٰۃ کی مذہبی حیثیت کے بعد اس کے معاشرتی اور معاشی فوائد زیادہ اہم ہیں اس لیے اس بیان کو اختصار کا روپ دیا گیا ہے۔

زکوٰۃ کے بارے میں چند آیات قرآنی:

1- وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ O

ترجمہ: ''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کیا کرو۔ (سورہ البقرہ آیت 43)

2- وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ

ترجمہ: ''پس نماز قائم کرو اور ادا کرو زکوٰۃ اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی۔'' (سورہ نور آیت 56)

3- وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ O لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ O

ترجمہ: ''اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے مالوں میں حاجت مندوں اور ناداروں کے لئے سلام مقرر حق ہے۔'' (سورہ المعارج آیت 25-24)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

4- وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ۝

ترجمہ: اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ (سورہ المومنون آیت 4)

5- وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔

ترجمہ: ''اور اپنے گھروں میں قرار کیے رکھو اور سابق دور جاہلیت کی شان و شوکت نہ دکھاتی پھرو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرو۔'' (سورہ الاحزاب آیت 33)

مقاصدِ زکوٰۃ

زکوٰۃ کے مقاصد کے بارے میں کتاب وسنت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے تین اہم فوائد یا مقاصد ہیں:

تزکیۂ نفس:

زکوٰۃ کا حقیقی اور بنیادی مقصد جس کا تعلق بالکلیہ شخص کی اپنی ذات سے ہوتا ہے، یہ ہے کہ زکوٰۃ دینے والے کا دل دنیا کی حرص سے پاک ہو کر نیکی اور تقویٰ کے کاموں کے لیے تیار ہو جائے۔ قرآن میں ہے:

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى۝ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى۝

ترجمہ: ''اس شخص کو جہنم سے دور رکھا جائے گا جو خدا سے ڈرنے والا ہو اور جو اپنے تزکیہ کی خاطر دولت دوسروں کو دیتا ہو۔'' (الیل ۱۸-۱۷)

گویا صدقہ اور زکوٰۃ کی اصل غایت دل کی پاکی اور نفس کا تزکیہ ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا کی محبت ہی وہ چیز ہے جو خدا پرستی کی اصل دشمن ہے اور جو انسان کو خدا اور آخرت سے بیگانہ بنا کر رکھ دیتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا بھی ہے کہ ''دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔'' دنیا کی محبت مختلف شکلوں میں آسکتی ہے لیکن اس کی سب سے معروف اور خطرناک شکل دولت کی محبت ہے۔ آپ ﷺ نے اسی کو امت مسلمہ کے لیے سب سے بڑا خطرہ بتایا تھا۔ آپ ﷺ کا قول ہے ''میری امت کا (سب سے بڑا) فتنہ مال ہے۔'' اگر آدمی اپنے آپ کو اس فتنے کی گرفت سے بچالے تو اور بہت سی برائیوں سے بچ سکتا ہے اور اچھائیاں نشوونما پاسکتی ہیں۔ خود زکوٰۃ کے لفظی معنی بھی پاکیزگی اور نمو کے ہیں، گویا اس طرح نفس میں پاکیزگی آتی ہے اور صفات حسنہ کی قوت نمو میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ زکوٰۃ کا بنیادی مقصد محض اس بات سے حاصل نہیں ہوتا کہ اپنی دولت کا ایک حصہ نکال کر کسی غریب کو دے دیا جائے بلکہ اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب اس عمل کے پیچھے سچی نیت اور عملی اہتمام ہو۔ مقصود صرف خدا کی رضا کا حصول ہو، نام و نمود کی خواہش یا کسی پر احسان دھرنے کا جذبہ کارفرما نہ ہو، لینے والے کی عزت نفس کو ٹھیس نہ پہنچائی جائے، زکوٰۃ پاک کمائی سے ادا کی جائے اور زکوٰۃ کے لیے جو چیزیں دی جائیں وہ عمدہ قسم کی ہوں؛ جس طرح نماز کا ظاہری پہلو اس کے ارکان ہیں لیکن اصل چیز توجہ الی اللہ ہے اسی طرح زکوٰۃ کا ظاہری پہلو ادائیگی نقد و جنس ہے لیکن اس کا باطن دنیا کے مقابلے میں آخرت کو فوقیت دینا ہے اور باطن کے تقاضے اسی وقت پورے ہوسکتے ہیں جب اوپر کی شرائط کا خیال رکھا جائے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

امداد باہمی:

زکوٰۃ کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ملت کے نادار افراد کی مدد کی جائے تاکہ ان کی بنیادی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

ان اللہ افترض علیھم صدقۃ توخذ من اغنیائھم فترد الی فقراء ھم۔

ترجمہ: ''اللہ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے کہ ان کے امراء سے لی جائے اور غربا میں تقسیم کر دی جائے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کا ایک خالص اجتماعی اور معاشی پہلو بھی ہے اور اس کے بغیر زکوٰۃ کا اسلامی پہلو مکمل نہیں ہوتا۔ ایک شخص نے پوری دلجمعی اور خلوص کے ساتھ اپنی دولت کا حصہ نکالا تو بلاشبہ اس نے اپنے دل کی پاکی اور اپنے نفس کے تزکیے کا اہتمام کر لیا مگر اس کا یہ فعل شریعت کے نزدیک ابھی ادائے زکوٰۃ نہیں بنا۔ یہ ادائے زکوٰۃ اس وقت بنے گا جب وہ اپنی نکالی ہوئی دولت کو حق داروں کے حوالے کر دے گا۔ یعنی دل کی پاکی اور نفس کے تزکیے کا زکوٰۃ کی بنیادی غرض وغایت ہونا مسلم، لیکن اس مال زکوٰۃ کا غریبوں کی حاجت روائی کا ذریعہ بننا بھی اپنی جگہ بالکل ضروری ہے اور اس کے بغیر زکوٰۃ کا شرعی فریضہ ادا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے زکوٰۃ کو کھاتے پیتے افراد کی دولت میں غریبوں کا حصہ کہا ہے۔ اور یہ حق ایسا ہے جس کی خاطر اسلامی حکومت تلوار بھی اٹھا سکتی ہے۔ دین میں اس بات کی جو اہمیت ہے اس کا پورا اندازہ اس حدیث سے ہوتا ہے کہ ''وہ شخص مومن نہیں جو خود تو سیر ہو کر کھا لے اور اس کے پہلو میں اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔'' اسی طرح ایک طویل حدیث میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک انسان سے کہے گا کہ میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ بندہ جواب دے گا کہ خدایا میں تجھے کیسے کھلا سکتا ہوں، تو تو اس سارے جہان کا پالنہار ہے۔ ارشاد ہوگا کہ تجھے نہیں معلوم کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا لیکن تو نے اسے کھلانے سے انکار کر دیا تھا۔

جو دین ایک حاجت مند کی بھوک پیاس کو خود اللہ تعالیٰ کی بھوک پیاس سے تعبیر کرتا ہو، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے یہاں غریبوں اور ناداروں کی حاجت براری کی کیا اہمیت ہوگی۔

دین کی نصرت:

زکوٰۃ کا ایک اور مقصد دین کی حفاظت اور نصرت ہے۔ قرآن میں اہل ایمان سے جگہ جگہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرو۔ جہاں اہل ایمان کی بنیادی صفات بیان کی جاتی ہیں ان میں اللہ کی راہ میں اپنے مال سے جہاد کرنے کی بات لازماً موجود ہوتی ہے۔ اس کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ دین کی خاطر جہاد کرنے کے لیے جن مصارف کی بھی ضرورت پڑے انہیں اپنے پاس سے مہیا کرو۔

دین کی حفاظت ونصرت معمولی کام نہیں، اس لیے اس کی خاطر اپنی دولت خرچ کرنا بھی معمولی کام نہیں۔ قرآن حکیم نے ایک جگہ جہاد کا حکم دیتے ہوئے فرمایا

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ج

ترجمہ: ''اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور ہاتھ روک کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔''
(البقرۃ۔۱۹۵)

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دین کی حفاظت ونصرت کے لیے مالی انفاق سے جی چرانا ہلاکت کو مول لینا ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

زکوٰۃ کا نصاف اور شرح

۱۔ سونا چاندی:

سونے کا نصاب ساڑھے سات (7½) تولے اور چاندی کا ساڑھے باون (52½) تولے ہے۔ ان پر زکوٰۃ کی شرح (2½) فیصد ہے۔

۲۔ روپیہ اور مال تجارت:

روپیہ پیسہ اور مال تجارت کی قیمت اگر (7½) تولے سونے یا (52½) تولے چاندی کے برابر ہو۔ اس کی قیمت لگا کر (2½) فیصد کی شرح سے اس پر زکوٰۃ عائد ہوگی۔

۳۔ سوائم:

یعنی چرنے والے وہ مویشی جو سال کا غالب حصہ چراگاہوں میں چرتے ہیں۔ ان کا نصاب اس طرح ہے:

اونٹ	پانچ (۵) عدد
بقر (گائے، بیل، بھینس)	تیس (۳۰) عدد
غنم (بھیڑ بکریاں)	چالیس (۴۰) عدد

جانوروں کی زکوٰۃ کی شرحیں مقررہ ہیں۔ ان میں بڑی تفصیلات پائی جاتی ہیں جن کو بیان کرنے کی اس مختصر کتاب میں گنجائش نہیں۔

۴۔ زرعی پیداوار:

کل زرعی پیداوار پر، بلالحاظ نصاب، زکوٰۃ عائد ہوتی ہے۔ زرعی پیداوار پر زکوٰۃ کو عشر کہتے ہیں۔ عشر کا معنی ہے دسواں حصہ۔ زمین بارش یا سیلاب یا قدرتی ندی نالے یا چشمے سے سیراب ہوتو اس پر عشر کی شرح دس فیصد ہے اور اگر کنوئیں یا ٹیوب ویل وغیرہ کسی مصنوعی ذریعے سے زمین سینچی گئی ہو تو عشر کی شرح فیصد (یعنی بیسواں حصہ) ہوگی۔

مصارف زکوٰۃ

قرآن حکیم (سورہ توبہ،۹: ۶۰) میں زکوٰۃ کے مندرجہ ذیل آٹھ مصارف بتائے گئے ہیں:

۱۔ فقراء:

فقراء جمع ہے فقیر کی۔ عربی زبان میں فقیر کا معنی ہے محتاج یعنی ایسا شخص جو کسی ایسی ضرورت سے دوچار ہو جس کو پورا کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ مثلاً کسی موذی مرض میں مبتلا ہو جس کے علاج کے لیے اس کے پاس پیسہ نہ ہو۔

۲۔ مساکین:

مساکین جمع ہے مسکین کی۔ مسکین اس شخص کو کہتے ہیں جو کام کرنے سے معذور ہو لیکن عزت نفس کا خیال اسے دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے باز رکھے۔

۳۔ عاملین:

یعنی وہ عاملین جو زکوٰۃ کی وصولی، اس کے حساب کتاب اور تقسیم وغیرہ کے امور سرانجام دیں۔ ان کی تنخواہیں زکوٰۃ سے ادا کی جائیں گی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۴۔ مؤلفۃ القلوب:

اس کا لفظی معنی ہے وہ لوگ جن کے دل جوڑے گئے ہیں اس سے مراد وہ لوگ تھے جو اسلام لائے تو بلا لحاظ اس کے کہ وہ امیر تھے یا غریب، مال و دولت سے ان کی دلجوئی کی گئی، نئے اسلام لانے والوں کی زکوٰۃ کے مال سے دلجوئی کی جا سکتی ہے، خواہ وہ امیر ہوں یا غریب۔

۵۔ غلاموں کی آزادی:

زکوٰۃ کے مال سے غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جائے۔

۶۔ غارمین:

ایسے ضامن یا مقروض جو زرِ ضمانت یا مالِ قرض ادا کرنے سے قاصر ہوں۔

۷۔ فی سبیل اللہ:

(اللہ کی راہ) اس سے مراد ان لوگوں کی مدد کرنا ہے جو اللہ کی راہ میں کوشاں ہیں اور روزی کمانے کی فرصت نہیں رکھتے۔ مثلاً جہاد کرنے والے، دین کی تبلیغ واشاعت کرنے والے، نادار طالب علم وغیرہ۔

۸۔ ابن سبیل:

اس سے مراد وہ مسافر ہیں جو حالت سفر میں محتاج ہو جائیں خواہ وہ اپنے گھر میں مالدار ہوں۔ زکوٰۃ سے مسافر کی مدد اس کی اصل حاجت کے مطابق کرنی چاہیے نہ کہ اس کی حیثیت کے مطابق۔

ادائیگی زکوٰۃ:

-1 زکوٰۃ صرف مسلمانوں سے وصول کر کے مسلمانوں کو ہی دی جا سکتی ہے یعنی غیر مسلم اس کے حق دار نہیں ہیں۔

-2 ایسے عزیز واقارب جن کی کفالت شرعی اعتبار سے ایک فرد پر فرض ہے مثلاً ماں، باپ، بیٹا، بیٹی، شوہر اور بیوی وغیرہ کو زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی البتہ دور کے عزیز، غیروں کے مقابلے میں قابل ترجیح ہیں۔

-3 عام حالات میں ایک بستی کی زکوٰۃ خود اس بستی میں تقسیم ہونی چاہیے البتہ اس بستی میں مستحق زکوٰۃ کے نہ ہونے یا کسی دوسری بستی میں ہنگامی صورت حال مثلاً سیلاب، زلزلہ، قحط وغیرہ کے مواقع پر زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔

-4 زکوٰۃ دیتے وقت یہ اطمینان کر لیا جائے کہ جس شخص کو زکوٰۃ دی جا رہی ہے وہ اس کا مستحق بھی ہے یا نہیں۔

-5 زکوٰۃ کی رقم سے ضرورت کی اشیاء کی خریداری بھی کی جا سکتی ہے۔

-6 مستحق زکوٰۃ کو بتانا ضروری نہیں کہ یہ پیسہ مال زکوٰۃ کا ہے۔

-7 سفید پوشوں کو زکوٰۃ دیتے وقت اس امر کا خیال رکھا جائے کہ ان کی سفید پوشی کا بھرم قائم رہے اور اعلانیہ یہ نہ کہا جائے کہ اسے (سفید پوش) زکوٰۃ دی گئی ہے۔

زکوٰۃ معاشی نقطۂ نظر سے:

اسلام دین اور دنیا کے امتزاج کا داعی ہے۔ اس لیے اس کی عبادات بھی اخلاقی فوز وفلاح کے ساتھ دنیوی زندگی کی اصلاح اور اس کی صحیح خطوط پر تعبیر کی بھی ضامن ہیں۔ زکوٰۃ جہاں جب مال کو کم کرتی اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے اور مال قربان کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے وہیں معاشی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نقطہ نظر سے یہ سماجی فلاح کی ایک ہمہ گیر اسکیم ہے۔ جس کے ذریعہ ملک وملت کے غریب اور نادار افراد کی مدد کی جاتی ہے اور انہیں زندگی کی جدوجہد میں برابر کی شرکت کے لائق بنایا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت یہ بات پیدا کرتی ہے کہ ہر شخص کی دولت صرف اسی کے لیے ہے اور معاشی دوڑ میں جو پیچھے رہ جائے اور جو گر جائے اسے فنا ہو جانا چاہیے۔ کشمکش حیات میں زندہ رہنے کا حق صرف اس کو ہے جو مسابقت میں دوسروں سے آگے بڑھ جائے۔ اسلام اس ذہنیت کی نفی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: جو کچھ دولت تم کھاتے ہو وہ صرف تمہاری محنتوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس میں فطرت کی بے شمار قوتیں شریک کار ہیں۔ نیز پورا معاشرہ ہزاروں طریقے پر تمہارا معاون ومددگار ہے۔ اس لیے تمہارے مال میں تمہارے علاوہ دوسروں کا بھی حق ہے۔ اہل ثروت کی ذمہ داری ہے کہ معاشی دوڑ میں جو پیچھے رہ جائے اسے سہارا دیں اور آگے بڑھائیں۔ جو معاشرہ کمزوروں کی مدد نہ کرے، ناداروں کو سہارا نہ دے، اور گرتوں کو تھام نہ لے وہ انسانی معاشرہ کہے جانے کا مستحق نہیں۔ اسلام نظام زکوٰۃ کے ذریعے سے معیشت کو صحت مند بنیادوں پر استوار کرتا ہے اور اس میں امداد باہمی کی روح کو جاری وساری کر دیتا ہے۔

جدید علم معیشت میں سماجی فلاح کا تصور بہت نیا ہے لیکن اسلام نے پہلے ہی دن سے فلاحی اور خدمتی ریاست کا تصور پیش کیا اور زکوٰۃ کی شکل میں امداد باہمی کا ایک ایسا نظام قائم کیا جس کے ذریعے سے تمام شہریوں کی بنیادی ضروریات کی ضمانت دی گئی۔ اسلامی حکومت نے ابتداء ہی اس نظام کو عملاً قائم کیا، آبادی کی مردم شماری کی، ناداروں کے رجسٹر بنائے، ہر ضرورت مند کو سرکاری وظیفے دیے اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ حال ہو گیا کہ بقول مورخ طبری زکوٰۃ دینے والے تو ہر طرف تھے مگر زکوٰۃ لینے والے نہ تھے۔

پھر زکوٰۃ دولت کی تقسیم میں غیر فطری عدم مساوات کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس ذریعہ سے امیروں کی دولت غریبوں کی طرف منتقل ہوتی ہے اور اس طرح تقسیم دولت صحت مند بنیادوں پر واقع ہوتی ہے۔

معیشت کا ایک اور بنیادی مسئلہ دولت کی ذخیرہ اندوزی کو روکنا اور سرمایہ کاری کو بڑھاتا رہا ہے۔ آج کی دنیا میں جہاں جہاں معاشی پسماندگی ہے اس کا بڑا سبب دولت کی غلط تقسیم اور صحیح سرمایہ کاری کا فقدان ہی ہے۔ زکوٰۃ کا ایک معاشی وظیفہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے سے دولت آپ سے آپ سرمایہ کاری کی طرف منتقل ہوتی ہے اس لیے کہ اگر اسے ذخیرہ کیا جائے تو ۴۰ سال میں وہ آپ سے آپ ختم ہو جائے گی۔ اس لیے اس کا فطری تقاضا یہ ہوتا ہے کہ دولت کو روک رکھنے کے بجائے کاروبار میں لگایا جاتا ہے اور اس سے معاشی ترقی رونما ہوتی ہے۔

پھر معاشی بحران کے جس چکر میں سرمایہ دارانہ دنیا گرفتار ہے اس کو دور کرنے میں بھی زکوٰۃ بڑی مفید ومعاون ہو سکتی ہے۔ تجارتی چکر سرمایہ کاری اور قوت صرفہ میں عدم توازن کی بنا پر رونما ہوتا ہے لیکن زکوٰۃ جہاں ایک طرف پیداواری عمل کو تیز تر کرتی ہے وہیں دوسری طرف عوام میں قوت خرید کا اضافہ بھی کرتی ہے۔ اس طرح یہ معیشت میں معاشی توازن قائم کرنے کا ایک خود کار آلہ بن جاتی ہے۔

زکوٰۃ ایک انقلابی معاشی تصور ہے اور یہ حقیقت بڑی افسوس ناک ہے کہ خود مسلمانوں نے ابھی تک اس کے ہمہ جہتی معاشی پہلوؤں کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اگر اس کے معاشی فوائد پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ پورے نظام معاشی کی قلب ماہیت کر دیتی ہے۔ اسے صحت منداور انسانی بنیادوں پر قائم کرتی ہے اور ایک ایسا نظام قائم کرتی ہے۔ جس میں جدوجہد کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوں اور زندگی کی نعمتیں تمام انسانوں کے لیے عام ہوں۔

زکوٰۃ کی اہمیت

زکوٰۃ اسلام کا ایک اہم رکن ہے۔ ہر صاحب نصاب پر زکوٰۃ فرض ہے۔ زکوٰۃ کا منکر مرتد اور واجب القتل ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا تھا، حالانکہ وہ لوگ اسلام کے باقی چار ارکان کو مانتے تھے۔

قرآن حکیم میں جہاں بھی اقامت صلوٰۃ کا حکم آیا ہے اس کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرنے کا بھی حکم آیا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ

ترجمہ: نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔

یہ حکم متعدد بار آیا ہے۔ زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کے لیے سخت عذاب کی وعید آئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لا فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ

ترجمہ: اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک عذاب کی بشارت دیجئے۔

حدیث شریف میں بھی زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور زکوٰۃ نہ دینے والے کے لیے دردناک عذاب کی وعید سنائی ہے۔ جس مال کی زکوٰۃ نہ دی جائے حدیث نبوی کی رو سے، وہ مال قیامت کے روز حب مال کے لیے عذاب بن جائے گا۔

اسلامی ریاست میں زکوٰۃ کی اہمیت

۱۔ اسلام کا نصب العین فلاحی ریاست Welfare State کا قیام ہے جہاں ہر شخص کی بنیادی ضروریات کی ریاست ضامن ہو۔ صحت کے لیے ضروری خوراک، ستر ڈھانپنے اور موسم کی شدت سے بچاؤ کے لیے لباس، مکان، علاج، تعلیم یہ سب بنیادی ضروریات ہیں اور ہر شخص کو لازماً ملنی چاہئیں۔ کوئی بھی شخص ان میں سے کسی بھی ضرورت سے محروم نہیں رہنا چاہیے۔ اسلامی ریاست ان کی فراہمی کی ضامن ہے۔

۲۔ اسلام ہر فرد معاشرہ کو سماجی تحفظات Social Securities مہیا کرنا چاہتا ہے۔ بیماری، بے روزگاری، مقروض یا دیوالیہ ہونے، یتیم یا بیوہ ہونے، غرض ہر ایسی مصیبت میں کہ جب انسان بے بس اور بے سہارا ہو کر مدد کا محتاج ہو جائے اسلامی ریاست پر فرض ہے کہ وہ اس کی ضروری مدد کرے۔ ہر فرد معاشرہ کو یہ احساس حاصل ہو کہ اس کا اور اس کے زیر کفالت افراد کا مستقبل محفوظ ہے اور وہ کسی بھی صورت کسمپرسی اور بے چارگی کی حالت سے دوچار نہ ہوں گے۔ ضرورت پڑنے پر ریاست ان کی مدد کو لپکے گی۔

۳۔ اسلام اس بات کا ہرگز روادار نہیں کہ دولت معاشرے کے چند افراد کے ہاتھوں میں مرتکز ہو کر رہ جائے۔ اس کی منشا تو یہ ہے کہ دولت تقسیم ہو اور گردش میں رہے۔

۴۔ اسلام اپنے پیروؤں کے دلوں سے مال و دولت کی محبت کو نکال دینا چاہتا ہے وہ انہیں دنیا کے بجائے آخرت کی اہمیت کا احساس دلانا چاہتا ہے۔ اگرچہ اسلام رہبانیت کا قائل نہیں لیکن دنیوی مال و متاع سے محبت کرنے، ان کے انبار لگانے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ وہ مال و دولت کے بجائے اللہ اور اس کی مخلوق سے محبت دیکھنا چاہتا ہے۔

ان اعلیٰ اور ارفع مقاصد کے حصول کے لیے زکوٰۃ ایک اہم اور مؤثر ذریعہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ریاست کو فلاحی بنانے اور سماجی تحفظات کی فراہمی کے لیے خاطر خواہ مقدار میں مالی وسائل کی ضرورت ہے۔ اسلامی ریاست کو یہ ضروری مالی وسائل زکوٰۃ سے فراہم ہوتے ہیں۔ زکوٰۃ کے بغیر اسلامی ریاست نہ تو ایک فلاحی ریاست بن سکتی ہے اور نہ ہی کسی فرد معاشرہ کو سماجی تحفظات مہیا کر سکتی ہے۔ دولت کو مرتکز ہونے سے روکنے اور مال و دولت کی محبت کو دلوں سے نکالنے کے لیے بھی زکوٰۃ ایک نہایت مؤثر ذریعہ ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

زکوٰۃ کے اخلاقی، روحانی اور سماجی اثرات

زکوٰۃ کے اخلاقی و روحانی اثرات

۱۔ مال پاک ہو جاتا ہے:

زکوٰۃ ادا کرنے سے مال پاک ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے مال کو اطمینان قلب کے ساتھ اپنے جائز تصرف میں لاسکتا ہے۔ جب تک وہ زکوٰۃ نہ دے اس کا مال پاک نہ ہوگا، کیونکہ اس کے مال میں غریبوں کا حق ہے۔ زکوٰۃ دینے سے غریبوں کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ نہ دینے سے وہ غریبوں کے حق کا غاصب ہوگا۔

۲۔ تزکیہ نفس:

زکوٰۃ ادا کرنے سے تزکیہ نفس حاصل ہوتا ہے۔ اپنے ہاتھ سے اور اپنی خوشی سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے جب انسان اپنے مال میں سے زکوٰۃ نکالتا ہے تو اس سے مال کی محبت کم ہوتی ہے، بخل اور کنجوسی کا جذبہ مغلوب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق استوار ہوتا ہے۔ برائیوں سے اجتناب کرتا ہے۔ مال کی بے پناہ محبت بہت سی اخلاقی برائیوں کو جنم دیتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا

ترجمہ: ''اے نبی ﷺ! ان کے اموال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) لیجیے جس کے ذریعے آپ ﷺ انہیں پاک کریں اور ان کا تزکیہ کریں۔''

۳۔ اللہ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے:

زکوٰۃ ادا کرنے سے اللہ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کا اجر دے گا۔ ارشاد ربانی ہے:

ترجمہ: ''جو نماز قائم کرتے ہیں اور ہمارے دیے ہوئے مال میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس بڑے درجات اور مغفرت اور بہترین رزق ہے (الانفال، ۸: ۳، ۴)

۴۔ نیکی (بر) حاصل ہوتی ہے:

زکوٰۃ دینے سے نیکی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بغیر نیکی ہرگز حاصل نہیں ہوسکتی۔ کوئی مسلمان خواہ کتنا ہی عبادت گزار کیوں نہ ہو، دیگر نیکیاں چاہے کتنی ہی کرتا ہو۔ جب تک اپنے اوپر عائد زکوٰۃ ادا نہیں کرے گا اسے نیکی حاصل نہیں ہوسکتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۵

ترجمہ: ''تم نیکی کو ہرگز نہیں پاسکتے جب تک کہ تم اپنی ان چیزوں میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو جو تمہیں محبوب ہیں۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۵۔ مال بڑھتا ہے:

زکوٰۃ دینے سے مال گھٹتا نہیں بلکہ بڑھتا ہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کیے ہوئے مال کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے قرض بتایا ہے اور اس کا وعدہ ہے کہ وہ اسے بڑھا دے گا۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ط وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ (التغابن: ۱۷)

ترجمہ: ''اگر تم اللہ کو قرض حسن دو تو وہ اس کو تمہارے لیے دوگنا کر دے گا اور تمہاری مغفرت کر دے گا اور اللہ قدر کرنے والا بردبار ہے۔''

سورہ البقرہ (۲: ۲۷۶) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ط

ترجمہ: ''اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔''

زکوٰۃ کے سماجی اثرات

۱۔ دولت گردش میں آتی ہے:

کسی بھی ملک کی معاشی ترقی کے لیے یہ بات اشد ضروری ہے کہ دولت مندوں کے پاس دولت منجمد ہو کر نہ پڑی رہے بلکہ معاشرے میں پھیل کر گردش میں آئے۔ زکوٰۃ کے ذریعے (2½) فیصد مال و دولت مال داروں کی تجوریوں سے نکل کر گردش میں آتی ہے۔ کافی لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر ان میں قوت خرید بڑھاتی ہے۔ وہ مارکیٹوں میں جا کر خریداری کرتے ہیں۔ اشیاء کی مانگ بڑھتی ہے پھر لامحالہ پیداوار بھی بڑھے گی۔ اگر عوام کی اکثریت قوتِ خرید سے محروم رہے تو لازماً کساد بازاری کا سامنا کرنا پڑے گا جس سے ملکی معیشت ترقی نہ کر سکے گی۔

۲۔ چند ہاتھوں میں ارتکاز دولت میں کمی:

اگر دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہو جائے جیسا کہ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام میں ہوتا ہے تو اس سے مال دار (Haves) اور نادار (Havenots) طبقوں کے درمیان تضاد و تفاوت بہت نمایاں اور گھناؤنی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ معیشت اور معاشرے دونوں کے لیے بالآخر تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ زکوٰۃ ارتکاز دولت کو کم کرتی ہے۔ اسلام چند ہاتھوں میں ارتکاز دولت کا روادار نہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ط

ترجمہ: ''تاکہ وہ (مال) تمہارے مالداروں کے درمیان ہی گردش نہ کرتا رہے۔''

۳۔ سرمایہ کاری میں اضافہ:

اگر مالدار شخص اپنے مال پر سانپ بن کر بیٹھا رہے اور کسی کاروبار میں نہ لگائے تو ہر سال زکوٰۃ ادا کرنے سے اس کا مال مسلسل گھٹتا چلا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ کوئی ہوش مند مال دار اس صورت حال کو پسند نہیں کرے گا، چنانچہ وہ اپنے مال کو زکوٰۃ کے ہاتھوں ختم ہونے سے بچانے کے لیے کسی نفع بخش کاروبار میں لگانے پر مجبور ہوگا۔ اس طرح ملک میں سرمایہ کاری کا رجحان بڑھے گا۔ سرمایہ کاری میں اضافہ سے ملکی معیشت ترقی کرے گی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۴۔ سماجی تحفظات کی فراہمی:

زکوۃ کی بدولت ریاست اس قابل ہوتی ہے کہ افراد معاشرہ کو سماجی تحفظات فراہم کر سکے۔ اگر انہیں سماجی تحفظات حاصل ہوں گے تو وہ اطمینان کے ساتھ ملکی ترقی میں اپنا کردار ادا کریں گے۔

۵۔ جرائم میں کمی:

اگر معاشرے کی صورت یہ ہو کہ ہر شخص کو تن تنہا اپنی بقاء کی جنگ لڑنی پڑے۔ اس کا اور اس کے بال بچوں کا مستقبل غیر یقینی اور غیر محفوظ ہو۔ اسے اس طرف سے اطمینان نہ ہو کہ کسی ناگہانی مصیبت، بیماری، حادثہ وغیرہ کی صورت میں اس کے اہل خانہ عزت و آبرو کی زندگی بسر کر سکیں گے تو وہ اپنے اہل خانہ کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے دولت جمع کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ دولت کے حصول کے لیے جرائم کے ارتکاب سے بھی گریز نہیں کرے گا۔ اس طرح معاشرے میں اخلاقی و معاشی جرائم میں اضافہ ہوگا۔ اس کے برعکس زکوۃ کے نظام سے چونکہ فرد اپنی بقاء کی جنگ تن تنہا نہیں لڑتا بلکہ پورا معاشرہ اس کی پشت پر ہوتا ہے، اسے اطمینان ہوتا ہے کہ ناگہانی مصیبت کی صورت میں حکومت زکوۃ سے اس کی خاطر خواہ مدد کر کے اسے سنبھال لے گی۔ اس کی اور اس کے اہل خانہ کی بنیادی ضروریات بہر صورت پوری ہوتی رہیں گی تو اسے کیا ضرورت ہوگی جرائم کا ارتکاب کرنے کی۔

۶۔ طبقاتی کشمکش میں کمی:

اگر امراء اپنے معاشرے کے غریب و نادار لوگوں کے ساتھ بے حسی اور لاپرواہی کا رویہ رکھیں، جیسا کہ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کا خاصہ ہے تو غریب لوگوں کے دلوں میں امیروں کے خلاف نفرت کا پیدا ہو جانا ایک فطری اور لازمی امر ہے۔ زکوۃ کے نظام میں چونکہ امراء غریبوں کی خبر گیری کرتے ہیں اور انہیں مالی امداد فراہم کرتے ہیں (حکومت کی وساطت سے) اس لیے غریب لوگوں کے دلوں میں ان کے خلاف پائی جانے والی نفرت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اس سے طبقاتی کشمکش اور منافرت بھی کمزور پڑ جاتی ہے جس کے نتیجے میں معاشرے کے افراد امن و سکون کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ امن و سکون کی فضا ملکی ترقی کے لیے نہایت مفید اور ضروری ہوتی ہے۔

۷۔ دینی وقومی بہبود کے کام:

زکوۃ سے بہت سے دینی وقومی بہبود کے کام سرانجام دیئے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ زکوۃ کا ایک مصرف ''فی سبیل اللہ'' بھی ہے۔ دین کی تبلیغ واشاعت، جہاد فی سبیل اللہ اور نادار طلبہ کی امداد کے کاموں پر زکوۃ خرچ کر کے دین کے فروغ اور قومی وملکی بہبود کے کام کیے جاسکتے ہیں۔

صوم رمضان (روزہ)

معنی ومفہوم:

صوم یا صیام کا لغوی معنی ہے کسی کام یا چیز سے رک جانا دینی اصطلاح میں اس سے مراد صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک عبادت کی نیت کے ساتھ کھانے پینے اور مباشرت سے پرہیز کرنا ہے۔

لغوی اعتبار سے روزے کا مطلب ہے رک جانا۔ باز رہنا، ٹھہر جانا لیکن شرعی اصطلاح میں اس سے مراد فجر سے لے کر مغرب تک کھانے پینے اور فعل جنسی اور دیگر برائیوں سے مکمل طور پر اجتناب کرنا ہے۔ امام راغب کہتے ہیں روزہ اصل میں کھانے، کلام کرنے اور چلنے سے رک جانا ہے (المفردات فی غرائب القرآن)۔

قرآن وحدیث میں صوم وصیام کے الفاظ آئے ہیں برصغیر پاک وہند میں اسے روزہ کہا جاتا ہے۔ بنیادی اسلامی عبادت اور اسلام کے ایک رکن کی حیثیت سے اس سے مراد ماہ رمضان کے روزے لی جاتی ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

فرضیت:

ماہِ رمضان کے روزے ہر عاقل، بالغ اور مقیم مرد و زن پر فرض ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ

ترجمہ: ''اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض ٹھہرایا گیا ہے جیسے ان پر فرض ٹھہرایا گیا تھا جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار بنو۔''

اسی سورت میں تھوڑا آگے حکم ربانی ہے:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ط

ترجمہ: ''پس تم میں سے جس نے یہ مہینہ (یعنی رمضان المبارک) پایا تو وہ اس میں روزے رکھے۔''

روزے کی اہمیت اور مقام

حصول تقویٰ:

روزے کی اہمیت کے بارے میں قرآن وحدیث میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر آیا ہے۔ سورہ البقرہ آیت 183 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ

ترجمہ: ''اے ایمان والو! تم پر روزہ اس طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے دوسرے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔''

اس آیت کریمہ سے جہاں روزے کی فرضیت ثابت ہے وہاں اس فرض کی حکمت بھی بیان کی گئی ہے یعنی حصول تقویٰ۔

امت محمدی ﷺ پر روزے کی فرضیت:

امت محمدی ﷺ پر روزہ ہجرت کے دوسرے سال فرض ہوا۔ سورہ البقرہ آیت 185 میں ارشاد ربانی ہے:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ

ترجمہ: ''جو تم میں سے یہ مہینہ پائے تو اسے چاہیے کہ وہ روزے رکھے۔''

حدیث شریف میں آتا ہے: رمضان کا چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور شوال کا چاند دیکھ کر تمام کرو۔ اس لیے روزہ ہر تندرست مسلمان، عاقل، بالغ، مقیم مرد و عورت امیر و غریب پر فرض ہے۔

روزے کی فرضیت کی شرائط:

روزے کی اہمیت کے بارے میں قرآن وحدیث میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر آیا ہے۔ سورہ البقرہ آیت 183 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۝

ترجمہ: "اے ایمان والو! تم پر روزہ اس طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے دوسرے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔"

اس آیت کریمہ سے جہاں روزے کی فرضیت ثابت ہے وہاں اس فرض کی حکمت بھی بیان کی گئی ہے یعنی حصول تقویٰ۔

روزے کی فرضیت کی تین شرائط ہیں:

1- اسلام 2- بلوغ 3- درستی ہوش وحواس

نابالغ اور مجنون پر روزے فرض نہیں اور فرضیت ادا کی دو شرطیں ہیں تندرستی اور افاقہ۔

بیمار کو حالت بیماری میں اور مسافر کو حالت سفر میں افطار کر لینا جائز ہے مگر پھر قضا دینا ہے اس ضمن میں اللہ تعالیٰ سورہ البقرہ کی آیت 184 میں فرماتے ہیں:

اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ط فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ط

ترجمہ: "گنتی کے دن ہیں تو تم میں جو کوئی بیمار یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں رکھیں۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی آسانی کے لیے یہ فرمایا کہ جو روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں انہیں چاہیے کہ وہ اس کے بدلے میں کسی مسکین کو کھانا کھلائیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: "اور جنہیں اس کی طاقت نہ ہو وہ بدلہ دیں ایک مسکین کا کھانا۔"

اس کے ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ روزے رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو۔ اسی سورہ کی آیت 185 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: "تو تم میں جو کوئی یہ مہینہ پائے ضرور اس کے روزے رکھے۔"

قرآن پاک کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ احادیث نبوی ﷺ کی روشنی میں روزے کی اہمیت کو واضح کیا جائے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کیے اور میں نے تمہارے لیے نماز تراویح تجویز کی پس جو لوگ روزے رکھیں گے اور تراویح پڑھیں گے ایمان اور احتساب کے ساتھ تو وہ اپنے گناہوں سے اس طرح پاک ہوں گے جیسے اس دن جبکہ وہ پیدا ہوئے تھے، گناہوں سے پاک تھے۔"

ترمذی اور ابوداؤد کی حدیث میں ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

ترجمہ: "جو شخص رمضان کا ایک روزہ بھی بلا عذر شرعی (سفر اور مرض) میں چھوڑ دے پھر مدت عمر روزے رکھے تو اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

روزے کے بارے میں اللہ تعالی فرماتے ہیں:

اَلصَّوْمُ لِیْ: روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔ روزہ کی جزا اللہ تعالی خود ہی دیں گے۔

مذکورہ بالا احادیث اور آیات پر غور کرنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ فرضیت صیام کے مقاصد ہیں۔

ضبط نفس اور اخلاقی تربیت:

روزہ ایک ایسی عبادت ہے کہ جس سے ایسی خواہشات پر قابو پانے کی تربیت حاصل ہوتی ہے جو روزے کی ممنوعات میں سے ہیں یعنی کھانا پینا اور جنسی فعل سے مکمل طور پر اجتناب۔ یہ دو ایسی خواہشات ہیں کہ عام حالات میں ان پر قابو پانا مشکل ہوتا ہے لیکن ماہ رمضان میں جو شخص روزہ رکھتا ہے وہ اللہ تعالی کے احکامات کی تکمیل کے لیے ان خواہشات کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے اس کے ساتھ ساتھ انسان ایسی بری، لغو، مکروہ اور بے ہودہ باتوں سے بھی احتراز کرتا ہے جسے معمول کے مطابق کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ چونکہ روزہ انسانی ذات تک محدود ہوتا ہے اس لیے ان اقدامات کی تکمیل کے لیے اس میں خوف خدا اور خود ضبطی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور یہی ضبط نفس ہے اور یہی تقوی ہے جو انسان کو ہر قسم کی برائی سے محفوظ رکھتا ہے۔ اسی لیے حدیث میں روزے کو ڈھال سے تشبیہ دی گئی ہے۔ روزے کا اصل مقصد ہی انسان کی خواہشات کو احکام الہی کے تابع کر کے اسے متقی بنانا ہے۔ جو شخص ہر سال ایک مہینہ تک اللہ تعالی کی خوشنودی حاصل کر لیتا ہے اسے ضبط نفس کی ایسی قوت حاصل ہو جاتی ہے کہ جس سے وہ شیطان کی ہر ترغیب کا آسانی سے مقابلہ کر سکتا ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے:

ترجمہ: ''جس نے اپنے نفس کو پاکیزہ کر لیا اس نے فلاح پائی اور جس نے ایسا نہ کیا اس نے اپنے آپ کو تباہ کیا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ شریف اور معزز اور سعادت مند انسان وہی ہے جو اپنے نفس پر قابو حاصل کرے اور اسے پاکیزہ بنائے۔

روزے کا حکم دینے کا بھی یہی فلسفہ ہے کہ نفس کی قوت کو توڑنے کے لیے اور اپنی تمام قوتوں کو اعتدال میں لانے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی دخل نہیں۔

رخصتیں:

۱۔ اگر کوئی شخص بیمار ہو اور اس میں روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو، یا روزہ رکھنے سے اس کے مرض کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو تو اسے رخصت ہے کہ روزہ نہ رکھے اور رمضان کے بعد مناسب وقت پر قضا کرے۔

۲۔ سفر میں روزہ رکھنے کی رخصت ہے بشرطیکہ سفر کم از کم تین منزل یعنی ۴۸ میل کی مسافت کا ہو اور منزل پر پندرہ دن سے زیادہ قیام کا ارادہ نہ ہو۔ سفر میں جتنے روزے رہ جائیں گے بعد میں ان کی قضا کرے۔

۳۔ عمر رسیدہ اور کمزور آدمی چاہے تو روزہ نہ رکھے۔ اس کی جگہ فدیہ ادا کرے۔ فدیہ یہ ہے کہ ہر روزہ کے بدلے میں ایک مسکین کو دو وقت کا کھانا کھلائے یا کھانے کے برابر جنس دے دے۔

۴۔ بچے کو دودھ پلانے والی ماں کی رخصت ہے کہ رمضان کے روزے نہ رکھے تاکہ بچے کے لیے دودھ میں کمی واقع نہ ہو۔ رمضان کے بعد ان روزوں کو قضا کرے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نماز کی طرح روزہ بھی زمانہ قدیم سے انبیا کی شریعتوں کا لازمی جز رہا ہے۔ نماز روزمرہ کا عمومی نظام تربیت ہے اور روزہ سال بھر میں ایک ماہ غیر معمولی نظام تربیت ہے جو آدمی کو تقریباً ۲۰ گھنٹے تک اپنے مضبوط ڈسپلن کے شکنجے میں کسے رکھتا ہے تاکہ روزانہ کی تربیت سے جو خرابیاں رہ گئی ہوں وہ دور ہو جائیں۔

روزے کا قانون یہ ہے کہ آخر شب طلوع سحر کی پہلی علامات ظاہر ہوتے ہی آدمی پر یکا یک کھانا پینا اور مباشرت کرنا حرام ہو جاتا ہے اور غروب آفتاب تک پورے دن حرام رہتا ہے۔ شام آتے ہی حرمت کا بند اچانک ٹوٹ جاتا ہے، جو چیزیں ایک لمحہ پہلے تک حرام تھیں اب حلال ہو جاتی ہیں تا آنکہ دوسرے روز کی مقررہ ساعت آجاتی ہے۔ ماہ رمضان کی پہلی تاریخ سے یہ عمل شروع ہوتا ہے اور ایک مہینہ تک مسلسل اس کی تکرار جاری رہتی ہے، گویا پورے تیس دن انسان ایک شدید ترین ڈسپلن کے تحت رہتا ہے۔

روزہ کے مقاصد

۱۔ احساس بندگی:

اس نظام تربیت پر غور کرنے سے جو بات پہلی نظر میں واضح ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام اس طریقے سے انسان کے شعور میں اللہ کی حاکمیت کے اقرار و اعتراف کو مستحکم کرنا چاہتا ہے اور اس شعور کو اتنا مستحکم بنا دیتا ہے کہ احکام الٰہی کے روبرو انسان اپنی آزادی اور خود مختاری سے دست بردار ہو جائے۔ خدا کا وجود محض ایک مابعد الطبیعی عقیدہ نہ رہے بلکہ عملی زندگی میں محسوس و کارفرما ہو جائے۔ کفر اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان خدا کے مقابلے میں اپنے آپ کو خود مختار محسوس کرے اور اس کے مقابلے میں اسلام یہ ہے کہ انسان ہر آن اپنے آپ کو خدا کا بندہ اور محکوم محسوس کرے اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا نماز کا مقصد اس شعور بندگی کی یاد دہانی ہے، اسی طرح رمضان کے روزے سال میں ایک مرتبہ پورے ۲۰ گھنٹے پیہم اس شعور کو ذہن پر قائم رکھتے ہیں تاکہ سارے سال انسان کے ذہن پر اس کے اثرات قائم رہیں۔

۲۔ اطاعت امر:

احساس بندگی کے ساتھ ساتھ جو چیز لازمی پیدا ہوگی وہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو جس خدا کا بندہ سمجھ رہا ہے اس کی اطاعت کرے۔ ان دونوں میں فطری طور پر ایسا ربط ہے کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ آپ جس کی خداوندی کا اعتراف کریں گے لازماً اطاعت بھی اسی کی کریں گے۔ اور احساس بندگی جس درجہ شدید ہوگا اطاعت امر بھی اتنی ہی شدت سے ہوگی۔ چنانچہ روزے کا مقصد احساس بندگی کی یاد دہانی کے ساتھ ہی ساتھ اطاعت امر کی تربیت دینا بھی ہے۔ روزہ انسان کو مہینہ مہینہ بھر کئی کئی گھنٹے اس حالت میں رکھتا ہے کہ اس کو اپنی ابتدائی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی خداوند عالم سے اذان و اجازت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اپنی خواہش ہو یا دوسروں کی، انسان بلا اذان خداوندی روزہ نہیں چھوڑ سکتا؛ اس طرح اس کی اطاعتیں ہر طرف سے سمٹ کر ایک مرکزی اقتدار کی طرف پھر جاتی ہیں۔

روزے میں اگرچہ بظاہر صرف دو خواہشات (غذا اور صنفی خواہش) پر پابندی لگائی گئی ہے لیکن اس کی اصل روح یہ ہے کہ انسان پر بندگی کا احساس پوری طرح طاری رہے۔ اس کے بغیر اگر انسان محض بھوکا پیاسا رہ لے تو یہ روزہ لاش کی طرح بے روح ہوگا۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ "جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو خدا کو کوئی حاجت نہیں کہ وہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔" اسی طرح ایک حدیث میں آیا ہے کہ "کتنے ہی روزہ دار ہیں کہ روزے سے بھوک اور پیاس کے سوا انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔" ان دونوں احادیث میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ روزے کا مقصد بھوکا پیاسا رہنا نہیں بلکہ تقویٰ اور طہارت ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۳۔ تعمیر سیرت:

روزے کا تیسرا مقصد انسان کی سیرت کی تعمیر ہے۔ اس سیرت کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔ تقویٰ سے مراد کوئی خاص شکل وصورت اختیار کرنا نہیں ہے بلکہ قرآن اس کو بڑے وسیع مضمون میں استعمال کرتا ہے وہ پوری انسانی زندگی کے ایسے رویے کو تقویٰ کے نام سے تعبیر کرتا ہے جس کی بنیاد احساس بندگی اور ذمہ داری پر ہو (اس کے مخالف رویے کا نام قرآن کی رو سے فجور ہے)۔ دنیا کے فساد کا سبب فجور ہے۔ اور دیگر عبادات کی طرح روزے کا مقصد بھی یہ ہے کہ انسان میں فجور کے رجحانات ختم کیے جائیں اور تقویٰ کو نشوونما دیا جائے۔ اب دیکھیے کہ روزہ کس طریقے سے اس کام کے سرانجام دینے میں مدد دیتا ہے۔

ایک شخص سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے تم پر پابندی لگائی ہے کہ صبح سے شام تک کچھ نہ کھاؤ۔ نہ صرف جلوت میں بلکہ خلوت میں بھی اکل وشرب سے پرہیز کرو۔ اب ایسی صورت میں اگر کوئی شخص روزے کی تمام شرائط پوری کرتا ہے تو غور کیجیے کہ اس کے نفس میں کس قسم کی کیفیات ابھرتی ہیں۔

اول، تو یہ کہ اسے خدا کے عالم الغیب ہونے کا پورا یقین ہے اور یہی یقین ہے جو اسے تنہائی میں بھی روزے کی حدود کا پابند رکھتا ہے۔

دوم، اس کو آخرت اور حساب وکتاب پر پورا ایمان ہے اس لیے کہ اس کے بغیر کوئی شخص ۱۲، ۱۴ گھنٹے بھوکا نہیں رہ سکتا ہے۔

سوم، اس کے اندر اپنے فرض کا احساس ہے، بغیر اس کے کہ کوئی شخص اس پر کھانے پینے کی پابندی لگائے اس نے خود سے اپنے اوپر یہ پابندی عائد کرلی۔

چہارم، مادیت اور روحانیت کے انتخاب میں اس نے روحانیت کو منتخب کرلیا اور دنیا اور آخرت کے درمیان ترجیح کا سوال جب اس کے سامنے آیا تو اس نے آخرت کو ترجیح دی۔ اس کے اندر اتنی طاقت تھی کہ اخلاقی فائدے کی خاطر مادی نقصان برداشت کرلیا۔

پنجم، وہ اپنے آپ کو اس معاملے میں آزاد نہیں سمجھتا کہ سہولت دیکھ کر مناسب موسم میں روزے رکھ لے بلکہ جو بھی وقت مقرر کیا گیا ہے، اس نے اس کی پابندی کی ہے۔

ششم، اس میں صبر واستقامت، تحمل، یکسوئی اور دنیوی تحریصات کے مقابلے کی طاقت کم ازکم اتنی ہے کہ رضائے الٰہی کے بلند نصب العین کی خاطر وہ ایک ایسا کام کرتا ہے جس کا نتیجہ مرنے کے بعد دوسری زندگی کو ملتوی کردیا گیا ہے۔

یہ کیفیات، جو روزہ رکھنے کے ساتھ انسان کی زندگی مین ابھرتی ہیں، روزوں میں عملاً ایک طاقت بن جاتی ہیں اور ہر سال ایک ماہ روزہ رکھتے رکھتے یہ انسان کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہیں۔

۴۔ ضبط نفس:

اس تربیت کے ضابطے میں پابندی کے لیے دو خواہشوں کو خاص طور پر منتخب کیا گیا ہے۔ یعنی بھوک اور جنسی خواہش۔ اور ان کے ساتھ تیسری خواہش آرام کرنے کی خواہش بھی زد میں آجاتی ہے اس لیے کہ تراویح پڑھنے اور سحری کے لیے اٹھنے سے اس پر بھی کافی ضرب پڑتی ہے۔

بقائے نفس کے لیے غذا اور آرام اور بقائے نسل کے لیے توالد وتناسل حیوانی زندگی کے مطالبات میں اصل بنیاد کا حکم رکھتے ہیں۔ انسان کے حیوانی جسم کے اہم ترین مطالبات ہی ہیں اور چونکہ وہ ذرا اونچے قسم کا حیوان ہے لہٰذا وہ صرف غذا ہی نہیں مانگتا بلکہ اونچی قسم کی اور نت نئی غذائیں تلاش کرتا ہے۔ یہی حال دیگر خواہشات کا ہے کہ ان میں بھی انسان کا مطالبہ محض جسمانی تسکین نہیں رہ جاتا، ہزاروں نزاکتیں اور باریکیاں نکل آتی ہیں۔ اب اگر انسان کا مطمع نظر یہ بن جائے کہ کسی طرح ان خواہشات کی تسکین کرتا رہے تو یہ خواہشات نفس انسانی پر سوار ہوجاتی ہیں۔ اس کے برخلاف اگر انسان ارادے کی باگیں مضبوطی سے تھامے رہے تو ان خواہشات کو اپنے پیچھے اور مرضی کے مطابق چلا سکتا ہے۔ روزے کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد انسان کو اس کے حیوانی جسم پر اقتدار بخشنا ہے۔ مذکورہ بالا تین خواہشات، جو انسان کی تمام حیوانی خواہشات میں سب سے زیادہ اہم ہیں، روزہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ان تینوں کو گرفت میں لے لیتا ہے اور ان کے منہ میں مضبوط لگام دے کر راسیں ہمارے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ تیس دن کی مسلسل مشق کا مقصد یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ہمارا نفس ہم پر غلبہ حاصل کرلے ہم اپنے خادم پر پورا اقتدار حاصل کرلیں۔ جس خواہش کو چاہیں روک دیں اور اپنی خواہشات کا مقابلہ کرنے کی کبھی عادت نہ رہی ہو اور جو نفس کے ہر مطالبے پر بے چون و چرا سر جھکا دینے کا خوگر رہا ہو اور جس کے لیے حیوانی جبلت کا داعیہ ایک فرمان واجب الاذعان کا حکم رکھتا ہو، وہ دنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا۔

یہاں روزے اور غیر اسلامی نفس کشی کی مشقوں کا اصولی فرق ذہن میں رکھنا چاہیے اس لیے کہ یہ دوسری قسم کا اقتدار تو دراصل ایک جاہل، مطلق العنان خودی کا استبداد ہے جو اپنے سے بالاتر کسی حاکم کی مطیع اور کسی ضابطہ وقانون کی پابند نہیں ہے۔ اس اقتدار کے لیے انسان خود اپنی فطرت سے لڑتا ہے اور جسم اور نفس سے ان کے جائز حقوق چھینتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی روزہ جس خودی کو نفس اور جسم پر اقتدار دیتا ہے وہ مطلق العنان خودی نہیں بلکہ خدا اور اس کے قانون کی اطاعت کرنے والی خودی ہے۔ ایسی خودی جو خدا کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت، علم اور کتاب منیر کی رہنمائی میں چلنے والی ہے، وہ خدا کے دیے ہوئے نفس و جسم کو اپنی ملکیت نہیں سمجھتی بلکہ اسے خدا کی امانت مان کر اس پر خدا کی منشا کے مطابق حکومت کرتی ہے۔ ایسی خودی کا حامل اپنے جسم پر ظلم نہیں کرتا بلکہ اس کو تمام جائز راحتیں بہم پہنچاتا ہے لیکن وہ اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ حدود اللہ کو توڑ ڈالے۔

احکام رمضان

فرمودات رسول ﷺ کی روشنی میں

☆ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''تم روزہ نہ رکھو جب تک رمضان کا چاند نہ دیکھ لو اور روزے موقوف نہ کرو جب تک شوال کا چاند نہ دیکھ لو پس اگر چاند بادلوں میں چھپا ہو تو (تیس) روزوں کی گنتی پوری کرلو۔

☆ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حمزہ بن عمرو اسلمی نے رسول کریم ﷺ سے عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ! میں روزے رکھا کرتا ہوں تو کیا سفر میں بھی روزہ رکھوں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیرا جی چاہے تو روزہ رکھ نہ چاہے تو نہ رکھ۔''

☆ ایک سفر کے موقع پر ایک شخص بدحال ہو کر گر گیا اور اس کے گرد لوگ جمع ہو گئے۔ نبی ﷺ نے یہ حال دیکھ کر دریافت فرمایا: ''کیا معاملہ ہے؟'' عرض کیا گیا یہ روزے سے ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ نیکی ہرگز نہیں۔'' یعنی مسافر کے لیے ضروری نہیں کہ وہ روزہ رکھے اور خواہ مخواہ تکلیف اٹھائے۔

☆ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دشمن سے مقابلہ درپیش ہے اس لیے روزہ چھوڑ دو تا کہ تمہیں لڑنے کی قوت حاصل ہو۔''

☆ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:
''روزہ ڈھال ہے پس جب تم میں سے کوئی روزہ دار ہو تو اسے چاہیے کہ بیہودہ نہ بکے اور جہالت کا رویہ اختیار نہ کرے۔ اگر کوئی شخص اسے گالی بکے یا لڑے تو کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں۔''

☆ نبی اکرم ﷺ سورج ڈوبتے ہی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو آواز دیتے تھے کہ لاؤ ہمارا شربت۔ بلال رضی اللہ عنہ عرض کرتے: ''یارسول اللہ ﷺ! ابھی تو دن چمک رہا ہے۔'' آپ ﷺ فرماتے: ''جب رات کی سیاہی مشرق سے اٹھنے لگے تو روزے کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔''

☆ حضرت عدی رضی اللہ عنہ بن حاتم روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے روزے کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب سفید اور کالے دھاگے میں امتیاز پیدا ہو جائے تب سے روزہ شروع کرو۔'' میں نے دو سفید اور کالے دھاگے بنائے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اور انہیں دیکھ کر روزہ شروع کرنے لگا۔ رسول کریم ﷺ کے علم میں یہ بات آئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اس سے مراد رات اور دن میں تمیز پیدا ہوتا ہے۔"

نماز تراویح:

رمضان المبارک میں مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے نماز تراویح ادا کرنا سنت موکدہ ہے کیونکہ حضور ﷺ نے یہ نماز پڑھی ہے تراویح کی جماعت کرنا سنت کفایہ ہے۔

تراویح کی تعداد آٹھ یا بیس رکعتیں ہیں دو دو رکعت کی نیت کے ساتھ ہر چہار رکعت کے بعد تھوڑی دیر بیٹھنا مستحب ہے۔ اس کو ترویحہ کہتے ہیں۔ اس تسبیح کا پڑھنا افضل ہے۔ تسبیح کے الفاظ یہ ہیں:

سبحان ذی الملک والملکوت سبحان ذی العزة وَالْعَظَمَة والهیبة والقدرة ط والکبریاء والجبروت ط سبحان الملک الحی الذی لاینام ولایموت ط سبوح قدوس ربنا ورب الملئکة والروح اللهم اجرنا من النار یا مجیر یا مجیر یا مجیر.

تراویح کا وقت عشاء کے بعد سے لے کر فجر تک ہے۔ نماز تراویح بلا عذر بیٹھ کر پڑھنی مکروہ ہے۔

اعتکاف:

شرعی اصطلاح میں اعتکاف کے معنی ہیں کہ انسان کا مسجد یا گھر کے کسی معین گوشہ میں بحالت روزہ عبادت کی نیت سے جم کر بیٹھ جانا اور سوائے طبعی حاجات کے وقت مقررہ تک اس گوشہ سے نہ نکلنا یہ اعتکاف مسنون ہے کیونکہ حضور ﷺ ہمیشہ کیا کرتے تھے۔ اعتکاف کے متعلق مختصر طور پر اتنا جان لینا چاہیے کہ معتکف گویا سب سے کٹ کر حق تعالیٰ سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ دنیاوی امور و مشاغل سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لیتا ہے اور خود کو عبادت الٰہی کے لیے وقف کر دینا گویا دنیا کے سامنے رجوع الی اللہ کا ایک کامل نمونہ ہوتا ہے۔

اعتکاف رمضان المبارک کے آخری عشرے میں کیا جاتا ہے۔

روزے کے اخلاقی، روحانی اور سماجی اثرات

روزے کے اخلاقی و روحانی اثرات

۱۔ تقویٰ پیدا ہوتا ہے:

خود باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ روزے اس لیے فرض کیے گئے ہیں تا کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔ روزے میں انسان ممنوع اور حرام چیزیں تو کجا بعض حلال چیزوں سے بھی پرہیز کرتا ہے۔ رمضان المبارک میں یہ ٹریننگ اسے بعد میں بھی برائیوں سے اجتناب کرنا سکھاتی ہے۔

۲۔ ضبط نفس:

روزے سے انسان کے اندر ضبط نفس کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ روزہ ضبط نفس کی تربیت ہے اور ضبط نفس کا ملکہ تعلقات اور دینوی امور میں کامیابی کا ضامن ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۳۔ اخلاص:

روزے سے انسان کے اندر اخلاص پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی عبادت ہے جو محض بندے اور خدا کو ہی معلوم ہوتی ہے۔ انسان تنہائی میں بھی ممنوعہ چیزوں سے پرہیز کرتا ہے، صرف اللہ کے لیے۔ روزے میں دکھاوا، ریاکاری اور کوئی دنیوی مفاد و منفعت مقصود ہی نہیں ہوتے۔

۴۔ دوسروں کی محرومیوں کا احساس:

روزے میں انسان بھوک پیاس برداشت کرتا ہے تو اسے دوسرے غریب بھائیوں کی محرومیوں کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اس سے اس کے اندر غریبوں سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

۵۔ طبی فائدے:

روزے سے پیٹ کی کئی بیماریوں سے نجات ملتی ہے۔ پیٹ کی کئی بیماریاں بسیار خوری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ موٹاپا جو کئی بیماریوں کا موجب ہے روزہ رکھنے سے کم ہوتا ہے اور بھی کئی طبی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

۶۔ قبول دعا:

روزہ دار سے اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتا ہے، اس لیے روزہ دار کی دعا قبول ہوتی ہے۔ ارشاد نبوی ہے کہ افطار کے وقت روزہ دار کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔

۷۔ اجر عظیم:

روزہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے اس لیے اس کا اجر بھی عظیم ہے۔ حدیث قدسی ہے کہ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔ انہ لی وانا اجزی بہ۔

۸۔ رمضان المبارک کی فضیلت:

رمضان کے مبارک مہینے میں قرآن حکیم اتارا گیا۔ اسی مہینے میں ایک رات ہے جسے لیلۃ القدر کہتے ہیں جس میں عبادت ایک ہزار مہینوں کی عبادت سے افضل ہے۔

۹۔ شکر:

شکر دو قسم کا ہوتا ہے قولاً اور عملاً۔ روزہ عملی شکر کی بہترین مثال ہے دن بھر بھوک پیاس سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انسان خلوص دل سے اعتراف کرتا ہے اور اس کے دل میں شکر الٰہی بجالانے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

۱۰۔ رُشد:

کیونکہ ماہ مبارک میں انسان ہر برائی سے بچنے کی کوشش کرنے کے ساتھ ساتھ دل لگا کر عبادت الٰہی انجام دیتا ہے اس لیے اس کا ایمان پختہ تر ہوتا ہے گویا روزہ انسان کی رشد و ہدایت کا سبب بھی بنتا ہے۔

۱۱۔ بھوک پیاس کا احساس:

یہ ایک ایسا جذبہ ہے کہ جس سے دوسرے کے احساسات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے غریبوں اور ناداروں کے لیے دل میں ہمدردی کے جذبات مزید پیدا ہوتے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۱۲۔ حوصلہ مند قوم کی تشکیل:

روزے نے مسلمان قوم کو ایک حوصلہ مند مشقت پسند قوم بنادیا ہے روزے نے مسلمانوں کے اندر مشکلات اور مصائب کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کی ہے اور انہیں بتایا ہے کہ وہ بھوکے اور پیاسے رہ کر اس کارگاہ حیات میں کس طرح آگے بڑھ سکتے ہیں۔

۱۳۔ تعمیر سیرت:

دنیا میں عبادت اور ریاضت کی بے شمار صورتیں ہیں جو دنیا کے مختلف مذاہب نے پیش کی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ روزہ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی ریاضت نہیں۔ روزہ انسان کی سیرت کی تعمیر کرتا ہے اطاعت الٰہی اور بندگی کا بہترین ذریعہ ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ روزہ ہی تھا جس نے کہ مسلمانوں کو ناقابل تسخیر قوم بنادیا اور اس قوم نے دنیا کی تاریخ اور دنیا کا نقشہ ہی بدل ڈالا۔

روزے کے سماجی اثرات

اگرچہ روزہ انفرادی فعل ہے لیکن نماز کے باجماعت ہونے کی وجہ سے جس طرح نماز اجتماعی فعل بن جاتی ہے اسی طرح روزہ رکھنے کے لیے ایک خاص مہینے کے تقرر نے اس فعل کو ایک اجتماعی عمل بنادیا ہے۔ اس حکیمانہ تدبیر سے روزے کے اخلاقی و روحانی منافع میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی طرف یہاں چند مختصر اشارات کیے جاتے ہیں:

جماعتی احساس:

اجتماعی عمل کا ایک دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے لوگوں میں فطری اور اصلی وحدت پیدا ہوتی ہے۔ نسل یا زبان کا اشتراک فطری قومیت پیدا نہیں کرتی۔ آدمی کا دل صرف اسی سے ملتا ہے جو خیالات اور عمل میں اس سے ملتا ہے۔ یہی وہ اصلی رشتہ ہے جو دو آدمیوں کو ایک دوسرے سے باندھتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے گردوپیش کے لوگوں کو ذہنیت اور عمل میں اپنے سے مختلف پاتا ہے تو صریح طور پر اپنے آپ کو ان کے درمیان اجنبی محسوس کرتا ہے۔ مگر جب بہت سے لوگ مل کر ایک ہی ذہنی عمل کے ساتھ ایک ہی عمل کرتے ہیں تو ان میں باہمی یگانگت، رفاقت، یک جہتی اور برادری کے گہرے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں۔ نیکی ہو یا بدی دونوں صورتوں میں اجتماعی نفسیات اسی طرح کام کرتی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ بدی کے راستے میں افراد کی نفسیات کا دخل رہتا ہے جس کا فطری میلان فرد فرد کو پھاڑ کر الگ کردینے کی طرف ہے۔ اس بنا پر برادری مستحکم نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف نیکی کے راستے میں نفسیات دبتی ہے اور نیک خیالات و افعال کا اشتراک بہترین رشتۂ اخوت پیدا کردیتا ہے۔

امداد باہمی کی روح:

اس اجتماعی عبادت کا تیسرا زبردست کام یہ ہے کہ یہ عارضی طور پر تمام لوگوں کو ایک سطح پر لے آتی ہے، اگرچہ امیر امیر ہی رہتا ہے اور غریب غریب، لیکن روزہ چند گھنٹوں کے لیے امیر پر بھی وہی کیفیت طاری کردیتا ہے جو اس کے فاقہ کش بھائی پر گزرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی مصیبت حقیقی طور پر محسوس کرتا ہے۔ اور خدا کی رضا کا جذبہ اسے غریب بھائیوں کی مدد پر اکساتا ہے۔ جس قوم کے امیروں میں غریبوں کی تکلیف کا احساس اور ان کی عملی ہمدردی کا جذبہ ہو اور جہاں صرف اداروں ہی کو خیرات نہ دی جاتی ہو بلکہ فرداً فرداً بھی حاجت مندوں کو تلاش کرکے مدد پہنچائی جاتی ہو، وہاں نہ صرف یہ کہ قوم کے کمزور حصے تباہ ہونے سے بچ جاتے ہیں اور اجتماعی فلاح برقرار رہتی ہے بلکہ غربت اور امارت میں حسد و نفرت کے بجائے محبت اور شکر گزاری کے تعلقات استوار ہوتے ہیں اور وہ طبقاتی کشمکش کبھی رونما نہیں ہوسکتی جو ان قوموں میں برپا ہوتی ہے جن کے مالدار لوگ جانتے ہی نہیں کہ فقر و فاقہ کیا چیز ہوتی ہے اور جو قحط کے زمانے میں تعجب سے پوچھتے ہیں کہ لوگ بھوکے کیوں مر رہے ہیں — انہیں روٹی نہیں ملتی تو وہ کیک کیوں نہیں کھاتے؟

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نامور یورپی مفکر پروفیسر آرنلڈ کی رائے:

روزہ مسلمانوں کی عبادت ہی نہیں ہے بلکہ روزہ میں وہ بے پناہ قوت ہے۔ جس نے مسلمانوں کو ناقابل تسخیر قوم بنا دیا ہے۔ پیغمبر اسلام نے ایک مہینے کے مسلسل روزے رکھوا کر مسلمان قوم کو فاقہ کشی اور نفس کشی کا عادی بنا دیا ہے ان میں تحمل اور برداشت کی بے پناہ قوت پیدا کر دی ہے اور انہیں اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت اور تکلیف کو بھی نظر میں نہ لا سکیں۔ تحمل برداشت اور نفس کشی کی اس تعلیم کے بعد جب یہ قوم آگے بڑھی تو دنیا پر سیلاب کی طرح چھاتی چلی گئی اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا کیونکہ جو قوم مشکل پسند بن جاتی ہے اس کا مقابلہ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

قرآن حکیم کے انگریزی مترجم محمد مارماڈیوک پکتھال:

دنیا میں صرف انہی قوموں نے ترقی کی ہے جو مشکل پسند ہیں دنیاوی مشکلات کو نظر میں نہیں لاتیں۔ جو بسیار خوری، آرام طلبی اور نفس پرستی کو گناہ سمجھتی ہیں اور یہ تمام صفات ایک قوم میں روزے ہی کے ذریعے آسانی سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ روزے میں صرف کھانے پینے اور دیگر نفسانی خواہشات ہی سے اجتناب نہیں کیا جاتا بلکہ ہر برائی سے اپنے آپ کو بچایا جاتا ہے یہاں تک کہ روزہ دار کو اس بات کی بھی اجازت نہیں کہ وہ کوئی برا خیال اپنے ذہن میں پیدا کر سکے۔ گویا روزہ جہاں انسان میں غیر معمولی تحمل اور مشکلات کی طاقت پیدا کر دیتا ہے وہیں مسلسل تیس دن تک تمام اخلاقی برائیوں سے کنارہ کش ہونے کے لیے ریاض کرنا بھی سکھاتا ہے۔ جس کا یقینی طور پر روزہ داروں کے اوپر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔

حج (Hajj)

لغوی اعتبار سے اس کا مطلب ہے قصد و ارادہ کرنا لیکن شرعی اصطلاح میں اس سے مراد خانہ خدا کی زیارت اور مناسک حج کی ادائیگی ہے۔ یہ مکہ مکرمہ میں ماہ ذوالحجہ میں ہوتا ہے۔

حج دین اسلام کا اہم رکن اور اہم مالی عبادت ہے۔ ہر عاقل، بالغ اور صاحب استطاعت مسلمان مرد اور عورت کو عمر بھر میں ایک مرتبہ حج کرنا فرض ہے۔

اس ضمن میں اللہ تعالیٰ سورہ آل عمران آیت 97 میں فرماتے ہیں:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ط وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ.

ترجمہ: ”لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو بیت اللہ تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے گا اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔“

اس آیت مبارکہ سے حج کی فرضیت کے ساتھ اس فریضہ کی اہمیت کا احساس بھی ہو جاتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ترجمہ: ”جس کا ارادہ حج کرنے کا ہو اسے چاہیے کہ وہ جلدی کرے۔“

یہ صحیح روایت ابوداؤد، دارمی، احمد اور حاکم نے نقل کی ہے۔

حج کی اس درجہ اہمیت و فرضیت کے باوجود بہت سے لوگ ہیں جو حج کرنے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی اس فریضہ کی ادائیگی سے غافل رہتے ہیں یا اس کی ادائیگی کو مختلف حیلوں بہانوں سے ٹالتے رہتے ہیں حتیٰ کہ وہ حج کیے بغیر ہی فوت ہو جاتے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

صحیح بخاری میں ہے:

''جو شخص زادِراہ اور سواری رکھتا ہو جس سے بیت اللہ تک پہنچ سکے اور پھر بھی حج نہ کرے تو اس کا اس حالت میں مرنا یہودی یا عیسائی ہو کر مرنا برابر ہے۔''

اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ جو شخص اتنا سرمایہ رکھتا ہے اور وہ ہوائی سفر یا بحری سفر کے ذریعے حج ادا کرنے کے لیے نہیں جاتا وہ مسلمان ہو کر نہیں بلکہ عیسائی یا یہودی ہو کر مرے گا۔

کعبے کی اہمیت:

کعبے کی تعمیر آج سے تقریباً ساڑھے چار ہزار برس پہلے حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اس کی تعمیر کا حکم اور جگہ کا تعین دونوں خدا کی طرف سے تھے۔ یہ دنیا میں پہلا گھر ہے جو خدا کی عبادت کے مرکز کی حیثیت سے بنایا گیا۔ اس گھر کی اہمیت سے متعلق قرآن میں آیا ہے کہ

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى ؕ

ترجمہ: ''اور جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لیے مرجع اور امن کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالو۔'' (البقرہ۔۱۲۵)

جس وقت اس گھر کی تعمیر شروع ہوئی اس وقت اس کے معماروں نے خدا کے حضور میں دعا کی تھی کہ

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ج رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ج اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ O

ترجمہ: ''خدایا، ہمارے عمل کو قبول فرما، یقیناً تو سب کچھ سنتا اور جانتا ہے، مالک، ہمیں اپنا سچا فرماں بردار بنادے اور ہماری اولاد میں سے ایک ایسا گروہ پیدا کردے جو تیرا فرماں بردار ہو اور ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتلا اور ہم پر کرم کی نظر رکھ، بیشک تو نظر کرم فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' (البقرۃ۔۲۲۷۔۲۲۸)

اس دعا سے معلوم ہوا کہ جس مقصد کی خاطر اس عمارت کی تعمیر عمل میں آئی ہے اس کی تکمیل ایک ایسے گروہ کے ذریعے سے ہوگی جو انہیں بزرگوں کی یا دوسرے الفاظ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوگا۔ چنانچہ جب کعبے کی تعمیر مکمل ہوگئی تو حضرت اسماعیل علیہ السلام یہیں بس گئے۔ انہیں کی اولاد میں سے حضور اکرم ﷺ ہیں جن کے ہاتھوں حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی دعا پوری ہوئی۔ کعبے کی اسی اہمیت کے پیش نظر سے مسلمانوں کا قبلہ، یعنی مرکز قرار دیا گیا کہ تمام مسلمان اس طرف رخ کر کے نماز پڑھا کریں۔

لبیک اللھم لبیک، لبیک لا شریک لک لبیک، ان الحمد و النعمة لک و الملک، لاشریک لک.

ترجمہ: ''حاضر ہوں، میرے اللہ، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاجر ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ حمد تیری ہی ہے، نعمتیں تیری ہی ہیں اور بادشاہی تیری ہے اور تیرا کوئی شریک نہیں۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حج کی اہمیت:

حج کے ابتدائی مضمون میں سورہ آل عمران کی آیت اور احادیث نبوی ﷺ کے حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ حج کی اہمیت کس قدر زیادہ ہے۔ اگر کوئی شخص زاد راہ اور سواری رکھنے کے باوجود حج نہیں کرتا تو وہ مسلمان ہو کر نہیں مرتا۔

حج ہی ایک ایسی عبادت ہے جو تاریخی تسلسل کے ساتھ گزشتہ چار ہزار سال سے کی جا رہی ہے۔ قرآن حکیم کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے حج کرنے کا حکم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیا گیا تھا انہوں نے ہی خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی۔

جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیت 96 سے واضح ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ.

ترجمہ: "سب سے پہلا گھر جو آدمیوں کے لیے مقرر کیا گیا ہے وہی ہے جو مکہ میں ہے وہ برکت والا اور سارے جہان کے لیے ہدایت ہے۔"

حج مسلمانوں پر زندگی میں صرف ایک دفعہ واجب ہے۔ ایک سے زیادہ حج کرنا اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی سعادت حاصل کرنا ہے لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص استطاعت رکھے اور حج بھی نہ کرے تو اس کے لیے بڑی وعید آئی ہے۔

ایک حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا:

"حج اور عمرہ گناہوں کو اس طرح دھو دیتے ہیں جس طرح بھٹی سونے اور چاندی کے میل اور کھوٹ کو صاف کر دیتی ہے۔"

حدیث نبوی ﷺ میں حج کرنے والوں کے لیے بڑے اجر کی بشارت دی گئی ہے مثلاً جو شخص حج کرے اور اس موقع پر نہ کوئی فحش اور بے ہودہ حرکت کرے اور نہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے تو وہ گناہوں سے ایسا پاک و صاف ہو کر واپس آئے گا جیسا کہ وہ پیدائش کے وقت تھا۔

مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ حج اور عمرہ کرنے والے لوگ اللہ کے مہمان خاص ہوتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے جو دعا مانگیں اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتا ہے اور اس سے مغفرت مانگیں تو وہ انہیں بخش دیتا ہے۔

اندازہ لگائیے کہ اللہ تعالیٰ نے فریضہ حج ادا کرنے والے کو کس قدر عزت سے نوازا ہے اسے اپنا مہمان قرار دیا ہے کیا یہ سعادت کم ہے۔

جن لوگوں کا حج اللہ تعالیٰ قبول کر لیتے ہیں ان کے بارے میں صحیح مسلم کی حدیث میں کہا گیا ہے:

الحج المبرور ليس له جزاء الا الجنة.

ترجمہ: "مقبول حج کا اجر جنت کے سوا کچھ نہیں۔"

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

"سب سے افضل جہاد حج مبرور (مقبول) ہے۔"

آپ ﷺ کے اسی ارشاد گرامی کے پیش نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے حج کا سامان تیار رکھو یہ بھی ایک جہاد ہے۔

حج کی جلد ادائیگی بھی بڑی ضروری ہے کیونکہ کچھ پتہ نہیں کہ کب اجل کی گھڑی آ جائے اور انسان استطاعت رکھتے ہوئے بھی اس اہم فریضہ کی ادائیگی سے محروم ہو جائے اور دل کی حسرت دل ہی میں لے کر چلتا بنے۔ اس ضمن میں حضور ﷺ نے فرمایا:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تعجلوا الی الحج یعنی الفریضۃ فان احدکم لا یدری ما یعرض لہ
(ترغیب)

اللہ تعالیٰ نے ایسی خواتین، بوڑھوں اور کمزور افراد کو حج کی ادائیگی پر جہاد کے برابر ثواب کا عہد کیا ہے جیسا کہ نسائی کی اس حدیث سے واضح ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بوڑھوں، کمزور اور عورتوں کے لیے حج اور عمرہ کرنا ثواب میں جہاد کے برابر ہے۔

خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ استطاعت رکھنے کے باوجود حج پر نہ جانے والوں کے بارے میں فرماتے تھے۔

''جو لوگ استطاعت رکھنے کے باوجود حج نہیں کرتے میرا جی چاہتا ہے کہ ان پر جزیہ لگادوں وہ مسلمان نہیں ہیں۔ وہ مسلمان نہیں ہیں۔

حج کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ماضی میں لوگوں نے یہ فریضہ پاپیادہ ادا کیا۔

اقسام حج:

حج کی تین قسمیں ہیں: 1- افراد 2- قران 3- تمتع

1- افراد:

اس طریقے کو کہتے ہیں جس میں حج کا احرام باندھا جاتا ہے عازم حج اس میں عمرہ نہیں کرتا بلکہ وہ صرف حج ہی کرتا ہے احرام باندھنے سے حج کے اختتام تک عازم حج کو احرام کی شرائط کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔

2- قرآن:

یہ وہ طریقہ ہے جس میں عازم حج عمرہ اور حج کا ایک ساتھ احرام باندھتا ہے اور مکہ مکرمہ پہنچ کر پہلے عمرہ کرتا ہے جس میں وہ صرف طواف اور سعی کرتا ہے اور سر کے بال ابھی نہیں منڈائے گا بلکہ حج سے فارغ ہونے کے بعد منڈائے گا۔ تاہم اس طرح وہ حج تک احرام کی حالت میں رہتا ہے اور اسی احرام سے وہ حج کرتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر حج کرنے میں مہینہ یا پندرہ دن کی دیر ہو اور اس دوران احرام کا کپڑا گندہ ہو جائے میلا ہو جائے یا ناپاک ہو جائے تو احرام کو تبدیل کرسکتا ہے مگر اس پر احرام کی تمام پابندیاں حج کرنے تک برقرار رہتی ہیں۔

3- تمتع:

تمتع وہ طریقہ حج ہے جس میں دو رکعت نماز نفل پڑھ کر پہلے عمرہ کی نیت کی جاتی ہے اور مکہ مکرمہ میں عمرہ ادا کرنے کے بعد احرام کی حالت سے باہر آجائیں اور روزمرہ کے کپڑے پہن لیں اس طرح احرام کی پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں پھر حج کے ایام شروع ہونے سے پہلے یعنی 8 ذی الحجہ کو جب حج کرنے جاتے ہیں تو اس سے پہلے حج کا احرام باندھ لیتے ہیں اور بجائے عمرہ کے حج کی نیت کرتے ہیں اور حج مکمل کرنے تک احرام کی پابندیاں عائد رہتی ہیں اس میں عمرہ اور حج ایک ہی سفر میں کرنا ضروری ہے۔

ان تینوں اقسام میں سے تمتع کا طریقہ آسان ترین طریقہ ہے اکثر حجاج تمتع ہی کرتے ہیں۔

حج کی نیت:

حج کی نیت یہ ہے:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اللهم انی ارید الحج فیسرہ لی وتقبله منی واعنی علیه وبارک لی فیه نویت الحج واحرمت به لله تعالیٰ

ترجمہ: "اے اللہ میں حج کی نیت کرتا ہوں پس اس کو میرے لیے آسان کر دے اور مجھ سے قبول کر لے اور اس میں میری مدد فرما اور اس میں میرے لیے برکت ڈال نیت کی میں نے حج کی اور احرام باندھا اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے۔"

فرائض وواجبات حج

فرائض حج:

فرائض حج تین ہیں یعنی 1- احرام باندھنا 2- وقوف عرفات اور 3- طواف زیارت

واجبات حج:

واجبات حج تعداد میں چھ ہیں یعنی:

1- مزدلفہ میں وقوف کے مقررہ وقت میں ٹھہرنا۔

2- صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا۔

3- رمی جمار یعنی شیطانوں کو کنکریاں مارنا۔

4- قارن اور تمتع کا قربانی کرنا۔

5- سر کے بال منڈوانا یا ترشوانا۔

6- آفاقی (مکہ کے باہر سے آنے والے) کو طواف وداع کرنا۔

حج کرنے کا طریقہ:

1- مال حلال وطیب کا انتظام اور مال حرام سے اجتناب کیا جائے کیونکہ حرام مال کا حج مسترد کر دیا جاتا ہے اور نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث کے مطابق اس گوشت و پوست کو جہنم کا ایندھن بنایا جاتا ہے جو مال حرام سے پرورش پائے۔

2- ایسے رفقاء حج کا انتخاب کیا جائے جو صحیح العقیدہ اور ایمان والے ہوں۔

3- جب حاجی میقات پر پہنچ جائے تو وہاں سے احرام باندھے اگر ہوئی جہاز میں ہو تو میقات کے قریب پہنچتے ہی احرام باندھ لے اور میقات سے ہرگز تجاوز نہ کرے۔

میقات:

مکہ مکرمہ کے باہر سے آنے والے تمام حجاج کے لیے مندرجہ ذیل میقات نبی ﷺ نے مقرر فرمائی ہیں:

1- ذوالحلیفه 2- جحفه 3- قران المنازل

4- ذات عرق 5- یلملم

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جو لوگ حج یا عمرہ کی نیت سے آتے ہوں ان میقات سے گزریں چاہے یہ حاجی حضرات میقات کے باہر دور یا قریب کے ہوں یا دنیا کے کسی بھی خطے سے آ رہے ہوں انہیں بہر حال یہاں سے احرام باندھ کر ہی جانا چاہیے۔

احرام:

احرام باندھنے سے پہلے جسم کی صفائی و ستھرائی کرنا، غسل کرنا اور خوشبو لگانا مستحب ہے میقات پہنچ کر احرام کے کپڑے زیب تن کرے اور ہوائی جہاز سے سفر کرنے والا شخص گھر ہی کپڑے پہنے اور میقات پہنچ کر تلبیہ کہہ کر حج یا عمرہ کی نیت کرے۔

مرد کا احرام:

مرد کے لیے سنت ہے کہ وہ دو صاف ستھرے کپڑوں میں احرام باندھے جو سلے ہوئے نہ ہوں اور اپنے سر کو نہ ڈھانپے بلکہ اس کو کھلا رکھے۔

عورت کا احرام:

عورت حالت احرام میں کسی بھی قسم کے کپڑے پہن سکتی ہے اس کے لیے مخصوص قسم کے کپڑے ضروری نہیں ہاں شرط یہ ہے کہ اس کا لباس کشادہ اور بے پردگی اور اظہار زیب و زینت والا نہ ہو اس کے لیے احرام کے وقت دونوں ہاتھوں میں دستانے پہننا یا نقاب کے ذریعہ چہرے کو چھپانا ممنوع ہے۔ البتہ اگر غیر محرم سامنے آ جائے تو چہرہ پر کوئی کپڑا لٹکا لینا یا کسی اور چیز سے منہ چھپانا منع نہیں ہے۔

ممنوعات احرام:

احرام کی حالت میں تمام حاجیوں کے لیے حسب ذیل باتیں منع ہیں:

-1 جماع اور متعلقات جماع، فحش باتیں کرنا، اسی طرح نکاح کرنا اور نکاح کرانا اور منگنی کرنا۔

-2 کسی چپکنے والی چیز سے سر کو ڈھانپنا لیکن چھتری یا خیمہ گاڑی کی چھت کے ذریعہ سایہ حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

-3 سر منڈوانا یا بال کتروانا۔

-4 ناخن تراشنا۔

-5 خوشبو لگانا اور خوشبو سونگھنا۔

-6 خشکی کے جانور کا شکار کرنا اور اس کی نشاندہی کرنا بھی۔

-7 مرد کے لیے قمیص یا کوئی دوسرا سلا ہوا کپڑا ڈالنا۔

-8 عورت کا چہرے اور ہاتھوں پر نقاب یا سلا ہوا کپڑا ڈالنا۔

-9 مرد جوتے پہن سکتا ہے لیکن جوتے نہ ملیں تو موزے استعمال کر سکتا ہے۔

تلبیہ:

لبیک اللھم لبیک لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد والنعمة لک والملک لاشریک لک.

ترجمہ: ''میں حاضر ہوں یا اللہ میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں بے شک تمام تعریفیں اور نعمتیں تیرے لیے ہیں اور تیرا کوئی شریک نہیں۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حج کے لغوی معنی زیارت کا ارادہ کرنے کے ہیں۔ شریعت کی زبان میں حج کی عبادت کو حج اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں انسان کعبہ کی زیارت کا ارادہ کرتا ہے۔ حج ہر بالغ اور صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں ایک بار فرض کیا گیا ہے۔ جو شخص حج کی قدرت رکھنے کے باوجود حج نہیں کرتا وہ اپنے مسلمان ہونے کو جھٹلاتا ہے

وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا ط ومن کفر فان اللہ غنی عن العلمین O

ترجمہ: "لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو بھی استطاعت رکھتا ہو اس کے گھر کا حج کرے اور جس نے کفر کی روش اختیار کی (اسے جان لینا چاہیے کہ) اللہ سارے اہل جہاں سے بے نیاز ہے۔" (آل عمران۔ ۹۷)

اسی طرح ایک حدیث میں آیا ہے کہ "جس شخص کو کسی بیماری یا واقعی ضرورت یا ظالم حکمران نے روک نہ رکھا ہو اور اس کے باوجود وہ حج نہ کرے تو چاہے وہ یہودی مرے چاہے نصرانی۔"

حج کی اس اہمیت کے پیش نظر ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آخر کعبہ کیا چیز ہے جس کی زیارت کی اتنی اہمیت ہے، اور جو مراسم حج میں ادا کیے جاتے ہیں ان کے پیچھے کون سے تصورات کام کر رہے ہیں؟

مناسک حج:

حج کی رسوم کو مناسک کہا جاتا ہے۔ اہم مناسک درج ذیل ہیں:

میقات:

مکہ معظمہ سے خاص فاصلوں پر بعض مقامات مقرر ہیں جن کو میقات کہتے ہیں۔ ان مقامات پر حج یا عمرہ کے لیے احرام باندھا جاتا ہے۔

احرام:

احرام سے مراد ایسی حالت ہے کہ جس میں محرم (احرام والے) پر چند حلال چیزیں مثلاً زیب و زینت، خوشبو، شکار اور مباشرت وغیرہ حرام ہو جاتی ہیں۔ مرد سلا ہوا لباس نہیں پہن سکتا، بلکہ ان سلی ہوئی دو چادروں سے جسم ڈھانپتا ہے۔ یہ چادریں پہننا ہی احرام کہلاتا ہے۔

تلبیہ:

احرام کے بعد کثرت سے حاجی تلبیہ کرتا ہے یعنی لبیک (اے اللہ میں تیرے بلانے پر حاضر ہوا) کہتا ہے۔

استلام:

اس کا لفظی معنی چومنا ہے۔ مراد ہے خانہ کعبہ کی ایک دیوار میں نصب حجر اسود کو چومنا۔

طواف:

لفظی معنی چکر کاٹنا۔ حاجی کعبہ کے گرد دائیں طرف سے شروع ہو کر سات پے در پے چکر لگاتے ہیں۔ اس کو طواف کہتے ہیں۔

مقام ابراہیم علیہ السلام میں نماز:

خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت جس پتھر پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو گارا اور پتھر دیتے تھے اس کو مقام ابراہیم کہتے ہیں۔ حاجی اس جگہ دو رکعت نماز پڑھتے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

صفا و مروہ کی سعی:

خانہ کعبہ کے قریب ہی صفا و مروہ نامی دو ٹیلوں کے درمیان حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لیے پانی کی تلاش میں بے چینی سے دوڑی تھیں۔ ان کی یاد میں صفا و مروہ کے درمیان حاجی سعی کرتے (دوڑ لگاتے) ہیں۔

منیٰ میں پڑاؤ:

ذوالحجہ کی ۸ تاریخ کو حاجی یہاں جمع ہو کر ایک دن اور رات قیام کرتے ہیں۔ اس دن کو یوم الترویہ کہتے ہیں۔

عرفات میں وقوف:

۹ ذی الحجہ کو حاجی منیٰ سے عرفات کے میدان میں جاتے ہیں۔ اس دن کو یوم عرفہ کہتے ہیں عرفات مکہ معظمہ سے کوئی چودہ میل کے فاصلے پر ایک وسیع و عریض میدان ہے۔ یہاں ایک پہاڑ ہے جسے جبل رحمت کہتے ہیں۔ اس پہاڑ کے پاس حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے حجۃ الوداع کا خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ حاجی یہاں امام کا خطبہ سنتے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کی یہیں دوبارہ ملاقات ہوئی تھی۔

وقوف عرفات ہی اصل حج ہے۔ جو شخص اس سے رہ گیا وہ حج سے رہ گیا۔ خواہ باقی تمام مناسک وہ ادا کرلے۔

مغرب کے وقت حجاج یہاں سے کوچ کرتے ہیں۔ رات مزدلفہ میں بغیر خیموں کے گزارتے ہیں اگلی صبح آفتاب سے پہلے منیٰ کی طرف سفر کرتے ہیں۔

قربانی:

۱۰ ذی الحجہ کو منیٰ میں پہنچ کر قربانی کرتے ہیں۔ اس کے بعد حاجی احرام کھول دیتے ہیں۔

رمی جمرات:

منیٰ میں تین پتھر نصب ہیں جن کو جمار یا جمرات کہتے ہیں۔ حجاج تین دن (۱۰ تا ۱۲ ذی الحجہ) رمی کرتے ہیں، یعنی ان پتھروں کو سات سات کنکریاں مارتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربان کرنے کے لیے لے جا رہے تھے تو راستے میں شیطان نے ان تین جگہوں پر ان کو بہکانے کی کوشش کی تھی۔ آپ ﷺ نے ہر موقع پر اس کو کنکریاں اٹھا کر ماری تھیں۔ رمی جمرات اسی واقعہ کی یادگار ہے۔

طواف زیارت:

منیٰ میں ۱۰ ذی الحجہ کے بعد دو دن قیام کرنا واجب ہے۔ اگر کوئی حاجی چاہے تو تیسرے روز بھی قیام کر سکتا ہے۔ دسویں تاریخ کو خانہ کعبہ کا دوسری بار طواف کرتے ہیں۔ اسے طواف زیارت کہتے ہیں۔

طواف وداع:

مکہ سے روانہ ہونے سے قبل حاجی بیت اللہ کا تیسری مرتبہ طواف کرتے ہیں اسے طواف وداع کہتے ہیں۔

مقاصد حج

1- حج کے مقاصد میں سب سے بڑا مقصد تو یہ ہے کہ اس سے سنت ابراہیمی کی تجدید کا عہد ہو جاتا ہے اور دوسرا فرض کی ادائیگی بھی۔

2- مسلمانان عالم ایک ہی مرکز پر جمع ہو کر توحید کا بول بالا کرتے ہیں اسی اجتماع سے ایک خدا کی عبادت کا تصور مزید ابھرتا ہے۔

3- مسلمانان عالم کے مابین یک جہتی اور ہم آہنگی کے جذبات ابھرتے ہیں اور وہ اپنے مسائل کو حل کرنے میں باہمی مشاورت کے ساتھ جلد کامیاب ہو جاتے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

4- مختلف نسلوں، رنگوں اور مختلف مقامات سے آئے ہوئے اور مختلف زبانیں بولنے والے ایک ہی لباس میں ملبوس خدا کی وحدانیت کا پرچار کرتے ہیں اور یوں امیر، غریب، کالے، گورے، چھوٹے، بڑے، عربی، عجمی کے مابین تمیز مٹ جاتی ہے۔

5- حاجی جب لبیک اللھم لبیک کے الفاظ بیک وقت کہتے ہیں تو ان کے درمیان جو اشتراک عمل پیدا ہوتا ہے اس سے توحید کا پرچم بلند ہوتا ہے اور ہر طرح کے شرک کا خاتمہ ہو جاتا ہے گویا اس وقت وہ خدا کے خدمتگار سپاہیوں کی ایک فوج معلوم ہوتے ہیں۔

6- اہل دل کو سفر حج اور در محبوب ﷺ کی حاضری سے جو تسکین ملتی ہے اس کی لذت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔

7- دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک جگہ جمع ہو کر اپنے ملی وسیاسی اور معاشرتی مسائل سے نہ صرف آگاہی ہوتی ہے بلکہ ان مسائل کو باہمی مشاورت اور بحث وتمحیص کے ذریعے حل کرنے کا خوبصورت موقع ملتا ہے۔ اس سے ایک طرف باہمی خیر سگالی کے جذبات کو تقویت ملتی ہے تو دوسری جانب مسلمانان عالم کے مابین اتحاد ومساوات اور افہام وتفہیم اور بھائی چارے اور باہم مل بیٹھنے کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔

8- چونکہ مسلمانان عالم ایک ہی امیر کی امامت میں مناسک حج ادا کرتے ہیں اس لیے ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی اس سے بڑی کوئی مثال نہیں ملتی۔

9- اس عالمی اجتماع سے بین الاقوامی تعلقات کو فروغ دینے میں بڑی مدد ملتی ہے اور اس طرح امن وآشتی کا دور دورہ ہوتا ہے۔

10- حج کی ادائیگی سے مسلمانان عالم اپنے ساتھ ایمان اور تقویٰ کی پاکیزگی کی جو دولت لے کر جاتے ہیں اس سے اصلاح احوال میں بڑی مدد ملتی ہے اور لوگوں کی اکثریت آئندہ کے لیے گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتی ہے۔

11- اس کا ایک نہایت اہم پہلو یہ بھی ہے کہ مسلمانان عالم تجارتی اور اقتصادی فوائد حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مال کی کھپت کر سکتے ہیں اور اس طرح وہ معاشی نفع بھی حاصل کر سکتے ہیں جو حج کے بغیر ممکن نہیں۔

12- ایک دوسرے سے دور دراز رہنے سے اجنبیت کا جو عنصر حج کی ادائیگی سے قبل مسلمانان عالم میں پایا جاتا ہے وہ دور ہو جاتا ہے اور دنیا سمٹ کر گلوبل ویلج نظر آنے لگتی ہے۔

13- مسلمان جب مدینہ منورہ میں روضہ رسول ﷺ پر جا کر حاضری دیتا ہے تو اس کی دلی کیفیات ہی بدل جاتی ہیں اور اس کا اندازہ صرف اور صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس تجربے سے گزرے ہوں تیز زائر کے دو حج بھی قبول ہو جاتے ہیں اس ضمن میں حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

جس شخص نے مکہ مکرمہ کا حج کیا پھر میری مسجد میں میری زیارت کا قصد کیا اس کے لیے دو حج مقبول لکھے جاتے ہیں۔

مشکوٰۃ شریف میں ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

جس نے حج کیا اور میرے وصال کے بعد میری قبر کی زیارت کی تو گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔

14- نوع انسانی متعدد معاشروں میں بٹی ہوئی ہے قومی اور ملکی حدود کی یہ تقسیم ایک ناگزیر ضرورت ہے لہٰذا دنیا میں بیک وقت بہت سے مسلم معاشرے قائم ہو سکتے ہیں اس لیے اس بات کی حقیقی ضرورت تھی کہ ان معاشروں کے درمیان برادرانہ مراسم اختیار کرنے اور انہیں مضبوط بنانے کی بھی کوئی موثر راہ نکالی جائے۔ حج اس ضرورت کا جواب ہے۔

حج چونکہ تمام عبادات کا مجموعہ ہے اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

من حج فلم یرفث ولم یفسق رجع کما ولدتہ امہ

ترجمہ: ''جس نے (خلوص نیت سے) حج کیا اور اس میں فسق اور برائیوں سے بچا رہا تو وہ ایسا پاک وصاف ہو کر لوٹنے گا جیسے اس دن تھا جب اس کی ماں نے اسے جنا تھا۔''

حج ابتداء سے انتہا تک ارکان ومناسک سے بھرپور ہے جس سے ہر انسان کو اللہ تعالیٰ کی عظمت وقدرت اور اس کی رحمت کا شعور ہوتا ہے اور ہر وہ شخص جو فریضہ حج کی ادائیگی کی خاطر دل ودماغ کے ساتھ حاضر ہوتا ہے تو اس پر حج کی حکمتیں اور اس کی خوبیاں واضح ہو جاتی ہیں اور اس کے اسرار ورموز اس پر منکشف ہوتے ہیں۔

حج کی شان جامعیت:

ان باتوں کے علاوہ اگر حج کے مراسم کو ایک اور پہلو سے دیکھیے تو محسوس ہوگا کہ یہ حج اگرچہ کہنے کو ایک عبادت ہے لیکن فی الواقع اس میں ہر عبادت اور ہر عملی خیر کی روح موجود ہے۔

(۱) وہ نماز بھی ہے، اس لیے کہ نماز کی حقیقت ذکر یا یاد دہانی ہے اور حج میں آدمی مسلسل زبان سے ذکر (لبیک اللھم لبیک) کرتا رہتا ہے اور ساتھ ہی ان مقامات کی زیارت کرتا ہے جو اس کے احساس عبدیت کو ابھار دیتی ہیں۔

(۲) وہ زکوٰۃ بھی ہے، اس لیے کہ ہر حج کرنے والے کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ قربانی کا گوشت غریبوں کو کھلائے۔ اس کے علاوہ بغیر مالی قربانی کے حج کیا ہی نہیں جا سکتا، زکوٰۃ کی حقیقت بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کی خاطر اپنی دولت صرف کی جائے۔

(۳) وہ روزہ بھی ہے، اس لیے کہ جنسی ملاپ روزے میں اگر صرف دن کو ممنوع ہے تو حج کے دوران راتوں میں بھی ممنوع رہتا ہے۔ رہا کھانے پینے کا معاملہ تو روزے کی طرح اگرچہ حج میں کھانا پینا منع نہیں ہے مگر اس کے بجائے اس میں زیب وزینت وغیرہ کی جو دوسری بہت سی پابندیاں عائد ہوتی ہیں وہ بڑی حد تک اس ممانعت کی قائم مقام بن جاتی ہیں۔ اس طرح نفس کی خواہشوں کو کنٹرول کرنے کی مشق جس طرح روزے میں ہوتی ہے اسی طرح حج میں بھی ہوتی ہے۔

اسلامی عبادات کے اس مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادات کے اس نظام کا اصل مقصد اسلام کا انسان مطلوب تیار کرنا ہے۔ یہ انسان کو اس ذمہ داری کے لیے تیار کرتی ہیں جو خدا اور اس کے رسول ﷺ نے ہمارے سپرد کی ہے۔ یہ انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی صفات محمودہ انسان میں پیدا کرتی ہیں، سیرت وکردار کی تعمیر کرتی ہیں اور روحانی ترقی اور اخلاقی بالیدگی کی راہ ہموار کرتی ہیں۔ عبادات کا اصل مقصد یہ ہے کہ نفس کا تزکیہ ہو، تقویٰ کی روح پیدا ہو، خدا سے تعلق استوار ہو، اور خدا کی اطاعت، اس کی بندگی اور اس کی محبت ہر چیز پر غالب آ جائے۔ نفس کی اصلاح کے بغیر کوئی اصلاح ممکن نہیں اور نفس کی اصلاح کا اصل اور مؤثر ترین طریقہ وہ عبادات ہیں جو خدا اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر کی ہیں۔

حج کی حکمتیں

1- احرام کی حکمت:

ارکان حج میں سب سے پہلا رکن نیت ہے اور نیت کا تعلق صرف دل سے ہوتا ہے اس لیے اگر دل اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہو جائے تو سارے اعمال درست ثابت ہوں گے اور اگر وہی دل غیر اللہ کی طرف پھر جائے تو سارے اعمال فاسد وبے کار ہو جائیں گے اور نیت تمام اعمال کی بنیاد ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لہٰذا حج میں حاجی کا سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ خالص اللہ کے لیے حج کی نیت کرے کیونکہ اللہ رب العزت ایسے بندے کے حج کو شرف قبولیت نہیں بخشتا جو اپنے حج کے ذریعے ریا و نمود یا کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہو اس لیے کہ حج اللہ کے راستے میں ہجرت اور ہجرت کی کوئی قیمت نہیں ہوتی جس میں غیر اللہ کا قصد کیا گیا ہو۔

حج کی نیت کو احرام کہا جاتا ہے جس کے دو شعار ہیں۔

1. اس کا تعلق دیکھنے سے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سلے ہوئے کپڑے اور جسمانی زیب و زینت کے مظاہر مثلاً خوشبو کے استعمال اور بال ترشانے اور کاٹنے یا اکھاڑنے اور دیگر ممنوعات احرام سے اجتناب کیا جائے اور نفس کو ایسے امور کے ارتکاب سے باز رکھا جائے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ربانی ہے

فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج (سورہ البقرہ آیت 197)

2. ان شعار کا تعلق سننے اور بولنے سے ہے یعنی تلبیہ کے کلمات لبیک اللھم لبیک با آواز بلند پڑھا جائے۔ ہر حاجی کو اس احرام کے ذریعے یہ محسوس کرنا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کے لیے حاضر ہوا ہے اور اللہ کے ہر حکم کی تعمیل اور اس پر لبیک کہنے کے لیے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی صاحب ملک و نعمت ہے اس لیے اس کے علاوہ کسی دوسرے کی نہ تو تعریف و ستائش کرے گا نہ کسی غیر سے اپنی حاجت طلب کرے گا۔

احرام کی حکمت یہ ہے کہ اس سے تمام مسلمانوں کے درمیان اخوت و مساوات کا اظہار ہوتا ہے اور تمام حجاج کرام کا لباس احرام میں ملبوس ہونا اخروی زندگی اور قیامت کا منظر پیش کرتا ہے اور اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ایک مومن عاقل کے لیے مناسب نہیں ہے کہ فانی دنیا کے فتنے اور اس کی رنگینیوں میں الجھ کر ہمیشہ کی زندگی کو اعمال صالحہ کے ذریعے سنوارنے سے محروم ہو جائے۔

شروع تلبیہ کے بارے میں امام مالک نے نافع عن ابن عمر کے طریق سے آنحضور ﷺ کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ آنحضور ﷺ اپنی زبان مبارک سے یہ تلبیہ پڑھتے تھے:

لبیک اللھم لبیک لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد والنعمة لک والملک لاشریک لک۔

ترجمہ: "اے میرے اللہ میں حاضر ہوں، حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں ساری تعریفیں اور نعمتیں تیرے ہی لیے ہیں اور حکومت و بادشاہت پر بھی تیرا ہی حق ہے تیرا کوئی شریک نہیں۔"

تلبیہ کا بآواز بلند پڑھنا بہت سے مقامات پر مستحب ہے مثلاً

1- سواری پر چڑھتے یا اترتے وقت
2- وادی میں اترتے یا کسی بلند ٹیلے پر چڑھتے وقت
3- مسافروں کی جماعت سے جب ملاقات ہو
4- ہر فرض نماز کے بعد
5- رات کے پچھلے پہر

2- طواف کعبہ کی حکمت:

طواف بیت اللہ کی حکمت یہ ہے کہ اس سے صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل اور اپنی عبودیت کا اظہار مقصود ہے۔

خانہ کعبہ کے طواف کا حکم مثل نماز ہے اس لیے ہر مسلمان پر واجب ہے کہ نماز کے جملہ آداب کی رعایت کرتے ہوئے نہایت ہی خشوع و

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

خضوع اور حضورِ قلب کے ساتھ طواف کریں اور بیت اللہ کے رب کی عظمت و کبریائی اپنے دلوں میں محسوس کریں اس لیے کہ خانہ کعبہ کے طواف سے صرف جسم کا طواف مطلوب نہیں بلکہ دل و دماغ کا طواف بھی مقصود ہے۔ خانہ کعبہ کا طواف مسلمانوں کی وحدت و جمعیت کا ایک امر ہے اور اسلامی روابط مستحکم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

3- صفا ومروہ کے مابین سعی کی حکمت:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا (سورہ البقرہ آیت 158)

ترجمہ: "بے شک صفا ومروہ یہ دونوں پہاڑیاں اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں پس جو شخص حج کے لیے آئے یا عمرہ کے لیے تو اس کے اوپر کوئی حرج نہیں کہ وہ ان پہاڑیوں کا طواف کرے۔"

صفا ومروہ کی سعی سے سلف صالحین کے آثار و نقوش یاد رکھیں چنانچہ سعی بین الصفا والمروہ کی حکمت آج تک باقی ہے دنیا کے مختلف گوشوں اور خطوں سے گناہوں اور خطاؤں کے بارے دبے ہوئے حجاج کرام جوق در جوق آتے ہیں اور اپنے گناہوں اور خطاؤں سے صفا ومروہ کے درمیان بخشش طلب کرتے ہیں اور اللہ کی رحمت و مغفرت کے طلبگار ہوتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

4- وقوف عرفہ کی حکمت:

عرفہ کے میدان میں حاجی کو قیامت کا میدان اور تمام امتوں کا اجتماع اور اللہ کے سامنے حاضری کا دن یاد آتا ہے اور عرفہ کے میدان میں وہ دن یاد آتا ہے جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن منادی کرے گا کہ آج کس کی حکومت ہے تو ساری مخلوق ایک زبان ہو کر پکار اٹھے گی للہ الواحد القہار۔ اور قیامت کا خوفناک منظر سامنے آجاتا ہے اس لیے حضور پاک ﷺ نے فرمایا الحج عرفہ یعنی حج عرفہ ہے۔

5- رمی جمار کی حکمت:

رمی جمار سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل اور عزم و یقین کے ساتھ خواہشات نفس کی بیخ کنی مقصود ہے۔ رمی جمار ایک اسلامی شعائر ہے اور شر کے عوامل کو زیر کرنے اور نفس امارہ کو ذلیل کرنے کا ایک وسیلہ ہے اور رمی جمرات واضح ثبوت کے ارتکاب سے روک دیا گیا ہے۔

سلام پڑھتے ہوئے صورت یہ ہوتی ہے کہ روضہ مبارک سامنے اور قبلہ پشت کی جانب ہوتا ہے لیکن سلام پڑھ لینے کے بعد دعا مانگنے کے لیے قبلہ کی طرف رخ کرکے ہی دعا مانگی جائے بہت سے لوگ مسجد نبوی ﷺ کے اندر یا باہر دور سے روضہ مبارک کی طرف رخ کرکے صلاۃ وسلام پڑھتے ہیں یہ طریقہ مناسب نہیں۔

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرما رہے تھے "تم اپنی مقدور بھر کفار و مشرکین کے خلاف طاقت و قوت اور گھوڑوں کو جہاد کے لیے تیار رکھو اور یاد رکھو کہ طاقت و قوت رمی (تیر اندازی) ہے آپ ﷺ نے یہ جملہ تین بار دہرایا۔"

6- قربانی کرنے کی حکمت:

قربانی کا مقصد فضائل کی بنیادیں استوار کرنے والے مضبوط ہاتھوں کے ذریعے رذائل کا خون بہانا اور نفس امارہ کو تہ تیغ کرکے اور انسان کے جسم سے خارج کرکے اس کی جگہ خیر و برکت کی روح پیدا کرنی ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قربانی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہے اور اس کے ذریعے ایام عید میں فقراء و مساکین پر خرچ کرنے سے اللہ کی عطا کردہ نعمت کا اظہار ہوتا ہے اس لیے کہ عید کا دن اللہ رب العزت کی جانب سے تمام مومنوں کے لیے ضیافت کا دن ہوتا ہے۔ قربانی حج کے ارکان میں سے ہے اس لیے کہ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت کی تجدید اور احیاء ہوتی ہے اور آپ علیہ السلام کی قوت ایمانی اور ایثار کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

حج کے اخلاقی، روحانی اور سماجی اثرات

حج کے اخلاقی و روحانی اثرات

۱۔ گناہوں کی مغفرت:

حج مبرور یعنی مقبول حج کے نتیجے میں حاجی پچھلے گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ حج اور عمرہ گناہوں کو اس طرح مٹا دیتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے کے زنگ کو۔ ایک اور حدیث کی رو سے انسان حج کرنے کے بعد اس طرح معصوم ہو جاتا ہے جیسے پیدائش کے وقت معصوم ہوتا ہے۔

۲۔ ضبط نفس کی تربیت:

احرام باندھنے کے بعد کئی حلال چیزیں حرام ہو جاتی ہیں۔ وہ ان چیزوں کے میسر ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں ان سے اجتناب کرتا ہے اس سے ضبط نفس کی تربیت ملتی ہے۔

۳۔ نظم وضبط کی تربیت:

حج کے موقع پر لاکھوں انسان ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ بعض مناسک مثلاً طواف، رمی، جمرات، عرفات سے واپسی کی ادائیگی کے وقت سخت ہجوم ہوتا ہے لیکن نہ کبھی لڑائی جھگڑا ہوتا ہے اور نہ کوئی حاجی کسی دوسرے حاجی کو گالی دیتا یا برا بھلا کہتا ہے۔ حجاج کے لیے لڑنا جھگڑنا اور گالی گلوچ ممنوع ہے۔ نادانستہ طور پر ایک دوسرے کے ہاتھوں سخت تکالیف بھی اٹھانا پڑتی ہیں لیکن کیا مجال کہ کوئی شخص تکلیف پہنچانے والے کو سخت الفاظ بھی کہے۔ حج کے موقع پر مسلمانوں کو نظم وضبط کی بہت اعلیٰ تربیت ملتی ہے۔

۴۔ جفاکشی کی تربیت:

زندگی پھولوں کی سیج نہیں بلکہ مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ وہی افراد اور قومیں عزت اور کامیابی حاصل کر سکتی ہیں جو جفاکش ہوں۔ حج جفاکشی کی تربیت کا ایک بہت اچھا ذریعہ ہے۔ انسان اپنے گھر سے دور اپنے گھر والوں اور اہل وطن سے دور سخت تکالیف اور صعوبتیں اٹھا کر مناسک حج ادا کرتا ہے، اس سے اس میں مشقت اٹھانے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

۵۔ سادگی کی تربیت:

حج میں سادگی کی تربیت ملتی ہے۔ ایک تو اپنے گھر اور وطن سے دور ویسے بھی آدمی ناز و نعمت کی زندگی نہیں گزار سکتا، خواہ وہ ارب پتی ہی کیوں نہ ہو۔ وہاں تو خیموں میں رہنا پڑتا ہے۔ آسمان کے نیچے فرش زمین پر بھی سونا پڑتا ہے۔ دوسرے حالت احرام سے انتہائی سادگی پیدا ہوتی ہے۔ ان سلی ہوئی دو چادروں سے جسم ڈھانپتا ہے۔ سر ننگا ہوتا ہے۔ ننگے سر پر دھوپ میں پھرتا ہوتا ہے، آرائش، خوشبو وغیرہ کا استعمال حرام ہوتا ہے۔

۶۔ روحانی بالیدگی اور تقرب الٰہی:

گھر سے روانہ ہونے کے بعد گھر واپس آنے تک حاجی کا تمام تر وقت عبادت و ریاضت میں گزرتا ہے۔ وہ دنیا و مافیہا سے الگ تھلگ صرف یاد الٰہی میں ہمہ وقت مصروف رہتا ہے۔ اس کا دھیان ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف لگا رہتا ہے۔ اس سے اس کی روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حج کے سماجی اثرات

ا۔ مساوات کا عملی مظاہرہ:

اسلام مساوات کا علمبر دار ہے اور حج کے موقع پر مساوات کا شاندار عملی مظاہرہ ہوتا ہے۔ سب حاجی خواہ کوئی امیر ہو یا غریب، حاکم ہو یا محکوم، چھوٹا ہو یا بڑا، ایک جیسا لباس پہنے یکساں پابندیوں کے ساتھ ایک جیسے حالات میں رہتے ہوئے ایک جیسے مناسک حج ادا کرتے ہیں۔ کسی بھی موقع پر کسی قسم کا امتیاز روا نہیں ہوتا۔

۲۔ اتحاد ملی:

حج دنیا بھر کے مسلمانوں کے اتحاد و یگانگت کا مظہر ہے۔ دنیا کے کونے کونے سے مختلف رنگوں، زبانوں اور نسلوں کے مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر مل جل کر رہتے اور مناسک حج ادا کرتے ہیں۔ اس سے دنیا بھر کے مسلمانوں میں یہ احساس اجاگر ہوتا ہے کہ وہ ایک ملت ہیں۔

۳۔ مرکزیت:

حج مسلمانوں کی مرکزیت کی علامت ہے۔ بیت اللہ شریف تمام مسلمانوں کا مرکز ہے دنیا بھر کے مسلمان اس ایک مرکز پر جمع ہوتے ہیں۔ ایک مرکز ان میں وحدت کا احساس پیدا کرتا ہے۔

۴۔ شکوہ ملی کا اظہار:

حج کے موقع پر دنیا بھر سے آئے ہوئے لاکھوں مسلمانوں کے ایک جگہ عظیم انسانی اجتماع سے مسلمانوں کے شکوہ ملی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری تمام اقوام بھی محسوس کرتی ہیں کہ مسلمان ایک عظیم ملت ہیں۔

۵۔ علمی واقتصادی فوائد:

حج سے علمی واقتصادی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ بری، بحری اور ہوائی راستوں سے سفر کا تجربہ۔ نئے علاقوں کی سیاحت مختلف علاقوں سے آئے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ تبادلۂ خیالات سے انسان کی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے۔ حج کے موقع پر مکہ معظمہ اور اس کا نواحی علاقہ، نیز مدینہ منورہ عالمی منڈی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ مختلف مسلم علاقوں کی مصنوعات وہاں پہنچتی ہیں۔ ان سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ وہاں ان کی خرید وفروخت ہوتی ہے اور بعد ازاں مختلف مسلم ممالک میں باہم تجارت ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

باب 2: سیرت طیبہ ﷺ کا مطالعہ بحیثیت نمونہ عمل

آؤٹ لائن

— انفرادی زندگی
— سفارت کار
— سپہ سالار اور جنگی منصوبہ ساز
— پیغمبر امن
— معلم انسانیت

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

انفرادی زندگی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے نمایاں پہلو

تعارف:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے جمال خلق اور کمال خلق سے متصف تھے جو حیطہ بیان سے بہار ہے۔ اس جمال وکمال کا اثر یہ تھا کہ دل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور قدر ومنزلت کے جذبات سے خود بخود لبریز ہو جاتے تھے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت اور اجلال وتکریم میں لوگوں نے ایسی ایسی فداکاری وجاں نثاری کا ثبوت دیا جس کی نظیر دنیا کی کسی اور شخصیت کے سلسلے میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء اور ہم نشین وارفتگی کی حد تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے تھے۔ انہیں گوارا نہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خراش تک آجائے خواہ اس کے لیے ان کی گردنیں ہی کیوں نہ کاٹ دی جائیں۔ اس طرح کی محبت کی وجہ یہی تھی کہ جن کمالات پر جان چھڑکی جاتی ہے ان کمالات سے جس قدر حصہ وافر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا تھا کسی اور انسان کو نہ ملا۔ ذیل میں ہم عاجزی و بے مائیگی کے اعتراف کے ساتھ ان روایات کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں جن کا تعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال وکمال سے ہے۔

حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ماں کے پیٹ ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی یتیمی و بے کسی کی حالت سے شروع ہوئی۔ مگر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو تمام ملک عرب کے شہنشاہ تھے۔ عرب کا کوئی صوبہ ایسا نہ تھا جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیوی حکومت اور شہنشاہی نہ ہو گئی ہو۔ ان تمام حالات اور تمام مدارج زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سادہ معاشرت یکساں طور پر نظر آتی ہے اور صحیح بخاری میں مذکور ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیوی کام کاج میں دوسروں پر فضیلت نہیں دی بلکہ جس طرح تم سب لوگ اپنے گھروں میں اپنا کام کرتے ہو ایسے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کیا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی اپنی بکریوں کا دودھ دوہ لیتے اور خود ہی اپنی جوتیاں گانٹھ لیتے تھے۔ مدینہ منورہ میں جب مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیر ہو رہی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب کاموں میں شریک تھے۔ یہاں تک کہ معمولی مزدوروں کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے تھے۔ جنگ احزاب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی خندق کھودنے والوں میں شامل تھے۔ اپنے ہاتھوں سے مٹی اٹھاتے اور پتھر توڑتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی غذا عموماً جو کی روٹی ہوتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں چھلنی نہ تھی۔ پھونک مار کر بھوسی اڑا دی جاتی تھی۔ کبھی دو دن تک متواتر یہ جو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ ملی۔ بعض مرتبہ ایک ایک مہینہ تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آگ نہیں جلی، صرف کھجوروں اور پانی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں نے زندگی بسر کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کھانے کو برا نہیں کہا۔ نہ اس میں عیب نکالے جو کچھ موجود ہوتا وہی تناول فرما لیتے۔ بھوک نہ ہوتی یا مرغوب نہ ہوتا تو ہاتھ کھینچ لیتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کس چیز کا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ ادھوڑی کا، جس میں کھجوروں کی چھال بھری ہوئی تھی۔ یہی سوال حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے بھی کیا گیا۔ انہوں نے فرمایا کہ ایک ٹاٹ کا ٹکڑا تھا جسے ہم دوہرا کر دیا کرتے تھے۔ ایک رات میں نے خیال کیا کہ اس کی چار تہیں کر دوں تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ آرام ملے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب صبح ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ رات تم نے میرے لیے کیا بچھایا تھا۔ میں نے کہا کہ وہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ٹاٹ تھا مگر اس کی چار تہیں کر دی تھیں تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ آرام ملے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، تم اسے جیسا پہلے تھا ویسا ہی کر دو۔ اس نے رات مجھے نماز شب سے باز رکھا۔ وفات سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میرے ورثاء کو میرے ترکے میں روپیہ پیسہ وغیرہ نقدی کچھ نہ ملے۔ ایک یہودی کے پاس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زرہ بعوض تیس درہم گروی رکھی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس زر نقد اتنا نہ تھا کہ اس کو چھڑا لیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترکے میں اپنے ہتھیار، ایک خچر اور ایک زرہ چھوڑی۔ ان چیزوں کی نسبت بھی یہی ارشاد تھا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کہ خیرات کر دی جائیں۔ کیا وہ لوگ اندھے نہیں ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے نعوذ باللہ ذاتی اغراض، نفسانی مقاصد، جاہ طلبی، حصول زر اور ملک گیری کے لیے اپنی قوم پر تلوار اٹھائی تھی؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں آٹھ برس کا تھا جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور برابر دس برس تک خدمت نبوی ﷺ میں رہا، مگر اس طویل مدت میں کبھی ایک مرتبہ بھی آپ ﷺ نے اف تک نہیں کی اور نہ یہ فرمایا کہ یہ کام کیوں کیا اور وہ کام نہ کیا۔ آپ ﷺ کی زبان سے کبھی کوئی فحش اور بیہودہ کلمہ نہیں نکلا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ لوگوں نے آپ ﷺ سے کہا مشرکین کے لیے بد دعا کیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں لعنت کرنے کے لیے نہیں آیا ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ کی طبیعت میں بیہودگی اور لغویت بالکل نہ تھی۔ آپ ﷺ بچوں کو اپنی گود میں بٹھا لیتے اور ان سے کھیلا کرتے۔ مریضوں کی عیادت اور مزاج پرسی کے لیے شہر کے دور دراز محلوں میں آپ ﷺ تشریف لے جاتے تھے۔ جس کسی سے ملتے پہلے خود سلام کرتے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے آپ ﷺ سے مصافحہ کیا ہو اور آپ ﷺ نے اس کے ہاتھ کھینچنے سے پہلے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہو۔ آپ ﷺ احتراماً اپنے اصحاب کا نام نہ لیتے بلکہ کسی کنیت سے مخاطب کرتے اور محبت آمیز پسندیدہ ناموں سے ان کو یاد کرتے تھے۔ آپ ﷺ کسی کا قطع کلام نہیں کرتے تھے۔ البتہ اگر کوئی نازیبا بات کہتا تو آپ ﷺ اسے منع فرما دیتے یا اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے تا کہ وہ خود ہی رک جائے۔

حلیہ مبارک:

ہجرت کے وقت رسول ﷺ ام معبد رضی اللہ عنہ خزاعیہ کے خیمے سے گزرے تو اس نے آپ ﷺ کی روانگی کے بعد اپنے شوہر سے آپ ﷺ کے حلیہ مبارک کا جو نقشہ کھینچا وہ یہ تھا: ''چمکتا رنگ، تابناک چہرہ، خوبصورت ساخت، نہ توندے پن کا عیب نہ گنجے پن کی خامی، جمال جہاں تاب کے ساتھ ڈھلا ہوا پیکر، سرگیں آنکھیں، لمبی پلکیں، بھاری آواز، لمبی گردن، سفید و سیاہ آنکھیں، سیاہ سرگیں پلکیں، باریک اور باہم ملے ہوئے ابرو، چمکدار کالے بال، خاموش ہوں تو باوقار، گفتگو کریں تو پُرکشش، دور سے (دیکھنے میں) سب سے تابناک و پُر جمال، قریب سے سب سے خوبصورت اور شیریں، گفتگو میں چاشنی، بات واضح اور دوٹوک، نہ مختصر نہ فضول، انداز ایسا کہ گویا لڑی سے موتی جھڑ رہے ہیں۔ درمیانہ قد، نہ چھوٹا کہ نگاہ میں نہ جچے، نہ لمبا کہ ناگوار لگے۔ دو شاخوں کے درمیان ایسی شاخ کی طرح ہیں جو سب سے زیادہ تازہ و خوش منظر ہے، رفقاء آپ ﷺ کے گرد حلقہ بنائے ہوئے، کچھ فرمائیں تو توجہ سے سنتے ہیں، کوئی حکم دیں تو لپک کر بجا لاتے ہیں۔ مطاع و مکرم، نہ ترش رو، نہ لغو گو۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کا وصف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''آپ ﷺ نہ لمبے تڑنگے تھے نہ ناٹے کھوٹے، لوگوں کے حساب سے درمیانہ قد کے تھے۔ بال نہ زیادہ گھنگریالے تھے نہ بالکل کھڑے کھڑے بلکہ دونوں کے بیچ بیچ کی کیفیت تھی۔ رخسار نہ بہت زیادہ پر گوشت تھا، نہ ٹھوڑی چھوٹی اور پیشانی پست، چہرہ کسی قدر گولائی لیے ہوئے تھا۔ رنگ گورا گلابی، آنکھیں سرخی مائل، پلکیں لمبی، جوڑوں اور مونڈھوں کی ہڈیاں بڑی بڑی، سینہ پر ناف تک بالوں کی ہلکی سی لکیر، بقیہ جسم بال سے خالی، ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں پر گوشت، چلتے تو قدرے جھکے سے پاؤں اٹھاتے اور یوں چلتے گویا کسی ڈھلوان پر چل رہے ہیں۔ جب کسی طرف توجہ فرماتے تو پورے وجود کے ساتھ متوجہ ہوتے۔ دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت تھی۔ آپ ﷺ سارے انبیاء علیہم السلام کے خاتم تھے۔ سب سے زیادہ سخی دست اور سب سے زیادہ صادق اللہجہ اور سب سے بڑھ کر عہد و پیمان کے پابند وفاء۔ سب سے زیادہ نرم طبیعت اور سب سے شریف ساتھی۔ جو آپ ﷺ کو اچانک دیکھتا ہیبت زدہ ہو جاتا۔ جو جان پہچان کے ساتھ ملتا محبوب رکھتا۔ آپ ﷺ کا وصف بیان کرنے والا یہی کہہ سکتا ہے کہ میں نے آپ ﷺ سے پہلے اور آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ جیسا نہیں دیکھا۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ کا سر بڑا تھا، جوڑوں کی ہڈیاں بھاری بھاری تھیں، سینے پر بالوں کی لمبی لکیر تھی۔ جب آپ ﷺ چلتے تو قدرے جھک کر چلتے گویا کسی ڈھلوان سے اُتر رہے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آپ ﷺ کا دہانہ کشادہ تھا، آنکھیں ہلکی سرخی لیے ہوئے اور ایڑیاں باریک۔

حضرت ابوالطفیل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ گورے رنگ، پرملاحت چہرے اور میانہ قدوقامت کے تھے۔

حضرت انس رضی الہ عنہ بن مالک کا ارشاد ہے کہ آپ ﷺ کی ہتھیلیاں کشادہ تھیں، اور رنگ چمکدار، نہ خالص سفید، نہ گندم گوں، وفات کے وقت تک سر اور چہرے کے بیس بال بھی سفید نہ ہوئے تھے۔

صرف کنپٹی کے بالوں میں کچھ سفیدی تھی اور چند بال سر کے سفید تھے۔

حضرت عبداللہ بن بسر کا بیان ہے کہ آپ ﷺ کے عنفقہ (داڑھ بچہ) میں چند بال سفید تھے۔

حضرت براء رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آپ ﷺ کا پیکر درمیانی تھا۔ دونوں کندھوں کے درمیان دوری تھی۔ بال دونوں کانوں کی لو تک پہنچتے تھے۔ میں نے آپ ﷺ کو سرخ جوڑا زیب تن کئے ہوئے دیکھا کبھی کوئی چیز آپ ﷺ سے زیادہ خوبصورت نہ دیکھی۔

پہلے آپ ﷺ اہل کتاب کی موافقت پسند کرتے تھے، اس لیے بال میں کنگھی کرتے تو مانگ نہ نکالتے، لیکن بعد میں مانگ نکالا کرتے تھے۔

حضرت براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: آپ ﷺ کا چہرہ سب سے زیادہ خوبصورت تھا اور آپ ﷺ کے اخلاق سب سے بہتر تھے۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ کیا نبی ﷺ کا چہرہ تلوار جیسا تھا، انہوں نے کہا: ''نہیں بلکہ چاند جیسا تھا۔'' ایک روایت میں آپ ﷺ کا چہرہ گول تھا۔

ربیع بنت معوذ کہتی ہیں کہ اگر تم حضور ﷺ کو دیکھتے تو لگتا کہ تم نے طلوع ہوتے ہوئے سورج کو دیکھا ہے۔

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے ایک بار چاندنی رات میں آپ ﷺ کو دیکھا، آپ ﷺ پر سرخ جوڑا تھا۔ میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھتا اور چاند کو دیکھتا۔ آخر (اس نتیجہ پر پہنچا کہ) آپ ﷺ چاند سے زیادہ خوبصورت ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ خوبصورت کوئی چیز نہیں دیکھی۔ لگتا تھا سورج آپ ﷺ کے چہرے میں رواں دواں ہے۔ اور میں نے رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کسی کو تیز رفتار نہیں دیکھا۔ لگتا تھا زمین آپ ﷺ کے لیے لپیٹی جا رہی ہے۔ ہم تو آپ ﷺ کو تھکا مارتے تھے اور آپ ﷺ بالکل بے فکر۔

حضرت کعب بن مالک کا بیان ہے کہ جب آپ ﷺ خوش ہوتے تو چہرہ دمک اٹھتا، گویا چاند کا ایک ٹکڑا ہے۔

ایک بار آپ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف فرما تھے۔ پسینہ آیا تو چہرے کی دھاریاں چمک اٹھیں۔ یہ کیفیت دیکھ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ابوکبیر ہذلی کا یہ شعر پڑھا:

واذا نظرت الی اسرة وجهه برقت كبرق العارض المتهلل

''جب ان کے چہرے کی دھاریاں دیکھو تو وہ یوں چمکتی ہیں جیسے روشن بادل چمک رہا ہو۔''

ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کو دیکھ کر یہ شعر پڑھتے:

أمين مصطفى بالخير يدعو كضوء البدر زايله الظلام

''آپ ﷺ امین ہیں، چنیدہ و برگزیدہ ہیں، خیر کی دعوت دیتے ہیں، گویا ماہ کامل کی روشنی ہیں جس سے تاریکی آنکھ مچولی کھیل رہی ہے۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حضرت عمر رضی اللہ عنہ زہیر کا یہ شعر پڑھتے جو ہرم بن سنان کے بارے میں کہا گیا تھا کہ:

لو کنت من شيء سوى البشر کنت المضئ لليلة البدر

''اگر آپ ﷺ بشر کے سوا کسی اور چیز سے ہوتے تو آپ ﷺ ہی چودھویں کی رات کو روشن کرتے۔''

پھر فرماتے کہ رسول اللہ ﷺ ایسے ہی تھے۔

جب آپ ﷺ غضبناک ہوتے تو چہرہ سرخ ہو جاتا گویا دونوں رخساروں میں دانہ انار نچوڑ دیا گیا ہے۔

حضرت جابر بن سمرہ کا بیان ہے کہ آپ ﷺ کی پنڈلیاں قدرے پتلی تھیں اور آپ ﷺ ہنستے تو صرف تبسم فرماتے (آنکھیں سرگیں تھیں) تم دیکھتے تو کہتے کہ آپ ﷺ نے آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا ہے حالانکہ سرمہ نہ لگا ہوتا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی حریر و دیبا نہیں چھوا جو رسول اللہ ﷺ کی ہتھیلی سے زیادہ نرم ہو۔ اور نہ کبھی کوئی عنبر یا مشکل یا کوئی ایسی خوشبو سونگھی جو رسول اللہ ﷺ کی خوشبو سے بہتر ہو۔

حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ کا ہاتھ اپنے چہرہ پر رکھا تو وہ برف سے زیادہ ٹھنڈا اور مشک سے زیادہ خوشبودار تھا۔

حضرت جابر بن سمرہ — جو بچے تھے — کہتے ہیں: ''آپ ﷺ نے میرے رخسار پر ہاتھ پھیرا تو میں نے آپ ﷺ کے ہاتھ میں ایسی ٹھنڈک اور ایسی خوشبو محسوس کی گویا آپ ﷺ نے اسے عطار کے عطر دان سے نکالا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آپ ﷺ کا پسینہ گویا موتی ہوتا تھا، اور حضرت ام سلیم کہتی ہیں کہ یہ پسینہ ہی سب سے عمدہ خوشبو ہوا کرتی تھی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''آپ ﷺ کسی راستے سے تشریف لے جاتے اور آپ ﷺ کے بعد کوئی اور گزرتا تو آپ ﷺ کے جسم یا پسینہ کی خوشبو کی وجہ سے جان جاتا کہ آپ ﷺ یہاں سے تشریف لے گئے ہیں۔

آپ ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت تھی جو کبوتر کے انڈے جیسی اور جسم مبارک ہی کے مشابہ تھی۔ یہ بائیں کندھے کی کری (نرم ہڈی) کے پاس تھی۔ اس پر مسوں کی طرح تلوں کا جھمگھٹ تھا۔

کمال نفس اور مکارم اخلاق:

نبی ﷺ فصاحت و بلاغت میں ممتاز تھے۔ آپ ﷺ طبیعت کی روانی، لفظ کے نکھار، فقروں کی جزالت، معانی کی صحت اور تکلیف سے دوری کے ساتھ ساتھ جوامع الکلم (جامع باتوں) سے نوازے گئے تھے۔ آپ ﷺ کو نادر حکمتوں اور عرب کی تمام زبانوں کا علم عطا ہوا تھا، چنانچہ آپ ﷺ ہر قبیلے سے اسی کی زبان اور محاوروں میں گفتگو فرماتے تھے۔ آپ ﷺ میں بدویوں کا زور بیان اور قوت تخاطب اور شہریوں کی شستگی الفاظ اور شگفتگی و شائستگی جمع تھی اور وحی پر مبنی تائید ربانی الگ سے۔

بردباری، قوت برداشت، قدرت پا کر درگزر اور مشکلات پر صبر ایسے اوصاف تھے جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی تربیت کی تھی۔ ہر حلیم و بردبار کی کوئی نہ کوئی لغزش اور کوئی نہ کوئی زبان کی بے احتیاطی جانی جاتی ہے مگر نبی ﷺ کی بلندی کردار کا عالم یہ تھا کہ آپ ﷺ کے خلاف دشمنوں کی ایذا رسانی اور بدمعاشوں کی خودسری و زیادتی جس قدر بڑھتی گئی آپ ﷺ کے صبر و حلم میں اسی قدر اضافہ ہوتا گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو جب بھی دو کاموں کے درمیان اختیار دیا جاتا تو آپ ﷺ وہی کام اختیار فرماتے جو آسان ہوتا۔ جب تک کہ وہ گناہ کا کام نہ ہوتا۔ اگر گناہ کا کام ہوتا تو آپ ﷺ سب سے بڑھ کر اس سے دور رہتے۔ آپ ﷺ نے کبھی اپنے نفس کے لیے انتقام نہ لیا! البتہ اگر اللہ کی حرمت چاک کی جاتی تو آپ ﷺ اللہ کے لیے انتقام لیتے۔

جودوسخاوت:

آپ ﷺ سب سے بڑھ کر غیض وغضب سے دور تھے اور سب سے جلد راضی ہو جاتے تھے۔ جود و کرم کا وصف ایسا تھا کہ اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ﷺ اس شخص کی طرح بخشش ونوازش فرماتے تھے جسے فقر کا اندیشہ ہی نہ ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ نبی ﷺ سب سے بڑھ کر پیکر جود و سخا تھے، اور آپ ﷺ کا دریائے سخاوت رمضان میں اس وقت زیادہ جوش پر ہوتا جب حضرت جبریل علیہ السلام آپ ﷺ سے ملاقات فرماتے اور حضرت جبریل علیہ السلام رمضان میں آپ ﷺ سے ہر رات ملاقات فرماتے اور قرآن کا دور کراتے۔ پس رسول اللہ ﷺ خیر کی سخاوت میں (خزائن رحمت سے مالا مال کر کے) بھیجی ہوئی ہوا سے بھی زیادہ پیش پیش ہوتے تھے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ایسا کبھی نہ ہوا کہ آپ ﷺ سے کوئی چیز مانگی گئی ہو اور آپ ﷺ نے نہیں کہہ دیا ہو۔

شجاعت و بہادری اور دلیری میں بھی آپ ﷺ کا مقام سب سے بلند اور معروف تھا۔ آپ ﷺ سب سے زیادہ دلیر تھے۔ نہایت کٹھن اور مشکل مواقع پر جبکہ اچھے اچھے جانبازوں اور بہادروں کے پاؤں اکھڑ گئے، آپ ﷺ اپنی جگہ برقرار رہے اور پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے ہی بڑھتے گئے۔ پائے ثبات میں ذرا لغزش نہ آئی۔ بڑے بڑے بہادر بھی کبھی نہ کبھی بھاگے اور پسپا ہوئے ہیں مگر آپ ﷺ میں یہ بات کبھی نہیں پائی گئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب زور کا رن پڑتا اور جنگ کے شعلے خوب بھڑک اٹھتے تو ہم رسول اللہ ﷺ کی آڑ لیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ سے بڑھ کر کوئی شخص دشمن کے قریب نہ ہوتا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک رات اہل مدینہ کو خطرہ محسوس ہوا لوگ شور کی طرف دوڑے تو راستے میں رسول اللہ ﷺ واپس آتے ہوئے ملے۔ آپ ﷺ لوگوں سے پہلے ہی آواز کی جانب پہنچ (کر خطرے کے مقام کا جائزہ لے) چکے تھے۔ اس وقت آپ ﷺ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے بغیر زین کے گھوڑے پر سوار تھے۔ گردن میں تلوار حمائل کر رکھی تھی اور فرما رہے تھے ڈرو نہیں، ڈرو نہیں (کوئی خطرہ نہیں)۔

عفت وعصمت:

آپ ﷺ سب سے زیادہ حیادار اور پست نگاہ تھے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ پردہ نشین کنواری عورت سے بھی زیادہ حیادار تھے۔ جب آپ ﷺ کو کوئی بات ناگوار گزرتی تو چہرے سے پتہ لگ جاتا۔ اپنی نظریں کسی کے چہرے پر گاڑتے نہ تھے۔ نگاہ پست رکھتے تھے اور آسمان کی بہ نسبت زمین کی طرف نظر زیادہ دیر تک رہتی تھی۔ عموماً نیچی نگاہ سے تاکتے۔ حیا اور کرم نفس کا عالم یہ تھا کہ کسی سے ناگوار بات نہ کہتے اور کسی کی کوئی ناگوار بات آپ ﷺ تک پہنچتی تو نام لے کر اس کا ذکر نہ کرتے بلکہ یوں فرماتے کہ کیا بات ہے کہ کچھ لوگ ایسا کر رہے ہیں۔ فرزدق کے اس شعر کے سب سے زیادہ صحیح مصداق آپ ﷺ تھے:

یغضی حیاء و یغضی من مهابته　　　فلا یکلم الا حین یبتسم

"آپ ﷺ حیاء کے سبب اپنی نگاہ پست رکھتے ہیں اور آپ ﷺ کی ہیبت کے سبب نگاہیں پست رکھی جاتی ہیں، چنانچہ آپ ﷺ سے اُسی وقت گفتگو کی جاتی ہے جب آپ تبسم فرما رہے ہوں۔"

صدق:

آپ ﷺ سب سے زیادہ عادل، پاک دامن، صادق اللہجہ اور عظیم الامنۃ تھے۔ اس کا اعتراف آپ ﷺ کے دوست دشمن سب کو ہے۔ نبوت سے پہلے آپ ﷺ کو امین کہا جاتا تھا اور دور جاہلیت میں آپ ﷺ کے پاس فیصلے کے لیے مقدمات لائے جاتے تھے۔ جامع ترمذی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک بار ابو جہل نے آپ ﷺ سے کہا: ''ہم آپ کو جھوٹا نہیں کہتے البتہ آپ ﷺ جو کچھ لے کر آئے ہیں اسے جھٹلاتے ہیں۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۶:۳۳)

ترجمہ: ''یہ لوگ آپ ﷺ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔''

ہرقل نے ابوسفیان سے دریافت کیا کہ کیا اس (نبی ﷺ) نے جو بات کہی ہے اس کے کہنے سے پہلے تم لوگ ان پر جھوٹ کا الزام لگاتے تھے؟ تو ابوسفیان نے جواب دیا کہ ''نہیں۔''

امانت:

آپ ﷺ ابتدائے عمر سے ہی دو القاب سے پکارے جاتے تھے، صادق اور امین۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے معاوضے پر تجارت کے لیے آپ ﷺ کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اپنے ملازم سے حضور ﷺ کی امانت داری کی باتیں سنیں تو بے حد متاثر ہوئیں اور آخر کار نکاح کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ مکہ کے لوگ آپ ﷺ کے پاس اپنی امانتیں رکھا کرتے تھے۔ حضور ﷺ کی دعوت اسلام کی شدت سے مخالفت و مزاحمت کر رہے تھے لیکن امانتیں پھر بھی حضور ﷺ کے پاس رکھی تھیں۔ چنانچہ جس رات حضور اکرم ﷺ نے مکہ سے مدینہ کو ہجرت فرمائی اس وقت بھی لوگوں کی امانتیں آپ ﷺ کے پاس موجود تھیں، جن کو لوٹانے کے لیے آپ ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پیچھے چھوڑ گئے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہ امانتیں ان کے مالکوں کو واپس کرنے کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی۔ آپ ﷺ نے امانت داری کی تلقین فرمائی ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: لا ایمان لمن لا امانۃ لہ، ''اس شخص کا کوئی ایمان نہیں جو امانتدار نہیں۔''

حضور ﷺ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنا آخری پیغام لوگوں تک پہنچانے کے لیے امانت سونپی، حضور ﷺ نے اس امانت کے پاس اور احترام کا بھی حق ادا کر دیا۔ اللہ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے میں بے پناہ مصائب جھیلے اور اذیتیں برداشت کیں مگر اللہ تعالیٰ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کا کام جاری رکھا۔ آپ ﷺ کے ذمے پیغام (عملی وضاحت کے ساتھ) پہنچانا تھا لیکن آپ ﷺ کی امانت داری کی انتہا یہ تھی کہ اس غم میں آپ ﷺ کی جان گھلی جا رہی تھی کہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ آخر اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ ﷺ کو تسلی دی:

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ط (فاطر، ۳۵:۸)

ترجمہ: ''پس (اے میرے پیارے رسول ﷺ) ان لوگوں کی خاطر غم و افسوس میں آپ ﷺ کی جان نہ گھلے۔''

اللہ تعالیٰ نے جس طرح قرآن حکیم آپ ﷺ پر نازل فرمایا آپ ﷺ نے من وعن لوگوں تک پہنچا دیا، اور آج تک اسی حالت میں موجود ہے جس حالت میں نازل ہوا تھا۔ آپ ﷺ کو اس امانت کا اس قدر احساس تھا کہ خطبہ حجۃ الوداع کے آخر میں (جس میں حضور ﷺ نے اسلام کی تمام اہم باتوں کا ذکر فرمایا تھا) لاکھوں مسلمانوں کے مجمع سے پوچھا، جب تم سے میرے بارے میں سوال ہوگا تو کیا کہو گے؟ لوگوں نے بیک آواز جواب دیا، آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا ہے۔ حضور ﷺ نے آسمان کی طرف تین بار انگلی اٹھا کر فرمایا: اے رب! گواہ رہ!

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

رحم:

حضور ﷺ کے اخلاق کریمہ میں رحم غالب دکھائی دیتا ہے۔ آپ ﷺ کے رحمت ہونے کا اعلان تو خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ.

ترجمہ: ''اور ہم نے تو آپ ﷺ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

حضور پاک ﷺ سراپا رحمت تھے۔ کسی کو بھی دکھ میں مبتلا دیکھتے تو آپ ﷺ کو بہت دکھ ہوتا۔ آپ ﷺ کی شفقت و رحمت اور دوسروں کے دکھ کو محسوس کرنے کی گواہی قرآن حکیم میں خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُ وْفٌ رَّحِیْمٌ.

ترجمہ: ''بے شک تمہارے پاس ایک رسول آیا ہے جو تمہیں میں سے ہے۔ تمہاری تکلیف اس پر شاق گزرتی ہے تمہاری بھلائی کا وہ حد درجہ متمنی ہے، ایمان لانے والوں کے لیے وہ بہت شفیق اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

حضور ﷺ کی رحمت کی بارش بچوں، عورتوں، غلاموں، غریبوں، یتیموں، مومنوں، کافروں، انسانوں اور جانوروں سب پر برستی تھی، سب آپ ﷺ کی رحمت سے بہرہ ور ہوئے، آج تک ہو رہے ہیں اور قیامت تک ہوتے رہیں گے۔ آپ ﷺ کی سیرت طیبہ رحمت کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ مثال کے طور پر چند واقعات درج ذیل ہیں:

۱۔ قریش مکہ نے اہل ایمان پر جو مظالم ڈھائے، آپ ﷺ کو جو اذیتیں دیں، پھر ہجرت مدینہ کے بعد جس طرح انہوں نے آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر جنگیں مسلط کیں، غزوہ احزاب میں سارے عرب کو اکٹھا کر کے مدینہ کی ننھی سی بستی پر چڑھ آئے۔ یہ سب باتیں معلوم ہیں لیکن جب غزوۂ خندق کے بعد وہ قحط اور معاشی بدحالی کا شکار ہوئے اور اس نوبت کو پہنچ گئے کہ گلی سڑی لاشیں بھی کھانے لگے تو ان کا سردار ابوسفیان مدینہ جا کر بارگاہ نبوت میں حاضر ہوا اور اپنی قوم کی تنگی اور بدحالی بیان کر کے آپ ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ﷺ اللہ سے دعا فرمائیں تو آپ ﷺ نے نہ صرف دعا فرمائی بلکہ پانچ سو دینار اور کچھ کھجوریں بھی امداد کے طور پر عطا فرمائیں۔ بدترین دشمنوں کے ساتھ ایسی رحم دلی فرمانا حضور ﷺ کا ہی خاصہ تھا۔

۲۔ مکہ معظمہ میں جب آپ ﷺ پر اور اہل ایمان پر مشرکین مکہ مظالم ڈھا رہے تھے اسی زمانے میں ایک صحابی حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ، دشمنوں کے حق میں بددعا فرمائیے۔ یہ سن کر آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک غصہ سے سرخ ہو گیا۔ ایک اور موقع پر بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف سے اسی قسم کی درخواست کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا، میں دنیا کے لیے لعنت نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ طائف میں آپ ﷺ دعوت اسلام کے لیے تشریف لے گئے تو طائف والوں نے آپ ﷺ پر پتھر برسائے لیکن آپ ﷺ نے ان کے لیے دعا فرمائی۔

۳۔ آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام اور متبنی حضرت زید بن حارثہ غزوۂ موتہ میں شہید ہوئے تو ان کی بچی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ حضور اس کے غم کو دیکھ کر بہت غمزدہ ہوئے اور اس قدر روئے کہ گلے میں آواز رندھ گئی۔

۴۔ ایک دفعہ ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ اپنے غلام کو پیٹ رہے تھے۔ حضور ﷺ نے دور سے دیکھ لیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، ابومسعود! تم کو جتنا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اس غلام پر اختیار ہے اللہ کو اس سے زیادہ تم پر اختیار ہے۔ ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے مڑ کر دیکھا تو حضور پاک ﷺ تھے۔ عرض کی، یا رسول اللہ، میں نے اس غلام کو اللہ کی رضا کے لیے آزاد کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، اگر تم ایسا نہ کرتے تو دوزخ کی آگ تمہیں چھو لیتی۔

حضور ﷺ نے جنگ کے دوران جن اخلاقی اقدار کو ملحوظ فرمایا اور جن کو تعلیم دی وہ بھی آپ ﷺ کی بے پایاں رحمت کا مظہر ہے۔ یعنی یہ کہ مثلہ نہ کیا جائے، بچوں، عورتوں، معذوروں، راہبوں وغیرہ بے ضرر لوگوں کو قتل نہ کیا جائے، بستیوں، فصلوں، کھیتوں اور باغات کو نہ اجاڑا جائے اور کسی بھی قسم کا کوئی وحشیانہ فعل نہ کیا جائے۔ آپ ﷺ نے رحم کرنے کی تعلیم دی ہے، بالخصوص کمزوروں، یعنی بچوں، عورتوں، غلاموں اور خادموں پر۔ اسی طرح جانوروں پر بھی رحم کرنے کی تعلیم دی ہے۔

عفوو درگزر:

حضور ﷺ غالب ہونے کی صورت میں اپنے بدترین دشمن کو بھی معاف فرما دیتے تھے، کبھی آپ ﷺ نے کسی سے انتقام نہیں لیا۔ مشرکین مکہ نے آپ ﷺ پر اور ایمان والوں پر کیا کیا ظلم کیے تھے، کیسی کیسی اذیتیں دی تھیں، تاریخ کے صفحات ان کی تفصیل سے بھرے پڑے ہیں۔ لیکن جب مکہ فتح ہوا تو رحمۃ للعالمین ﷺ نے ان کے مظالم کا انتقام لینے کے بجائے ان سب کو معاف فرما دیا۔ حالانکہ اس زمانے کے دستور کے مطابق مفتوحین کے ساتھ یہ سلوک کرنا جائز تھا کہ لڑنے کے قابل سب مردوں کو قتل کر دیا جاتا اور بچوں اور عورتوں کو غلام لونڈی بنا لیا جاتا اور ان کے مال و جائیداد لوٹ لیے جاتے لیکن آپ ﷺ نے ان کو مال و جان کی امان عطا فرمائی۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ غزوۂ احد میں شہید ہوئے، ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے ان کی نعش کی سخت بے حرمتی کی، ان کا کلیجہ نکال کر چبایا۔ فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ نے اسے بھی معاف فرما دیا۔

صبر واستقامت:

حضور ﷺ نے بعثت سے لے کر وصال تک دین حق کی سربلندی کے لیے جس استقامت کا مظاہرہ فرمایا اور اس راہ میں پہنچنے والی تکالیف ومصائب پر جس طرح صبر سے کام لیا اس کی مثال ملنی محال ہے۔ اس پورے تیئس برس کے طویل عرصہ میں آپ ﷺ کو مسلسل طرح طرح کے مصائب ومشکلات پیش آئے لیکن آپ ﷺ نے بے مثال صبر واستقامت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔ آپ ﷺ نے تن تنہا نعرۂ توحید بلند کیا، اس پر آپ ﷺ کی شدید مخالفت اور پھر مزاحمت شروع ہوگئی۔ آپ ﷺ کے اپنے خاندان میں سے صرف آپ ﷺ کے چچا ابو طالب آپ ﷺ کا ساتھ دے رہے تھے۔ ایک دن قریش مکہ نے حضرت ابو طالب کو دھمکی آمیز لہجے میں کہا کہ اپنے بھتیجے سے کہو کہ اپنے نئے دین سے باز آجائے ورنہ ہم دونوں میں سے ایک فریق مٹ جائے گا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ (معاذ اللہ) حضور ﷺ کو مٹانے کی دھمکی تھی، کیونکہ سارا شہر ایک طرف تھا اور حضور ﷺ اکیلے ایک طرف۔ حضرت ابو طالب نے حضور ﷺ کو قریش کی یہ دھمکی بتانے کے بعد کہا، اے میرے بھتیجے، مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈال کہ میں اٹھا نہ سکوں۔ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا، چچا جان! آپ نے اب تک میری جو مدد کی ہے اس کا شکریہ۔ آپ بے شک میری مدد سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں تو بھی میں اپنے دین سے نہ ہٹوں گا تا آنکہ اللہ تعالیٰ اس دین کو غالب کر دے یا میری جان چلی جائے۔ حضرت ابو طالب رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کا یہ عزم صمیم دیکھ کر حضور ﷺ سے فرمایا، جا اور جیسے جی چاہے تبلیغ کر، میں ہرگز تیرا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قریش مکہ کہ حضور پاک ﷺ کا اور آپ ﷺ کا ساتھ دینے والے ہر شخص کا سوشل بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے خاندان کے لوگ بچوں اور عورتوں سمیت تین سال تک مکہ کے قریب ایک گھاٹی میں محصور رہے۔ جو شعب ابی طالب کے نام سے مشہور ہے۔ کفار مکہ سخت نگرانی رکھتے تھے کہ کوئی شخص چوری چھپے بنو ہاشم کو کھانے پینے کی کوئی چیز نہ دے دے۔ فاقوں تک نوبت آ جاتی، بچے بھوک پیاس سے بے چین ہو کر بلک بلک کر روتے اور چلاتے۔ کفار مکہ پہاڑیوں کی اوٹ میں رونے اور چیخنے کی یہ آوازیں سنتے تو خوش ہوتے کہ بس اب بنو ہاشم گھٹنے ٹیک دیں گے لیکن صبر واستقامت کے پیکر حضور ﷺ نے نہ صرف اپنی دعوت اسلام کو جاری رکھا بلکہ آپ ﷺ کی تبلیغی سرگرمیاں پہلے سے بھی بڑھ گئیں۔

کفار مکہ آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نت نئے طریقوں سے ایذائیں دیتے رہے، آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھاتے، آپ ﷺ پر مٹی اور پتھر پھینکتے، آپ ﷺ کے گھر آ کر ہنڈیا میں گندگی ڈال جاتے۔ آپ ﷺ نے اپنے اور اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ ہونے والے مظالم پر انتہائی صبر سے کام لیا۔ مخالفین کے خلاف کبھی بد دعا تک نہ کی بلکہ ان کے لیے دعا ہی فرماتے۔ آپ ﷺ اپنے دین پر ثابت قدمی کے ساتھ ڈٹے رہے۔ قریش مکہ کے مظالم کی انتہا ہو گئی تو آپ ﷺ نے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مدینہ ہجرت فرمائی۔ مشرکین مکہ نے وہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا، انہوں نے مسلسل کئی جنگیں مسلط کیں۔ ہر جنگ میں کفار مکہ کی تعداد اور سامان جنگ کی کثرت اور مسلمانوں کی تعداد اور اسلحہ میں قلت کے باوجود حضور ﷺ نے بے مثال صبر واستقامت سے کام لیا، اپنے موقف پر مضبوطی کے ساتھ ڈٹے رہے اور گھبرا کر پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے آ کر ان کا عزم وحوصلہ کے ساتھ مقابلہ کیا اور انہیں شکست دی۔ مدینہ میں منافقین اور یہودیوں کی سازشیں اس کے علاوہ تھیں۔ یہ آستین کے سانپ تھے، جب بھی موقع ملتا ڈسنے کی کوشش کرتے، رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے واقعہ افک کے ذریعے حضور ﷺ کو اور آپ ﷺ کے خاندان کو سخت ذہنی اذیت پہنچائی مگر آپ ﷺ نے اس پر بھی صبر کیا۔ عمر مبارک کے آخری حصہ میں، جب سارا عرب آپ ﷺ کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہو چکا تھا اور پورے عرب نے ایک اسلامی ریاست کی شکل اختیار کر لی تھی اس نوزائیدہ اسلامی ریاست کو سلطنت روما کے عیسائیوں کی طرف سے شدید خطرات درپیش ہو گئے۔ آپ ﷺ کو ان خطرات کو دور کرنے کے لیے اپنی عمر کے اس حصے میں تبوک جیسی سخت مشکل اور صبر آزما مہم پر جانا پڑا۔ غرض آپ ﷺ کی پوری حیات طیبہ صبر واستقامت سے عبارت ہے۔

فقر وزہد:

حضور اکرم ﷺ نے نہایت فقر وزہد کی زندگی بسر فرمائی۔ آپ ﷺ نے اپنی خوشی سے اپنے اور اپنے خاندان کے لیے فقر وزہد کو اختیار فرمایا۔ آپ ﷺ کا فقر اختیاری تھا، جبری نہ تھا۔ آپ ﷺ کو جو کچھ ملتا غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم فرما دیتے اور خود تنگی کی زندگی گزارتے۔ آپ ﷺ کے فقر وزہد سے متعلق چند باتیں اور واقعات بطور مثال ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کے گھر والوں نے آپ ﷺ کے وصال تک کبھی جو کی روٹی بھی لگاتار دو دن شکم سیر ہو کر نہیں کھائی۔

۲۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم دو ماہ میں تین (مرتبہ) چاند دیکھ لیا کرتے تھے اور اس عرصہ میں رسول اللہ ﷺ کے گھروں میں چولہا نہیں جلتا تھا، کھجور اور پانی پر گزارا ہوتا تھا۔

۳۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی خوشحالی اور دولت مندی کا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ذکر کرنے کے بعد فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس حال میں دیکھا ہے کہ آپ ﷺ دن بھر بھوکے پیٹ رہتے اور آپ ﷺ کے پاس پیٹ بھرنے کے لیے ردی کھجور بھی نہ ہوتی تھی۔

۴۔ ام المومنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے بھائی حضرت عمرو بن حارث رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے وصال کے وقت نہ دینار چھوڑے نہ درہم، نہ غلام، نہ لونڈی اور نہ کوئی اور چیز سوائے اپنے سفید خچر کے جس پر آپ ﷺ سواری فرمایا کرتے تھے اور اپنے ہتھیار کے اور اس زمین کے جو آپ ﷺ نے مسافروں کے لیے وقف فرما رکھی تھی۔

۵۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے وقت آپ ﷺ کی ایک زرہ تیس صاع جو کے بدلے ایک یہودی کے پاس رہن رکھی ہوئی تھی۔

۶۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اے اللہ! محمد (ﷺ) کے گھر والوں کو اتنا رزق عطا فرما کہ جو زندہ رہنے کے لیے ضروری ہو۔"

۷۔ جب سارے عرب پر آپ ﷺ کی حکومت قائم ہو گئی تو آپ ﷺ سے ازواج مطہرات نے خرچہ بڑھانے کا مطالبہ کیا، جسے آپ ﷺ نے منظور نہ فرمایا۔ بات بڑھی تو آپ ﷺ ان سے ناراض ہو کر گھر میں ہی الگ ہو گئے۔ اس علیحدگی کی حالت کو ایک ماہ گزرا تو اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرما کر آپ ﷺ کو حکم دیا:

ترجمہ: "اے نبی ﷺ اپنی ازواج سے کہہ دیجیے کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ متاع دے کر اچھی طرح رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور دار آخرت کو چاہتی ہو تو اللہ نے تم میں سے نیکی کرنے والیوں کے لیے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔"

ازواج مطہرات نے اللہ تعالیٰ، اللہ کے رسول ﷺ اور آخرت کو دنیا کی زینت پر ترجیح دی اور اسی طرح تنگی اور فقر و فاقہ سے زندگی گزارنا منظور کر لیا۔

حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فقر و زہد کا دائرہ صرف معاشی زندگی کو محیط ہے، بیوی سے پیار محبت کا اظہار اور اس کی ناز برداریاں فقر و زہد کے منافی نہیں ہیں۔

حضور ﷺ نے اپنی امت کو اس امر کی تعلیم فرمائی ہے کہ دنیا کی چیزوں میں کھو نہ جائیں۔ ذیل میں حضور ﷺ کے چند ارشادات گرامی درج کیے جاتے ہیں:

(الف) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جائداد نہ بناؤ، ایسا نہ ہو کہ دنیا کے ہو کے رہ جاؤ۔

(ب) حضرت کعب بن عیاض رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہر امت کے لیے کوئی نہ کوئی چیز آزمائش رہی ہے اور میری امت کی آزمائش مال ہے۔

(ج) حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ابن آدم کہتا ہے، میرا مال، میرا مال۔ اور اے ابن آدم کیا تیرے مال میں سے کچھ بھی تیرا ہے سوائے اس کے جو تو نے کھا کر فنا کر دیا یا پہن کر بوسیدہ کر ڈالا یا صدقہ کر کے آگے بھیج دیا۔

(د) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

(د) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے دونوں کندھے پکڑ کر فرمایا: دنیا میں اس طرح رہ کہ گویا تو پردیسی یا راہ گیر ہے۔

صدق، امانت، عفو، صبر واستقامت اور فقر و زہد حضور اکرم ﷺ کے اخلاق کے نمایاں پہلو ہیں۔ ان کے علاوہ جو اخلاق حسنہ ہیں، مثلاً حلم، تحمل، تواضع وانکسار، ایفائے عہد، سخاوت اور شجاعت وغیرہ تو آپ ﷺ کی سیرت طیبہ میں ان کی نہایت شاندار اور اعلیٰ مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔

انکساری وتواضع:

آپ ﷺ سب سے زیادہ متواضع اور تکبر سے دور تھے۔ جس طرح بادشاہوں کے لیے ان کے خدام وحاشیہ بردار کھڑے رہتے ہیں اس طرح اپنے لیے آپ ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو کھڑے ہونے سے منع فرماتے تھے۔ مسکینوں کی عیادت کرتے تھے، فقرا کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے، غلام کی دعوت منظور فرماتے تھے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں کسی امتیاز کے بغیر ایک عام آدمی کی طرح بیٹھتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ اپنے جوتے خود ٹانکتے تھے، اپنے کپڑے خود سیتے تھے اور اپنے ہاتھ سے اس طرح کام کرتے تھے جیسے تم میں سے کوئی آدمی اپنے گھر کے کام کاج کرتا ہے۔ آپ ﷺ بھی انسانوں میں سے ایک انسان تھے۔ اپنے کپڑے خود ہی دیکھتے اپنی بکری خود دوہتے تھے اور اپنا کام خود کرتے تھے۔

آپ ﷺ سب سے بڑھ کر عہد کی پابندی اور صلہ رحمی فرماتے تھے، لوگوں کے ساتھ سب سے زیادہ شفقت اور رحم ومروت سے پیش آتے تھے، رہائش اور ادب میں سب سے اچھے تھے۔ آپ ﷺ کا اخلاق سب سے زیادہ کشادہ تھا۔ بدخلقی سے سب سے زیادہ دور ونفور تھے۔ نہ عادتاً فحش گو تھے نہ بہ تکلف فحش کہتے تھے، نہ لعنت کرتے تھے۔ نہ بازار میں چیختے چلاتے تھے، نہ برائی کا بدلہ برائی سے دیتے تھے، بلکہ معافی اور درگزر سے کام لیتے تھے۔ کسی کو اپنے پیچھے چلتا ہوا نہ چھوڑتے تھے اور نہ کھانے پینے میں اپنے غلاموں اور لونڈیوں پر ترفع اختیار فرماتے تھے۔ اپنے خادم کا کام خود ہی کر دیتے تھے۔ کبھی اپنے خادم کو اف نہیں کہا۔ نہ اس پر کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر عتاب فرمایا۔ مسکینوں سے محبت کرتے، ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھے اور ان کے جنازوں میں حاضر ہوتے تھے۔ کسی فقیر کو اس کے فقر کی وجہ سے حقیر نہیں سمجھتے تھے۔ ایک بار آپ ﷺ سفر میں تھے۔ ایک بکری کاٹنے پکانے کا مشورہ ہوا۔ ایک نے کہا، ذبح کرنا میرے ذمہ، دوسرے نے کہا کھال اتارنا میرے ذمہ، تیسرے نے کہا، پکانا میرے ذمہ، نبی ﷺ نے فرمایا ایندھن کی لکڑیاں جمع کرنا میرے ذمہ صحابہ نے عرض کیا، ہم آپ ﷺ کا کام کر دیں گے آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں جانتا ہوں تم لوگ میرا کام کر دو گے لیکن میں پسند نہیں کرتا کہ تم پر امتیاز حاصل کروں کیونکہ اللہ اپنے بندے کی یہ حرکت ناپسند کرتا ہے کہ اپنے آپ کو رفقاء میں ممتاز سمجھے۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے اٹھ کر لکڑیاں جمع فرمائیں۔

کمال مکارم اخلاق:

آیئے ذرا ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ کی زبانی رسول اللہ ﷺ کے اوصاف سنیں۔ ہند رضی اللہ عنہ اپنی ایک طویل روایت میں کہتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ پیہم غموں سے دوچار تھے۔ ہمیشہ غور وفکر فرماتے رہتے تھے۔ آپ ﷺ کے لیے راحت نہ تھی۔ بلاضرورت نہ بولتے تھے۔ دیر تک خاموش رہتے تھے۔ از اول تا آخر بات پورے منہ سے کرتے تھے، یعنی صرف منہ کے کنارے سے نہ بولتے تھے۔ جامع اور دوٹوک کلمات کہتے تھے جن میں نہ فضول گوئی ہوتی تھی نہ کوتاہی۔ نرم خو تھے، جفاجو اور حقیر نہ تھے۔ نعمت معمولی بھی ہوتی تو اس کی تعظیم کرتے تھے۔ کسی چیز کی مذمت نہیں فرماتے تھے۔ کھانے کی نہ برائی کرتے تھے نہ تعریف حق کو کوئی نقصان پہنچاتا تو جب تک انتقام نہ لے لیتے آپ ﷺ کے غضب کو روکا نہ جا سکتا تھا۔ البتہ کشادہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دل تھے۔ اپنے نفس کے لیے نہ غضبناک ہوتے نہ انتقام لیتے۔ جب اشارہ فرماتے تو پوری ہتھیلی سے اشارہ فرماتے اور تعجب کے وقت ہتھیلی پلٹتے۔ جب غضبناک ہوتے تو رخ پھیر لیتے اور جب خوش ہوتے تو نگاہ پست فرمالیتے۔ آپ ﷺ کی بیشتر ہنسی تبسم کی صورت میں تھی۔ مسکراتے تو دانت اولوں کی طرح چمکتے۔ لایعنی بات سے زبان روکے رکھتے۔ ساتھیوں کو جوڑتے تھے، توڑتے نہ تھے۔ ہر قوم کے معزز آدمی کی تکریم فرماتے تھے اور اسی کو ان کا والی بناتے تھے۔ لوگوں (کے شر) سے محتاط رہتے اور ان سے بچاؤ اختیار فرماتے تھے لیکن اس کے لیے کسی سے اپنی خندہ جبینی ختم نہ فرماتے تھے۔ اپنے اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خبر گیری کرتے اور لوگوں کے حالات دریافت فرماتے۔ اچھی چیز کی تحسین وتصویب فرماتے اور بری چیز کی تقبیح وتوہین۔ معتدل تھے، افراط وتفریط سے دور تھے۔ غافل نہ ہوتے تھے کہ مبادا لوگ بھی غافل یا ملول خاطر ہو جائیں۔ ہر حالت کے لیے مستعد رہتے تھے۔ حق سے کوتاہی نہ فرماتے تھے، نہ حق سے تجاوز فرما کر ناحق کی طرف جاتے تھے۔ جو لوگ آپ ﷺ کے قریب رہتے تھے وہ سب سے اچھے لوگ تھے اور ان میں بھی آپ ﷺ کے نزدیک افضل وہ تھا جو سب سے بڑھ کر خیر خواہ ہو؛ اور سب سے زیادہ قدر آپ ﷺ کے نزدیک اس کی تھی جو سب سے اچھا غمگسار و مددگار ہو۔

آپ ﷺ اٹھتے بیٹھتے اللہ کا ذکر ضرور فرماتے۔ جگہیں متعین نہ فرماتے — یعنی اپنے لیے کوئی امتیازی جگہ مقرر نہ فرماتے — جب قوم کے پاس پہنچتے تو مجلس میں جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے اور اسی کا حکم بھی فرماتے۔ سب اہل مجلس پر برابر توجہ فرماتے، حتی کہ کوئی جلیس یہ نہ محسوس کرتا کہ کوئی شخص آپ ﷺ کے نزدیک اس سے زیادہ باعزت ہے۔ کوئی کسی ضرورت سے آپ ﷺ کے پاس بیٹھتا یا کھڑا ہوتا تو آپ ﷺ اتنے صبر کے ساتھ اس کے لیے رکے رہتے کہ وہ خود ہی واپس ہوتا۔ کوئی کسی ضرورت کا سوال کر دیتا تو آپ ﷺ اسے عطا کیے بغیر یا اچھی بات کہے بغیر واپس نہ فرماتے۔ آپ ﷺ نے اپنی خندہ جبینی اور اخلاق سے سب کو نوازا، یہاں تک کہ آپ ﷺ سب کے لیے باپ کا درجہ رکھتے تھے اور سب آپ ﷺ کے نزدیک یکساں حق رکھتے تھے، کسی کو فضیلت تھی تو تقویٰ کی بنیاد پر۔ آپ ﷺ کی مجلس حلم وحیاء اور صبر وامانت کی مجلس تھی۔ اس میں آوازیں بلند نہ کی جاتی تھیں اور نہ حرمتوں پر عیب لگتے تھے — یعنی کسی کی بے آبروئی کا اندیشہ نہ تھا — لوگ تقویٰ کی بدولت باہم محبت و ہمدردی رکھتے تھے۔ بڑے کا احترام کرتے تھے چھوٹے پر رحم کرتے تھے، حاجتمند کو نوازتے تھے اور اجنبی کو انس عطا کرتے تھے۔

آپ ﷺ کے چہرے پر ہمیشہ بشاشت رہتی۔ سہل خو اور نرم پہلو تھے جفا جو اور سخت خو نہ تھے۔ نہ چیختے چلاتے تھے، نہ فحش کہتے تھے نہ زیادہ عتاب فرماتے تھے نہ بہت تعریف کرتے تھے۔ جس چیز کی خواہش ہوتی اس سے تغافل برتتے تھے۔ آپ ﷺ سے مایوسی نہیں ہوتی تھی۔

آپ ﷺ نے تین باتوں سے اپنے نفس کو محفوظ رکھا:

(۱) ریاء سے

(۲) کسی چیز کی کثرت سے؛ اور

(۳) لایعنی بات سے

تین باتوں سے لوگوں کو محفوظ رکھا یعنی آپ ﷺ

(۱) کسی کی مذمت نہیں کرتے تھے

(۲) کسی کو عار نہیں دلاتے تھے اور

(۳) کسی کی عیب جوئی نہیں کرتے تھے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آپ ﷺ وہی بات نوک زبان پر لاتے تھے جس میں ثواب کی امید ہوتی۔ جب آپ ﷺ تکلم فرماتے تو آپ ﷺ کے ہم نشین یوں سر جھکائے ہوتے گویا سروں پر پرندے بیٹھے ہیں اور جب آپ ﷺ خاموش ہوتے تو لوگ گفتگو کرتے۔ لوگ آپ ﷺ کے پاس گپ بازی نہ کرتے۔ آپ ﷺ کے پاس جو کوئی بولتا سب اس کے لیے خاموش رہتے، یہاں تک کہ وہ اپنی بات پوری کر لیتا۔ ان کی بات ہی ہوتی جو ان کا پہلا شخص کرتا۔ جس بات سے سب لوگ ہنستے اس سے آپ ﷺ بھی ہنستے اور جس بات پر سب لوگ تعجب کرتے اس پر آپ ﷺ بھی تعجب کرتے۔ اجنبی آدمی درشت کلامی سے کام لیتا تو اس پر آپ ﷺ صبر کرتے اور فرماتے: "جب تم لوگ حاجتمند کو دیکھو کہ وہ اپنی حاجت کی طلب میں ہے تو اسے سامان ضرورت سے نوازدو۔" آپ ﷺ احسان کا بدلہ دینے والے کے سوا کسی سے ثناء کے طالب نہ ہوتے۔

پروقار شخصیت:

خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ اپنی مجلس مین سب سے زیادہ باوقار ہوتے۔ اپنے پاؤں وغیرہ نہ پھیلاتے، بہت زیادہ خاموش رہتے۔ بلاضرورت نہ بولتے، جو شخص نامناسب بات بولتا اس سے رخ پھیر لیتے۔ آپ ﷺ کی ہنسی مسکراہٹ تھی اور کلام دوٹوک: نہ فضول نہ کوتاہ۔ آپ ﷺ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ہنسی بھی آپ کی توقیر واقتداء میں مسکراہٹ ہی کی حد تک ہوتی۔

حاصل کلام یہ کہ نبی ﷺ بے نظیر صفات کمال سے آراستہ تھے۔ آپ ﷺ کے رب نے آپ ﷺ کو بے نظیر ادب سے نوازا تھا حتیٰ کہ اس نے خود آپ ﷺ کی تعریف میں فرمایا:

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (۶۸:۴)

ترجمہ: "یقیناً آپ عظیم اخلاق پر ہیں۔"

اور یہ ایسی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے لوگ آپ ﷺ کی طرف کھنچ آئے، دلوں میں آپ ﷺ کی محبت بیٹھ گئی اور آپ ﷺ کو قیادت کا وہ مقام حاصل ہوا کہ لوگ آپ ﷺ پر وارفتہ ہو گئے۔ ان ہی خوبیوں کے سبب آپ ﷺ کی قوم کی اکڑ اور سختی نرمی میں تبدیل ہوئی یہاں تک کہ یہ اللہ کے دین میں فوج درفوج داخل ہو گئی۔

یاد رہے کہ ہم نے پچھلے صفحات میں آپ ﷺ کی جن خوبیوں کا ذکر کیا ہے وہ آپ ﷺ کے کمال اور عظیم صفات کے مظاہر کی چند چھوٹی لکیریں ہیں ورنہ آپ ﷺ کے مجد وشرف اور شمائل وخصائل کی بلندی اور کمال کا یہ عالم تھا کہ ان کی حقیقت اور تہ تک نہ رسائی ممکن ہے نہ اس کی گہرائی ناپی جاسکتی ہے۔

بھلا عالم وجود کے اس سب سے عظیم بشر کی عظمت کی انتہا تک کس کی رسائی ہو سکتی ہے جس نے مجد وکمال کی سب سے بلند چوٹی پر اپنا نشیمن بنایا اور اپنے رب کے نور سے اس طرح منور ہوا کہ کتاب الٰہی کو اس کا وصف اور خلق قرار دیا گیا یعنی

ع قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

رسول کریم ﷺ اخلاق حسنہ کے سب سے اعلیٰ مرتبے پر فائز تھے۔ اخلاق فاضلہ میں سے ہر خلق آپ ﷺ پر کمال پذیر ہو گیا۔ آپ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق کریمہ کی گواہی تو خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے دی: وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم، ۶۸:۴)۔ "اور یقیناً آپ ﷺ کے اخلاق عظیم ہیں۔" آپ ﷺ نے اپنی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے: انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق، "مجھے تو بھیجا ہی اس لیے گیا ہے کہ میں اخلاق فاضلہ کی تکمیل کروں۔" مثال کے طور پر حضور ﷺ کے اخلاق کریمہ کے چند پہلو بیان کیے جاتے ہیں:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بے تکلفی:

ایک مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم میری تعریف میں زیادہ مبالغہ مت کرو۔ جیسے نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو حد سے زیادہ بڑھا دیا۔ میں تو اللہ کے بندوں میں سے ایک ہوں۔ اس لیے مجھے عبداللہ ورسولہ کہا کرو۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ باہر تشریف لائے تو سب صحابہ تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جیسے عجمی آپس میں ایک دوسرے کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اس طرح تم کو کھڑا ہونا نہ چاہیے۔ آپ ﷺ اپنے اصحاب میں بالکل ملے جلے رہتے تھے اور مجلس میں جہاں جگہ مل جاتی تھی وہیں بیٹھ جاتے تھے۔ آپ ﷺ نوکروں کے کام میں شریک ہو جاتے اور ان کو اپنے پاس بٹھا لیتے تھے۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ کوئی شخص کسی یہودی کا مقروض ہوا اور یہودی نے تنگ طلبی کی۔ وہ شخص آپ ﷺ کے پاس آیا۔ اگر آپ ﷺ کے پاس کچھ ہوا تو خود اس کا قرض دے دیا ورنہ اس یہودی کے پاس خود تشریف لے گئے اور اس سے کچھ مہلت دینے کے لیے کہا۔ مگر یہودی لوگ اس کا بھی کچھ خیال نہیں کرتے تھے تو آپ ﷺ ادھر ادھر کوشش کر کے جس طرح ممکن ہوتا تھا ادائے قرض کا بندوبست کر دیتے تھے۔

آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ بھوکوں اور مسکینوں کے لیے کوشش کرنے والا مجاہد فی سبیل اللہ قائم اللیل اور صائم النہار کے برابر درجہ رکھتا ہے۔

ایک شخص نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ جنت پانے کا کیا عمل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: صدق۔ کیونکہ جب آدمی سچا ہوتا ہے تو نیکی کرتا ہے اور جب نیکی کرتا ہے تو نور ایمان پیدا ہوتا ہے اور جب ایمان دار ہوتا ہے تو جنت میں داخل ہوتا ہے۔ ایک اور واقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ خبردار! سچے رہو، خواہ تم کو سچائی میں ہلاکت ہی کیوں نہ نظر آئے۔ کیونکہ بلاشبہ نجات اسی میں ہے۔ مکہ سے بدر کی طرف آتے ہوئے راستے میں احسن بن شریق نے ابوجہل سے کہا کہ اے ابوالحکم میں تجھ سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ اس جگہ ہم دونوں کے سوا کوئی تیسرا شخص ہماری بات سننے والا نہیں ہے، تو مجھے سچ سچ بتا دے کہ آیا محمد (ﷺ) جھوٹا ہے یا سچا۔ ابوجہل نے جواب دیا کہ واللہ بے شک محمد (ﷺ) ہمیشہ سچ بولتا ہے اور اس نے کبھی غلط بیانی نہیں کی۔

خوش طبعی:

آپ ﷺ کبھی خوش طبعی بھی فرما لیتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ آپ ﷺ نے کسی کو ایک اونٹ دینے کا وعدہ کیا۔ جب وہ آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تجھے اونٹنی کا بچہ دیتا ہوں۔ یہ سن کر وہ شخص کہنے لگا میں اونٹنی کا بچہ کیا کروں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اونٹ اونٹنی کے بچے نہیں ہوتے تو وہ کس کے بچے ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ نے خوش طبعی کی راہ سے بجائے اونٹ کے اونٹنی کا بچہ کہا تھا۔ وہ سمجھا کہ شاید آپ ﷺ نے چھوٹے سے کم عمر بچے کے لیے حکم دیا ہے۔ آپ ﷺ خوش طبعی فرماتے تھے لیکن خوش طبعی میں بھی صدق و راستی کے سوا آپ ﷺ کی زبان سے کوئی کلمہ غلط یا جھوٹ نہیں نکلتا تھا۔ آپ ﷺ لوگوں کو کھیلنے کودنے یا خوشی منانے سے بھی منع نہیں فرماتے تھے۔

اخلاق حمیدہ:

آپ ﷺ جب بیٹھتے تو لوگوں کے اندر اس طرح ملے جلے ہوتے کہ کوئی نووارد آپ ﷺ کو پہچان نہیں سکتا تھا اور پوچھنے کی ضرورت پیش آتی تھی کہ نبی ﷺ کون ہیں۔ ایسی چیز جس کے کھانے سے منہ بدبودار ہو جائے، آپ ﷺ پسند نہ فرماتے تھے۔ پیوند لگا ہوا کپڑا پہن لیتے اور اچھا کپڑا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مل جائے تو اسے پھینک نہ دیتے تھے۔ آپ ﷺ کا لباس سادہ مگر صاف ہوتا تھا۔ دن میں کئی کئی مرتبہ مسواک کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے پاس بیٹھنے والے یہ شہادت دیتے ہیں کہ کبھی آپ ﷺ کے جسم، لباس یا منہ سے بو نہیں آئی۔ جہاں عفو سے اصلاح ہوتی وہاں آپ ﷺ عفو کرتے، مگر جہاں سزا کی ضرورت ہوتی وہاں سزا بھی دیتے کیونکہ ان شریروں کو جو شرارت سے باز نہ آتے تھے، سزا نہ دینا بدی کی اعانت کرنا تھا۔

مسلمانوں کی خیرات کو آپ ﷺ نے مسلمانوں ہی تک محدود نہیں رکھا۔ عیسائی، یہودی، مشرک سب سے فیاضی کا برتاؤ کرتے۔ آپ ﷺ پر جو بڑی سے بڑی مصیبت آتی اسے آسانی سے برداشت کر لیتے۔ مگر دوسروں کی مصیبت پر آپ ﷺ کا دل بے چین ہو جاتا تھا۔ آپ ﷺ اسباب سے کام لیتے تھے اور نتیجے کو اللہ پر چھوڑ دیتے تھے اور کبھی اس بات سے نہیں گھبراتے تھے کہ نتیجہ خلاف امید ہو۔ آپ ﷺ میں تواضع تھی مگر دنائت نہ تھی۔ ہیبت تھی مگر درشتی نہ تھی۔ سخاوت تھی مگر اسراف نہ تھا۔ جو شخص آپ ﷺ کے سامنے یکایک آ جاتا وہ ہیبت زدہ ہو جاتا اور جو پاس آ بیٹھتا وہ فدائی بن جاتا۔ متعدی امراض سے بچاؤ رکھتے، تندرستوں کا محتاط رہنے کا حکم دیتے اور نادان طبیب کو طبابت سے منع کرتے۔ حرام اشیاء کو بطور دوا استعمال کرنا ناپسند فرماتے تھے جب کسی معاملے مین دو صورتیں سامنے آتیں تو آسان صورت کا اختیار فرما لیتے۔ اسیرانِ جنگ کی خبر گیری، مہمانوں کی طرح فرماتے تھے۔ تیر افگنی، نشانہ بازی، گھوڑ دوڑ وغیرہ مردانہ ورزشوں میں بھی آپ ﷺ شریک ہوا کرتے تھے۔ غرض کہ

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچیں بہار تو زداماں گلہ دارد

پیغمبر ﷺ بطور سفارت کار

(The Prophet (SAW) as Diplomat)

حضرت محمد ﷺ سب سے بڑے سفارتکار تھے اور آپ ﷺ اسلام کی تبلیغ کے دوران مختلف قسم کی سفارتکارانہ سرگرمیوں میں مصروف رہے اور ان کو رواج دیا۔ آپ ﷺ نے قبائلی سرداروں اور غیر ملکی سربراہوں سے سفارتکاری کے ذریعے روابط قائم کیے، ان کو خطوط لکھے، سفراء بھیجے اور اسلام اور امن کی طرف بلایا۔ بعض جگہوں پر تو آپ ﷺ خود بنفس نفیس تشریف لے گئے مثلاً طائف میں آپ ﷺ نے خود جا کر وہاں کے سرداروں کو دعوت اسلام دی۔

آپ ﷺ نے نہ صرف عرب کے اندر مختلف سربراہوں، گورنروں کو خطوط ارسال کیے بلکہ جزیرۃ العرب کے باہر بھی سفراء کے ذریعے ایسے حکمرانوں سے روابط قائم کیے جیسے کہ نجاشی شاہ حبشہ، کسریٰ ایران، قیصر روم وغیرہ۔

اسی طرح آپ ﷺ جب مدینہ پہنچے تو وہاں اوس و خزرج کے درمیان صلح کرا کے ان کو انصار میں یکجا کر دیا اور انصار مدینہ اور مہاجرین مکہ کے مابین اخوت کا رشتہ قائم کر دیا۔ میثاق مدینہ، ایک بے مثال عہد نامہ کے ذریعے یہود کو اسلامی ریاست کے اندر شامل کیا اور اپنی سیاسی قیادت تسلیم کروائی اور وجود باہمی کو رواج دیا۔

آپ ﷺ نے ایسے معاہدے بھی کیے جیسے کہ بیعت عقبہ اولیٰ وثانیہ، صلح حدیبیہ، بیعت رضوان وغیرہ۔ آپ ﷺ چاندی کی ایک مہر بھی استعمال کرتے تھے جو خطوط پر ثبت کر دی جاتی تھی۔ جس پر یہ الفاظ کندہ تھے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

الله
رسول
محمد

آپ ﷺ اپنی زندگی میں درج ذیل سفارتکارانہ سرگرمیوں میں مصروف رہے۔

خلف الفضول:

خلف الفضول کا اہتمام چند قبائل قریش یعنی بنی ہاشم، بنی مطلب، بنی اسد بن عبدالعزیٰ بنی زہرہ بن کلاب اور بنی تیم بن مرہ نے اس کا اہتمام کیا۔ یہ لوگ عبداللہ بن جدعانجمی کے مکان پر جمع ہوئے...... کیونکہ وہ سن وشرف میں ممتاز تھا...... اور آپس میں عہد و پیمان کیا کہ مکہ میں جو بھی مظلوم نظر آئے گا خواہ مکے کا رہنے والا ہو یا کہیں اور کا یہ سب اس کی مدد اور حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں گے اور اس کا حق دلوا کر رہیں گے۔ اس اجتماع میں رسول اللہ ﷺ بھی تشریف فرما تھے اور بعد میں شرف رسالت سے مشرف ہونے کے بعد فرمایا کرتے تھے: "میں عبداللہ بن جدعان کے مکان پر ایک ایسے معاہدے میں شریک تھا کہ مجھے اس کے عوض سرخ اونٹ بھی پسند نہیں اور اگر (دور) اسلام میں اس عہد و پیمان کے لیے مجھے بلایا جاتا تو میں لبیک کہتا۔

اس معاہدے کی روح عصبیت کی تہ سے اٹھنے والی جاہلی حمیت کے منافی تھی۔ اس معاہدے کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ زبید کا ایک آدمی سامان لے کر مکہ آیا اور عاص بن وائل نے اس سے سامان خریدا۔ لیکن اس کا حق روک لیا۔ اس نے حلیف قبائل عبالدار، مخزوم، جمح، سہم اور عدی سے مدد کی درخواست کی لیکن کسی نے توجہ نہ دی۔ اس کے بعد اس نے جبل ابوقبیس پر چڑھ کر بلند آواز سے چند اشعار پڑھے جن میں اپنی داستان مظلومیت بیان کی تھی اس پر زبیر بن عبدالمطلب نے دوڑ دھوپ کی اور کہا کہ یہ شخص بے یار و مددگار کیوں ہے؟ ان کی کوشش سے اوپر ذکر کیے ہوئے قبائل جمع ہو گئے اور یوں آپ ﷺ اس نیک اور انسان دوست معاہدہ میں شریک ہوئے۔

ہجرت حبشہ (615-617):

جب آپ ﷺ نے علی الاعلان تبلیغ اسلام شروع کی تو قریش مکہ آپ کے اصحاب کے درپے ہو گئے۔ اگرچہ آپ ﷺ ابوطالب کی حمایت کی وجہ سے محفوظ رہے، تاہم کمزور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ ﷺ نے دو دفعہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ وہ حبشہ کو ہجرت کر جائیں اور آپ ﷺ نے نجاشی شاہ حبشہ کو لکھا کہ مسلمانوں کا احترام وتعاون کیا جائے۔ اس نے مسلمانوں کو خاص طور پر امان دی اور قریش کو واپس لوٹا دیا۔ یوں آپ ﷺ کی سفارت کاری کی یہ کوشش کامیاب ہوئی۔

سفر طائف (619):

مشرکین مکہ کی روز افزوں مخالفت ومزاحمت کی وجہ سے آپ ﷺ نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز طائف کو بنانا چاہا، طائف مکہ سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ آپ ﷺ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اپنے ہمراہ لے کر طائف تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ نے طائف کے سرداروں کو اسلام کی دعوت دی لیکن انہوں نے نہ صرف یہ کہ گستاخانہ جواب دیا بلکہ اوباش قسم کے لڑکوں کو آپ ﷺ کے پیچھے لگا دیا۔ انہوں نے آپ ﷺ پر پتھر پھینکے۔ آپ ﷺ کی مبارک ٹانگوں میں زخم ہو گئے اور جوتے خون سے لت پت ہو گئے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بھی چوٹیں آئیں۔ آخر شہر کے چند آدمیوں نے آپ ﷺ کو اس ایذا رسانی سے نجات دلائی اور آپ ﷺ کو اپنی حفاظت میں ایک باغ میں چھوڑ آئے۔ وہاں جبرئیل امین

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

علیہ السلام خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور کہا، آپ ﷺ حکم دیں تو یہ پہاڑ طائف والوں کے اوپر گرادوں۔ رحمۃ اللعالمین نے جواب دیا، نہیں مجھے امید ہے کہ ان کی اولاد میں سے اہل ایمان اٹھیں گے۔

لہٰذا آپ ﷺ بنفس نفیس سفیر اسلام بن کر طائف گئے تھے اگرچہ وہاں آپ ﷺ کے پیغام کو قبول نہ کیا گیا۔ تاہم بعدازاں عام الوفود میں اہل طائف نے اسلام قبول کیا۔ وفود بھی سفارتکاری کا ایک اہم ذریعہ تھے۔

بیعت عقبہ اولی و بیعت عقبہ ثانیہ:

مکہ سے تین سو میل شمال میں ایک شہر ہے جس کا نام یثرب تھا۔ بعد میں مدینۃ النبی ﷺ اور مختصر ہو کر مدینہ ہوا۔ مدینہ کی آبادی دو بڑے گروہوں پر مشتمل تھی۔

۱۔ اوس و خزرج

۲۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ پر مشتمل یہود۔

نبوت کے دسویں برس ایک شب منیٰ کے قریب ایک بلند پہاڑی راستے (عقبہ) سے آپ ﷺ گزرے تو آپ ﷺ کی ملاقات مدینہ سے آئے ہوئے سات مذائرین (حاجیوں) سے ہوئی۔ آپ ﷺ نے انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور کہا کہ ہم مدینہ جا کر دوسروں کو بھی اسلام لانے کی دعوت دیں گے۔

بیعت عقبہ اولی:

ان سات مسلمانوں نے مدینہ پہنچ کر دوسروں کو بھی اسلام کی دعوت دی۔ چنانچہ اگلے سال یعنی ۱۱ نبوی میں وہ بیت اللہ کے حج کے لیے آئے تو پانچ مسلمان ان کے ساتھ تھے۔ اسی مقام پر آپ ﷺ کی ان بارہ اصحاب کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ انہوں نے حضور ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی۔ اس بیعت کو بیعت عقبہ اولی کہتے ہیں۔ بیعت کی شرطیں یہ تھیں۔

۱۔ شرک نہیں کریں گے اور صرف اللہ کی عبادت کریں گے۔
۲۔ چوری نہیں کریں گے۔
۳۔ زنا نہیں کریں گے۔
۴۔ اولاد کو قتل نہیں کریں گے۔
۵۔ تہمت نہیں لگائیں گے۔
۶۔ حضور ﷺ کی نافرمانی نہیں کریں گے۔

ان اصحاب کی فرمائش پر آپ ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو ان کے ہمراہ بھیج دیا تاکہ مدینہ میں جا کر وہ ان کو قرآن مجید کی تعلیم اور اسلام کی دعوت دیں۔ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ قرآن کی تلاوت فرماتے تو سننے والوں کے دلوں میں اس کی تاثیر اتر جاتی۔ چنانچہ اوس کے سردار سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور خزرج کے سردار سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سمیت بہت سے لوگ اسلام لے آئے۔

بیعت عقبہ ثانیہ:

سنہ ۱۲ نبوی میں حج کے موقع پر مدینہ سے حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کے ساتھ ۷۳ مرد اور دو عورتیں آئیں۔ انہوں نے عقبہ ہی کے مقام پر بیعت کی جسے بیعت عقبہ ثانیہ کہتے ہیں۔ انہوں نے حضور ﷺ کو مدینہ کی طرف ہجرت کی دعوت دی۔ اس بیعت میں حضور ﷺ نے ان سے یہ عہد لیا کہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جس طرح وہ اپنی جانوں، عورتوں اور اپنے بچوں کو حفاظت کرتے ہیں اسی طرح حضورﷺ کی حفاظت بھی کریں گے۔ ایک انصاری نے حضورﷺ سے عرض کیا۔ اللہ تعالیٰ آپﷺ کو کامیاب کردے تو آپﷺ ہمیں چھوڑ کر واپس مکہ تو نہیں آ جائیں گے۔ حضورﷺ نے فرمایا: میں تمہارا ہوں اور تم میرے ہو۔ تم نے جس سے صلح کی اس سے صلح کروں گا اور تم نے جس سے جنگ کی اس سے جنگ کروں گا۔ اسی لیے بیعت عقبہ ثانیہ کو بیعت الحرب یعنی جنگ کی بیعت بھی کہتے ہیں۔ یوں اس سفارتکاری کے ذریعے آپﷺ نے اہل مدینہ کو اپنا ہم پلہ بنا دیا۔

ہجرت مدینہ اور اس کی اہمیت:

بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد نبی اکرمﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک ایک دو دو کر کے خفیہ طریقے سے مدینہ کو ہجرت کرنے لگے۔ مشرکین مکہ نے رکاوٹیں ڈالنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن ان کی تمام تر مزاحمت کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور مکہ میں صرف نبی اکرمﷺ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور صحابی رہ گئے جو مشرکین کی قید میں تھے۔ بعد میں نبی کریمﷺ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی مدینہ کو ہجرت کر لی۔ اہل اسلام نے ہجرت مدینہ خوشی سے نہیں بلکہ مجبور ہو کر کی تھی۔

ہجرت مدینہ کی اہمیت:

اسلام کی اشاعت اور اس کی تکمیل میں ہجرت مدینہ کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بڑے اہم اور دور رس نتائج نکلے جو سب کے سب اسلام اور اہل اسلام کے حق میں تھے مثلاً

۱۔ اسلام سے وابستگی میں شدت۔
۲۔ اسلام کو محفوظ مرکز مل گیا۔
۳۔ اشاعت اسلام میں تیزی آگئی۔
۴۔ مسلمان متحد اور منظم ہو گئے۔
۵۔ منفرد اور جداگانہ مسلم قومیت وجود میں آگئی۔
۶۔ اسلامی ریاست کی بنیاد رکھ دی گئی۔
۷۔ نئے احکام، تکمیل دین ہو گئے۔
۸۔ اسلامی کیلنڈر کی بنیاد ڈالی گئی۔

مدنی زندگی

آپﷺ کی آمد کے وقت مدینہ کی آبادی چار عناصر پر مشتمل تھی:

۱۔ انصار یعنی مدینہ کے مقامی مسلمان، جو اوس اور خزرج قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے۔
۲۔ مہاجرین، جو مکہ سے ہجرت کر کے یہاں پہنچے تھے۔
۳۔ مشرکین جن کا سرغنہ عبداللہ بن ابی سلول تھا جو اہل مدینہ اپنا بادشاہ بنانے ہی والے تھے کہ اسلام نے اس کے خواب پریشان کر دیئے۔
۴۔ یہود جنہیں دکھ تھا کہ بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسماعیل سے نبی کیوں مبعوث ہو گیا۔

میثاق مدینہ

مدینہ کی آبادی بنیادی طور پر تو چار مذکورہ بالا عناصر پر مشتمل تھی لیکن اہل مدینہ بہت سے گروہوں میں منقسم تھے۔ قبیلے، پھر ان کی آگے شاخیں، قبیلوں کے حلیف، موالی۔ یہ سب لوگ کسی قسم کی تنظیم سے قطعی طور پر نا آشنا تھے۔ اکثر باہم لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، بلکہ لڑ لڑ کر تھک چکے تھے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

رسول کریم ﷺ نے مدینہ پہنچنے کے چند ماہ بعد اہل مدینہ کو ایک سیاسی وحدت میں پرو دیا۔ مدینہ کو ایک چھوٹی سی شہری ریاست کی شکل عطا کی۔ آپ ﷺ نے ایک صحیفہ (تحریر، حکمنامہ) نافذ کیا جو ہمارے ہاں میثاق مدینہ کے نام سے معروف ہے۔ یہ دستاویز سیرت کی ابتدائی کتابوں میں محفوظ ہے۔ جس کے ذریعے آپ ﷺ نے مدینہ کے اندر اپنی سیاسی بالادستی کو قائم کیا اوس اور خزرج کو یکجا کر دیا اور یہود کو اس ریاست کا بنیادی حصہ بنا دیا اور اپنے دفاع کو اس سفارت کاری کے ذریعے ناقابل تسخیر بنا دیا۔ میثاق مدینہ کی اہمیت کو ہم درج ذیل نکات میں بیان کر سکتے ہیں۔

۱۔ میثاق مدینہ سے امن کا قیام ہوا۔
۲۔ اسلامی ریاست کی بنیاد ڈال دی گئی۔
۳۔ مدینہ کو حرم اور دارالخلافہ تسلیم کر لیا گیا۔
۴۔ مدینہ کا مشترکہ دفاع قائم کر دیا گیا۔
۵۔ عدل وانصاف کے قیام کو یقینی بنایا گیا۔
۶۔ معاشرے کے اندر باہمی وجود (Co-existence) کو فروغ دیا گیا۔
۷۔ مسلم قومیت کی منفرد حیثیت تسلیم کر لی گئی۔
۸۔ اللہ تعالیٰ کے نبی کو اس ریاست کا بلاشرکت غیرے حکمران تسلیم کر لیا گیا۔

صلح حدیبیہ:

سن ۶ ہجری میں اللہ تعالیٰ کے نبی اپنے 1400 صحابہ کے ہمراہ عمرہ کی نیت سے مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے۔ چونکہ آپ ﷺ عمرہ کے لیے جا رہے تھے اس لیے اسلحہ وغیرہ ساتھ نہ لیا۔ ذوالحلیفہ کے مقام پر آپ ﷺ نے احرام باندھا اور یہاں آپ ﷺ کو اطلاع ملی کہ دشمن حملہ کرنے کی تیاری کر رہا ہے اس لیے آپ ﷺ نے مدینہ سے اسلحہ بھی منگوا لیا پھر بعد میں آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورے سے سفر جاری رکھا اور حدیبیہ میں پڑاؤ ڈال دیا حدیبیہ ایک کنویں کا نام ہے اسی وجہ سے اس مقام کو حدیبیہ کہتے ہیں۔ یہ مکہ سے تقریباً ۱۲ میل کے فاصلے پر مکہ اور جدہ کی راہ پر واقع ہے۔ یہاں آپ ﷺ اور قریش مکہ کے درمیان مذاکرات شروع ہوئے۔ قبیلہ خزاعہ کا سردار بدیل بن ورقعہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بتایا کہ قریش حدیبیہ کے دوسری جانب خیمہ زن ہیں اور آپ ﷺ کو مکہ نہیں جانے دیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہمارا مقصد جنگ کرنا نہیں بلکہ عمرہ کرنا ہے۔ قریش چاہیں تو ہمارے ساتھ میعادی صلح کر لیں۔ بدیل نے یہ پیغام قریش کو پہنچایا انہوں نے عروہ بن مسعود ثقفی کو حضور ﷺ کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ اس نے واپس آ کر قریش سے کہا کہ حضور ﷺ کی صلح کی پیشکش قبول کر لیں۔ قریش نہ مانے اس کے بعد قریش نے چند حلیف قبائل کے مشترکہ سردار حلیس بن علقمہ کو بھیجا اس نے واپس آ کر قریش کو دوٹوک رائے دی کہ آپ ﷺ سے جنگ نہ کریں ورنہ میں اپنا قبیلہ لے کر چلا جاؤں گا رسول ﷺ نے بھی بنو خزاعہ کے ایک آدمی کو قریش کے پاس بھیجا لیکن وہ ناکام واپس آیا۔ اگلے روز فجر کی نماز کے وقت ۸۰ آدمیوں پر مشتمل قریش کے ایک فوجی دستہ نے اچانک پہاڑی سے نمودار ہو کر حملہ کر دیا۔ اس دستے کو حضور ﷺ کے قتل کے لیے بھیجا گیا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کو اسیر کر لیا لیکن حضور ﷺ کے فرمان پر ان کو آزاد کر دیا گیا۔

بیعت رضوان:

رسول کریم ﷺ نے مصالحت کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قریش مکہ کے پاس بھیجا۔ قریش نے انہیں روک لیا اور یہ افواہ پھیل گئی کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ رسول ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتقام لینے کے لیے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ بیعت لی کہ وہ ثابت قدم رہیں گے اس کو بعد میں بیعت رضوان کا نام دیا گیا یعنی اللہ کی رضا یا رضوان کے لیے کی جانے والی بیعت۔ جب قریش کو بیعت رضوان کی خبر ہوئی تو حوصلہ چھوڑ گئے اور صلح کی شرائط طے کرنے کے لیے سہیل بن عمرو کو حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ صلح حدیبیہ کی شرائط درج ذیل ہیں:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۱۔ دس سال تک فریقین میں جنگ نہ ہوگی۔

۲۔ اس سال مسلمان واپس چلے جائیں گے۔

۳۔ حضورﷺ قریش کی موجودگی میں مکہ تشریف نہیں لائیں گے۔

۴۔ آئندہ سال قریش تین دن کے لئے مکہ سے نکل جائیں گے۔ حضورﷺ ان ایام میں اپنے صحابہ کے ہمراہ یہاں تشریف فرما ہوں گے۔

۵۔ مسلمان مکہ میں بے نیام اسلحہ نہیں لائیں گے۔

۶۔ قبائل عرب کو آزادی ہوگی کہ وہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں اس کے حلیف بن جائیں۔

۷۔ مکہ سے کوئی شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر حضرت محمدﷺ کے پاس جائے گا تو اسے واپس کر دیا جائے گا اور اگر محمدﷺ کے اصحاب سے کوئی شخص قریش کے پاس جائے گا اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔

صلح حدیبیہ کی اہمیت:

صلح حدیبیہ کے مقام پر جو صلح نامہ لکھا گیا اس کی شرائط ظاہری طور پر مسلمانوں کے خلاف اور قریش مکہ کے حق میں تھیں۔ لیکن بعد میں اس صلح کے نتائج حقیقت میں فتح مبین ثابت ہوئے اور یوں اس طرح آپﷺ کی یہ سفارت کارانہ سرگرمی کامیاب ٹھہری جس کے دوررس اثرات درج ذیل ہیں:

۱۔ قریش نے امت مسلمہ کے وجود کو تسلیم کر لیا۔

۲۔ مسلمانوں کو آئندہ سال عمرہ کرنے کی اجازت مل گئی۔

۳۔ قبائل عرب کی مخالفت کا خاتمہ ہو گیا۔

۴۔ اشاعت اسلام میں تیزی آ گئی۔

۵۔ فتوحات کا سلسلہ بڑھ گیا۔

۶۔ جزیرۃ العرب میں امن وامان قائم ہو گیا۔

۷۔ معاشی خوشحالی کے آثار شروع ہو گئے۔

۸۔ بیرونی حکمرانوں کو دعوت اسلام دینا شروع کر دی۔

۹۔ خالد بن ولید اور عمرو بن العاص نے اسلام قبول کر لیا۔

۱۰۔ مسلمانوں کی طاقت میں اضافہ ہو گیا۔

بادشاہوں اور امراء کے نام خطوط:

سن ۶ ہجری کے آخر میں جب رسول اللہﷺ حدیبیہ سے واپس تشریف لائے تو آپﷺ نے مختلف بادشاہوں کے نام خطوط لکھ کر انہیں اسلام کی دعوت دی۔ آپﷺ نے خطوط لکھنے کا ارادہ فرمایا تو آپﷺ سے کہا گیا کہ بادشاہ اسی صورت میں خطوط قبول کریں گے جب ان پر مہر لگی ہو اس لیے نبی کریمﷺ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی جس پر محمد رسول اللہ نقش تھا۔ یہ نقش تین سطروں میں تھا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اللہ

رسول

محمد

بعد ازاں آپ ﷺ نے معلومات رکھنے والے تجربہ کار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بطور قاصد منتخب فرمایا اور انہیں بادشاہوں کے پاس خطوط دے کر روانہ فرمایا۔ جن میں سے بعض نے اسلام قبول کر لیا۔ یوں صلح حدیبیہ کے بعد جلد ہی اسلام کو بین الاقوامی دین کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ نبی کریم ﷺ نے درج ذیل حکمرانوں کو اسلام کے دعوت نامے بھیجے۔

۱۔ نجاشی شاہ حبشہ:

اس نے اسلام قبول کر لیا۔

۲۔ ہرقل قیصر روم:

اس نے حضور ﷺ کے قاصد کا بہت احترام کیا اور بڑی عقیدت کا اظہار کیا تاہم سیاسی مصلحت کی وجہ سے اسلام قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی۔

۳۔ خسرو پرویز کسری ایران:

یہ حضور کے ایلچی کے ساتھ گستاخی سے پیش آیا اور ہلاک ہو گیا۔

۴۔ منذر بن ساوی حاکم بحرین:

اس نے حضور ﷺ کی دعوت پر نہ صرف خود اسلام قبول کیا بلکہ اپنی رعایا کو بھی اسلام کی دعوت دی۔

۵۔ شرجیل بن عمرو غسانی حاکم بصرہ:

اس نے اسلام قبول کرنے کی بجائے حضور ﷺ کے قاصد حضرت حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ ازدی کو قتل کر دیا جس کی وجہ سے غزوہ موتہ لڑا گیا۔

۶۔ عمان پر دو حقیقی بھائی حاکم تھے۔ حضور ﷺ کی دعوت پر دونوں نے لبیک کہا۔

۷۔ جرجیس شاہ مصر:

اس نے اسلام قبول نہ کیا تاہم آپ ﷺ کے قاصد کی بہت تکریم کی۔ شام کے حکمرانوں کا بھی یہی حال تھا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

وفود کا سلسلہ

فتح مکہ کے بعد ۹ ہجری کو وفود کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا اسی نسبت سے اس سال کو عام الوفود کہتے ہیں۔ سیرت مطہرہ کے مطابق تقریباً ستر کے قریب وفود نے آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضری دی اور اسلام قبول کیا جن میں مشہور وفود کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ وفد بنی حضرموت
۲۔ وفد ہوازن
۳۔ وفد بنی اسد
۴۔ وفد یمامہ
۵۔ وفد تمیم
۶۔ وفد ہمدان
۷۔ وفد بنی عمرو بن طفیل
۸۔ وفد تغلق
۹۔ وفد صدا
۱۰۔ وفد نجران
۱۱۔ وفد بنی حنیفہ
۱۲۔ وفد بنی عامر بن صعصعہ
۱۳۔ وفد تجیب
۱۴۔ وفد طی

بین الاقوامی معاہدے:

قانون کا ایک حصہ بین الاقوامی معاہدوں سے تعلق رکھتا ہے۔ عہد نبوی ﷺ کے سیاسی آثار میں سے ایک نمایاں واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے بعد رسول اکرم ﷺ نے مدینہ میں ایک وفاقی حکومت کی بنیاد رکھی جس کے صدر اعلیٰ خود حضور ﷺ تھے۔ اس تحریری معاہدے کا متن جو اس موقع پر تیار ہوا ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی کتاب ''الوثائق السیاسیہ'' میں تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔ فریق معاہدہ ایک طرف رسول اللہ ﷺ اور مہاجرین وانصار تھے اور دوسری طرف مدینہ کے تمام یہود و نصاریٰ اور دیگر غیر مسلم باشندے۔ تمام فریقوں کو سیاسی طور پر ایک جماعت کی حیثیت دی گئی۔ مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں شرکاء معاہدہ میں سے ہر فرد اور جماعت حملہ آوروں کی مداخلت کے خلاف دوسرے فریقوں کی حمایت کرنے کی پابند تھی اور دشمن سے صلح کی صورت میں ہر نوع کی منفعت میں مسلمانوں کی مانند دوسرے شرکاء بھی متمتع ہونے کا حق رکھتے تھے۔ ہر فرد کا فرض تھا کہ اپنے ہمسائے کی طرف داری اپنے نفس کی مانند کرے، انصاف رسانی پوری جماعت کا فریضہ قرار پائی۔ اس بارے میں کسی رشتہ داری یا قرابت کا پاس ولحاظ ممنوع ہوا۔ ایک شق معاہدہ کی یہ بھی تھی کہ کسی قاتل یا مجرم کو کوئی شخص پناہ نہ دے سکے گا۔ فدیہ اور دیت وغیرہ کے اصول حسب سابق رہے۔ انفرادی انتظام کی جگہ مرکزی عدل گستری کا نظام قائم ہوا۔ باہمی اختلافات یا تنازعات کا مقدمہ خود رسول اکرم ﷺ کے فیصلے پر موقوف تھا۔ آنحضرت ﷺ غیر مسلموں کے مقدمات میں ان کے اپنے شخصی قانون کے مطابق فیصلے فرماتے تھے۔ یہ فقید المثال معاہدہ بعد میں قبائل یہود کی مسلمانوں کے خلاف سازشوں اور ان کی فتنہ پردازیوں کی نذر ہو گیا۔ ہمارے ہاں اقلیتوں کے مسائل کا حل شاید اس تاریخی معاہدے کی روشنی میں دریافت ہو سکے۔

بین القومی معاہدوں کا جو حشر متمدن مغربی اقوام کے ہاتھوں آیا ہے تاریخ کے کسی طالب علم سے مخفی نہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے جس جماعت یا فرد کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا خود اس کی پابندی کی اور اپنے پیروؤں سے پوری دیانت داری کے ساتھ اس پر عمل کروایا۔ صلح حدیبیہ اس ضمن میں فقید المثال ہے۔ یہ معاہدہ کفار قریش اور آنحضرت ﷺ کے درمیان حدیبیہ کے مقام پر ہوا اور اس کے کاتب حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ اس معاہدے کی رو سے فریقین میں دس سال کے لیے جنگ ممنوع قرار پائی۔ ایک شرط معاہدے کی یہ تھی کہ اس عرصہ میں اگر مسلمان مکہ میں حج، عمرہ یا تجارت کے لیے وارد ہوں تو اہل مکہ ان کی جان و مال کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے اور اگر قریش تجارت کے لیے مدینہ کی راہ سے مصر یا شام کی طرف عازم ہوں تو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مسلمان ان کی جان و مال کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ ایک اور شق کے مطابق اگر اہل مکہ میں سے کوئی شخص اپنے خاندانی سربراہ کی اجازت کے بغیر مسلمان ہو کر مدینہ چلا آئے تو اس کا لوٹا دینا رسول اللہ ﷺ پر واجب تھا۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص مدینے میں اسلام ترک کر کے کے میں پناہ گزین ہو تو قریش اس کی واپسی پر مکلف نہ ہوں گے۔ بظاہر اس شق کے ماتحت فریقین کے حقوق مساوی نہ تھے لیکن حضور اکرم ﷺ نے ہر قیمت پر معاہدے کا پاس کیا، ایک صحابی ابوجندل رضی اللہ عنہ پابہ زنجیر آئے اور رہائی کی درخواست کی لیکن حضور ﷺ نے اسے قریش کے حوالے کر دیا۔ ایک اور صحابی ابوبصیر جنہیں صاحب عیص بھی کہا جاتا ہے کے سے فرار ہو کر مدینے پہنچے تو آنحضرت ﷺ نے اہل مکہ کے دو ایلچیوں کے ہمراہ انہیں واپس جانے کا حکم دیا۔ ابوبصیر رضی اللہ عنہ نے تعمیل ارشاد کی۔ جب تینوں ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچے تو ابوبصیر رضی اللہ عنہ نے حیلہ سے اپنے محافظ کی تلوار پر قبضہ کر کے اسے ختم کر دیا اور پھر بھاگ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''تم بڑے لڑا کا ہو۔ اگر دوسروں کے ہمراہ بھی تھوڑے آدمی ہوتے تو فریقین میں جنگ چھڑ جانا مشکل نہ تھا۔'' قریش کا دوسرا آدمی بھی بدحواسی کے عالم میں رسول اکرم ﷺ کے پاس شکایت لے کر پہنچا۔ یہ دیکھ کر ابوبصیر چپکے سے نکل گئے اور عیص کے مقام پر جا کر مقیم ہو گئے۔

یہ واقعہ ملک میں مشہور ہو گیا تو اہل مکہ میں سے اس زمرے کے اور لوگوں نے بھی عیص کا رخ کیا اور اس طرح وہاں گویا مجاہدین کی ایک نوآبادی بن گئی جو قریش کے قافلوں کے لیے خطرہ بن گئی چنانچہ قریش نے خود معاہدے کی اس شق سے دستبرداری دے دی اور عیص والے مدینہ آ گئے۔ ابوبصیر اس وقت وفات پا چکے تھے۔

متفرق روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے جاسوسوں کے قتل کی اجازت دی۔ یہ بات زمان حاضر میں بھی سیاست ملکی اور جماعتی سلامتی کے موافق سمجھی جاتی ہے، خصوصاً جنگ کے ایام میں۔

قاصدوں کے بارے میں حضور ﷺ کا فرمان تھا کہ ان کا قتل ممنوع ہے۔ ان کے ارشاد کے مطابق قاصد کا روک لینا اور اس سے کسی قسم کا تعرض روا رکھنا درست نہیں۔

مفتوح اقوام یا جماعتوں پر صرف جزیہ عائد کیا جاتا تھا اور ان کے مال و جان کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی ریاست پر قائم ہو جاتی تھی۔ اس قسم کے ذمیوں کو جنگی خدمات سے معاف رکھا جاتا تھا اور کسی قسم کا دیگر باران پر نہ ڈالا جاتا تھا۔ پھر ان کے معذور یا نادار لوگوں سے جزیہ بھی وصول نہ کیا جاتا تھا اس کی ایک مثال وہ وثیقہ امان ہے جو حضور ﷺ نے تیماء کے یہود بن عادی کے لیے لکھوا دیا تھا۔ معاہدات کے متعلق حضور ﷺ نے یہ کلیہ بیان فرمایا کہ مسلمانوں نے آپس میں جن شرطوں کا التزام کیا ہو ان کی پابندی لازمی ہے۔ الا یہ کہ انہوں نے کوئی شرط عائد کی ہو جس کی وجہ سے حرام حلال ہو جائے یا حلال کو حرام سمجھنا پڑے۔

دوسری/متفرق سفارت کارانہ سرگرمیاں:

درج بالا کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ نے کچھ اور متفرق سفارتکارانہ سرگرمیوں میں حصہ لیا اور انہیں رواج دیا جن کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ آپ ﷺ نے سفارتکاروں کو ارسال کیا اور وصول بھی کیا۔

۲۔ آپ ﷺ نے بین الاقوامی معاہدوں پر عملدرآمد کو لازمی قرار دیا اور اس کی پامالی کو منع کیا۔

۳۔ آپ ﷺ نے بین الاقوامی قوانین کی پاسداری کو لازمی قرار دیا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

فرمایا۔ کی حفاظت کی ضمانت دی اور ان کے قتل سے منع فرمایا۔

۴۔ آپ ﷺ نے سفارتکاروں کی جان کی حفاظت کی ضمانت دی اور ان کے قتل سے منع فرمایا۔

۵۔ آپ ﷺ نے سفارتکاروں کے لیے مدینہ میں دارالضیفان (Guesthouse) قائم کیا جہاں سفیروں کی خاطر تواضع کی جاتی تھی۔

۶۔ آپ ﷺ سفیروں کو تحائف دیتے بھی تھے اور وصول بھی کرتے تھے۔

حاصل کلام:

اس سے ہم یہ اخذ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ دنیا میں سب سے بڑے سفیر تھے بلکہ سفیر امن تھے۔ آپ ﷺ نے ہمیشہ سفارت کاری کے ذریعے، صلح جوئی کے ذریعے، معاہدوں کے ذریعے اسلام کی تبلیغ اور امن وامان کے قیام کو ترجیح دی اور جارحانہ اقدام سے ازحد بچاؤ کی کوشش کی۔ آپ ﷺ نے عرب اور غیرملکی سربراہوں کے نام خطوط لکھے۔ اپنے سفیر بھیجے اور ان کو اسلام کی دعوت دی۔ کچھ نے اسلام قبول کیا اور کچھ نے باہمی وجود کو تسلیم کیا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے بین الاقوامی معاہدوں/قوانین کی پاسداری کو لازمی قرار دیا اور سفیروں کے قتل سے منع کر دیا۔

حضور ﷺ بحیثیت پیغمبر امن

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء:۱۰۷)

''اور ہم نے آپ ﷺ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

اس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ آپ ﷺ دنیا کے سب سے بڑے امن کے حامی تھے۔ اسلام کا مقصد دنیا میں امن وآشتی کا درس دینا ہے اور یہی مشن پیغمبر اسلام کا بھی تھا۔ آپ ﷺ ہمیشہ جنگی اقدام کے اوپر مصالحتی کوشش، سمجھوتہ کرنے اور سفارتکاری کے ذریعے مسائل حل کرنے کو ترجیح دیتے تھے، کیونکہ جنگیں انسانی جانوں اور مال کے نقصان کا باعث بنتی ہیں۔

آپ ﷺ کی تمام جنگیں اپنے دفاع کے لئے تھیں اور وہ محدود ہوتی تھیں۔ آپ ﷺ نے دوران جنگ ایسے اصولوں کو جاری کیا جس سے کم سے کم نقصان ہوتا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمان جاری کیا کہ عورتوں، بچوں، ضعیفوں، غیر مسلح وغیرہ کو قتل نہ کیا جائے۔ منٹگمری واٹ کے مطابق آپ ﷺ کی قیادت یا ہدایات پر 82 جنگیں (غزوات، سریات) لڑی گئیں جن میں کل 1058 انسانی جانیں کام آئیں (مسلمانوں اور کفار کو ملا کر)۔ یہ تاریخ میں سب سے کم شدت والی جنگیں تھیں۔ مکہ میں آپ ﷺ نے پرامن طریقے سے اسلام کی تبلیغ جاری رکھی۔ جب وہاں آپ ﷺ کا جینا دوبھر ہو گیا تو آپ ﷺ مدینہ آ گئے۔

مدینہ میں آپ ﷺ نے اسلامی معاشرے اور ریاست کی بنیاد رکھی۔ یہاں آپ ﷺ نے نہ صرف مدینہ کے متحارب قبائل (اوس وخزرج) کے درمیان صلح کروائی، بلکہ اصحاب مکہ (مہاجرین) اور انصار مدینہ کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا۔ اسی طرح یہود سے میثاق مدینہ کے ذریعے آپ نے مصالحت پسندی اختیار کی۔ صلح حدیبیہ میں بھی آپ ﷺ نے سخت شرائط کے باوجود صلح کو ترجیح دی۔ اسی طرح فتح مکہ کو دنیا کی سب سے امن پسند جنگ کہا جاتا ہے۔ جہاں آپ ﷺ نے سب کو معاف کر دیا اور حتیٰ کہ اپنے جانی دشمنوں کو بھی جنہوں نے مکہ میں آپ ﷺ کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے ایام جاہلیت کے تمام خونوں کو ساقط کر دیا۔ انسانی جان کی حرمت، مال کی حفاظت اور عزت کا تقدس قائم کر دیا۔

بعینہٖ آپ ﷺ نے سفارتکاری کے ذریعہ دنیا میں امن قائم کرنے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لئے آپ ﷺ نے دنیا کے مختلف رہنماؤں، بادشاہوں کو خطوط لکھے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسلام دین امن، پیغمبر اسلام، پیغمبر امن:

اسلام کا مقصد وحتی امن، صلح اور آشتی ہے۔ لفظ اسلام سلم سے مشتق ہے۔ جس کا مطلب امن اور صلح ہے۔ بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق، اسلام امن ہے، خدا امن ہے، اسی طرح جنت کو بھی امن کا گھر کہا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ

والصلح خیر

"صلح سب سے بہترین شے ہے۔"

ایک اور حدیث بخاری کے مطابق حضور ﷺ کو جب بھی ایک آسان (صلح جو) (اور مشکل جنگجوانہ) اقدام میں سے انتخاب کرنا ہوتا تھا تو آپ ﷺ آسان اور صلح پسند عمل کو پسند کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ کی تمام جنگیں دفاع کے لئے تھیں، انصاف کے لئے تھیں اور محدود (Limited) تھیں۔

حضور ﷺ کے امن پسند اقدامات مکہ میں:

آپ ﷺ نے مکہ میں درج ذیل امن پسند اقدامات کیے۔ مکہ میں تو آپ ﷺ نے نہ ہی تلوار اٹھائی نہ ہی کسی سے مخاصمت کی۔

۱۔ پرامن طریقے سے تبلیغ اسلام کی۔

۲۔ اپنے خلاف ظلم وستم سہے۔

۳۔ دوبار مسلمانوں کو ہجرت حبشہ کرنا پڑی۔

۴۔ قریش کی بار بار ریشہ دوانیوں کے باوجود آپ ﷺ نے جنگ کا راستہ اختیار نہیں کیا۔

۵۔ شعب ابی طالب میں محصور رہے، یہ مقاطعہ قریش مکہ کی جانب سے ظلم اور جارحیت پر مبنی تھا۔ آپ ﷺ نے کوئی جارحانہ رویہ/راستہ اختیار نہ کیا۔

۶۔ طائف میں آپ ﷺ کو پتھر پڑے۔ آپ ﷺ نے وہاں کے لوگوں کو دعا دی۔

خلاصتاً آپ ﷺ نے مکہ میں جنگ کا راستہ اختیار نہیں کیا حالانکہ قریش مکہ نے نہ صرف آپ ﷺ کو دھتکارا بلکہ آپ ﷺ کی جان کے دشمن بن گئے تھے۔

مدینہ میں آپ ﷺ کی امن پسند کوششیں:

آپ ﷺ نے صلح، امن اور آشتی کو رواج دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی اپنے بدلہ کا حق چھوڑ دیتا ہے اللہ اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے، قیام مدینہ میں آپ ﷺ نے درج ذیل اقدامات امن کئے۔

۱۔ اوس وخزرج کی متحارب لڑائی ختم کر کے ان کو انصار کی صورت میں یکجا کر دیا۔

۲۔ انصار مدینہ اور مہاجرین مکہ کے درمیان اخوت کا رشتہ قائم کر کے تمام مسلمانوں کو بھائی بھائی بنا دیا۔

۳۔ آپ ﷺ نے یہود مدینہ کو میثاق مدینہ کے ذریعے اپنا ہمنوا بنایا اور اس طرح امن اور باہمی وجود (Co-existence) کو عملی جامہ پہنایا۔

۴۔ صلح حدیبیہ میں آپ ﷺ نے سخت شرائط کو قبول کر لیا اور جنگ سے اجتناب کیا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۵۔ آپ ﷺ نے سفارتکاری کے ذریعے غیر ملکی رہنماؤں، حکمرانوں کو خطوط لکھے اور ان کو اسلام کی طرف بلایا، بعض نے اسلام قبول کر لیا تو یہ معاملات امن پسند طریقوں سے حل ہو گئے۔

۶۔ فتح مکہ میں آپ ﷺ نے عوام و خواص، دوست و دشمن سب کے لئے عام امان کا اعلان کر دیا۔

۷۔ فتح مکہ کے بعد عام الوفود میں عرب قبائل نے آپ ﷺ سے بیعت کی اور آپ ﷺ نے بغیر کسی جنگ کے ان کو اسلام میں داخل کیا۔

۸۔ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے جاہلیت کے تمام خون خرابہ کو ختم کر دیا اور امن کا ایک نیا باب شروع کر دیا۔

ودماء الجاهلية موضوعة وان اول دم اضع من دمائنا دمر ابن ربيعة بن الحارث كان مسترضعا في بني سعد فقتلته هذيل

آپ ﷺ کی جنگوں پر ایک نظر:

حضور ﷺ کے دور میں، خاص طور پر قیام مدینہ کے دوران ۸۲ جنگیں بشمول غزوات و سریات لڑے گئے جس میں صرف ۱۰۵۸ انسانی جانیں ضائع ہوئیں یہ انسانی تاریخ کی سب سے کم شدت والی جنگیں تھیں۔

اسلام نے ہر شخص کو بنیادی انسانی حقوق عطا فرمائے ہیں، کسی پر ظلم کے پہلو کو روا نہیں رکھا ہے۔ اہل قتال جن پر تلوار اٹھانا جائز ہے، ان پر بھی دست درازی کا غیر محدود حق حاصل نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے بھی کچھ حدود ہیں جن کی پابندی ضروری ہے۔ حضور ﷺ نے ان حدود و آداب کی پابندی مجاہدین کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔ ان آداب اور اصلاحات کو ایک ایک کر کے تفصیل کے ساتھ یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

رسول اللہ ﷺ کی جنگی اصلاحات / اسلام میں جنگ کے قوانین وضوابط

جنگ کے مقاصد:

حضور ﷺ محسن انسانیت ہیں۔ آپ ﷺ تو لوگوں کی زندگی سنوارنے اور ان کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ انسانوں کو تہ تیغ کرنے کے لیے نہیں۔ آپ ﷺ کو تمام جنگیں دفاع کے لیے لڑنا پڑیں، اس میں بھی طریقہ جنگ یہ رکھا کہ جانی و مالی نقصان کم از کم ہو۔ اپنی طاقت کی دھاک بٹھانا، لوگوں کو زبردستی اپنا مطیع بنانا، مال غنیمت کے طور پر دشمن کے اموال حاصل کرنا، دشمن سے انتقام لینا، انتقام کے طور پر دشمن پر قتل و غارت مسلط کرنا، سلطنت کی توسیع کرنا یا کسی بھی قسم کا کوئی مادی و دنیوی مفاد حاصل کرنا آپ ﷺ کے جنگ کے مقاصد میں شامل نہ تھا۔ آپ ﷺ کا مقصد جنگ دشمن کو ہلاک کرنا بھی نہ تھا بلکہ صرف اس کے شر کو دور کرنا تھا۔

1- غفلت میں حملہ کرنے سے احتراز:

اہل عرب کا قاعدہ تھا کہ رات کے وقت جب لوگ سو جاتے تو ان پر حملہ کر دیتے۔ نبی کریم ﷺ نے اس عادت کو بند کیا اور قاعدہ مقرر کیا کہ صبح ہونے سے پہلے دشمن پر حملہ نہ کیا جائے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ خیبر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"نبی کریم ﷺ جب رات کے وقت کسی قوم پر پہنچتے تو جب تک صبح نہ ہو جاتی حملہ نہ کرتے۔"

2- آگ میں جلانے کی ممانعت:

عرب اور غیر عرب شدت انتقام میں دشمن کو آگ میں ڈال دیا کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے اس وحشیانہ حرکت سے بھی منع فرمایا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"آگ کا عذاب دینا سوائے آگ کے پیدا کرنے والے کے کسی کو سزاوار نہیں ہے۔"

ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زنادقہ کو آگ کا عذاب دینے کا حکم فرمایا۔ اس پر حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے انہیں روکا اور نبی کریم ﷺ کا یہ حکم بیان کیا کہ "آگ اللہ کا عذاب ہے، اس سے بندوں کو عذاب نہ دو۔"

3- باندھ کر قتل کرنے کی ممانعت:

نبی کریم ﷺ نے دشمنوں کو باندھ کر قتل کرنے کی بھی ممانعت فرمائی ہے۔ عبید بن یعلی کا بیان ہے کہ ہم عبدالرحمن بن خالد کے ہمراہ جنگ پر گئے تھے، ایک دفعہ ان کے پاس لشکر اعداء میں سے چار لوگ پکڑے ہوئے آئے اور انہوں نے حکم دیا کہ انہیں باندھ کر قتل کر دو۔ اس کی اطلاع جب حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو ہوئی تو انہوں نے کہا۔ **سمعت من محمد ﷺ نهى عن قتل الصبر** میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے قتل صبر سے منع کیا ہے۔

4- لوٹ مار کی ممانعت:

اسلام نے جنگ کی صورت میں کامیابی ہونے پر لوٹ کھسوٹ سے منع کیا ہے۔ ایک دفعہ سفر جہاد میں صحابہ نے کچھ بکریاں لوٹ لیں اور ان

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کا گوشت پکا کر کھانا چاہا۔ نبی کریم ﷺ کو جب خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے دیگچیاں الٹ دیں اور فرمایا۔ "لوٹ کھسوٹ کا مال مردار سے بہتر نہیں ہے۔"

عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے لوٹے ہوئے مال کو حرام قرار دیا ہے۔

5- تباہ کاری کی ممانعت:

افواج کی پیش قدمی کے وقت فصلوں کو خراب کرنا، کھیتوں کو تباہ کرنا، بستیوں میں قتل عام اور آتش زنی کرنا جنگ کے معمولات میں سے ہے مگر اسلام ان چیزوں کو فساد سے تعبیر کرتا ہے اور سختی کے ساتھ ناجائز قرار دیتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (بقرۃ:205)

اور جب وہ حاکم بنتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے اور فصلوں اور نسلوں کو تباہ کرے، مگر اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

6- قتل سفیر کی ممانعت:

سفراء اور قاصدوں کے قتل سے بھی نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ مسلیمہ کذاب کا قاصد عبداللہ بن الحارث جب اس کا گستاخانہ پیغام لے کر حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر قاصدوں کا قتل منع نہ ہوتا تو میں تیری گردن اڑا دیتا۔

7- بدعہدی کی ممانعت:

غدر، نقض عہد اور معاہدین پر دست درازی کرنے کی برائی کے متعلق بے شمار احادیث آتی ہیں جن کی بناء پر یہ فعل اسلام میں بدترین قرار پایا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو کوئی کسی معاہد کو قتل کرے گا اسے جنت کی بو تک نصیب نہیں ہوگی، حالانکہ اس کی بو چالیس برس کی مسافت سے محسوس ہو جاتی ہے۔''

حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا تھا۔ آپ ﷺ رؤوف و رحیم تھے، معلم اخلاق حسنہ اور داعی توحید تھے۔ آپ ﷺ نے دعوت حق کے سلسلے میں بڑی تکالیف اٹھائیں، مصائب جھیلے اور دکھ پہنچانے والوں کے خلاف کبھی بددعا نہیں فرمائی۔ کفار مکہ کی ایذاء رسانیوں سے تنگ آ کر اذن الٰہی سے آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ ہجرت فرما گئے۔ دشمنان حق نے پھر بھی معاندانہ سرگرمیاں جاری رکھیں اور آخر کار وہ سفاکی پر آ گئے اور مرنے مارنے پر اتر آئے۔ آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے پیروکاروں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے انہوں نے جنگ و جدال کا راستہ اختیار کر لیا۔ حضور ﷺ کو دفاع کرنا پڑا۔ حق و باطل کے ان معرکوں میں آپ ﷺ نے اپنی سپاہ کی قیادت فرمائی۔ بطور سپہ سالار آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کے اتنے پہلو ہیں کہ ان سب کا مختصر طور پر صرف ذکر کر دینا بھی یہاں ممکن نہیں۔ صرف چند پہلوؤں کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔

حاصل کلام:

حضور ﷺ نے جنگ میں جن چیزوں کی ممانعت فرمائی یہ سب چیزیں اس زمانے میں ہر قوم میں جائز بلکہ حق سمجھی جاتی تھیں۔ اس زمانے میں ہی نہیں غیر مسلموں میں تو یہ چیزیں بیسویں صدی عیسوی میں بھی جائز سمجھی جاتی رہی ہیں۔ دو عالمی جنگوں میں دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

خلاف ان سب چیزوں کو روا سمجھا تھا۔ جنگ میں یہ اعلیٰ اخلاقی اقدار حضور ﷺ نے متعارف کرائیں اور یہ صرف مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں۔ اہل اسلام نے ہمیشہ جنگوں میں ان کو ملحوظ رکھا ہے۔

تنقیدی جائزہ (Critical Assessment):

- Prophet (SAW) is considered a pacifist. Dr. Michael Hart (b. 1932) in his book, *The 100: A Ranking of the Most Influential Persons in History* places him as the number one personality and states, "he was supremely successful in both the secular and religious fields."
- Maulana Wahiduddin Khan (b. 1925) confirms that the Prophet (SAW) was supremely successful as he always followed the principles of peace, and refers to him as 'The Prophet of Peace'.
- Although Samuel Huntington (1927-2008) and others speak of Islam's 'bloody borders', in an attempt to project Islam as a religion that was spread through violence, T W Arnold (1864-1930) in "The Preaching of Islam" concludes that Islam was spread through peaceful means, not by the sword.
- According to Zeenat Shaukat Ali, many Muslims in the past and present have used the name of Islam to perpetrate violence, but this is due to their self-devised interpretation and has nothing to do with Islam. As a result, conquests were conducted wrongly in the name of Islam.
- According to Karen Armstrong in his book "Muhammad: The Prophet for Our Time" Islam is religion of peace and its Prophet preached tolerance and coexistence.
- Former U.K Prime Minister Tony Blair once remarked that "Tolerance is the defining characteristic of Islam"
- Khalifa Abdul Hakim said that Mohammed did not merely preach toleration; he embodied it into a law. To all conquered nations he "offered liberty of worship. Proselytism by the sword was wholly contrary to the instincts of Mohammed, and wrangling over creeds his abhorrence. Repeatedly he exclaims:

"Why wrangle over that which you know not; try to excel in good works; when you shall return to God, He will tell you about that in which you have differed."

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حضور ﷺ بحیثیت سپہ سالار و جنگی منصوبہ ساز

تعارف: حدیث، سیرت اور مغازی کی کتابوں میں غزوات اور معرکوں کی طویل فہرست ملتی ہے۔ آنحضور ﷺ کی دس سالہ زندگی سرد یا گرم جنگوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے 28 غزوات میں آپ ﷺ بنفس نفیس شریک ہوئے۔ اور 77 سرایا میں آپ ﷺ کی زیر ہدایت آپ ﷺ کے نائبین نے شرکت کی ان تمام جنگی کارروائیوں کے نتیجے میں دس لاکھ مربع میل پر مشتمل وسیع اسلامی اسٹیٹ قائم ہوئی۔ مسلم شہداء اور کفار مقتولین کی تعداد جو ان جنگوں میں کام آئی 255 اور 759 علی الترتیب ہے۔ مسلمان مجاہدین کی جانب نقصان کی اوسط ایک ماہ میں ایک فرد بنتی ہے۔ اس طرح جنگی قیدیوں کی کل تعداد 6564 ہے۔ جن میں صرف دو قیدیوں کو ان کے سنگین جرائم کی پاداش میں قتل کیا گیا۔ یہ اعداد و شمار آنحضرت ﷺ کی جنگی فراست اور حربی صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں جو اس امر کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ دنیا کے بہترین اور کامیاب ترین سپہ سالار تھے اور اس میزان میں بھی آپ ﷺ بہترین اسوۂ حسنہ ہیں۔ اب ہم آنحضور ﷺ کا بطور سپہ سالار اور اس سے متعلقہ مختلف پہلوؤں کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

حضور ﷺ ایک عالمگیر انقلاب کے داعی تھے جس کی بنیاد اس حقیقت پر تھی کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ (Sovereign) یعنی حاکم نہیں لا الہ الا اللہ کے نعرہ انقلاب کی زد ان تمام خداؤں پر پڑتی تھی جن کی پوجا کی جارہی تھی وہ مٹی و پتھر کے بنے ہوئے بت ہی نہ تھے بلکہ خواہشات نفس خاندان و برادری کے بت، نسل پرستی اور ناجائز معاشی مفادات، سب اس کی زد میں آتے تھے۔ ظاہر کے محض تبلیغ سے ان لوگوں کو منایا نہیں جا سکتا تھا جو اپنے مفادات کی خاطر اشاعت اسلام کے راستے میں مزاحم تھے۔ ہجرت مدینہ کے بعد اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو مخالفین اسے ختم کرڈالنے پر تل گئے۔ لہٰذا جنگ ناگزیر تھی۔ ان جنگوں میں حضور ﷺ خود سپہ سالار ہوتے اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اس لشکر کے سپاہی۔ سپہ سالار کی حیثیت سے آپ ﷺ نے جدید ترین طریقے اختیار کیے۔

عرب میں فوجی تنظیم کا معیار اتنا بلند نہ تھا۔ آپ ﷺ نے باقاعدہ صف بندی کا طریقہ اختیار کیا۔ صفوں کو درست کرنے کے لیے سپیشل افسر (وازع) بھی مقرر فرمایا۔ صف بندی کے بعد آپ خود معائنہ کرتے تھے اور کم عمر اور ناقابل اعتماد آدمیوں کو فوج سے نکال دیتے تھے۔ بوقت ضرورت لشکر کے ساتھ خواتین بھی جاتیں جو مرہم پٹی اور تیمارداری کی خدمات سرانجام دیتیں۔ مومنین پر پابندی تھی کہ جب تک حکم نہ دیا جائے، لشکر حرکت میں نہ آئے۔ جب تک دشمن زد میں نہ آئے، تیر نہ چلایا جائے۔ جب ذرا اور قریب آئے تو پتھراؤ کیا جائے اور جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہو جائیں تو نیزہ اور تلوار سے مقابلہ کیا جائے۔ اسلامی لشکر میں شعار Watch Word بھی استعمال کیا جاتا تھا تاکہ دوست اور دشمن میں پہچان کی جا سکے۔ عرب میں خندق کا استعمال سب سے پہلے آپ ﷺ نے فرمایا۔ منجنیق اور دبابہ کا استعمال بھی کیا گیا۔

آنحضرت ﷺ دشمن فوج کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنے کے لیے فوجی جاسوس بھی مقرر فرماتے۔ خود اپنی فوج کی نقل و حرکت کو خفیہ رکھتے۔ چنانچہ جب بھی کسی غزوہ پر نکلنا ہوتا، اصل مدمقابل کا نام ظاہر نہ کیا جاتا۔ (سوائے غزوہ تبوک کے) فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار کا لشکر مکہ پر حملہ آور ہوا لیکن دشمن کو اس لشکر کے مکہ پہنچنے سے پہلے اطلاع نہ مل سکی۔ آپ ﷺ نے معاشی دباؤ ڈالنے کا طریقہ بھی استعمال کیا۔ چنانچہ اہل مکہ نے صلح حدیبیہ کی خلاف ورزی کی تو ان کے تجارتی سفروں کے راستے مسدود کردیے گئے اور اس طرح انہیں جھکنے پر مجبور کردیا گیا۔ طائف والے غزوہ حنین کے بعد قلعہ بند ہوگئے تو ان کے باغات کاٹ دیے گئے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اخلاقی حدود کی پاسداری:

حضور ﷺ نے جنگ کے بھی آداب مقرر کیے تھے۔ مثلاً عورتوں، بچوں، ضعیفوں اور راہبوں کو قتل کرنے سے منع فرمادیا تھا۔ آگ میں جلا کر مارنے سے بھی منع فرمایا۔ لوٹ کھسوٹ اور فصلوں کو برباد کرنے پر پابندی لگادی اور اسے فساد فی الارض قرار دیا۔ البتہ بعض اوقات سرکش دشمن پر معاشی دباؤ ڈالنے کے لیے درختوں کو کاٹنے کی اجازت دی۔ کسی دشمن کا مثلہ کرنے پر باندھ کر قتل کرنے کو بھی ممنوع قرار دیا۔ دشمن کے سفیر کے قتل کو بھی جائز نہ رکھا۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی دشمن کے ساتھ بدعہدی نہیں کی۔

مقبول ترین سپہ سالار:

نبی ﷺ نے اپنی فوج کا حوصلہ ہمیشہ بلند رکھا۔ خدا اور آخرت کے تصور نے مومنین کے اندر ذوق شہادت پیدا کردیا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ حضور ﷺ کے ساتھ اس حد تک محبت کرتے تھے کہ ان کے وضو کا پانی تک زمین پر نہیں گرنے دیتے تھے۔ اس عشق رسول ﷺ نے مومنین کو ایک ایسی قوت بنادیا تھا جس کی مثال تاریخ عالم میں اور کہیں نہیں ملتی۔

بطور سپہ سالار آپ ﷺ کے اوصاف

نظریہ جنگ میں تبدیلی:

آپ ﷺ قرآنی آیات تعلیمات کی عملی تصویر تھے۔ جنگ اور معرکہ میں آپ ﷺ نے احکام الٰہی کی پوری پوری پابندی کی ہے۔ آپ ﷺ تاریخ انسانی میں منفرد سپہ سالار ہیں جنہوں نے جنگ کا مقصد اور نقطہ نظر ہی بدل دیا۔ عربوں میں جنگ کے لئے حرب کا کلمہ استعمال کیا جاتا تھا جس سے مقصود ذاتی انتقام لینا اپنی بہادری کا سکہ بٹھانا، ملک میں وسعت دینا اور دیگر دنیاوی خواہشات کی تکمیل تھا۔ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص مال غنیمت کے لئے لڑتا ہے۔ دوسرا شہرت کے لئے لڑتا ہے۔ تیسرا قومی یا وطنی حمیت کے لیے لڑتا ہے ان میں سے کس کی لڑائی فی سبیل اللہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جو قومی حمیت کے لڑتا ہے۔

عزم راسخ اور ارادہ محکم:

رسول اللہ ﷺ کا تن تنہا مشرکین کے ابلتے ہوئے سمندر کی ہولناک موجوں کے سامنے نزول وحی سے لے کر اپنے آخری دم تک ڈٹے رہنا۔ آپ ﷺ کے قوی اور مضبوط ارادے کی دلیل ہے۔ یہ ارادہ کبھی متزلزل نہ ہوسکا۔ آپ ﷺ نے اعراض، تکذیب، مصیبتوں اور خطرات کو صبر سے برداشت کیا اور اپنے شہر سے دوسرے شہر میں ہجرت کر گئے اور ہمیشہ مقابلہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ کی قوت سہارا بننے کے قابل ہوگئی اور اسلام مضبوط ہوگیا۔ پھر آپ ﷺ نے اس طاقت سے اپنے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ مدینہ کے اندر یہودیوں اور منافقوں سے مقابلہ اور مدینہ سے باہر مشرکین سے مقابلہ خصوصاً بدترین دشمن قریش سے جو ہمیشہ سب کچھ کر گزرنے کو تیار رہتے تھے۔

آپ ﷺ تمام نامساعد حالات میں ثابت قدم رہے۔ اپنے اردگرد کے تمام لوگوں سے برابر مقابلہ جاری رکھا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے دین کو غالب کردیا۔ رسول اللہ ﷺ نے کبھی دشمنوں کی بے اندازہ فوجی طاقت کی ذرا پرواہ نہ کی، نہ اپنا ارادہ بدلا۔ محمد مصطفیٰ ﷺ کی پوری زندگی قوی اور مضبوط ارادے کی بہترین مثال ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مسئولیت کا تحمل:
مسلمانوں میں کوئی بھی ایسا آدمی نہ تھا، جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تمام جنگی اور غیر جنگی اعمال میں عظیم ذمہ داری کو برداشت کرسکتا اور پھر آنحضرت ﷺ کے اعمال وہ کام کتنے عظیم تھے کہ جنہوں نے تاریخ کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ اور اس ذمہ داری سے بڑھ کر اور کون سی عظیم اور نازک ذمہ داری ہے جسے آنحضرت ﷺ نے اپنی ابتدائے وحی سے لے کر رفیق اعلیٰ سے ملنے تک اٹھائے رکھا۔ یہ صحیح ہے کہ آپ ﷺ کے صحابہ آپ ﷺ سے ہر معاملہ میں تعاون کرتے تھے، لیکن ہر چیز کی ذمہ داری صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس پر تھی۔

غیر متزلزل اور غیر تغیر پذیر مزاج:
آنحضرت ﷺ کی طبیعت میں فتح اور شکست دونوں حالتوں میں کبھی تغیر اور تبدل نہیں ہوا۔ آپ ﷺ اپنے اعصاب پر اس طرح قابو رکھتے تھے جو خیال سے زیادہ حقیقت پرمبنی ہوتا تھا۔ انتہائی خطرناک حالات اور سنگین مقامات میں بھی۔

جنگ احد میں جب مشرکین نے آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے صحابہ کو گھیرے میں لے لیا تو اس وقت اپنے حواس پر غالب آنا اور ان پر قابو پانا آسان کام نہیں تھا۔ اس کے باوجود آپ ﷺ نے اپنے حواس پر قابو رکھا اور مسلمانوں کی کشتی کو سلامتی کے ساحل پر عافیت سے جا لگایا۔

جنگ احزاب کے دن بھی اپنے حواس کو برقرار رکھنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ خصوصاً یہودیوں کی غداری کے بعد، اس کے باوجود آپ ﷺ اپنے حواس پر غالب رہے۔ لشکروں کا مقابلہ کیا اور یہود کا خاتمہ کر دیا۔

پھر حنین کے روز اپنے حواس پر قابو رکھنا بھی آسان نہ تھا۔ جب آپ ﷺ صرف دس صحابہ کے ساتھ مشرکین کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی ہولناک موجوں کے سامنے ڈٹ گئے۔ اس کے باوجود آپ ﷺ نے اپنے حواس کو برقرار رکھا اور اپنے دشمن کو شکست دی۔

اس کی سب سے بڑی مثال فتح مکہ کا واقعہ ہے:

مسلمانوں نے آپ ﷺ کو اس دن اس حال میں دیکھا کہ آپ ﷺ کا سر مبارک پالان پر جھکا ہوا تھا، آپ ﷺ کے روئیں روئیں سے بے انتہا تواضع اور انکسار کا اظہار ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ کی داڑھی مبارک سواری کے پالان کے وسط کو چھو رہی تھی اور جتنا آپ ﷺ کو اپنی اس فتح کی اہمیت کا احساس ہوتا جاتا، اسی قدر اپنی سواری پر خدا کے حضور جھکتے جاتے، سجدہ شکر بجالاتے۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ ایک ایسی طبیعت کے مالک تھے، جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔ آپ ﷺ کا مزاج یکسر غیر تغیر پذیر رہا۔

آنحضرت ﷺ اپنے تمام کاموں میں خواہ وہ جنگی ہوں یا غیر جنگی دور اندیشی کی خوبی سے آراستہ تھے اور اس کی مثالیں تو اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا شمار بھی نہیں کیا جا سکتا۔

رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کی صلح کے شرائط قبول کر لینے پر اصرار کیا کیونکہ آپ ﷺ نے اس صلح کی شرائط کو بغور دیکھا اور اپنی روشن رائے سے معلوم کر لیا کہ ان شرائط کو قبول کر لینا مسلمانوں کی فتح ہے۔ یہ شرائط مسلمانوں کے لئے مفید رہیں گی۔

مردم شناس قابلیت کی معرفت:

رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کرام کی نفسیات اور قابلیت کو بہت اچھی طرح جانتے تھے، کیونکہ آپ ﷺ انہی میں ایک فرد کی طرح زندگی گزار رہے تھے اور رنج و راحت میں ان کے ساتھ شریک رہتے اور ہر معاملے میں مساوات کا سلوک کرتے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آپ ﷺ تمام صحابہ کی خوبیاں اور کمالات الگ الگ پہچان لیتے تھے۔ آپ ﷺ ہر آدمی کو اسی کام پر متعین فرماتے جس کام کو اس کی جسمانی اور عقلی طاقت برداشت کر سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر صحابہ ان مہمات کو بآسانی سرانجام دے دیتے جو ان کے سپرد کی جاتیں۔

حضرت ﷺ نے جنگ حنین کے بعد مؤلفۃ القلوب کی دلوں کو دولت دے کر مائل کر لیا۔ اس لئے دشمنی کا مادہ ان کے دماغوں کو ماؤف کر چکا تھا، ان لوگوں نے ابھی ایمان کی حلاوت نہیں چکھی تھی۔

حضور کریم ﷺ کی جنگی اصلاحات:

اسلام نے ہر شخص کو بنیادی انسانی حقوق عطا فرمائے ہیں، کسی پر ظلم کے پہلو کو روا نہیں رکھا ہے۔ اہل قتال جن پر تلوار اٹھانا جائز ہے، ان پر بھی دست درازی کا غیر محدود حق حاصل نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے بھی کچھ حدود ہیں جن کی پابندی ضروری ہے۔ حضور ﷺ نے ان حدود و آداب کی پابندی مجاہدین کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔ ان آداب اور اصلاحات کو ایک ایک کر کے تفصیل کے ساتھ یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

1- غفلت میں حملہ کرنے سے احتراز:

اہل عرب کا قاعدہ تھا کہ رات کے وقت جب لوگ سو جاتے تو ان پر حملہ کر دیتے۔ نبی کریم ﷺ نے اس عادت کو بند کیا اور قاعدہ مقرر کیا کہ صبح ہونے سے پہلے دشمن پر حملہ نہ کیا جائے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ خیبر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"نبی کریم ﷺ جب رات کے وقت کسی قوم پر پہنچتے تو جب تک صبح نہ ہو جاتی حملہ نہ کرتے۔"

2- آگ میں جلانے کی ممانعت:

عرب اور غیر عرب شدت انتقام میں دشمن کو آگ میں ڈال دیا کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے اس وحشیانہ حرکت سے بھی منع فرمایا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"آگ کا عذاب دینا سوائے آگ کے پیدا کرنے والے کے کسی کو سزاوار نہیں ہے۔"

ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زنادقہ کو آگ کا عذاب دینے کا حکم فرمایا۔ اس پر حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے انہیں روکا اور نبی کریم ﷺ کا یہ حکم بیان کیا کہ "آگ اللہ کا عذاب ہے، اس سے بندوں کو عذاب نہ دو۔"

3- باندھ کر قتل کرنے کی ممانعت:

نبی کریم ﷺ نے دشمنوں کو باندھ کر قتل کرنے کی بھی ممانعت فرمائی ہے۔ عبید بن یعلی کا بیان ہے کہ ہم عبدالرحمٰن بن خالد کے ہمراہ جنگ پر گئے تھے، ایک دفعہ ان کے پاس لشکر اعداء میں سے چار لوگ پکڑے ہوئے آئے اور انہوں نے حکم دیا کہ انہیں باندھ کر قتل کر دو۔ اس کی اطلاع جب حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو ہوئی تو انہوں نے کہا۔ سمعت من محمد ﷺ نهى عن قتل الصبر میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے قتل صبر سے منع کیا ہے۔

4- لوٹ مار کی ممانعت:

اسلام نے جنگ کی صورت میں کامیابی ہونے پر لوٹ کھسوٹ سے منع کیا ہے۔ ایک دفعہ سفر جہاد میں صحابہ نے کچھ بکریاں لوٹ لیں اور ان کا گوشت پکا کر کھانا چاہا۔ نبی کریم ﷺ کو جب خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے دیگچیاں الٹ دیں اور فرمایا:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

"لوٹ کھسوٹ کا مال مردار سے بہتر نہیں ہے۔"

عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے لوٹے ہوئے مال کو حرام قرار دیا ہے۔

5- تباہ کاری کی ممانعت:

افواج کی پیش قدمی کے وقت فصلوں کو خراب کرنا، کھیتوں کو تباہ کرنا، بستیوں میں قتل عام اور آتش زنی کرنا جنگ کے معمولات میں سے ہے مگر اسلام ان چیزوں کو فساد سے تعبیر کرتا ہے اور سختی کے ساتھ ناجائز قرار دیتا ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (بقرۃ:205)

ترجمہ: اور جب وہ حاکم بنتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے اور فصلوں اور نسلوں کو تباہ کرے، مگر اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

6- قتل سفیر کی ممانعت:

سفراء اور قاصدوں کے قتل سے بھی نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ مسلیمہ کذاب کا قاصد عبداہ بن الحارث جب اس کا گستاخانہ پیغام لے کر حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ اگر قاصدوں کا قتل منع نہ ہوتا تو میں تیری گردن اڑا دیتا۔

7- بدعہدی کی ممانعت:

غدر، نقض عہد اور معاہدین پر دست درازی کرنے کی برائی کے متعلق بے شمار احادیث آتی ہیں جن کی بناء پر یہ فعل اسلام میں بدترین قرار پایا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو کوئی کسی معاہد کو قتل کرے گا اسے جنت کی بو تک نصیب نہیں ہوگی، حالانکہ اس کی بو چالیس برس کی مسافت سے محسوس ہو جاتی ہے۔

جنگ کے مقاصد:

حضور ﷺ محسن انسانیت ہیں، آپ ﷺ تو لوگوں کی زندگی سنوارنے اور ان کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوئے تھے، انسانوں کو تہہ تیغ کرنے کے لیے نہیں۔ آپ ﷺ کو تمام جنگیں دفاع کے لیے لڑنا پڑیں، اس میں بھی طریقۂ جنگ یہ رکھا کہ جانی و مالی نقصان کم از کم ہو۔ اپنی طاقت کی دھاک بٹھانا، لوگوں کو زبردستی اپنا مطیع بنانا۔ مال غنیمت کے طور پر دشمن کے اموال حاصل کرنا، دشمن سے انتقام لینا، انتقام کے طور پر دشمن پر قتل و غارت مسلط کرنا، سلطنت کی توسیع کرنا یا کسی بھی قسم کا کوئی مادی و دنیوی مفاد حاصل کرنا آپ ﷺ کے جنگ کے مقاصد میں شامل نہ تھا۔ آپ ﷺ کا مقصد جنگ دشمن کو ہلاک کرنا بھی نہ تھا بلکہ صرف اس کے شر کو دور کرنا تھا۔

جنگ میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کا احترام:

چونکہ آپ ﷺ کا جنگ کرنے کا مقصد اپنا دفاع کرنا اور فتنہ و فساد برپا کرنے والوں کی اصلاح تھا اس لیے آپ ﷺ نے جنگ کے دوران بھی اعلیٰ اخلاقی اقدار کو ہمیشہ ملحوظ رکھا اور امت کو اس امر کی تعلیم بھی دی۔ یہ اعلیٰ اخلاقی اقدار درج ذیل ہیں:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۱۔ دشمن قوم کے جو لوگ عملاً جنگ میں حصہ لینے کے اہل نہیں انہیں قتل نہ کیا جائے، مثلاً بچے، بوڑھے، عورتیں، بیمار، زخمی، اندھے، پاگل، معبدوں کے مجاور، خانقاہ نشین وغیرہ۔
۲۔ دشمن کو زندہ جلانے کی ممانعت۔
۳۔ دشمن کو باندھ کر اور ایذا دے دے کر قتل کرنے (قتل صبر) کی ممانعت کردی۔
۴۔ مثلہ کرنے (یعنی ہاتھ، پاؤں، کان، ناک وغیرہ کاٹنے) کی ممانعت کردی۔
۵۔ جنگی قیدی کو قتل کرنے کی ممانعت کردی۔
۶۔ دشمن کے علاقے میں لوٹ مار کرنے، فصلوں اور باغات کو اجاڑنے، کس چیز کو نذر آتش کرنے اور کسی قسم کی تباہ کاری کرنے کی ممانعت کردی۔
۷۔ دشمن صلح پر آمادہ ہو جائے تو جنگ روک کر صلح کرنے کی ہدایت کردی۔
۸۔ بر سر جنگ دشمن سے بھی بد عہدی نہ کی جائے۔

حضور ﷺ نے جنگ میں جن چیزوں کی ممانعت فرمائی یہ سب چیزیں اس زمانے میں ہر قوم میں جائز بلکہ حق سمجھی جاتی تھیں۔ اس زمانے میں ہی نہیں غیر مسلموں میں تو یہ چیزیں بیسویں صدی عیسوی میں بھی جائز سمجھی جاتی رہی ہیں۔ دو عالمی جنگوں میں دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کے خلاف ان سب چیزوں کو روا سمجھا تھا۔ ۱۹۹۱ء میں امریکہ نے عراق پر کارپٹ بمباری کی اور ہتھیار پھینک کر کویت سے واپس عراق جانے والے نہتے ہزاروں عراقی فوجیوں کا بمباری کر کے قتل عام کیا۔ جنگ میں یہ اعلیٰ اخلاقی اقدار حضور ﷺ نے متعارف کرائیں اور یہ صرف مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں۔ اہل اسلام نے ہمیشہ جنگوں میں ان کو ملحوظ رکھا ہے۔

سپاہ کی اعلیٰ اخلاقی تربیت:

حضور ﷺ نے مجاہدین اسلام کی اعلیٰ اخلاقی تربیت فرمائی تھی۔ آپ ﷺ کا تو مشن ہی لوگوں کو کتاب و حکمت کی تعلیم دینا اور تزکیہ باطن کرنا تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اخلاق فاضلہ کے مالک اور نہایت متقی اور پارسا لوگ تھے۔ یہ نہیں کہ سپہ سالار خود تو اعلیٰ اخلاقی اقدار کا حامل ہو مگر اس کی سپاہ کے لوگ بد اخلاق، ظالم، سفاک، مال و زر کی حرص کے اسیر ہوں، ایسی صورت میں اکیلا سپہ سالار رفع شر اور اصلاح نہیں کر سکتا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مجاہدین کی خوب اخلاقی تربیت فرمائی۔ آپ ﷺ کی سپاہ کا جنگ کرنے کا مقصد بھی وہی تھا جو آپ ﷺ کا تھا۔ اکثر غزوات میں آپ ﷺ نے خود قیادت فرمائی اور آپ ﷺ پورا اہتمام فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کے لشکر کا ہر سپاہی اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرے۔ جن جنگوں میں آپ ﷺ نے خود شرکت نہیں فرمائی بلکہ کسی صحابی کی کمان میں لشکر یا دستہ بھیجا آپ ﷺ نے روانہ فرماتے وقت انہیں ہمیشہ تقویٰ اور پارسائی کو اختیار کیے رکھنے کی ہدایت فرمائی۔

سپاہ کا مقصد اور نظریہ پر پختہ یقین:

بطور سپہ سالار کے آپ ﷺ کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ آپ ﷺ نے اپنی فوج کے ہر سپاہی میں اپنے مقصد اور نظریے کی حقانیت پر پختہ یقین پیدا کر دیا تھا۔ جب تک فوج کو اپنے مقصد اور نظریے کی سچائی کا پکا یقین نہ ہو وہ جنگ میں ثابت قدمی سے بہادری کے جوہر نہیں دکھا سکتی جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تمام جنگوں میں صبر و استقامت سے کام لیتے ہوئے دلیری اور شجاعت کے ایسے جوہر دکھائے جو رہتی دنیا تک یاد رکھے جائیں گے۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ انہیں اپنے موقف کے سچا ہونے پر پختہ یقین تھا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سپاہ میں ہر صورت عزم و حوصلہ قائم رکھا:

حضور ﷺ کو بہت سے جنگیں نہایت نامساعد حالات میں لڑنا پڑیں۔ دشمن کی تعداد مقابلۃً بہت زیادہ ہوتی، وہ کہیں زیادہ سامان جنگ سے لیس ہوتا، مال و اسباب میں بھی دشمن کو بہت زیادہ فوقیت حاصل ہوتی جبکہ اہل ایمان ان سب شعبوں میں بہت کمزور ہوتے تھے۔ یہ مومنین کے سپہ سالار کا کمال تھا کہ آپ ﷺ نے ہر حال میں اپنی سپاہ کے اندر عزم و حوصلہ اور جوش و ولولہ قائم رکھا۔ غزوۂ بدر میں صرف ۳۱۳ نہتے مسلمانوں کو ایک ہزار کفار کا مقابلہ کرنے کے لیے عزم و ہمت کے ساتھ آمادہ کر لیا، غزوۂ احد میں تین ہزار کے جنگی سامان سے لیس لشکر کا مقابلہ کرنے کے لیے سات سو مجاہدین کو تیار کیا اور غزوۂ احزاب میں جب سارا عرب مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے چڑھ آیا تو مٹھی بھر مسلمانوں کو دفاعی خندق کھود کر مدینہ میں محصور ہو کر مقابلہ کرنے کے لئے پرعزم کر لینا آپ ﷺ کا معجزانہ کام تھا۔ قیصر روم کی طرف سے متوقع حملے کی پیش بندی کے لیے انتہائی ناسازگار حالات میں تبوک جیسی دور دراز کی مہم پر مجاہدین اسلام کو لے جانا آپ ﷺ کا کمال تھا۔ آپ ﷺ نے کبھی اپنے سپاہ کو حوصلہ نہیں ہارنے دیا۔ غزوۂ احد اور غزوۂ حنین میں جب مسلمانوں کی بعض غلطیوں کی وجہ سے مسلمانوں کو شکست ہونے لگی اور ان میں کھلبلی مچ گئی تو آپ ﷺ نے ان کو پھر سے اکٹھا کر کے ان میں جوش و ولولہ پیدا کر دیا اور شکست کو فتح میں بدل دیا۔

صرف اللہ پر بھروسہ:

آپ ﷺ نے تمام جنگوں میں صرف اللہ تعالیٰ کی نصرت پر بھروسہ کیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی صرف اللہ پر بھروسہ کرنا سکھایا۔ آپ ﷺ نے کبھی تعداد اور سامان جنگ پر بھروسہ نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے اکثر و بیشتر جنگیں دشمن کے مقابلے میں بہت تھوڑی سی جماعت اور معمولی سامان جنگ کے ساتھ لڑیں، صرف اللہ تعالیٰ کی مدد کے بھروسے پر۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ آپ ﷺ کی مدد فرمائی، مثلاً غزوۂ بدر میں فرشتے بھیج کر، غزوۂ احد میں بعض مجاہدین اسلام پر اونگھ طاری کر کے اور دشمن کو مرعوب کر کے، غزوۂ احزاب میں آندھی بھیج کر۔ آپ ﷺ کے دشمنوں پر اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ آپ ﷺ کا رعب طاری رکھا۔ وسیع و عریض اور عظیم الشان سلطنت کے حکمران قیصر روم جیسا شخص بھی مرعوب تھا اور تبوک میں حضور ﷺ کے مقابلے کے لیے نہیں نکلا تھا۔

محبوب شخصیت:

حضور ﷺ بے حد محبوب اور دل نواز شخصیت کے مالک تھے۔ آپ ﷺ کی سپاہ کے ہر مجاہد کو آپ ﷺ سے انتہائی محبت تھی، وہ حضور ﷺ پر ہر وقت اپنی جان نچھاور کرنے کو تیار رہتے تھے۔ غزوۂ احد میں جب مسلمانوں کے لشکر میں افراتفری مچی تو جو صحابی رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے پاس تھے انہوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر آپ ﷺ کا دفاع کیا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے ہاتھ پر تیر روکے، ان کا یہ ہاتھ شل ہو گیا۔ حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا پانی پلانے آتی تھیں، وہ حضور کا بچاؤ کرتے ہوئے زخمی ہو گئیں۔ غزوۂ اُحد میں ہی ایک صحابیہ رضی اللہ عنہا کا باپ، شوہر اور بھائی شہید ہو گئے۔ انہیں اس کی خبر ملی تو یہ پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کیسے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے بتایا کہ اللہ کا شکر ہے آپ ﷺ خیریت سے ہیں۔ صحابیہ رضی اللہ عنہا نے کہا، آپ ﷺ سلامت ہے تو ہر مصیبت آسان ہے۔

سپہ سالار کے لیے ہر دلعزیز اور محبوب شخصیت کا مالک ہونا نہایت ضروری ہے ورنہ وہ جنگ میں جاں نثار ثابت نہیں ہوتے بلکہ نازک موقع پر ساتھ چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں اور سپہ سالار صرف اپنی جسمانی خوبصورتی یا ظاہری شان و شوکت سے ہر دلعزیز نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا اخلاق اعلیٰ اور سپاہیوں سے سلوک مثالی ہو، جیسا کہ حضور ﷺ کا تھا۔ آپ ﷺ ہر صحابہ کے لیے بے حد خلوص و محبت رکھتے تھے، ہر ایک کے غمگسار اور ہمدرد تھے، اپنے لیے کسی قسم کا امتیاز پسند نہیں فرماتے تھے۔ ہر دکھ، درد اور مصیبت جھیلنے میں سب کے ساتھ برابر شریک ہوتے تھے۔ غزوۂ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

خندق میں بھوک پیاس کی حالت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خندق کی کھدائی کی تو آپ ﷺ نے بھی ان سے زیادہ بھوک پیاس کی حالت میں اس کی کھدائی میں برابر حصہ لیا۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی سپاہی کی توہین یا بے عزتی نہیں کی، کسی سے بھی کوئی توہین آمیز سلوک نہیں کیا، کبھی کسی سے ایسی خدمت نہیں لی جس سے اس کی عزت نفس مجروح ہوتی ہو۔ سب کے ساتھ عزت و احترام کا اور مساویانہ برتاؤ ہوتا تھا۔ آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرماتے تھے۔ پھر ایسی شخصیت سب کی محبوب کیوں نہ ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور ﷺ کے ساتھ اپنی اولاد اور ماں باپ سے زیادہ محبت رکھتے تھے۔

حضور ﷺ بطور جنگی منصوبہ ساز/ بہترین جنگی حکمت عملی اور جنگی حربے

حضورؐ کو چھوٹی سی جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ قریش مکہ اور دیگر ان کے حلیف قبائل کا جنگوں میں مقابلہ کرنا پڑا۔ شروع میں سارا عرب ہی مخالف تھا۔ یہ حضور ﷺ کی سپہ سالاری کا اعجاز ہے کہ چند برسوں میں نہ صرف سارا عرب آپ ﷺ کے زیر نگیں ہو گیا بلکہ عرب سے باہر ہمسایہ طاقتیں بھی اسلام کی قوت و حشمت سے لرزنے لگیں اور یہ سب کچھ بہت ہی معمولی جانی نقصان سے حاصل ہو گیا۔ مومنین اور کفار دونوں فریقوں کا جانی نقصان بہت ہی تھوڑا ہوا۔ اور یہ صرف اور صرف حضور ﷺ کی اعلیٰ بصیرت و فراست، بہترین جنگی حکمت عملی اور عمدہ جنگی حربوں کی بدولت ہوا چند باتیں بطور مثال بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ دشمن کا سیاسی محاذ پر مقابلہ:

شروع میں سارا عرب حضور ﷺ کی دعوت حق کا مخالف تھا، جس کا سبب جہالت اور ادنی دنیوی مفادات تھے۔ آپ ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد اپنے مخالفین کی تعداد کو کم کرنے کی کوشش فرمائی۔ آپ ﷺ نے مدینہ کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ ایک معاہدہ طے فرمایا جو میثاق مدینہ (یا صحیفۂ مدینہ) کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں دوسری شرائط کے ساتھ ایک شرط یہ بھی رکھی گئی تھی کہ بیرونی حملہ آور کے خلاف سب اہل مدینہ مل کر شہر کا دفاع کریں گے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے مدینہ کے گرد و نواح کے قبائل کے ساتھ دوستی کے معاہدے کیے۔ اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ مدینہ کے غیر مسلم اور مدینہ کے گرد و نواح کے قبیلے کم از کم کھلم کھلا قریش سے مل کر مسلمانوں سے دشمنی نہ کر سکتے تھے۔ اس کے بعد ہر مناسب موقع پر حضور ﷺ عرب کے مختلف قبائل سے معاہدات فرماتے رہے تا آنکہ فتح مکہ تک قریش مکہ بالکل تنہا رہ گئے۔ اگر حضور ﷺ ایسا نہ کرتے اور اس کے برعکس قریش مکہ مدینہ کے غیر مسلموں اور قرب و جوار کے قبائل سے معاہدے کر لیتے تو آپ ﷺ کے لیے اتنے مصائب و مشکلات پیدا ہو جاتے کہ ان کا تصور بھی محال ہے۔ حضور ﷺ نے قریش مکہ کو ایسا کرنے کی مہلت ہی نہ دی اور فوراً پہل کر کے معاہدات طے فرما لیے۔

سیاسی محاذ پر دشمن کا مقابلہ کرنے کی بے حد اہمیت ہے۔ جو سپہ سالار اور حکمران اس محاذ پر شکست کھا جائے وہ میدان جنگ میں بھی بالعموم شکست کھاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر نے اتحادیوں سے سیاسی محاذ پر شکست کھائی (بالخصوص روس پر حملہ کرکے) اور پھر جنگ بھی ہار گیا۔

۲۔ دشمن کے حالات کی خبر رسانی:

جب تک دشمن کے تازہ ترین حالات، اس کے عزائم، اس کی خفیہ تدبیروں، اس کی چالوں سے آگاہی حاصل نہ ہو اس کا پورے اعتماد کے ساتھ مقابلہ کر کے فتح حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے دشمن کی خبریں حاصل کرنے کا عمدہ اہتمام فرما رکھا تھا۔ آپ ﷺ نے مستعد اور ہوشیار خبر رساں اس کام پر مامور فرما رکھے تھے۔ گاہ بگاہ معلوماتی مہمیں بھی اس مقصد کے لیے روانہ فرماتے رہتے۔ چنانچہ دشمن کی تمام سرگرمیوں کی آپ ﷺ کو فوراً اطلاع ہو جاتی تھی۔ مثلاً جنگ بدر کے لیے قریش مکہ کا لشکر مدینہ پر چڑھائی کے لیے مکہ سے روانہ ہوا تو آپ ﷺ کو فوراً اس کی خبر مل گئی تھی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۳۔ نہایت رازداری:

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دشمن کے تازہ ترین حالات سے آگاہی حاصل کرنے کا شاندار انتظام فرما رکھا تھا لیکن اپنے ارادوں اور جنگی چالوں کو مناسب وقت سے پہلے کسی پر ظاہر نہ فرماتے تھے بلکہ مکمل رازداری سے کام لیتے تھے۔ یہ ایک نہایت کامیاب اور عظیم سپہ سالار کا طریقہ کار ہے ایسا کرنے سے ایک تو دشمن آپ ﷺ کے ارادوں اور جنگی حربوں سے مکمل طور پر بے خبر رہتا اور ان کا توڑ کرنے کے قابل نہ ہو پاتا تھا دوسرے اسلامی سپاہ کے کئی نفسیاتی مسائل پیدا نہ ہو پاتے تھے۔ مثلاً حضور ﷺ غزوہ بدر کے لیے روانہ ہوئے تو کسی پر اس ارادے کو ظاہر نہ فرمایا کہ میدان جنگ میں دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔ مجاہدین اسلام کا عام تاثر یہی تھا کہ شاید قریش کے تجارتی قافلہ کو جو شام سے واپس آ رہا تھا، لوٹنے جا رہے ہیں۔ آپ ﷺ مکہ کی فتح کے لیے مدینہ سے روانہ ہوئے تو آخر تک قریش مکہ کو اس کی خبر نہ ہو سکی۔ حتیٰ کہ اسلامی لشکر مکہ کے قریب پہنچ کر فروکش ہو گیا۔ قریش کا سردار ابوسفیان چند سرداروں کو ساتھ لے کر معمول کے گشت کے لیے باہر نکلا تو اسلامی پہرے دار اسے پکڑ کر بارگاہ نبوت میں لے آئے۔ جب دشمن کا سپہ سالار یوں بے خبری میں پکڑ لیا جائے تو دشمن کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔

۴۔ دشمن پر اقتصادی دباؤ کی تدبیریں:

قریش مکہ تجارت پیشہ تھے، مال و زر کی کمی نہ تھی لہٰذا وافر سامان جنگ مہیا کرنا اور جنگوں کا اقتصادی بوجھ اٹھانا ان کے لیے مشکل نہ تھا۔ اس کے مقابلے میں مہاجرین نے اپنا سب مکہ میں چھوڑ کر مدینہ ہجرت کی تھی اور وہ معاشی طور پر بالکل بدحال تھے۔ انصار رضی اللہ عنہم بھی معاشی طور پر نہایت کمزور تھے۔ ان حالات میں حضور ﷺ نے قریش مکہ کے تجارتی راستوں کی ناکہ بندی فرما کر ان پر خوب اقتصادی دباؤ ڈالا تاکہ وہ جنگی جنون سے باز آ جائیں۔ جنگ بدر کے بعد آپ ﷺ نے قریش پر شام کا راستہ بند کر دیا۔ انہوں نے عراق کے راستے تجارتی قافلے بھیجنا چاہے تو آپ ﷺ نے چھوٹے چھوٹے اسلامی دستے بھیج کر یہ راستہ بھی بند کر دیا۔ جنگ خیبر کے بعد بنو حنیفہ کا سردار ثمامہ بن اثال اسلام لے آیا تو اس نے قریش پر غلہ بھی بند کر دیا۔ تجارت سے آمدنی تقریباً ختم ہو چکی تھی، جمع پونجی جنگوں میں جھونک چکے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ قریش مکہ کی معاشی طور پر کمر ٹوٹ گئی، مفلسی اور قحط ان پر مسلط ہو گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ قریش مکہ کے سردار ابوسفیان کو مدینہ پہنچ کر آپ ﷺ سے دعا کی التجا کرنا پڑی۔ حضور ﷺ نے کمال رحم دلی سے کام لیتے ہوئے نہ صرف دعا فرمائی بلکہ قریش کے غریب لوگوں کی مدد کے لیے ابوسفیان کو پانچ سو دینار عطا فرمائے .... ابوسفیان کو کھجوریں تحفہ میں دیں اور ثمامہ بن اثال کو حضور ﷺ نے فرمان لکھوا کر بھیجا کہ وہ قریش کا غلہ نہ روکیں۔

قریش مکہ جب شدید اقتصادی دباؤ میں آ گئے تھے اصل میں جنگ تو وہ اس وقت ہار گئے تھے۔ اس کے بعد تو صرف ایک رسمی کارروائی ہونا باقی تھی جو فتح مکہ کی صورت میں تمام ہوئی۔

آج جو قوم معاشی میدان میں جنگ ہار جاتی ہے وہ سیاسی اور فوجی میدان میں بھی لازماً شکست سے دوچار ہوتی ہے۔ سوویٹ سوشلسٹ روس معاشی جنگ ہار کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ آج جدید ترین طریقہ جنگ ہی یہ ہے کہ معاشی میدان میں حریف کو شکست دی جائے۔ جاپان اور جرمنی اب فوجی قوتیں نہیں ہیں لیکن معاشی محاذ پر امریکہ جیسی عظیم فوجی قوت کو ناکوں چنے چبوا رہے ہیں۔ حضور ﷺ نے چودہ سو سال قبل حریف پر اقتصادی دباؤ ڈالنے کا جنگی حربہ استعمال کیا جسے آج بیسویں صدی کی چوتھائی میں جدید ترین حربہ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے، گویا آج ساری دنیا حضور ﷺ کی بطور سپہ سالار عظمت کو خراج عقیدت پیش کر رہی ہے۔

۵۔ کمانڈو سرگرمیاں:

بعض جنگی امور ایسے ہوتے ہیں جنہیں لشکر کشی یا میدان جنگ میں لڑائی سے سرانجام نہیں دیا جا سکتا لیکن وہ جنگی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہوتے ہیں۔ ایسے امور کی انجام دہی کے لیے آج سبھی ملک کمانڈوز کو استعمال کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے چودہ سو سال پہلے آج کی اس تکنیک کو استعمال

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

فرمایا۔ آپ ﷺ بعض امور کے لیے جانباز غازی (کمانڈوز) روانہ فرماتے۔ مثلاً ایک یہودی کعب بن اشرف کو کمانڈو ایکشن سے قتل کروایا۔ یہ بدفطرت شخص مدینہ میں اپنے ننھیال، بنونضیر کے ہاں رہتا تھا۔ یہ نہ صرف مسلمانوں کے خلاف خفیہ سازشیں کرتا بلکہ عشقیہ اشعار میں مسلم خواتین کے نام لے کر مسلمانوں کو ذہنی اذیت بھی پہنچاتا تھا۔ حضور ﷺ نے چند جانبازوں کو اس کے قتل پر مامور فرمایا۔ وہ ایک رات اس کے پاس آئے اور بہانے سے اسے اس کے گھر سے دور باہر لے گئے اور پھر اسے قتل کر دیا۔ ایک اور یہودی سردار سلام بن ابی حقیق کو چند انصاری جانبازوں نے خیبر جا کر اس کے گھر میں قتل کر کے جہنم رسید کیا۔

کمانڈو سرگرمیوں سے دشمن پر بوکھلاہٹ اور رعب طاری ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے اعصاب پر دباؤ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ وہ نفسیاتی طور پر جنگ ہار جاتا ہے۔

۶۔ میدانِ جنگ میں فوجی دستوں کی عمدہ تعیناتی:

حضور ﷺ میدانِ جنگ میں اپنے فوجی دستوں کی تعیناتی جنگی نقطۂ نظر سے نہایت اہم جگہوں پر فرماتے تھے۔ مثلاً جنگ بدر میں پانی کے چشموں پر مسلمانوں کا قبضہ تھا، تاہم حضور ﷺ نے انتہائی رحم دلی سے کام لیتے ہوئے قریش مکہ کو بھی وہاں سے پانی لینے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ غزوۂ احد میں آپ ﷺ نے جبل حنین پر تیراندازوں کا ایک دستہ تعینات فرمایا اور سختی سے ہدایت فرمائی کہ کسی حال میں بھی اس جگہ سے نہیں ہٹنا۔ یہ دستہ اس لیے تعینات فرمایا تھا تا کہ دشمن اچانک عقب سے حملہ نہ کر دے۔ چنانچہ جب تک یہ دستہ اپنی جگہ قائم رہا مسلمان عقب سے محفوظ رہے، دشمن کے گھڑسواروں کے دستہ نے عقب سے حملہ آور ہونے کی کوشش کی مگر جبل حنین پر تعینات تیراندازوں نے تیروں کی بوچھاڑ کر کے انہیں واپس لوٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ لیکن جب فتح کے بعد مال غنیمت جمع کرنے کے لیے یہ تیرانداز پہاڑ سے نیچے اتر آئے تو دشمن کے رسالہ نے عقب سے حملہ کر دیا اور مسلمانوں کی فوج میں افراتفری پڑ گئی اور اہل ایمان کو سخت مشکلات و مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ غزوۂ خندق میں جب قریش مکہ نے عرب قبائل کو ساتھ ملا کر کوئی چوبیس ہزار کے ٹڈی دل لشکر کے ساتھ مدینہ کی چھوٹی سی بستی پر چڑھائی کی تو حضور ﷺ نے شہر میں محصور ہو کر لڑنے کا فیصلہ کیا۔ شہر کے تین اطراف میں دشوار گزار پہاڑیاں اور گھنے نخلستان تھے ادھر سے دشمن کے حملہ آور ہونے کا خطرہ نہ تھا۔ صرف شہر کی شمالی سمت کھلی تھی۔ ادھر حضور ﷺ نے اتنی چوڑائی کی خندق کھدوالی (حضور ﷺ نے خود بھی اس کی کھدائی میں حصہ لیا) کہ دشمن کے گھوڑے اسے پھلانگ نہ سکیں۔ حضور ﷺ کی یہ جنگی چال انتہائی کامیاب رہی۔ کچھ دنوں کے بعد دشمن کو نامراد واپس جانا پڑا اور پھر دوبارہ حملہ آور ہونے کی کبھی جرأت نہ ہوئی۔

جنگ کے اعلیٰ مقاصد، دورانِ جنگ اعلیٰ اخلاقی اقدار کا احترام، جنگ کا بہترین طریقہ کار شاندار جنگی حکمت عملی، بہترین جنگی چالیں اور شاندار فتوحات اور کامیابیاں اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ حضور ﷺ تاریخ انسانی کے سب سے عظیم سپہ سالار تھے۔ جو سپہ سالار کامیابی اور عظمت کا خواہش مند ہو اسے چاہیے کہ حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی تقلید کرے۔

جنگی اخلاق

ملاحظہ کیجئے اسلام کی انسانیت دوستی کا ایک اور جدید پہلو، اور اس پہلو کے لحاظ سے بھی، اسلامی تہذیب منفرد ہے، امن و سلامتی کی حالت میں، حسن خلق، نرمی، ضعیفوں سے رحم دلی، اقربا اور پڑوسیوں کے ساتھ رواداری کا مظاہرہ ہر قوم کر سکتی ہے، جبکہ کمزوری اور ناطاقتی کی مجبورانہ زندگی گزار رہی ہو......... لیکن جنگ کی حالت میں لوگوں کیساتھ منصفانہ معاملہ کرنا، دشمنوں سے نرم سلوک کرنا بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کے ساتھ رحم دلی کا مظاہرہ کرنا، مغلوب لوگوں کے ساتھ نرمی اور رواداری کا برتاؤ کرنا، یہ ہر قوم کے بس کی بات نہیں ہے اور نہ ہر جرنل میں ان اوصاف کا پایا جانا ممکن ہے۔ خون دیکھنے سے خون کھول اٹھتا ہے اور دشمنی، کینہ اور غیض و غضب کو برانگیختہ کرتی ہے۔ کامیابی کا نشہ ایک فاتح کو مدہوش کر دیتا ہے اور ایسے حالات میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

وہ بدترین شقاوت قلبی اور انتقام کا مظاہرہ کر جاتا ہے۔ یہی اقوام کی تاریخ ہے خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید، بلکہ پوری انسانیت کی یہی تاریخ ہے، جب قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کا خون بہایا:

اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ط قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ط قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (المائدہ: ۲۷)

ترجمہ: ''جبکہ دونوں نے، کچھ نیازیں چڑھائیں تو ایک کی نیاز قبول ہوگئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی (قابیل) کہنے لگا میں تجھے قتل کردوں گا، اس (ہابیل) نے کہا خدا پرہیزگاروں ہی کی نیاز قبول کرتا ہے۔''

اس موقع (قوت وشوکت اور جنگ) پر تاریخ نے زندگی جاریہ کا تاج، صرف ہماری تہذیب کے قائدین کے سر پر رکھا ہے، خواہ وہ شہری اور فاتح ہوں یا حاکم ہوں، کیونکہ تمام تہذیبوں میں اسلام وہ واحد تہذیب ہے، جس کے اکابر نے سخت ترین جنگی حالات میں بھی، بلند ترین عادلانہ اور مشفقانہ انسانیت کا مظاہرہ کیا۔ خصوصاً ایسے مواقع پر جب حالات انسان کو خونریزی، ظلم اور انتقام پر برانگیختہ کرتے ہیں۔ خدا شاہد ہے کہ مسلمانوں کے یہ جنگی اخلاق، اگر نا قابل انکار تاریخی واقعات سے ثابت نہ ہوتے تو میں ان تمام واقعات کو ایک افسانہ سمجھتا جس کی کوئی حقیقت اس زمین پر نہیں ہوا کرتی۔

تہذیب اسلامی کی برکت:

جب اسلام دنیا میں آیا تو لوگوں کی حالت ایسی تھی جیسی کہ جنگل میں جانوروں کی ہوتی ہے کہ ''قوی، بے تکلف، ضعیف کو قتل کر دیتا اور ایک مسلح، بغیر کسی جھجک کے، ایک غیر مسلح آدمی کو لوٹ لیتا ہے۔ تمام ادیان وشرائع اور تمام اقوام، قبائل کے ہاں جنگ گویا زندگی کی روزمرہ معمولات میں سے تھی، جو کسی قید سے مقید نہ تھی اور نہ کسی حد میں محدود تھی۔ جائز جنگ اور ناجائز اور ظالمانہ جنگ کے درمیان کوئی فرق وامتیاز نہ تھا جو قوم بھی اس بات کی قدرت پاتی کہ دوسری قوم سے اس کی زمین چھین لے، اس کی عورتوں کو باندیاں اور اس کے مردوں کو غلام بنالے اور اس کے اپنے عقائد وخیالات کو ترک کر دینے پر مجبور کرے، وہ بغیر کسی جھجک اور احساس گناہ کے یہ سب کچھ کر گزرتی لیکن ہماری تہذیب نے یہ بات گوارا نہ کی کہ دنیا میں یہ ظالمانہ طرز عمل برقرار رہے، جس نے انسانیت کو حیوانیت خالصہ کی سطح تک گرا دیا تھا، بلکہ یہ اعلان کیا کہ اقوام کے درمیان باہمی تعلقات کے باب میں اصل چیز تعارف اور تعاون ہے (نہ کہ نفرت اور حرب):

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ط

ترجمہ: ''لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کرو اور خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔'' (الحجرات: ۱۳)

اس بنا پر صلح وآشتی اور امن وسلامتی، اقوام کے درمیان تعلق کا ایک طبعی اور فطری علاقہ ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً ص

ترجمہ: ''اے ایمان والو داخل ہو جاؤ، صلح وسلامتی (اسلام) میں پورے کے پورے۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سامان طاقت کی فراہمی کس لیے ضروری ہے؟

اب جو قوم امن وسلامتی سے رہنا ہی نہ چاہے اور دوسری قوم سے جنگ اور اس پر تعدی کے بغیر اسے چین ہی نہ ملتا ہو، اس مقصد کے لیے ہر گھڑی آمادۂ پیکار رہتی ہو، تو اس دوسری قوم کا بھی فرض ہے کہ وہ اس جارحیت کے دفاع کے لیے تیار رہے، کیونکہ اگر کوئی قوم، بروقت دفاع کے لیے مستعد اور تیار نہ ہو تو جارحیت پسند قوم حرب وتعدی کو فتح یاب کرنے میں نہایت تیزی سے کام لیتی ہے:

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ

ترجمہ: ''اور جہاں تک ہو سکے قوت وطاقت فراہم کر کے اور گھوڑوں کی تیاری سے، ان کے لیے مستعد رہو، کہ اس سے خدا کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں پر ہیبت بیٹھی رہے۔''

اب اگر جارحیت پسند قوم اپنے جارحانہ عزائم سے باز آ جاتی ہے، اور ''مسلح صلح پسندی'' سے ڈر جاتی ہے، تو پہلی قوم کو بھی چاہیے کہ وہ بے تکلف، مصالحانہ ہاتھ مصالح کے لیے بڑھائے، بلکہ اسے چاہیے کہ وہ صلح کے لیے بہت زیادہ خواہشمندی کا اظہار کرتے:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ط

ترجمہ: ''اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہو جائیں تو تم بھی اس کی طرف ہو جاؤ اور خدا پر بھروسہ رکھو۔''

لیکن جارحیت پسند اگر لڑنا ہی چاہیں تو پھر قوت کا دفاع قوت ہی سے ہو سکتا ہے، لوہا لوہے کو کاٹتا ہے: وَقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم (بقرہ: ۱۹۰) اور اللہ کے راستے میں، ان لوگوں سے قتال کرو جو تم سے لڑتے ہیں۔''

جنگ کے مقاصد:

یہ ہے وہ موقف جس کی بنا پر اسلامی تہذیب کے اصول ومبادی مال غنیمت لوٹ مار اور اقوام کو ذلیل کرنے کی خاطر جنگ کی اجازت ہرگز نہیں دیتے، کیونکہ اس کے اصول ایسی لڑائیوں کو قطعاً حرام قرار دیتے ہیں اور اس کی نظر میں صرف وہی جنگ جائز ہے، جو ان مقاصد میں سے کسی ایک کے لیے لڑی جائے۔

۱۔ قوم کے اخلاق اور نظریات کے دفاع کی خاطر۔

۲۔ قوم کی حریت، استقلال اور سلامتی کے بچاؤ کے لیے: وقاتلوا ھم حتی لاتکون فتنة ویکون الدین کله لله (حج: ۴)۔
''اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔''

اس شکل میں اعلان جنگ کرنے والے قوم کے لیے محض اپنے عقیدے کی حریت مطلوب نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ عقائد کی حریت وآزادی کی ضمانت بھی دے اور سارے مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت کی بھی ضامن ہو:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ط

ترجمہ: ''اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو صومعے، گرجے عبادت خانے، مسجدیں جن میں خدا کا بکثرت ذکر کیا جاتا ہے، ڈھائی جا چکی ہوتیں۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ایک اور درخشندہ پہلو:

اسلامی تہذیب کے تابناک اصول کا یہ ایک انتہائی درخشندہ پہلو بھی ہے کہ اس نے جس طرح ہم پر یہ فریضہ عائد کیا ہے کہ ہم اپنی عزت وحریت پر کوئی آنچ نہ آنے دیں اسی طرح ہمارے لیے یہ بھی لازم قرار دیا ہے کہ دوسرے کمزور اور مظلوم گروہوں اور طبقوں کی دستگیری کرتے ہوئے ان پر کیے جانے والے مظالم کے مقابلہ میں، ان کا دفاع کریں:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا ج وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ج وَّاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا (نساء:۷۵)

ترجمہ: ''اور تم کو کیا ہوا ہے کہ خدا کی راہ میں اور ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کو ظلم وتشدد سے نجات دلانے کی خاطر نہیں لڑتے، جو دعائیں کیا کرتے ہیں کہ اے پروردگار، ہم کو اس شہر سے جس کے رہنے والے ظالم ہیں نکال کر کہیں اور لے جا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا حامی بنا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا مددگار مقرر فرما۔''

ان اخلاقی پابندیوں میں جکڑی ہوئی، جنگ ہی وہ جنگ ہو سکتی ہے جو عقیدے اور آزادیٔ فکر وعمل اور امن وسلامتی پر ہونے والے جبر وتشدد کے دفعیہ کے لیے میدان کا رخ کرے، اور یہی جنگ اسلام میں جائز ہے اور اس مقصد کے لیے لڑنے والا ہی اللہ کا تقرب حاصل کرتا ہے اور اسے جنت ملتی ہے اور اسی کے متعلق تہذیب اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے یہ جہاد فی سبیل اللہ ہے اور اس کے سوا جس قدر جنگیں ہیں وہ طغیان اور فساد فی الارض کے لیے ہوتی ہیں۔ اسلامی تہذیب میں مشروع لڑائی اور اقوام عالم کے ہاں معروف لڑائیوں کے درمیان جو فرق ہے اسے اس آیت کے اندر خوبی سے واضح کیا گیا ہے:

اَلَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ج وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطٰنِ ج إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيفًا (النساء:۷۶)

ترجمہ: ''جو مومن ہیں وہ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں، سو تم شیطان کے مددگاروں سے لڑو یقین رکھو کہ شیطان کا داؤ بودا ہوتا ہے۔''

جنگ کس سے اور کس حد تک؟:

اسلامی تہذیب اعلان جنگ اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے کرتی ہے اور اس تجویز کردہ نظام زندگی کے قیام کے لیے کرتی ہے۔ یہ نظام، نظام حق ہے۔ یہی خیر ہے اور یہی شریفانہ انداز ہے، اس کے بالمقابل دوسرے لوگ اعلان جنگ دوسروں پر تعدی، شیطنت اور فساد فی الارض کی خاطر کرتے ہیں اور شیطنت نام ہے شر، سرکشی اور فساد کا۔ تو جب ہماری تہذیب کی جنگوں کی یہ غایت اور اس کا یہ مطلوب ہے تو حق کی راہ میں خیر کی خاطر، اس کی جنگ باطل اور شر کا ذریعہ ہرگز نہیں بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ کے باب میں ہماری تہذیب کے اصول ومبادی میں سے ایک یہ ہے کہ صرف اسی سے لڑا جائے جو ہم سے لڑتا ہے اور جو ہم پر زیادتی کرتا ہے: **فمن اعتدی علیکم فاعتدوا بمثل ما اعتدی علیکم** (بقرہ:۱۹۴) ''جب تم پر کوئی زیادتی کرے تو اس کے جواب میں تمہارا ردعمل اسی قدر ہونا چاہیے جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہے۔'' لہٰذا اگر ہم ان حدود سے تجاوز کرتے ہوئے ان لوگوں سے لڑنے لگیں جو لڑنا نہیں چاہتے، اور ان کو ایذا پہنچائیں جو ایذا کے درپے نہیں، تو ہم اس جنگ انسانیت کو، اس کے اعلیٰ اغراض ومقاصد سے منحرف کردینے کی بنا پر، زیادتی کرنے والے قرار پائیں گے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے: **وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان**

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اللہ لا یحب المعتدین (البقرہ:۱۹۰) "اور جو لوگ تم سے لڑتے ہیں تم بھی خدا کی راہ میں ان سے لڑو، مگر زیادتی نہ کرو کہ خدا زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا"۔ اور دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

(شوریٰ: ۴۱-۴۲)

ترجمہ: "اور جس پر ظلم ہوا اگر وہ اس کے بعد انتقام لے تو ایسے لوگوں پر کچھ الزام نہیں۔ الزام تو ان لوگوں پر ہے جو انسان پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد پھیلاتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔"

لہٰذا جب جنگ کی آگ بھڑک اٹھے تو ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنے اصول جنگ کو ہر وقت ملحوظ خاطر رکھیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم سنگدلی، فساد اور تباہی و بربادی کے باعث بن جائیں۔ ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیے، کیونکہ خالص اللہ کے راستے میں لڑی جانے والی جنگ انسانیت کو، اپنے وسائل و ذرائع کے لحاظ سے بھی، ہمیشہ انسانیت کی حدود کے اندر رہنا چاہیے وہ جنگ بے انتہا سخت اور شدید کیوں نہ ہو۔

جنگ سے متعلق چند ہدایات:

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جنگ کے بارے میں جو ہدایات دی ہیں ایسی ہدایات ہیں جو کسی بھی دوسری تہذیب کی تاریخ میں نہیں ملتیں۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جیش اسامہ کو یہ ہدایات دیں:

"لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر مثلہ نہ بنانا، چھوٹے بچوں کو قتل نہ کرنا، ایسے بوڑھوں کو قتل نہ کرنا جو لڑ نہیں سکتے، عورتوں کو کچھ نہ کہنا، باغات نہ کاٹنا، نہ آگ لگانا، کسی پھل دار درخت کو نہ کاٹنا، کھانے بھر کی ضرورت سے زائد کسی جانور کو ذبح نہ کرنا، تم لوگوں کا گزر ایسے لوگوں پر ہوگا جنہوں نے اپنے آپ کو گرجوں میں، عبادت کے لیے وقف کر رکھا ہے، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا اور وہ کام کرنے دینا جس کے لیے وہ یکسو ہو گئے ہیں۔"

آپ نے دیکھ لیا کہ خالص "اسلامی جنگ" جو شر و فساد اور ظلم کے لیے نہیں بلکہ صرف اللہ کے راستے میں لڑی جاتی ہے اس کے کیا خدوخال ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ وہ ہمیشہ ایسے اصول و مبادی کی پابند رہتی ہے جو انسانیت کے لیے باعث رحمت ہیں، یہاں تک کہ وہ دو نتائج میں سے کسی ایک پر پہنچ جاتی ہے یا صلح ہو جاتی ہے یا فتح نصیب ہو جاتی ہے، اگر صلح کی جائے تو اس میں معاہدات کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے اور فریقین کے مابین کیے جانے والے معاہدات کو پورا کرتے رہنا لازمی ہوتا ہے، کیونکہ وہ دراصل اللہ سے کیا ہوا عہد ہوتا ہے:

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ

ترجمہ: "اور جب خدا سے عہد کرو تو اس کو پورا کرو، اور جب پکی قسمیں کھاؤ تو ان کو مت توڑو کہ تم تو اپنا ضامن مقرر کر چکے ہو۔"

اور اگر فتح نصیب ہو تو وہ ایک ایسی جماعت کی فتح ہے، جس نے محض اللہ کے لیے تندہی دکھائی، اس کے افراد اللہ کی راہ میں شہید ہوئے، ایسی جماعت فتح کے بعد وہی اقدامات کرتی ہے جن سے زمین میں نظام حق کی جڑیں مضبوط ہوں اور لوگوں کے درمیان ہر قسم کے فساد اور تعدی کا سدباب کرتی ہے:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ

ترجمہ: "وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں تو نماز قائم کریں، زکوۃ دیں، نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں اور تمام امور کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

یہ ہیں وہ حدود جو اسلامی تہذیب نے فتح کے بعد اپنے فاتح کی سرگرمیوں کے لیے مقرر کیے ہیں یعنی بلند روحانیت، اجتماعی انصاف، نیکی اور رفاہ عامہ کے کاموں میں باہمی تعاون اور سرزمین پر شر و فساد سے پیہم مقابلہ .... یہ ہیں ہماری تہذیب کے جنگی اصول و مبادی، اور یہ ہیں ہمارے جنگی اخلاق جنہیں سمیٹ کر صرف تین لفظوں میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ "انصاف، رحم اور وفا عہد۔"

غزوات پر ایک نظر

نبی ﷺ کے غزوات، سرایا اور فوجی مہمات پر ایک نظر ڈالنے کے بعد کوئی بھی شخص جو جنگ کے ماحول، پس منظر و پیش منظر اور آثار و نتائج کا علم رکھتا ہو یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ نبی ﷺ دنیا کے سب سے بڑے اور باکمال فوجی کمانڈر تھے۔ آپ ﷺ کی سوجھ بوجھ سب سے زیادہ درست اور آپ ﷺ کی فراست اور بیدار مغزی سب سے زیادہ گہری تھی۔ آپ ﷺ جس طرح نبوت و رسالت کے اوصاف میں سید الرسل اور اعظم الانبیاء تھے، اسی طرح فوجی قیادت کے وصف میں بھی آپ ﷺ یگانہ روزگار اور نادر عبقریت کے مالک تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے جو بھی معرکہ آرائی کی اس کے لیے ایسے حالات و جوہات کا انتخاب فرمایا جو حزم و تدبر اور حکمت و شجاعت کے عین مطابق تھے۔ کسی معرکے میں حکمت عملی، لشکر کی ترتیب اور حساس مراکز پر اس کی تعیناتی، موزوں ترین مقام جنگ کے انتخاب اور جنگی پلاننگ وغیرہ میں آپ ﷺ سے کبھی کوئی چوک نہیں ہوئی اور اسی لیے اس بنیاد پر آپ ﷺ کو کبھی کوئی زک نہیں اٹھانی پڑی، بلکہ ان تمام جنگی معاملات و مسائل کے سلسلے میں آپ ﷺ نے اپنے عملی اقدامات سے ثابت کر دیا کہ دنیا بڑے بڑے کمانڈروں کے تعلق سے جس طرح کی قیادت کا علم رکھتی ہے آپ ﷺ اس سے بہت کچھ مختلف ایک نرالی قسم کی کمانڈرانہ صلاحیت کے مالک تھے۔ جس کے ساتھ شکست کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ اس موقع پر یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ اُحد اور حنین میں جو کچھ پیش آیا اس کا سبب رسول اللہ ﷺ کی کسی حکمت عملی کی خامی نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے حنین میں کچھ افراد لشکر کی بعض کمزوریاں کارفرما تھیں اور اُحد میں آپ ﷺ کی نہایت اہم حکمت عملی اور لازمی ہدایات کو نہایت فیصلہ کن لمحات میں نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

پھر ان دونوں غزوات میں جب مسلمانوں کو زک اٹھانے کی نوبت آئی تو آپ ﷺ نے جس عبقریت کا مظاہرہ فرمایا وہ اپنی مثال آپ تھی۔ آپ ﷺ دشمن کے مد مقابل ڈٹے رہے اور اپنی نادرہ روزگار حکمت عملی سے اسے یا تو اس کے مقصد میں ناکام بنا دیا ___ جیسا کہ اُحد میں ہوا ___ یا جنگ کا پانسہ اس طرح پلٹ دیا کہ مسلمانوں کی شکست، فتح میں تبدیل ہو گئی ___ جیسا کہ حنین میں ہوا ___ حالانکہ احد جیسی خطرناک صورت حال اور حنین جیسی بے لگام بھگدڑ سپہ سالاروں کی قوتِ فیصلہ سلب کر لیتی ہے اور ان کے اعصاب پر اتنا بدترین اثر ڈالتی ہے کہ انہیں اپنے بچاؤ کے علاوہ اور کوئی فکر نہیں رہ جاتی۔

یہ گفتگو تو ان غزوات کے خالص فوجی اور جنگی پہلو سے تھی۔ باقی رہے دوسرے گوشے تو وہ بھی بے حد اہم ہیں۔ آپ ﷺ نے ان غزوات کے ذریعے امن و امان قائم کیا، فتنے کی آگ بجھائی اسلام و بت پرستی کی کشمکش میں دشمن کی شوکت توڑ کر رکھ دی اور انہیں اسلامی دعوت و تبلیغ کی راہ آزاد چھوڑنے اور مصالحت کرنے پر مجبور کر دیا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ان جنگوں کی بدولت یہ بھی معلوم کر لیا کہ آپ ﷺ کا ساتھ دینے والوں میں کون سے لوگ مخلص ہیں اور کون سے لوگ منافق، جو نہاں خانہ دل میں غدر و خیانت کے جذبات چھپائے ہوئے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پھر آپ ﷺ نے محاذ آرائی کے عملی نمونوں کے ذریعے مسلمان کمانڈروں کی ایک زبردست جماعت بھی تیار کردی جنھوں نے آپ ﷺ کے بعد عراق وشام کے میدانوں میں فارس وروم سے ٹکر لی، اور جنگی پلاننگ اور تکنیک میں ان کے بڑے بڑے کمانڈروں کو مات دے کر انہیں ان کے مکانات وسرزمین سے، اموال وباغات سے، چشموں اور کھیتوں سے، آرام دہ اور باعزت مقام سے اور مزے دار نعمتوں سے نکال باہر کیا۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ان غزوات کی بدولت مسلمانوں کے لیے رہائش، کھیتی، پیشے اور کام کا انتظام فرمایا۔ بے خانماں اور محتاج پناہ گزینوں کے مسائل حل فرمائے۔ ہتھیار، گھوڑے، ساز وسامان اور اخراجات جنگ مہیا کیے اور یہ سب کچھ اللہ کے بندوں پر ذرہ برابر ظلم وزیادتی اور جور وجفا کیے بغیر حاصل کیا۔

حاصل کلام:

آپ ﷺ نے ان اسباب ووجوہ اور اغراض ومقاصد کو بھی تبدیل کرڈالا جن کے لیے دور جاہلیت میں جنگ کے شعلے بھڑکا کرتے تھے، یعنی دورِ جاہلیت میں جنگ نام کی تھی لوٹ مار اور قتل وغارت گری کا، ظلم وزیادتی اور انتقام وتشدد کا، کمزوروں کو کچلنے، آبادیاں ویران کرنے اور عمارتیں ڈھانے کا، عورتوں کی بے حرمتی کرنے اور بوڑھوں، بچوں اور بچیوں کے ساتھ سنگدلی سے پیش آنے کا، کھیتی باڑی اور جانوروں کو ہلاک کرنے اور زمین میں تباہی وفساد مچانے کا۔ مگر اسلام نے اس جنگ کی روح تبدیل کرکے اسے ایک مقدس جہاد میں بدل دیا۔ جسے نہایت موزوں اور معقول اسباب کے تحت شروع کیا جاتا ہے اور اس کے ذریعے ایسے شریفانہ مقاصد اور بلند پایہ اغراض حاصل کیے جاتے ہیں جنھیں ہر زمانے اور ہر ملک میں انسانی معاشرہ کے لیے باعثِ اعزاز تسلیم کیا گیا ہے۔ کیونکہ اب جنگ کا مفہوم یہ ہوگیا تھا کہ انسان کو قہر وظلم کے نظام سے نکال کر عدل وانصاف کے نظام میں لانے کی مسلح جدوجہد کی جائے۔ یعنی ایک ایسے نظام کو جس میں طاقتور کمزور کو کھا رہا ہو، اُلٹ کر ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں طاقتور کمزور ہو جائے جب تک کہ اس سے کمزور کا حق لے نہ لیا جائے۔ اسی طرح اب جنگ کا معنی یہ ہوگیا تھا کہ ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کو نجات دلائی جائے جو دعائیں کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں۔ اور ہمارے لیے اپنے پاس سے ولی بنا، اور اپنے پاس سے مددگار بنا۔ نیز اس جنگ کا معنی یہ ہوگیا کہ اللہ کی زمین کو غدر وخیانت، ظلم وستم اور بدی وگناہ سے پاک کرکے اس کی جگہ امن وامان، رافت ورحمت، حقوق رسانی اور مروت وانسانیت کا نظم بحال کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے جنگ کے لیے شریفانہ ضوابط بھی مقرر فرمائے اور اپنے فوجیوں اور کمانڈروں پر ان کی پابندی لازمی قرار دیتے ہوئے کسی حال میں ان سے باہر جانے کی اجازت نہ دی۔ حضرت سلیمان بن بریدہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی شخص کو کسی لشکر یا سریہ کا امیر مقرر فرماتے تو اسے خاص اس کے اپنے نفس کے بارے میں اللہ عزوجل کے تقویٰ کی اور اس کے مسلمان ساتھیوں کے بارے میں خیر کی وصیت فرماتے۔ پھر فرماتے: ''اللہ کے نام سے اللہ کی راہ میں غزوہ کرو۔ جس نے اللہ کے ساتھ کفر کیا ان سے لڑائی کرو۔ غزوہ کرو، خیانت نہ کرو، بدعہدی نہ کرو، ناک کان وغیرہ نہ کاٹو، کسی بچے کو قتل نہ کرو۔''

اسی طرح آپ ﷺ آسانی برتنے کا حکم دیتے اور فرماتے: ''آسانی کرو، سختی نہ کرو۔ لوگوں کو سکون دلاؤ، متنفر نہ کرو۔

جب رات میں آپ ﷺ کسی قوم کے پاس پہنچتے تو صبح ہونے سے پہلے چھاپہ نہ مارتے۔ نیز آپ ﷺ نے کسی کو آگ میں جلانے سے نہایت سختی کے ساتھ منع کیا۔ اسی طرح باندھ کر قتل کرنے اور عورتوں کو مارنے اور انہیں قتل کرنے سے بھی منع کیا اور لوٹ مار سے روکا۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ لوٹ کا مال مردار کی طرح ہی حرام ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے کھیتی باڑی تباہ کرنے، جانور ہلاک کرنے اور درخت کاٹنے سے منع فرمایا، سوائے اس صورت کے کہ اس کی سخت ضرورت آن پڑے اور درخت کاٹے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہو۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ''کسی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

زخمی پر حملہ نہ کرو کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کرو، اور کسی قیدی کو قتل نہ کرو۔" آپ ﷺ نے یہ سنت بھی جاری فرمائی کہ سفیر کو قتل نہ کیا جائے۔ نیز آپ ﷺ نے معاہدین (غیر مسلم شہریوں) کے قتل سے بھی نہایت سختی سے روکا یہاں تک کہ فرمایا: "جو شخص کسی معاہدہ کو قتل کرے گا وہ جنت کی خوشبو نہیں پائے گا۔ حالانکہ اس کی خوشبو چالیس سال کے فاصلے سے پائی جاتی ہے۔"

یہ اور اس طرح کے دوسرے بلند پایہ قواعد وضوابط تھے جن کی بدولت جنگ کامل جاہلیت کی گندگیوں سے پاک وصاف ہو کر مقدس جہاد میں تبدیل ہو گیا۔

حضور ﷺ بحیثیت معلم انسانیت

ارشاد نبوی ہے:

انما بعثت معلما مجھے تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

ترجمہ: بے شک اللہ نے مومنین پر احسان کیا کہ انہیں میں سے ان میں ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے ہماری آیات تلاوت کرتا ہے۔ انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے جب کہ وہ قبل ازیں کھلی گمراہی میں تھے۔

آپ ﷺ کی تبلیغ ہی آپ ﷺ کی تعلیم ہے۔ جس چیز کی آپ ﷺ نے تعلیم دی وہ اسلام ہے اور ہم سب، بالواسطہ طور پر، آپ ﷺ کی تعلیم ہی کی بدولت مسلمان ہیں۔ آپ ﷺ کی تعلیم کا فیض قیامت تک جاری رہے گا۔

معلم کی حیثیت:

ایک معلم کے لیے سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ بھی معلم ہیں۔ وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے جہالت کے خلاف جہاد کیا اور علم کا عام کرنے کا جھنڈا اُٹھایا۔ صرف یہی نہیں بلکہ آپ ﷺ نے معلم کے لیے بہترین مرتبہ تجویز فرمایا:

العلماء ورثة الانبياء.

ترجمہ: "علماء وارثین انبیاء ہیں۔"

آپ ﷺ نے اپنی امت کے علماء کے احترام اور ان کے حقوق کا لحاظ رکھنے کا حکم دیا ہے۔ آنحضور ﷺ کے ارشادات سے معلمین کی عظمت کا پتہ چلتا ہے:

قال ليس من امتي من لم يوقفر كبيرنا، ويرحم صغيرنا ويعرف لعالمنا حقه.

ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ شخص میری امت میں سے نہیں جو ہمارے بڑوں کا احترام نہیں کرتا، ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور ہمارے عالم کا حق نہیں پہچانتا۔"

پھر آپ ﷺ نے یہ بھی وضاحت فرمائی کہ معلم کو تعلیم دیتے وقت اجر ملتا ہے جیسے کہ طالب علم کو خداوند کریم اجر عنایت کرتے ہیں۔ چونکہ علم پھیلانا کارِ خداوندی ہے اس لیے علم کا حصول اور اس کی نشر واشاعت عند اللہ ماجور ہونے کا سبب ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قال رسول الله: العالم و المتعلم شریکان فی الاجر.

ترجمہ: "رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: معلم اور متعلم دونوں اجر میں شریک ہیں۔"

وقال: معلم الخیر یستغفرلہ کل شئ حتی الحیتان فی البحار.

ترجمہ: "آپ ﷺ نے فرمایا: اچھی بات سکھانے والا ایسا شخص ہے جس کے لیے ہر شے طلب مغفرت کرتی ہے حتی کہ سمندروں کی مچھلیاں بھی۔"

عن أمامۃ الباھلی قال: ذکر لرسول اللہ ﷺ رجلان احدھما عابد والاخر عالم. فقال رسول اللہ ﷺ: فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم ثم قال رسول اللہ ﷺ: ان اللہ وملئکتہ وأھل السموت والارضین حتی النملۃ فی جحرھا وحتی الحوت لیصلون علی معلم الناس الخیر.

ترجمہ: "ابوامامہ باہلی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے دو آدمیوں کا ذکر کیا گیا جن میں سے ایک عابد تھا اور دوسرا عالم تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عالم عابد پر ایسی فضیلت رکھتا ہے جیسا کہ میں تم سے ادنیٰ پر فضیلت رکھتا ہوں۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یقیناً اللہ اور اس کے فرشتے اور آسمان وزمین کی ساری مخلوقات یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنے سوراخوں میں اور مچھلیاں اس کے لیے دعائے خیر کرتی ہیں جو لوگوں کو بھلائی سکھاتا ہے۔"

آنحضرت ﷺ نے اپنی شخصیت کے لیے معلم کے لقب کو زیادہ پسند فرمایا اور اپنی بعثت کا مقصود معلم ہونا قرار دیا۔

عن عبداللہ بن عمرو قال خرج رسول اللہ ذات یوم من بعض حجرہ، فدخل المسجد، فاذاھو بحلقتین احدا ھما یقرون القرآن ویدعون الیہ ، والاکری یتعلمون ویعلمون، فقال النبی: "کل علی خیر، ھؤلاء یقرء ون القرآن ویدعون اللہ، فان شاء اعطاھم وان شاء منھم، وھؤلاء یتعلمون ویعلمون وانما بعثت معلما ثم جلس معھم.

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ دو مجلسوں میں سے گزرے جو مسجد میں منعقد ہوئی تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: دونوں مجلسیں بھلائی پر ہیں لیکن ان میں سے ایک دوسری سے بہتر ہے ان دونوں میں سے ایک عبادت میں مصروف ہے، اللہ سے دعا کر رہی ہے اور اس سے اپنی خواہش و رغبت کا اظہار کر رہی ہے پس اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو انہیں عطا کر دیں۔ چاہیں تو محروم رکھیں اور دوسرے لوگ دینی بصیرت حاصل کر رہے ہیں اور جاہلوں کو علم سکھا رہے ہیں لہٰذا یہ لوگ بہتر ہیں اور میں بھی معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں (یہ کہہ کر) آپ ﷺ بھی ان میں بیٹھ گئے۔"

حضور ﷺ کے ان تمام ارشادات سے معلم کے بلند مرتبے کا تعین ہوتا ہے اور اسلام کے نقطۂ نظر کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔

متعلم کی حیثیت:

علم اگر اپنی ذات میں ایک فضیلت ہے پہچانے والا معزز ہے تو اسے حاصل کرنے والا بھی صاحب فضیلت وعظمت ہونا چاہیے اور حصول علم کی جدوجہد بھی قابل فکر وستائش طرز عمل قرار پانا چاہیے۔ یہ بھی عظمت اسلام ہے کہ اس نے انسانی معاشرے کے لیے منفعت بخش سعی وجہد کو ماجور قرار

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دیا۔ طلب علم تو بطریق اولی اس کے تحت آتا ہے۔

عن ابی امامۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: من غدا الی المسجد لایرید الا ان یتعلم خیرا، ویعلمہ کان لہ کاجر حاج تاما حج وفی روایۃ کان بمنزلۃ المجاھد فی سبیل اللہ.

ترجمہ: ''ابوامامہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص مسجد میں اس کے سوا کسی ارادے سے نہیں جاتا کہ وہاں سے بھلائی سیکھے یا سکھائے تو اسے ایک حج کا اجر ملے گا جس نے اپنا حج مکمل کیا۔ ایک روایت میں ہے کہ اس کی حیثیت ایک مجاہد کی ہے جو اللہ کی راہ میں (جہاد کر رہا ہے۔)''

عن واثلۃ بن الاسقع قال: قال رسول اللہ ﷺ: من طلب علما فادر کہ کتب اللہ لہ کفلین من الاجر ومن طلب علما فلم یدر کہ کتب اللہ لہ کفلا من الاجر.

ترجمہ: ''واثلہ بن اسقع سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے علم طلب کیا اور اسے پا لیا تو اسے دوہرا اجر ہے اور جس نے طلب علم کی اور اسے حاصل نہ کر سکا اسے بھی ایک اجر ملے گا۔''

وقال؛ اذاجاء الموت طالب العلم وھو علی حالہ مات شھیدا.

ترجمہ: ''اور فرمایا: جب طالب علم کو حصول علم میں موت آجائے تو وہ شہادت کی موت مرے گا۔''

وقال: فضل العلم خیر من فضل العبادۃ، وملاک الدین الورع.

ترجمہ: ''فرمایا: علم کی فضیلت عبادت کی فضیلت سے بہتر ہے اور دین کی روح تقوی ہے۔''

آخری حدیث سے دراصل علم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ بالواسطہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ علم عبادت پر فضیلت رکھتا ہے کہ علم حاصل کرنے والا عبادت کرنے والے پر فوقیت رکھتا ہے۔ النبی المعلم نے طالبان علم کی حیثیت کو جس طرح واضح فرمایا ہے وہ مندرجہ بالا بیانات سے ظاہر ہو گئی ہوگی۔ ہم آپ ﷺ کے دو مزید اقوال نقل کرتے ہیں، ان سے بھی اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے:

عن ابی ھریرہ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: من سلک طریقا یلتمس فیہ علما سھل اللہ لہ بہ طریقا الی الجنۃ وما اجتمع قوم فی بیت من بیوت اللہ یتلون کتب اللہ ویتدار سونہ بینھم الا حفتھم الملائکۃ نزلت علیھم السکینۃ وغشیتھم الرحمۃ و ذکرھم اللہ فیمن عندہ ومن أبطابہ عملہ لم یسرع بہ نسبہ.

ترجمہ: ''ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس راہ پر چلتا ہے جس سے علم حاصل ہوتا ہے تو اللہ اس کے لیے جنت کی راہ آسان بناتا ہے اور کسی خانہ خدا میں بھی لوگ تلاوتِ کتاب اور مذاکرہ (علم) کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں تو ان پر سکون طاری کیا جاتا ہے۔ اللہ کی رحمت انہیں ڈھانپ لیتی ہے۔ فرشتے ان پر سایہ فگن ہوتے ہیں اور اللہ اپنے ہاں ان کا ذکر کرتا ہے اور جس کے عمل نے اسے پیچھے رکھا اس کا نسب اسے آگے نہیں لے جائے گا۔''

وقال صفوان بن عسال: اتیت النبی ﷺ وھو فی المسجد متکی علی بردلہ احمر فقلت لہ یا رسول اللہ ﷺ: انی جئت اطلب العلم فقال: مرحبا بطالب العلم ان

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

طالب العلم لتحفه الملائكة باجنحتها: ثم يركب بعضهم بعضا حتى يبلغوا السماء الدنيا من محبتهم لما طلب.

ترجمہ: ''صفوان بن عسال کہتے ہیں: میں نبی ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ مسجد میں سرخ چادر کے سہارے تشریف فرما تھے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں علم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: طالب علم کے لئے خوش آمدید ہے۔ طالب علم پر فرشتے اپنے پروں سے سایہ فگن ہوتے ہیں۔ پھر ایک دوسرے پر سوار ہوتے ہیں حتی کہ آسمان دنیا پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہ سب طالب علم کی محبت کے سبب ہوتا ہے۔''

ایک روایت میں ہے:

من حبهم لما طلب.

ترجمہ: ''یہ ان کی محبت کا اظہار ہے اس چیز کے لئے جس کا وہ طالب ہے۔''

رسول کریم ﷺ نے صرف معلمین و متعلمین کے فضائل پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی وفات سے پہلے اس امر کا اطمینان کر لیا کہ سلسلۂ تعلیم جاری رہے چنانچہ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو تعلیم و تعلم کے بارے میں خصوصی وصیت کی اور ہدایات فرمائیں تاکہ چشمۂ علم جاری رہے اور امت مسلمہ علم کی نشر و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہے۔ محدثین نے اپنی کتابوں کے ابواب العلم میں ''وصیت الرسول لطلب العلم'' کے مستقل باب باندھے ہیں۔ ہم ذیل میں آپ ﷺ کے ارشادات نقل کیے دیتے ہیں۔ ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ تحریک علم کو کس طرح پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے تھے اور آپ ﷺ کو اس امر سے کتنی دلچسپی تھی کہ آپ ﷺ کی امت میں اشاعت علم کے مستقل حلقے قائم ہوں اور طلبہ دور دور سے حصول علم کے لیے کشاں کشاں آئیں۔

عن ابى هارون العبدى قال: كنا اذا اتينا ابا سعيد الخدرى قال: مرحباً بوصية رسول الله ﷺ قال قلنا: وما وصية رسول الله ﷺ قال: قال لنا رسول الله: انه سيأتى بعدى قوم يسئالونكم الحديث عنى فاذا جاء وكم فالطفوا بهم وحدثوهم.

ترجمہ: ''ابو ہارون عبدی کہتے ہیں کہ ہم جب ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو وہ کہنے لگے: حضور ﷺ کی وصیت کے مطابق تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔ ہم نے کہا حضور ﷺ کی کیا وصیت ہے؟ کہنے لگے ہمیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے بعد تمہارے پاس میری احادیث پوچھنے کے لیے لوگ آئیں گے۔ پس جب وہ تمہارے پاس آئیں تو ان سے لطف و شفقت سے پیش آنا اور انہیں حدیثیں بتانا۔''

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

انه اذا راى الشباب قال مرحبا بوصية رسول الله ﷺ اوصانا رسول الله ان نوسع لكم فى المجلس وان نفقهكم فانكم خلوفنا واهل الحديث بعدنا.

ترجمہ: ''جب وہ نوجوانوں کو دیکھتے تو حضور ﷺ کی وصیت کے مطابق انہیں مرحبا کہتے اور کہتے ہمیں رسول اللہ ﷺ نے وصیت کی ہے کہ تمہارے لیے مجلس میں کشادگی پیدا کریں اور تمہیں دین سکھائیں کیونکہ تم ہمارے بعد رہنے والے ہو اور ہمارے بعد حدیث کے امین ہوں گے۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ ﷺ قال: سیأتیکم اقوام یطلبون العلم فاذا رأیتموھم فقولوا لھم: مرحبا بوصیۃ رسول اللہ ﷺ وافتوھم.

ترجمہ: ''ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ فرماتے: تمہارے پاس لوگ طلب علم کے لیے آئیں گے جب تم انہیں دیکھو تو انہیں کہو: حضور ﷺ کی وصیت کے مطابق تمہیں خوش آمدید ہے اور انہیں بات سمجھاؤ۔''

ایک اور روایت میں ہے:

انھم ای طلاب العلم سیاتونکم من أقطار الارض یتفقھون فی الدین فاذا جاء وکم فاستوصوا بھم خیرا.

ترجمہ: ''وہ یعنی طالب علم تمہارے پاس زمین کے گوشوں سے فہم دین حاصل کرنے کے لیے آئیں گے، جب وہ آئیں تو انہیں اچھی بات بتاؤ۔''

اب تک جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس سے علم کے بارے میں حضور ﷺ کا موقف پتہ چلتا ہے، علم کی اہمیت، معلمین و متعلمین کی فضیلت اشاعت علم کے لیے تیاری، سب وہ امور ہیں جن سے آنحضرت ﷺ کے مزاج کی عکاسی ہوتی ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حضور ﷺ کے طریقۂ تعلیم کی خصوصیات

۱۔ دلنشیں اندازِ تعلیم:

سب سے پہلی بات جو آپ ﷺ نے پیش نظر رکھی وہ یہ تھی کہ تعلیم و تعلم کو اس انداز سے جاری رکھا کہ متعلم اکتا نہ جائے۔ کیونکہ تعلیم میں جبر سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ تعلیم اگر باطنی انبساط اور ذہنی و روحانی فرحت کا باعث نہ بنے تو طبائع اس سے درست اثرات نہیں قبول کرتے۔ آپ ﷺ تعلیم کے دوران کوئی ہلکی پھلکی بات، لطیف مزاح سے طبیعتوں کی دلچسپی کو زندہ رکھتے اسی طرح اوقاتِ تعلیم کو کبھی بے ہنگم نہیں رکھا۔

عن ابن مسعود قال: كان النبي ﷺ يتخولنا بالموعظة في الايام كراهة السآمة علينا.

ترجمہ: ''ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں وعظ کرنے میں دنوں کا وقفہ کرتے۔ ہمارے اکتا جانے کے اندیشے سے۔''

صحیح بات بھی اگر کہی جائے اور اس میں کوئی وقفہ نہ ہو تو طبیعت اسے معمولی سمجھ کر حقیقی اثر نہیں قبول کرتی۔

۲۔ مخاطب کے معیار کو ملحوظ خاطر رکھنا:

حضور ﷺ کے طریق تعلیم میں دوسری اہم بات ''مخاطب کا معیار'' ہے۔ آپ ﷺ نے ہمیشہ اس بات کا لحاظ رکھا کہ سننے والے کی استعداد کیا ہے۔ ایک حقیقی معلم ہمیشہ افادیت کے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے جب کہ عام طریقہ یہ ہے کہ معلم اپنے علم و فضل، بھاری بھرکم اصطلاحات سے متعلمین کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے یا اس زعم میں مبتلا ہوتا ہے کہ وہ تو صرف اعلیٰ سطح پر بات کرتا ہے، عام سطح پر اس سے گفتگو نہیں ہوتی۔ آنجناب ﷺ کے طریق تعلیم میں ہمیں صاف طور پر نظر آتا ہے کہ وہ بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایک اچھے استاد کی طرح سامع کا نفسیاتی جائزہ لیتے ہیں، اس کے ذہنی پس منظر، اس کی استعداد اور اس کے مزاج کو سامنے رکھ کر گفتگو کرتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ ﷺ نے استعداد عقلی کو نظر انداز کیا ہو اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سامع نے آپ ﷺ کی بات کو نہ سمجھا ہو یا غلط سمجھا ہو۔ پیغمبر ﷺ کی بات کو غلط سمجھنے کے نتائج ویسے بھی بڑے تباہ کن ہو سکتے تھے۔ انفرادی تعلیم کے سلسلے میں جو کچھ سیر و احادیث کی کتابوں میں مروی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ بدوی اور شہری، پڑھے لکھے اور ان پڑھ اور عقل و تجربہ کے مختلف مدارج والے انسانوں سے مختلف طریقوں پر سلوک کرتے تھے۔ ہر شخص آپ ﷺ سے مطمئن ہوتا تھا۔ صرف یہی نہیں آپ ﷺ عمدہ مثالوں اور روزمرہ کے مشاہدات سے استدلال کرتے اور سامع کے ذہن میں ہر بات اترتی چلی جاتی۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں:

عن ابي هريرة قال: جاء رجل من بني فزاره الى النبي ﷺ فقال: ان امراتي ولدت غلاما اسود و إني انكرته فقال له النبي ﷺ: هل لك من ابل؟ قال نعم قال: فما الوانها؟ قال حمر قال هل فيها من اورق؟ قال ان فيها اورقا. قال؛ فأني ترى ذلك جائها قال يا رسول الله ﷺ عرق نزعها قال: وهذا لعله يكون نزعه عرق له.

ترجمہ: ''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: بنی فزارہ کا ایک شخص حضور ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میری بیوی نے سیاہ بچے کو جنم دیا اور میں پسند نہیں کرتا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تمہارے اونٹ ہیں؟ اس نے جواب دیا ہاں! آپ ﷺ نے پوچھا ان کے کیا رنگ ہیں؟ اس نے کہا سرخ! آپ ﷺ نے فرمایا ان میں کوئی سیاہی مائل بھی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آپ ﷺ نے فرمایا وہ کہاں سے آگیا؟ کہنے لگا ان کی اصل نسب میں
ہے؟ اس نے کہا ہاں سیاہی مائل بھی ہے۔
کہیں ہوگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ بھی کہیں اصل نسب کا اثر ہوگا۔"

عن امامة الباهلی ان فتی من قریش اتی النبی ﷺ فقال یا رسول اللہ ﷺ ائذن لی فی الزنا. فاقبل القوم علیه وزجروہ فقالوا: مه مه! فقال ادنه فدنا منه قریباً. فقال اتحبه لامک؟ قال لا واللہ جعلنی اللہ فداک. قال: ولا الناس یحبونه لامهاتهم. قال: افتحبه لابنتک؟ قال لا واللہ یا رسول اللہ ﷺ: جعلنی اللہ فداک. قال: ولا الناس یحبونه لبناتهم. ثم ذکر رسول اللہ ﷺ: اخته وعمته وخالته و فی کل ذلک یقول الفتی مقالة: لا واللہ یا رسول اللہ ﷺ جعلنی اللہ فداک. قال: فوضع یده علیه وقال اللهم اغفر ذنبه وطهر قلبه وحصن فرجه. قال الراوی فلم یکن بعد ذلک الفتی یلتفت الی شئ.

ترجمہ: "امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک قریشی نوجوان آنحضور ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا؟ حضور ﷺ مجھے زنا کی اجازت دیں! تمام لوگ اس پر جھپٹے، اسے سخت سست کہا اور اسے بات کرنے سے روکا۔ آپ ﷺ نے اسے قریب کیا۔ وہ آپ ﷺ کے قریب ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم اپنی والدہ کے لیے اسے پسند کرو گے؟ کہنے لگا اللہ مجھے آپ ﷺ پر قربان کرے، اللہ کی قسم ہرگز نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: لوگ بھی اپنی ماؤں کے لیے اسے ناپسند کرتے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اسے تم اپنی بیٹی کے لیے پسند کرو گے؟ کہنے لگا اللہ کی قسم ہرگز نہیں! میں آپ ﷺ پر قربان ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا لوگ بھی اپنی بیٹیوں کے لیے اسے ناپسند کرتے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے اس کی بہن، پھوپھی اور خالہ کا ذکر کیا اور ہر مرتبہ وہ مذکورہ جواب دہراتا۔ حضور ﷺ نے اس پر اپنا داہنا ہاتھ رکھا اور کہا: اے اللہ اس کے گناہ کو بخش دے، اس کے دل کو صاف کر دے اور اس کے قوائے جنسیہ کو محفوظ کر دے! راوی کہتے ہیں کہ اس نوجوان نے اس کے بعد کبھی کسی کی طرف التفات نہ کیا۔"

ان دو واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ مخاطب کی نفسیات اور ذہنی مرتبہ کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔ بات کرنے میں تو اس امر کا ملحوظ رکھنا اچھے معلم کے لیے کتنا ضروری ہے۔

Css Aspirants ebooks & Notes
Css Aspirants Forum
http://t.me/CssAspirantsForum
Rules of the group.
*No irrelevant text/pic islamic pic/videos

۳۔ مخاطب کی بولی/ لہجے میں بات کرنا:

The CSS Group does not hold any rights on shared the Books & Notes
This book/notes downloaded from the internet.

آپ ﷺ کے طریق تعلیم میں تیسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ آپ ﷺ مخاطب کی بولی اور ان کے لہجے میں بات کرتے۔ آج نظام تعلیم میں یہ متنازع مسئلہ ہے کہ تعلیم کس زبان میں ہونی چاہیے؟ یہ درست ہے کہ دوسری اقوام کی زبانیں سیکھنا بہت مفید ہے اور بعض علوم کو ان زبانوں میں حاصل کرنا بھی مناسب ہے۔ لیکن بنیادی تعلیم اس زبان میں ہونی چاہیے جس میں مخاطب زیادہ بہتر طریقے پر سمجھ سکتا ہے۔ عرب اگرچہ عربی زبان ہی میں بولتے تھے، لیکن ان کے مختلف قبائل اور علاقوں میں لہجوں (Dialects) کا اختلاف پایا جاتا تھا۔ آنحضور ﷺ سے علم حاصل کرنے کے لئے مختلف قبائل اور افراد آتے تو آپ ﷺ ان سے ان کے لہجے میں بات کرتے۔ خطیب بغدادی نے اپنی سند سے عاصم الاشعری کا قول نقل کیا کہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ کو مخصوص لہجے میں بات کرتے سنا:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

عن عاصم الاشعری رضی اللہ عنہ قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: لیس من امبر امصیام فی امسفر اراد لیس من البر الصیام فی السفر.

ترجمہ: "عاصم اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ الفاظ کہتے سنا۔ آپ ﷺ یہ کہنا چاہتے تھے کہ سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں ہے۔"

اشعریوں کی لغت میں لام کو میم سے تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے لہجے کو چھوڑ کر مخاطب کی لغت میں بات کی جس میں زیادہ اپنائیت معلوم ہوتی ہے۔ بلاشبہ اس سے مخاطب پر ایک خوشگوار اثر پڑتا ہے۔

۴۔ آہستہ اور تکرار سے بات کرنا:

جب آپ ﷺ گفتگو فرماتے تو آہستہ آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر بات کرتے تاکہ سامع پوری طرح مستفید ہو اور اگر ضرورت پڑتی تو آپ ﷺ بات کو دہراتے تاکہ سمجھنے میں کمی نہ رہ جائے۔ حضور ﷺ کے اس طریق کار کی حکمت سمجھ میں آتی ہے یعنی اگر معلم کے پیش نظر اپنی شخصیت کا رعب، اپنے علم کا دبدبہ اور اپنی بلند آواز اور وقار الکلام ہونے کا اظہار مقصود نہیں تو اسے وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ معلم سے اس وقت تک استفادہ ممکن نہیں جب تک ایک ایک لفظ نہ محفوظ ہو۔ حضور ﷺ سے یہی طریقہ منقول ہے:

عن أبی أمامة قال: کان رسول اللہ ﷺ اذا تکلم تکلم ثلاثا لکی یفهم عنه.

ترجمہ: "ابوامامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ جب بات کرتے تو تین مرتبہ دہراتے تاکہ اسے ٹھیک طرح سمجھ لیا جائے۔"

عن عروة رضی اللہ عنه عن عائشة رضی اللہ عنها قالت: اذا تکلم تکلم فصلا یبینه فیحفظه منه من سمعه.

ترجمہ: "عروۃ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب گفتگو کرتے تو درمیان میں وقفہ کرتے، بات کھول کر بیان کرتے تاکہ ان سے سننے والا محفوظ کر سکے۔"

عن عائشة رضی اللہ عنها انه کان لا یسرد الکلام کسردکم وفی روایة. انما کان حدیث رسول اللہ ﷺ فصلا، فهام تفهمه القلوب.

ترجمہ: "عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تمہاری طرح کلام کو مسجع بنانے میں نہیں لگے رہتے تھے بلکہ جب بات کرتے تو اتنا وقفہ دیتے کہ سننے والا حفظ کر سکے۔"

وفی روایة یحدث حدیثا لو عده العاد لاحصاره.

ترجمہ: "ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ بات کرتے اور اگر کوئی گننے والا گنتی کرے تو شمار کر سکے۔"

عن انس ان النبی ﷺ کان اذا تکلم بکلمة اعادها ثلاثا حتی تفهم عنه واذا اتی علی قوم فسلم علیهم سلم علیهم ثلاثا.

ترجمہ: "انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ جب گفتگو فرماتے تو تین مرتبہ دہراتے حتیٰ کہ سمجھ لیا جاتا اور کسی کے ہاں جاتے تو تین مرتبہ سلام کہتے۔"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ان احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے پیش نظر اصل بات یہ تھی کہ کسی طرح مسئلہ سمجھایا جا سکے۔ وہ خود بات کو دہرانے، مگر ٹھہر ٹھہر کر فرمانے۔ یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے سائل کی بات کو بڑی وضاحت کے ساتھ اور اس کے بیان سے زیادہ مفصل طور پر بیان کیا۔ جبکہ آپ ﷺ جس طرح فصیح اللسان اور قادر الکلام تھے، آپ ﷺ انتہائی پرشکوہ اور مرصع زبان استعمال کر سکتے تھے مگر آپ ﷺ نے اسے پسند نہیں فرمایا۔ آپ ﷺ نے اس کو بھی ناپسند فرمایا کہ کوئی شخص اپنے علم کو اپنے وقار کا ذریعہ بنا کر دوسروں پر مسلط ہونے یا دوسروں کا استحصال کرنے کی کوشش کرے علم صرف نفع بخشی وفیض رسانی ہے اور کچھ نہیں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں:

عن کعب بن مالک عن ابیه قال: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: من طلب العلم لیجاری به العلماء اولیماری به السفهاء اویصرف به وجوه الناس ادخله الله النار.

ترجمہ: ''کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے علم اس غرض سے حاصل کیا کہ وہ اس سے علماء پر فخر کرے یا جاہلوں سے جھگڑے یا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے تو اللہ اس کو آگ میں داخل کرے گا۔''

۵۔ آسان طریقہ تعلیم:

آپ ﷺ کے طریقہ تعلیم کی پانچویں خصوصیت ''آسانی'' ہے۔ آپ ﷺ نے ہمیشہ آسانی کو پسند فرمایا اور تشدید وتعقید کو ناپسند کیا۔ وہ مسلمانوں سے توقع رکھتے کہ جس طرح عزائم امور کو انجام دیتے ہیں اسی طرح رخصتوں سے بھی فائدہ اٹھائیں۔ وہ ہمیشہ اس امر کی تلقین کرتے جس میں یسرو آسانی کا پہلو غالب ہوتا۔ اگر کسی سے کوئی غلطی سرزد ہوتی، اسے زائل کرنے کے لیے خوبصورت طریقہ استعمال فرماتے۔ آپ ﷺ کی بصیرت اور آپ ﷺ کے ارشادات کا تتبع کیا جائے تو ایسے بے شمار اقوال وواقعات ملتے ہیں جن سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً:

عن ابی هریرۃ قال: دخل اعرابی المسجد فصلی رکعتین ثم قال اللهم ارحمنی ومحمدا ﷺ ولا ترحم معنا احدا فالتفت (الیه) النبی ﷺ فقال: لقد تحجرت واسعا! ثم لم یلبث ان بال فی المسجد! فاسرع الناس الیه فقال لهم رسول اللہ ﷺ: انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین اهریقوا علیه دلوا من ماء اوسجلا من ماء.

ترجمہ: ''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی مسجد میں آیا، اس نے دو رکعتیں ادا کیں۔ پھر کہنے لگا اللہ مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم فرما اور ہمارے ساتھ کسی اور پر نہ فرما۔ حضور ﷺ نے توجہ فرمائی اور کہا تو نے وسیع چیز کو تنگ کر دیا۔ پھر جلدی میں اس نے مسجد میں پیشاب کر دیا۔ لوگ اس کی طرف دوڑے تو آپ ﷺ نے فرمایا: تمہیں آسانی کرنے والا بنایا گیا ہے مشکل پسند نہیں اس پر پانی کا ایک ڈول بہا دو۔''

کوئی عام مذہبی آدمی ہوتا تو اس واقعہ پر کتنا ہنگامہ کرتا لیکن حضور ﷺ نے اسے کتنی خوش اسلوبی سے نبٹایا اور آپ ﷺ کی اس روش سے اس دیہاتی پر کتنا گہرا اثر پڑا ہوگا۔ اس کے مقابلے میں اپنے معلمین وعلمائے دین کے طرز عمل کو دیکھیں، جنہوں نے اپنی خشونت اور تنگ نظری سے مسجدوں اور مدرسوں کو خوفناک جگہیں بنا دیا۔ جہاں لوگ جانے سے ڈرتے اور ان حضرات کو ملنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ جہالت یا عدم واقفیت ایک مرض ہے، اسے معذور سمجھ کر اس کے ازالے کی کوشش کرنا انسانیت کی خدمت ہے لیکن اس سے اظہار نفرت وانتقام اور بغض وعناد کر کے اس کی اصلاح کے تمام راستے مسدود کرنے والی بات ہے۔ آسانی کے متعلق حضور ﷺ کے دیگر ارشادات ملاحظہ ہوں:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن النبی ﷺ انہ قال: علموا و یسروا ولا تعسروا واذا غضب احدکم فلیسکت۔

ترجمہ: "ابن عباس رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: سکھاؤ، آسانی پیدا کرو، مشکل نہیں اور جب کوئی غصے میں ہو تو اسے خاموش ہو جانا چاہیے۔"

وعن انس رضی اللہ عنہ: قال: قال رسول اللہ ﷺ خیر دینکم ایسرہ وخیر العبادہ الفقہ۔

ترجمہ: "انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارا بہتر دین آسان ہے اور اچھی عبادت دینی بصیرت حاصل کرنا ہے۔"

حضور ﷺ نے لمبی نماز پڑھانے والے کو تنبیہ کی اور تخفیف کا حکم دیا۔ نماز سے بہتر تو کوئی بات نہیں ہو سکتی، لیکن اس میں بھی آسانی کو ملحوظ خاطر رکھا تا کہ بوجھ نہ بنے۔ آپ ﷺ نے مشکل مسائل میں الجھنے سے منع فرمایا:

عن معاویہ قال: نہی رسول اللہ ﷺ عن الاغلوطات۔

ترجمہ: "معاویہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اغلوطات سے منع کیا ہے۔"

قال الاوزاعی: یعنی صعاب المسائل۔

ترجمہ: "اوزاعی کہتے ہیں کہ اس سے مراد مشکل مسائل ہیں۔"

آسانی کے بارے میں یہ نقطہ نظر صرف بیانیہ نہیں تھا۔ آنحضرت ﷺ کا اپنا عمل بھی اسی پر تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ انسان طبعاً سہولت پسند ہے، اس لیے دین کو مشکلات کا مجموعہ نہیں بنانا چاہیے۔ آپ ﷺ نے حتی الامکان دینی زندگی کو آسان بنایا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے سوال پر فرمایا بار بار سوال نہ کرو۔ ورنہ دین مشکل ہوتا چلا جائے گا۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ تشدد پسندی نہ کرو واللہ تم پر سختی کرے گا۔ حضور ﷺ کے طرز عمل کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

ما خیر بین أمرین الا اخذا یسرھما مالم یکن اثما فان کان اثما کان ابعد الناس منہ وما انتقم رسول اللہ ﷺ لنفسہ الا ان تنتھک حرمۃ اللہ فینتقم للہ بھا۔

ترجمہ: "حضور ﷺ کو کبھی دو امور میں اختیار نہیں دیا گیا، الا یہ کہ ان میں سے آسان کو اختیار کیا بشرطیکہ اس میں گناہ نہ ہو۔ اگر گناہ ہو تو اس سے تمام انسانوں سے زیادہ دور ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہ لیا الا یہ کہ اللہ کی حرمت مجروح ہو تو پھر اللہ کے لیے آپ ﷺ انتقام لیتے۔"

۲۔ کردار میں تواضع وانکسار:

بطور معلم آپ ﷺ کی بڑی خصوصیت آپ ﷺ کی تواضع وانکسار تھا۔ رسول اور آخری نبی کے لحاظ سے اللہ سے ہمکلام ہونے کے اعتبار سے اور حقائق اشیاء کا سب سے اچھا علم رکھنے کے سبب سے آپ ﷺ نے کبھی کبر وغرور کا شائبہ بھی اپنی شخصیت میں نہ آنے دیا۔ رفقاء کرام جانثار ہیں۔ بلند کرداری کے باعث لوگوں کے دلوں میں بے پناہ تکریم ہے مگر اس معلم خیر ﷺ نے تواضع کی روش کو نہیں چھوڑا۔ آپ ﷺ کی حیثیت، متواضع بھائی، حلیم معلم بلکہ ایک رحیم وشفیق باپ کی سی تھی۔ جب کبھی آپ ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے خطاب فرماتے یا انہیں آداب

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

زندگی سے روشناس کراتے تو لطیف ترین انداز اور نرم ترین خطاب سے نوازتے۔ ایسا انداز جو دل میں اتر جائے اور طبیعت ذرہ بھر بھی کدو محسوس نہ کرے۔ مثلاً فرماتے:

انما انا لکم مثل الوالد

ترجمہ: ''میں تمہارے لیے تمہارے والد کی مانند ہوں۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بے مثل معلم کے لیے جذبات محبت وعقیدت کا اظہار کرتے تو آپ ﷺ منع فرماتے، مثلاً

لا تطرونی کما اطرت النصاری عیسی بن مریم فانما انا عبد فقولوا عبده و رسوله.

ترجمہ: ''مجھے تم اس طرح نہ بڑھاؤ چڑھاؤ جس طرح عیسائیوں نے مسیح (علیہ السلام) کو بڑھایا۔ میں تو بندہ ہوں پس مجھے اس کا بندہ اور رسول کہو۔''

لا تقومو کما یقوم الاعاجم.

ترجمہ: ''تم ایسے نہ کھڑے ہوا کرو جس طرح عجمی کھڑے ہوتے ہیں۔''

آپ ﷺ کبھی اس بات کی خواہش نہ کرتے کہ انہیں بشر کے مقام سے بلند کر کے خدا بنا دیا جائے۔ طبیعت کا یہ انکسار و تواضع معلم کی شخصیت کا زیور ہے۔ سیرت سازی میں اس صفت کو بنیادی دخل حاصل ہے۔ کوئی مغرور و متکبر معلم کبھی اچھے نتائج نہیں پیدا کر سکا۔ یہ جو آج استاد و شاگرد کے ربط میں دو اصطلاحیں گردش کرتی ہیں یعنی (Mutual Understanding and Close Contact) اگر ان سے کوئی درست معنی نکالے جا سکتے ہیں تو وہ یہی ہیں کہ استاد کی شخصیت کو مؤثر ہونا چاہیے اور طلباء کو بذریعہ قرب استاد سے کچھ حاصل کرنا چاہیے۔ بات استاد کی شخصیت پر ہی آتی ہے کہ وہ فیض رساں اور نفع بخش نہیں، ورنہ استاد شاگرد کی گستاخی و بے ادبی کا گلہ نہ کرتا۔

۷۔ تعلیم نسواں:

معلم خیر نے اپنی تعلیم کو صرف ایک طبقہ تک محدود نہیں رکھا تھا بلکہ آپ ﷺ معاشرے کے ہر طبقے کو استفادہ کا موقع دیتے تھے۔ خواتین نے مطالبہ کیا کہ ہمیں بھی وقت ملنا چاہیے تو آپ ﷺ نے ان کے لیے علیحدہ وقت مقرر کیا اور ان کے مسائل کو بغور سنتے اور جواب دیتے۔ خواتین کے شغف علم کا احساس اس روایت سے ہوتا ہے:

عن ابی سعید الخدری قال: قالت النساء للنبی ﷺ غلبنا علیک الرجال فاجعل لنا یوما من نفسک فوعدھن یوما لقیھن فیه فوعظھن وامرھن بصدقة.

ترجمہ: ''ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عورتوں نے آنحضور ﷺ سے کہا کہ مردوں نے آپ ﷺ سے ہماری نسبت زیادہ حصہ لیا ہے، آپ ﷺ ہمارے لیے ایک مخصوص دن رکھیں۔ آپ ﷺ نے ایک دن کا وعدہ فرمایا، اس میں آپ ﷺ ان سے ملے، انہیں نصیحت کی اور صدقہ کا حکم دیا۔''

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ خواتین نے حضور ﷺ سے مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے ایک جگہ کا تعین فرمایا اور وہاں انہیں تعلیم دی۔ خواتین آپ ﷺ سے سوال کرتیں اور آپ ﷺ انہیں جواب عطا فرماتے۔ خاص اوقات میں مجلس منعقد ہوتی اور آپ ﷺ انہیں اسلامی تعلیمات سے روشناس کراتے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نعم النساء نساء الانصار لم یمنعھن الحیاء ان یتفقھن فی الدین۔

ترجمہ: ''انصار خواتین بہت اچھی ہیں کہ انہیں دینی بصیرت حاصل کرنے میں حیا مانع نہیں ہوتی۔''

تعلیم نسواں کے سلسلے میں اور بہت کچھ مروی ہے جس کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔ حضور ﷺ کے اس طرز عمل سے دو نتیجے نکلتے ہیں

۱۔ اسلامی نظام تعلیم میں عورتوں کی تعلیم کا انتظام علیحدہ ہونا چاہیے۔

۲۔ عورتوں کا نصاب بھی مختلف ہونا چاہیے کیونکہ ان کی عملی زندگی مردوں سے مختلف ہے۔ دور حاضر کی عالمی تہذیب نے جو اثرات ڈالے ہیں ان میں ایک مخلوط نظام تعلیم اور نصابات کی یکسانیت ہے۔ اب یہ مسلم سوسائٹی کے راہنماؤں پر منحصر ہے کہ وہ اسلامی معاشرت کے استحکام کے لیے کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ تعلیم نسواں ایک اہم موضوع ہے جو علیحدہ توجہ کا طالب ہے۔

ہم نے اوپر حضور نبی کریم ﷺ کی شخصیت کا تعلیمی پہلو بیان کیا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے قول وعمل سے تعلیمی نظام کے متعلق بے نظیر مثالیں قائم کی ہیں۔ بطور معلم آپ ﷺ کا رویہ، آپ ﷺ کا کردار اور طرز عمل ایک نمونہ اور ایک مثال ہے ان لوگوں کے لیے جو معلوم بنا چاہتے ہیں یا رہنا چاہتے ہیں۔ ہم اس گفتگو کو ارشاد خداوندی پر ختم کرتے ہیں:

لقد کان لکم فی رسول اللہ ﷺ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجو اللہ والیوم الاخر وذکر اللہ کثیرا۔

ترجمہ: ''تم کو پیغمبر خدا ﷺ کی پیروی (کرنی) بہتر ہے (یعنی) اُس شخص کو جسے اللہ (سے ملنے) اور روز قیامت (کے آنے) کی امید ہو اور وہ اللہ کا ذکر کثرت سے کرتا ہو۔''

۸۔ خود عملی نمونہ پیش فرماتے:

حضور ﷺ کے طریقہ تعلیم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جس چیز کی دوسروں کو تعلیم دی۔ پہلے اس پر خود عمل فرمایا اور اس چیز کا بے نظیر عملی نمونہ پیش کیا۔ عقائد کی تعلیم دی تو مابعد الطبیعاتی حقائق پر سب سے پختہ ایمان آپ ﷺ کا تھا جس کا اظہار آپ ﷺ کی حیات طیبہ کے ہر لمحے میں ہوا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی مدد اور رحمت پر بھروسہ کرنے کی تعلیم دی تو خود اس کا بے مثال نمونہ پیش کیا۔ غار ثور میں جب دشمن غار کے دہانے پر آ گیا، غزوہ بدر میں، غزوۂ احد میں جب مسلمانوں کی فتح شکست میں بدل گئی۔ غزوۂ حنین میں جب اسلامی لشکر میں افراتفری پھیل گئی۔ عبادات کی تعلیم دی تو خود سب سے زیادہ ان پر عمل فرمایا۔ رات بھر نماز میں قیام فرمانے سے پاؤں مبارک پر ورم آ جاتا، بکثرت نفلی روزے رکھتے۔ حقوق العباد کی ادائیگی کا یہ عالم کہ اللہ کے رسول ﷺ اور اتنی بڑی مملکت کے حکمران ہونے کے باوجود اگر کوئی قرض خواہ آ کر قرض کا تقاضا کرنے میں سختی اور بدتمیزی سے کام لیتا ہے اور صحابہ اس قرض خواہ کو سزا دینا چاہتے ہیں تو آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایسا کرنے سے منع فرماتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں کہ اسے تقاضا کرنے کا حق ہے، تمہیں چاہیے تھا کہ مجھے حسن ادائیگی کے لیے کہتے، مرض الموت میں اعلان فرماتے ہیں کہ اگر میں نے کسی کے ساتھ کبھی کوئی زیادتی کی ہو تو اسی دنیا میں وہ مجھ سے انتقام لے لے۔ مکارم اخلاق کی معراج تھے۔ آپ ﷺ نے اخلاق فاضلہ کو کمال تک پہنچا دیا۔

۹۔ نرم اور شیریں لہجے میں بات فرماتے:

نبی اکرم ﷺ نرم اور شیریں لہجے میں بات فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کی میٹھی میٹھی باتیں سامع کے دل میں اتر جاتیں۔ ہر شخص کو آپ ﷺ کی باتیں سننے کا اشتیاق رہتا تھا، حالانکہ آپ ﷺ کی باتیں اکثر اوامر و نواہی زیادہ ترغیبات و ترہیبات پر مشتمل تھیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۱۰۔ کلام میں فصاحت و بلاغت:

آپ ﷺ کی گفتگو فصاحت و بلاغت کی جان ہوتی تھی۔ الفاظ کا چناؤ، جملے کی ترکیب وغیرہ اس طرح ہوتی کہ مفہوم کا مکمل ابلاغ ہو جاتا جو کچھ آپ ﷺ سمجھانا چاہتے سامع بھی وہی مفہوم اخذ کرتا، کسی قسم کا ابہام پیدا نہ ہوتا۔ حضور پاک ﷺ کو تمام عرب افصح العرب قرار دیتے تھے یعنی عربوں میں فصیح ترین۔

۱۱۔ متعلم کا معیار و نفسیات ملحوظ رکھتے:

تمام صحابہ رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے شاگرد تھے۔ آپ ﷺ جب بھی کسی سے خطاب فرماتے مقصد تعلیم ہی ہوتا تھا۔ آپ ﷺ اپنے مخاطب یعنی مخاطب کی نفسیات اور معیار کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے جس شخص میں جو کمزوری پاتے اس کی مناسبت سے بات فرماتے۔ ایک شخص نے اپنے اندر جھوٹ کے علاوہ شراب، بدکاری وغیرہ کی برائیاں بتائیں اور عرض کیا کہ ان میں سے کس کو چھوڑ دوں۔ آپ ﷺ نے اس کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر اسے صرف جھوٹ چھوڑنے کی تلقین فرمائی۔ جھوٹ چھوڑا تو باقی سب برائیاں بھی چھوٹ گئیں۔

۱۲۔ مثالوں کا استعمال:

آپ ﷺ اکثر اپنے کلام میں مثالیں استعمال فرماتے تاکہ بات سننے والے کے اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بنو فزارہ کا ایک آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: میری بیوی نے ایک سیاہ فام بچے کو جنم دیا ہے جسے میں تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ (ماں باپ دونوں سفید رنگ کے ہیں تو ان کے ہاں سیاہ فام بچہ کیونکر پیدا ہو سکتا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے اونٹ ہیں؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں! فرمایا: ان کے کیا رنگ ہیں؟ عرض کیا: سرخ۔ فرمایا: ان میں کوئی سیاہی مائل بھی ہے؟ عرض کیا: جی ہاں، سیاہی مائل ہے۔ فرمایا: وہ کہاں سے آ گیا؟ عرض کیا! ہو سکتا ہے کہ اس کی اصل، نسب میں کوئی ایسا ہو، آپ ﷺ نے فرمایا: ہو سکتا ہے کہ اس کی اصل، نسب میں بھی کوئی ایسا ہو۔

۱۳۔ دل آزار تنقید سے پرہیز:

معلم کو بسا اوقات اصلاح کے لیے تنقید کرنا پڑتی ہے لیکن اگر اس تنقید میں دل آزاری کا پہلو ہو یا اس سے دوسروں کے سامنے طالب علم کی سبکی اور بدنامی ہوتی ہو تو اصلاح کا مقصد حاصل نہیں ہوتا، بلکہ وہ طالبعلم ڈھیٹ یا گستاخ ہو جاتا ہے یا معلم سے متنفر ہو جاتا ہے۔ حضور ﷺ کبھی کسی پر دل آزار تنقید نہ فرماتے۔ اگر تنقید کرنا ہوتی تو کسی کا نام لیے بغیر فرماتے کہ بعض لوگوں کو نجانے کیا ہوا کہ ایسا ویسا کرم کرتے ہیں۔

۱۴۔ نرمی اور شفقت:

حضور ﷺ لوگوں کے ساتھ (جو سب کے سب آپ ﷺ کے متعلم تھے) نرمی اور شفقت کا سلوک فرماتے۔ اگر کوئی بدوی غیر مہذب زبان میں گفتگو کرتا، کوئی گنوار مسجد میں پیشاب کر دیتا تو آپ ﷺ سختی نہ فرماتے بلکہ پیار سے سمجھاتے۔ آپ ﷺ جن صحابیوں کو دوسرے علاقوں میں معلم بنا کر بھیجتے انہیں بھی لوگوں کے ساتھ نرمی اور شفقت کا سلوک کرنے کی ہدایت فرماتے۔

۱۵۔ بے جا تعظیم کی ممانعت:

آپ ﷺ اپنے شاگردوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) کو نہ تو اپنی تعریف کرنے کی اجازت دیتے اور نہ کسی طرح بے جا تعظیم کرنے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کی۔ آپ ﷺ نے اپنی تشریف آوری پر اپنی تعظیم میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو تعظیماً کھڑے ہونے سے منع فرما رکھا تھا۔ اپنے لیے تعریفی القاب بھی پسند نہ فرماتے تھے۔

۱۶۔ مرد و زن سب کو تعلیم فرماتے:

حضور ﷺ تعلیم کے معاملے میں مرد اور عورت میں کوئی امتیاز روا نہ رکھتے تھے۔ آپ ﷺ جس طرح مردوں کو تعلیم فرماتے، اسی طرح عورتوں کو بھی تعلیم فرماتے تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے عورتوں کے لیے ہفتہ میں ایک دن مخصوص کر دیا تھا۔

۱۷۔ تعلیم کا مقام اور وقت:

حضور ﷺ نے تعلیم کے لیے نہ کوئی وقت مقرر کر رکھا تھا اور نہ ہی جگہ۔ ہر وقت اور ہر جگہ آپ ﷺ تعلیم فرماتے رہتے تھے۔ اگرچہ خصوصی حلقۂ درس مکہ میں حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کے گھر میں اور مدینہ میں مسجد نبوی اور صفہ میں قائم ہوتے لیکن آپ ﷺ کے ساتھ جس وقت اور جہاں بھی کوئی صحابہ رضی اللہ عنہ یا صحابہ رضی اللہ عنہم ہوتے آپ ﷺ تعلیم فرماتے اگر کوئی شخص کوئی مسئلہ پوچھنے کے لیے حاضر ہوتا تو آپ ﷺ اسے خوش آمدید فرماتے۔

بحیثیت سربراہ مملکت تعلیم کا انتظام

حضور ﷺ نے مدنی زندگی میں سربراہ مملکت کی حیثیت سے بھی فرائض سرانجام دیے۔ اب ہم مختصر طور پر بیان کریں گے کہ حضور ﷺ نے اس حیثیت میں تعلیم کے فروغ کے لیے کیا اقدامات کیے۔

۱۔ اہمیت علم اور تعلیم کی ترغیب:

حضور ﷺ نے علم کی اہمیت پر بہت زور دیا اور اس کی بڑی فضیلت بیان فرمائی۔ آپ ﷺ نے علم حاصل کرنے اور علم سکھانے کی بھی اپنی امت کو بہت ترغیب دی۔ اس ضمن میں حضور ﷺ کے چند ارشادات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ جو شخص علم کی جستجو میں (گھر سے) نکلے، وہ اللہ کی راہ میں ہے جب تک لوٹ نہ آئے۔

۲۔ علم حاصل کرو، خواہ اس کے لیے چین جانا پڑے کیونکہ طلب علم ہر مسلمان پر فرض ہے۔

۳۔ جو شخص حصول علم کے لیے سفر کرے اللہ اسے (اس کے بدلے میں) جنت کے راستوں میں سے ایک راستے پر چلاتا ہے اور فرشتے طالب علم کی خوشنودی کے لیے اس پر اپنے پروں کا سایہ کر دیتے ہیں۔

۴۔ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

۵۔ عالم کی فضیلت عبادت گزار پر ایسی ہے جیسے چودھویں کا چاند ستاروں پر فضیلت رکھتا ہے۔

۶۔ تجھے اس حال میں صبح کرنی چاہیے کہ یا تو عالم ہو یا متعلم ہو، علم سننے والا ہو، یا علم سے محبت کرنے والا ہو۔ (ان چار کے علاوہ) کوئی پانچویں صورت اختیار نہ کرو، ورنہ تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

۷۔ عالم اور متعلم دونوں اجر میں شریک ہیں۔

۸۔ عالم کو عابد پر وہی فضیلت حاصل ہے جو مجھے تم میں سے ادنیٰ شخص پر حاصل ہے۔

۹۔ طلب علم کی حالت میں اگر طالب علم کو موت آ جائے تو وہ شہید کی موت مرتا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تعلیم کا انتظام

حضور ﷺ نے تعلیم کے لیے متعدد عملی اقدامات فرمائے۔

۱۔ صفہ۔ مسجد نبوی میں ایک احاطہ تھا جسے صفہ کہتے تھے۔ یہ ایک اقامتی درس گاہ تھا۔ یہاں مقامی اور دوسرے علاقوں سے آئے ہوئے طالب علم تعلیم پاتے اور قیام بھی یہیں کرتے۔ ان کی خوراک وغیرہ کا بندوبست بھی کیا جاتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ خود اس کی نگرانی فرماتے تھے۔ آپ ﷺ نے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہاں تعلیم دینے کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ یہاں مقیم طلبہ کی تعداد ستر تک بھی بتائی گئی ہے۔

۲۔ مدینہ منورہ میں نو مسجدیں تھیں (حضور پاک ﷺ کے زمانے میں) ہر مسجد میں طلبہ کی تعلیم کا کام ہوتا تھا۔

۳۔ جو قبیلہ اسلام قبول کرتا حضور پاک ﷺ ان کی تعلیم کے لیے ان کے ہاں معلم بھیجتے تھے۔ ہجرت سے قبل مدینہ منورہ میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو معلم بنا کر بھیجا تھا۔

۴۔ صوبائی عاملوں کو آپ ﷺ حکم فرماتے کہ وہ اپنے علاقے میں لوگوں کی تعلیم کا بندوبست کریں۔

۵۔ آپ ﷺ کو تعلیم کا اس قدر خیال تھا کہ غزوۂ بدر کے موقع پر کفار کے جو آدمی جنگی قیدی بنے مگر زرفدیہ دے کر رہائی پانے سے قاصر تھے۔ آپ ﷺ نے ان کا فدیہ مقرر فرمایا کہ جو قیدی لکھنا جانتا ہے وہ مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا سکھا دے تو اسے آزاد کر دیا جائے گا۔

حضور علیہ وسلم کے زمانے میں نصاب تعلیم

ظاہر بات ہے کہ حضور ﷺ کے عہد مبارک میں سب سے زیادہ زور قرآن حکیم کی تعلیم پر ہی دیا جاتا تھا لیکن اس کے علاوہ حضور ﷺ نے حکم دیا تھا کہ نشانہ بازی، تیراکی، تقسیم ترکہ کی ریاضی، مبادیٔ طب، علم ہیئت، اور علم تجوید قرآن کی تعلیم دی جایا کرے۔ حضور ﷺ نے عورتوں کے لیے چرخہ کاتنا سب سے اچھا مشغلہ قرار دیا تھا۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ عربوں میں اسلام سے قبل تعلیم و تعلم کا کم ہی رواج تھا۔ انہیں سب سے زیادہ شغف زبان دانی سے تھا۔ مختلف علوم کی طرف ان کا میلان بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لیے قرآن حکیم کے علاوہ وہاں کسی علم پر کوئی کتاب شاید ہی کہیں موجود ہو، نہ ہی دیگر علوم و فنون رکھنے والے کوئی خاص علماء موجود تھے۔ عربوں کی رسائی زیادہ سے زیادہ مذکورہ علوم و فنون تک ہی ممکن تھی۔ اس لیے آپ ﷺ نے ان علوم و فنون کی تعلیم کا حکم فرمایا۔ اگر ان کے علاوہ نفع بخش علوم سے عرب واقف ہوتے تو یقینی بات ہے کہ نبی اکرم ﷺ ان علوم کی تعلیم کا حکم بھی ضرور فرماتے۔ عرب صنعتوں سے بھی قطعی نابلد تھے۔ چرخہ کاتنے کا تھوڑا بہت رواج ہوگا۔ لہٰذا آپ ﷺ نے عورتوں کو اس ہنر کی ترغیب دلائی۔ اگر عرب میں مفید صنعتیں ہوتیں اور عرب ان کی مہارت رکھتے تو لازماً حضور ﷺ ان صنعتوں کی تعلیم کی بھی تلقین فرماتے۔

آپ ﷺ نے قرآن حکیم کے علاوہ جن علوم و فنون کی تعلیم کی ہدایت فرمائی اور جن کی تلقین نہیں فرمائی اس سارے معاملے کو اس وقت کے معروضی حالات کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ یہ سمجھ لینا کہ اسلام صرف دینی علوم کی تعلیم کا حکم دیتا ہے اور علم، معلم اور متعلم کی جو فضیلت قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہے وہ صرف دینی علوم کے لیے مخصوص ہے نہایت غلط بات ہے۔ آج ہم جدید علوم، بالخصوص فزیکل سائنسز اور جدید ٹیکنالوجی کو حاصل کیے بغیر نہ صرف یہ کہ خوشحال نہیں ہو سکتے، بلکہ فرض ہونے پر نہ جہاد کر سکتے ہیں، اور نہ اپنی معاشی و سیاسی آزادی برقرار رکھ سکتے ہیں۔ ہر چیز میں غیر مسلموں کے محتاج رہیں گے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حضور ﷺ کا طریق تعلیم:

نبی ﷺ کی دعوت سرتاپا تعلیم تھی۔ ایسی تعلیم جو علم غیب کی طرف سے آ رہی تھی۔ قرآن کی صورت میں جو کچھ آپ ﷺ پر اترتا تھا آپ ﷺ اسے بلا کم وکاست اپنے شاگردوں تک پہنچا دیتے تھے جس طرح قرآن پاک کا نزول آپ ﷺ کی زندگی کے تیئس برسوں پر پھیلا ہوا ہے اسی طرح آپ ﷺ کی تعلیم وتعلم کی مشغولیت بھی تیئس برس پر مشتمل ہے۔

آپ ﷺ کے پیش نظر دو کام تھے۔ ایک اس معاشرے کی اصلاح جو فکری وعملی لحاظ سے بے شمار الجھنوں میں گھرا ہوا تھا، دوسرے اس معاشرے کے پسندیدہ افراد کو مجتمع کر کے نئی اجتماعیت کی بنیاد جس میں انفرادی اور اجتماعی طرز عمل مثالی ہو۔ اس پس منظر میں ہم آپ ﷺ کے طریق تعلیم کو دو حصوں میں منقسم کرتے ہیں۔ پہلا طریق یہ کہ آپ ﷺ قرآنی تعلیمات کو عمومی انداز میں پیش فرماتے اور نئی اجتماعیت میں شمولیت کی دعوت دیتے۔ تعلیم کے اس طریق میں آپ ﷺ اجتماعات کو بھی خطاب کرتے اور افراد کو انفرادی طور پر بھی قائل کرنے کی سعی فرماتے۔ تاریخ کی کتابوں میں تفصیل بھی موجود ہے کہ آپ ﷺ قبائل کے پاس بھی گئے اور ان کے روساء کو بھی مخاطب کیا۔ تعلیم کے اس حصے میں آپ ﷺ آیات پڑھ کر سناتے اور مختلف مسائل قرآنی نقطۂ نظر سے واضح کرتے۔ قرآن کریم کے اسلوب سے شناسائی رکھنے والا ذہن جانتا ہے کہ آپ ﷺ نے تدریجی طریق اختیار کیا، عقائد فاسدہ، ضرر رساں عادات اور ناپسندیدہ جھگڑوں کی برائی کو پیش کیا اور آہستہ آہستہ درست خیالات، صحیح عبادات، مناسب احکام اور عمدہ اخلاق و آداب کی طرف دعوت دی۔ گویا قرآن پاک نے تنقیدی و تعمیری دونوں انداز ہائے تعلیم کو پیش نظر رکھا اور رسول اکرم ﷺ نے بھی تعلیمی زندگی میں یہی و عمومی وخصوصی رنگ اختیار کیا۔

تعلیم کا دوسرا طریق یہ کہ منتخب افراد کو مجتمع کیا اور ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا۔ آپ ﷺ قرآن پاک کی تلاوت فرماتے۔ اس کے الفاظ و معانی کی درست تعبیر فرماتے اور اگر کہیں کوئی الجھن پیش آتی تو اسے دور فرماتے۔ جب تک دعوت کا سلسلہ مخفی تھا آپ ﷺ نے ارقم کے گھر کو مرکز قرار دیا تھا۔ یہاں تمام اولین رفقاء جمع ہوتے، کتاب اللہ کو یاد کرتے، آپ ﷺ سے اسلام کے بنیادی مسائل اخذ کرتے اور مختلف معاملات میں راہنمائی لیتے، ازاں بعد آپ ﷺ کا اپنا گھر مسلمانوں کو مرکز بن گیا تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اکٹھے ہوتے، قرآن یاد کرتے، اس کی تفہیم ہوتی، پیش آمدہ معاملات پر بحث ہوتی اور اس عظیم معلم (ﷺ) سے راہنمائی حاصل کر کے یہ لوگ اپنے کام کاج میں مشغول ہو جاتے۔ اس میں شک نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے گھروں، دکانوں اور انفرادی واجتماعی مواقع پر خود بخود اپنے اسباق دہراتے رہتے اور قرآن وتشریح قرآن کا ذکر ایک دوسرے سے کرتے رہتے لیکن اس مرکز سے کبھی غافل نہ ہوتے۔ حضور اکرم ﷺ کے سامنے یہ حضرات اپنے تمام مسائل رکھتے اور ان کے صحیح جوابات سے اطمینان حاصل کرتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم چلتے پھرتے بھی قرآن پاک کو یاد کرنے اور اس کی تفسیر یعنی حدیث کو محفوظ کرنے میں مشغول ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا واقعہ بتاتا ہے کہ مسلمان اپنے گھروں میں قرآن کی تلاوت کرتے اور فہم دین کے لیے کوشش کرتے۔ بعد ازاں مسجد کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ یہی وہ مقام تھا جہاں تمام تعلیمی امور طے پاتے تھے۔ مسجد میں تو باقاعدہ علمی حلقے ہوتے جسے آج کی زبان میں کلاس کہہ سکتے ہیں۔ اس معلم اکبر ﷺ نے اس مرکز تعلیم میں اشاعت تعلیم کا اہتمام کیا۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا مقالہ نگار مسجد کی تعلیمی حیثیت پر بڑی دلچسپ بحث کرتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضور ﷺ اپنی تعلیم کو صرف مرکز تک محدود نہیں رکھتے بلکہ جہاں کہیں بھی کسی کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا آپ ﷺ اس کی وضاحت کرتے۔ مناسب مقامات کے علاوہ آپ ﷺ نے کئی مرتبہ راہ چلتے بھی مسائل کا حل بتایا۔ اس انفرادی کوشش کے علاوہ وہ حلقے خصوصی اہمیت رکھتے ہیں جہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن وحدیث اور مسائل حیات پر مذاکرہ اور تبادلہ خیال کرتے نظر آتے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

يقول انس رضى الله عنه: انما كانوا اذا صلوا الغداة فعدوا حلقا يقرؤن القرآن ويتعلمون الفرائض والسنن.

ترجمہ: ''انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم جب صبح کی نماز پڑھ لیتے ،حلقوں کی صورت میں بیٹھ جاتے، قرآن پڑھتے اور فرائض وسنن سیکھتے۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حیات علمیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ اکثر ان مجلسوں میں تشریف فرما ہوتے اور ان کے تعلیمی وتربیتی معاملات کو درست فرماتے۔ بطور معلم آپ ﷺ کا ایک خصوصی انداز تھا۔ تعلیم انفرادی ہو یا اجتماعی معلم کو کچھ اصول وقواعد پیش نظر رکھنا پڑتے ہیں جن سے زیادہ سے زیادہ افادہ واستفادہ ہو سکے۔ نبی کریم ﷺ نے تعلیم میں ایک اسلوب اختیار فرمایا۔ آپ ﷺ کی پوری تعلیمی زندگی سے اس اسلوب کی خصوصیات کا پتہ چل سکتا ہے۔ ذیل میں ہم چند اہم نکات دے رہے ہیں۔ ایک طالب علم دیکھے گا کہ بطور معلم آپ ﷺ نے کیا طریق اختیار کیا:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حضور ﷺ بطور معلم اخلاق

قرآن مجید میں ہے: ﴿ وانک لعلی خلق عظیم ﴾

محبت کے یوں جس نے دریا بہائے
دل ان کا چھینا جو سر لینے آئے
یہ بندہ نوازی کے جوہر دکھائے
کہ خود کھا کے جو اور جواہر لٹائے
خوشی ساری اوروں کے غم میں بھلا دی
دیا دکھ جس نے اسے بھی دعا دی

دہلیز پہ پڑے ایک ٹوٹے ہوئے جام کے لیے ماضی کو آواز دینا بڑا دردناک ہوتا ہے۔ وقت کا سیل رواں ایک مدت مدیدہ سے جوئے آب کی مانند محو خرام ہے اس کی نیم ناز نگاہوں نے بڑے بڑے مصلحین کی تعلیم سے پیدا ہونے والے انقلابات دیکھے لیکن بے رحم وقت کے جھونکے ان کے نقوش کو مٹاتے چلے گئے۔ لیکن رسول مکرم ﷺ کی اخلاقی تعلیم نے جو انقلاب پیدا کیا، انسانیت کو جو معراج بخشی اس نیلگوں آسمان کے ستارے آج بھی دنیا کے کسی نہ کسی خطے میں ضرور اس کی بہار دیکھ رہے ہیں اور دیکھتے رہیں گے اور آج میں اس معاشرے کی گری ہوئی دیواروں پر کھڑا ہو کر اس معلم اخلاق کی تعلیم حجازی لے میں چھیڑنا چاہتا ہوں کہ وہ تو وہ معلم تھا جس کے نقش پا میں بھی مستقبل کے مسافروں کے لیے کئی منزلیں پوشیدہ ہیں...... قول کا اثر اس وقت اپنا رنگ دکھاتا ہے جب اس کے ساتھ فعل کو بھی اسی رنگ میں سجا دیا جائے، زبان کی باتوں اور دل و نگاہ مین تفاوت پیدا ہو جائے تو باتیں اور اصول اپنا اثر کھو دیتے ہیں۔

وہ خود اپنی تعلیم کا آپ نمونہ تھا، انسانوں کے مجمع عام میں جو کہتا تھا گھر کے خلوت کدہ میں اسی طرح نظر آتا تھا، اس کو جب طائف میں پتھر پڑے تو اس کے ہاتھ اللھم اھد قومی کہتے ہوئے اٹھے اس کے شفیق چچا کو ذبح کیا گیا لیکن وہ وحشی کو معاف کر جنت کے راستے پر ڈالتا ہوا نظر آیا اس کی راہوں میں کانٹے بچھائے گئے۔

گندگی پھینکی گئی لیکن وہ ایسے لوگوں کے بیمار ہونے پر تیمارداری کرتا ہوا نظر آتا ہے، اس کی بیٹی زینب رضی اللہ عنہا کو حمل کی حالت میں ھبار نے نیزہ مار کر ہلاک کر دیا لیکن معلم اخلاق کی بارگاہ سے اس کے لیے معافی نامہ جاری ہوا اور وہ تو ایسا تھا کہ جب اس کے پاس اختیار تھا اقتدار تھا قوت تھی، غلبہ تھا، کفار کی نگاہیں شرم سے جھکی ہوئی تھیں، ان کے ظلم ان کی نگاہوں کے سامنے رقص کر رہے تھے تو معلم اخلاق نے دیکھا کہ آج کا دن ان کی اخلاقی تربیت کرنے کا دن ہے زبان اطہر سے فرمایا لا تثریب علیکم الیوم اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا آکرت کی تیاریوں میں مصروف تھا تو ایک چھڑی کا بدلہ دینے کے لیے بھی اپنے جسم سے کپڑا ہٹا رہے ہیں۔

لے گیا فوق انبیاء پہ خلق میں اور خلق میں
کس میں اس کا علم تھا اور کس میں اس کا کرم

انہی باتوں کو دیکھتے ہوئے قرآن نے آپ ﷺ کو سرٹیفکیٹ دے دیا کہ اے شاہ دو جہاں آپ ﷺ کا رحم ایسا ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ آپ ﷺ کی تعلیم ایسی ہے ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ اور آپ ﷺ کا خلق ایسا ہے انک لعلی خلق عظیمہ یہ کائنات کی نگاہیں نہ آپ ﷺ جیسا کوئی معلم اخلاق دیکھیں گی اور نہ پیدا ہوگا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

رخِ مصطفیٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری بزمِ خیال میں نہ دوکانِ آئینہ ساز میں

ہٹلر نے آپ ﷺ کے اخلاق کا مطالعہ کیا تو پکار اٹھا:

"MUHAMMAD (PBUH) is a blessing for world."

اور جرمن مصنف گستاف وائل نے لکھا:

"MUHAMMAD (PBUH) is a bright example for humanity and an example of morality."

پھر گھر کی گواہی معتبر ہوا کرتی ہے جہاں آدمی تصنع کو ایک طرف رکھ کر اصل روپ میں دکھائی دیتا ہے اور جب اس معلم کے گھر والوں سے پوچھا گیا تو جواب ملا:

کان خلقه القرآن

تیری خلق کو حق نے عظیم کیا
تیرے شہر و کلام و بقاء کی قسم

آج بہار ہم سے روٹھ گئی، اس لیے کہ ہم نے چمن انسانیت میں بہار لانے والے معلم اخلاق کی تعلیم کو چھوڑ دیا جہاں سے اخلاقیات کی تعلیم رخصت ہو جائے وہاں پھر جرائم ہی جنم لیتے ہیں، دہشت گردی کی آگ معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے، انسان انسانیت سے گر کر حیوانیت کی دہلیز پر پہنچ جاتے ہیں، آج اگر امن چاہتے ہو ملک کی بقا چاہتے ہو تو اخلاقیات اور دین محمدی ﷺ کے بہترین اصولوں کو نافذ کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ

سنا ہے کہ جب تک نہ ہو دینِ محمد ﷺ سے اجالا
چمن میں بہاروں کا بسیرا نہیں ہوتا

بلغ العلی بکماله کشفت الدجی بجماله
حسنت جمیع خصاله صلو علیه و آله

☆☆☆☆☆

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

باب 3: اسلام میں انسانی حقوق اور خواتین کا مقام و مرتبہ

آؤٹ لائن

— انسانی حقوق اور اسلام میں خواتین کا مقام و مرتبہ

— وقارِ انسانی (مرد و خواتین کا انسانی وقار، عزت و احترام)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

انسانی حقوق کا پہلا منشور

خطبہ حجۃ الوداع

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ یہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں سے متعلق ہدایت و رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ یہ بنیادی انسانی حقوق کا ایک جامع منشور عطا کرتا ہے۔ یہ دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں:

-1 بنیادی انسانی حقوق

-2 اسلامی ریاست کے اندر غیر مسلموں کے حقوق

یہ حقوق قرآن مجید، سیرت النبی ﷺ اور خلافت راشدہ کے شاندار نمونہ حقوق سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اسلام عام طور پر دو قسم کے حقوق کی نشاندہی کرتا ہے:

-1 حقوق اللہ (جو کہ عبادات پر مشتمل ہیں)

-2 حقوق العباد (جو کہ زیادہ تر معاملات پر مشتمل ہیں) اس لئے اسلام ان کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے 9 ذی الحجہ (10 ہجری) کو یوم عرفہ کے موقع پر اونٹنی پر سوار ہو کر جو خطبہ دیا اسے خطبہ حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر تکمیل دین کا اعلان بھی فرمایا اس حج کے 3 ماہ بعد آپ ﷺ رحلت فرما گئے۔ اس کو انسانی حقوق کا پہلا منشور کہا جاتا ہے۔

وقال ان دماء كم واموالكم حرام عليكم كحرمة يومكم هذا في شهركم هذا في بلدكم هذا. الا ان المسلم اخو المسلم فليس يحل لمسلم من اخيه شيء الا ما أحل من نفسه. أيها الناس إن ربكم واحد واباكم واحد. الا لا فضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي ولا لأسود على أحمر ولا لأحمر على اسود إلا بالتقوىٰ. الا كل شيىء من امر الجاهلية تحت قدمي موضوع ودماء الجاهلية موضوعة وان اول دم اضع من دمائنا دمر ابن ربيعة بن الحارث كان مسترضعا في بني سعد فقتلته هذيل. وربا الجاهلية موجوع واول ربا اضع ربانا ربا عباس بن عبدالمطلب فانه موضوع كله. فاتقوا الله في النساء فانكم اخذتموهن بامان الله واستحللتم فروجهن بكلمة الله ولكم عليهن ان لا يوطئن فرشكم احدا تكرهونه فان فعلن ذلك فاضر بوهن ضربا غير مبرح. ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف. الا لا يجنى جان الا على نفسه ولا يجني والد على ولده ولا ولد على والده. وقد تركت فيكم مالن تضلو بعده ان اعتصمتم به كتاب الله وانتم تسألون عني فما انتم قائلون؟ قالو نشهد انك قدبلغت واديت ونصحت فقال باصبعه السبابة يرفعها الى السماء وينكتها الى الناس اللهم اشهد اللهم اشهد اللهم اشهد ثلاث مرات.

ترجمہ: ''پس آپ ﷺ نے لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے فرمایا، بے شک تمہارے خون اور تمہارے مال ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جیسے آج کے دن کی حرمت ہے اس مہینے اور اس شہر میں۔ آگاہ رہو، بے شک مسلمان مسلمان

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کا بھائی ہے تو کسی مسلمان کے لیے اپنے بھائی کی کوئی چیز حلال نہیں جب تک وہ خود اپنی مرضی سے حلال قرار نہ دے۔ اے لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے۔ سنو! کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر ہے اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر ہے سوائے تقویٰ کے۔ جاہلیت کے تمام کام میرے قدموں کے نیچے پامال ہیں اور جاہلیت کے تمام خون ساقط ہیں اور اپنے خونوں میں سے سب سے پہلا خون جو میں ساقط کرتا ہوں وہ ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون ہے، وہ بنو سعد میں دودھ پی رہا تھا اور اسے بنو ھذیل نے قتل کر ڈالا اور جاہلیت کے سود ساقط ہیں اور اپنے سود میں سے سب سے پہلے میں عباس بن عبدالمطلب کا سود ساقط کرتا ہوں وہ سب معاف کر دیا گیا۔ تم لوگ عورتوں (یعنی بیویوں) کے بارے اللہ سے ڈرنا کیونکہ تم نے انہیں اللہ کی امان سے لیا ہے اور اللہ کے حکم سے ان کی شرمگاہوں کو اپنے لیے حلال کیا ہے اور تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارا بستر کسی کو روندنے نہ دیں جسے تم ناپسند کرتے ہو اور اگر وہ ایسا کریں تو انہیں اس طرح مارو کہ چوٹ شدید نہ ہو (ہڈی نہ ٹوٹے نشان نہ پڑے)۔ یاد رکھو ہر جرم کرنے والا خود ہی اپنے جرم کا ذمے دار ہے اور کوئی باپ اپنے بیٹے کے جرم کا ذمے دار نہیں اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کے جرم کا ذمے دار ہے۔ اور دستور کے مطابق ان کی خوراک اور ان کا لباس تمہارے ذمے ان کا حق ہے اور میں تمہارے درمیان ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ اگر اسے مضبوطی سے پکڑے رہو تو کبھی گمراہ نہ ہو گے (اور وہ ہے) اللہ کی کتاب اور تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا تو تم کیا کہو گے، وہ سب بولے ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ نے (پیغام) پہنچا دیا ہے اور حق ادا کر دیا اور خیر خواہی کی۔ پھر آپ ﷺ نے اپنی انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھا کر اور لوگوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، اے اللہ گواہ رہنا، اے اللہ گواہ رہنا، اے اللہ گواہ رہنا، تین بار۔"

خطبہ حجۃ الوداع کے اہم نکات:

خطبہ حجۃ الوداع کو درج ذیل عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے:

1- معاشرتی احکامات　2- معاشی اصلاحات　3- سیاست سے متعلق ہدایات

4- دین سے متعلق ہدایات　5- عمومی گواہی

اللہ کی حمد و ثنا کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:

لوگو! میری بات غور سے سنو۔ میرا خیال ہے کہ شاید اس سال کے بعد میں تم کو اس جگہ نہ مل سکوں۔

1- معاشرتی احکامات:

i- جاہلیت کی مخالفت:

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"خبردار! زمانہ جاہلیت کی تمام رسمیں میرے قدموں کے نیچے روند دی گئی ہیں۔ زمانہ جاہلیت کے تمام خون معاف ہیں۔ سب لوگ آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں۔"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

"لوگو! بے شک تمہارا رب ایک اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فوقیت نہیں مگر تقویٰ کے سبب"

ii- غلاموں کے حقوق:

"تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں۔ تم خود جو کچھ کھاؤ انہیں بھی کھلاؤ اور جو خود پہنتے ہو وہی انہیں پہناؤ۔"

iii- عورت کے حقوق:

"عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔"

"اے لوگو! تمہاری عورتوں پر تمہارے کچھ حقوق ہیں اسی طرح تم پر ان کے حقوق ہیں۔"

iv- جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت:

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لوگو! (خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ) ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سب مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔"

"لوگو! تمہارے خون، مال اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے پر ایسی ہی محترم ہیں جیسا کہ تمہارے لئے آج کا یہ دن۔ یہ شہر اور یہ حرمت والا مہینہ محترم ہے۔"

2- معاشی اصلاحات:

i- سود کی حرمت:

"دور جاہلیت کا ہر سود معاف ہے۔ (اس قانون کی ابتداء بھی اپنے خاندان سے کرتا ہوں) اور اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب کا سود معاف کرتا ہوں۔"

ii- قرض کی ادائیگی:

ارشاد فرمایا۔ "قرض ادا کیا جائے گا۔ امانتیں واپس کی جائیں گی۔ ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے۔"

3- سیاست کے متعلق ہدایات:

ارشاد فرمایا: "اگر کوئی ناک کٹا اور سیاہ فام حبشی بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے اور وہ کتاب اللہ (قرآن مجید) کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو تم پر اس کی اطاعت لازمی ہے۔"

4- دین اسلام کے متعلق ہدایات:

ارشاد فرمایا: "اے لوگو! میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور تمہارے بعد اب کوئی نئی امت نہیں۔"

"میں تم میں ایک نعمت چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر تم مضبوطی سے اسے تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے اور وہ نعمت اللہ کی کتاب (قرآن مجید) ہے۔ مزید ارشاد فرمایا: "لوگو مذہب میں غلو اور مبالغہ سے بچو کیونکہ تم سے پہلی بہت سی قومیں مذہب میں غلو کے سبب برباد ہو گئیں۔"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تکمیل دین:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حجۃ الوداع کے موقع پر تکمیل دین کے بارے میں آیت نازل فرمائی:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط

''آج تمہارا دین مکمل ہوا۔ میں نے تم پر اپنی نعمتیں پوری کر دیں اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔''
(سورۃ المائدۃ آیت نمبر 3)

ارشاد فرمایا: ''خبردار جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ میری بات ان لوگوں تک پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں۔ کیونکہ بہت سے لوگ جن کو میرا پیغام پہنچے گا وہ ان لوگوں سے زیادہ اسے محفوظ رکھنے والے ہوں گے جو اس وقت سننے والے ہیں۔''

اسلام میں بنیادی انسانی حقوق

(Basic Human Rights in Islam)

اسلام نے بنیادی حقوق کا تصور انسانی تمدن کے اس دور میں پیش کیا جب آزادی کا نظریہ انسانیت کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ یہ عین ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک حقوق انسانی کے تصور کی ابتدا تاریخ انگلستان کے میگنا کارٹا یا یو این (اقوام متحدہ) کے چارٹر سے ہوئی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ بنیادی انسانی حقوق کے تصور کا آغاز دور اسلامی سے ہوتا ہے۔ اسلام نے محض نظریاتی طور پر ہی حقوق کا تصور پیش نہیں کیا، بلکہ مدینہ کی اسلامی ریاست میں تمام بنیادی انسانی حقوق کا باقاعدہ طور پر نفاذ کیا۔ اسلام کے تصور آزادی کی فضیلت اس کی اخلاقی اور روحانی قدروں میں پنہاں ہے۔ اسلام ایک ایسا اخلاقی نظام رائج کرتا ہے جو حقوق کے تحفظ کی پوری طرح ضمانت دیتا ہے اور جس میں حقوق و فرائض میں گہرا ربط برقرار رہتا ہے۔

فضیلت:

اسلام نے حقوق العباد کے احترام پر اتنا زور دیا کہ ان کو حقوق اللہ کی ادائیگی کے لیے لازمی شرط قرار دیا۔ ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد کردی گئی ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق کا احترام کرے اور اپنے مفادات کو حاصل کرنے میں کبھی بھی مفاد عامہ کو پس پشت نہ ڈالے۔ اسلامی نظام حیات کے

اسلام نے حقوق العباد کے احترام پر اتنا زور دیا کہ ان کو حقوق اللہ کی ادائیگی کے لیے لازمی شرط قرار دیا۔ ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد کردی گئی ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق کا احترام کرے اور اپنے مفادات کو حاصل کرنے میں کبھی بھی مفاد عامہ کو پس پشت نہ ڈالے۔ اسلامی نظام حیات کے

مطابق شہریوں کے تمام افعال احساس ذمہ داری کے تحت سرانجام پاتے ہیں۔ ایک اسلامی ریاست میں حکومت کو شہریوں کے حقوق کے نفاذ کے لیے محض قوت سے ہی کام نہیں لینا پڑتا، بلکہ رائے عامہ اس سے پورا تعاون کرتی ہے۔

حقوق کا ڈھانچہ:

اسلام میں شہریوں کے بعض حقوق تو شرعی قوانین میں واضح طور پر موجود ہیں جن کو نافذ کرنا ہر اسلامی ریاست پر فرض ہے۔ اس کے علاوہ ایسے تمام حقوق بھی اسلامی ریاست میں نافذ کیے جا سکتے ہیں جو موجودہ ریاست نے زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق تسلیم کر لیے ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حقوق کی ایک ایسی جامع لسٹ جو آج کے سیاسی حالات کے مطابق مرتب شدہ ہو، شرعی قوانین میں نہیں ملتی، کیونکہ دور جدید کے ایسے پیچیدہ انسانی مسائل تیرہ سو سال پہلے کے تمدن انسانی کو درپیش نہ تھے، جن کی وجہ سے حقوق کا دائرہ کار آج کے صنعتی دور میں بہت زیادہ وسعت اختیار کر چکا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

باب 5: اسلام اور دنیا

آؤٹ لائن

— اسلامی تہذیب کے مغرب اور مغرب کے اسلامی تہذیب پر اثرات

— جدید دنیا میں اسلام کا مقام

— اسلام اور عصر حاضر کے چیلنجز

— انتہا پسندی کا فروغ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسلامی تہذیب کے مغرب اور مغرب کے اسلامی دنیا پر اثرات

اسلام کی علمی تحریک

اسلام سے پہلے دنیا جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انسان مظاہر فطرت کے سامنے سجدہ ریز تھا اوران کی پوجا کرتا تھا۔ مظاہر فطرت تو اللہ نے انسان کے فائدے کے لئے پیدا کیے ہیں اور انسان کے خادم ہیں لیکن انسان نے اپنی جہالت سے مظاہر کو اپنا مخدوم بنالیا تھا۔ اسی وجہ سے سائنسی میدان میں ترقی نہ ہوسکی۔ تاریخ انسانیت میں اسلام ہی وہ دین ہے جس نے ہر شخص کے لئے حصول علم فرض قرار دیا، قرآن مجید کی رو سے انسان کو تمام مخلوقات پر صرف علم کی بدولت ہی برتری حاصل ہے۔ صاحب علم کی فضیلت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ط اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ

کہہ دیجیے کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہوسکتے ہیں۔ بے شک عقل والے ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ (الزمر:۳۹:۹)

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ○

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے درجے بلند رکھے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور جنہیں علم دیا گیا۔ (المجادلہ:۱۱)

اللہ تعالیٰ نے آنحضور ﷺ کو قرآن مجید میں تلقین فرمائی۔

قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (طہٰ:۱۱۴)

کہو! اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ کر۔

اسلام کی علمی تحریک کے امتیازات

1- تفکر فی الخلق:

اسلامی تحریک کا پہلا امتیاز تفکر فی الخلق تھا۔ قرآن وحدیث میں ایسے متعدد احکام ہیں جن میں انسان کو کائنات، آسمان، زمین اور دوسری اشیاء کی تخلیق پر تدبر، تفکر اور غور وفکر کی ہدایت اور تاکید کی گئی ہے۔ اس تفکر فی الخلق کے نتیجہ میں وہ ذات خداوندی کا ادراک واعتراف کر کے، متاع ایمان سے مالا مال ہوا چنانچہ اسلام کی دی ہوئی ان تعلیمات کے زیر اثر عرب کے ریگستانوں میں رہنے والوں نے فطرت کے مطالعہ اور غور وفکر کی جانب توجہ مبذول کی۔ یہی چیز طبعی علوم میں ترقی کا موجب بنی۔ مسلمانوں نے سائنس، فلسفہ اور دیگر علوم میں حیرت انگیز ترقی کی اور دنیا کی دوسری قوموں کو اس دوڑ میں نہ صرف پیچھے چھوڑ دیا بلکہ دنیا کے امام اور قائد بن گئے چنانچہ ایک مغربی مفکر لکھتا ہے کہ ’’اسلام کی تعلیمات محض روحانیت اور عبادات تک محدود نہیں بلکہ اس کے زیر اثر علوم طبیعیہ، طب اور فلکیات میں بھی ترقیاں ہوئیں، قرآن علوم کا سرچشمہ ہے۔ اس نے طبعی علوم کی ہمت افزائی کی اور عام زندگی میں فطرت کے مطالعہ اور غور وفکر کی جانب توجہ مبذول کروائی۔‘‘

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

-2 تحقیقی روایت کی بنیاد:

اسلام کی علمی تحریک کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تحقیق کی روایت کا آغاز کیا گیا ہے۔ قرآن میں فرمان الٰہی ہے کہ

''اے مومنو! اگر کوئی فاسق شخص تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تم اس کی تحقیق کر لیا کرو۔'' (الحجرات:۶)

پھر ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ

''کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ سنی سنائی بات آگے دوسروں کو (بلا تحقیق) پہنچا دے۔'' اس طرح قرآن و حدیث نے ایک ''رویہ'' تشکیل دیا جس سے مسلمانوں میں چھان پھٹک اور تحقیق کا رجحان پیدا ہوا۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں نے حفاظت قرآن، تدوین قرآن، سیرت نگاری اور تاریخ نویسی کے اصول وضع کیے۔ علاوہ ازیں طبعی علوم میں تجربے کی بنیاد رکھی۔ اس طرح مسلمانوں نے دنیا کی دیگر قوموں کو ''اصول تحقیق'' سے آشنا کیا۔ انہی اصول ہائے تحقیق کے تحت مسلمانوں نے یونانی علوم میں موجود غیر معتبر مواد کو تجربہ شدہ ذخیرہ سے الگ کیا اور ثابت شدہ تحقیق پر مبنی علوم کو آگے بڑھایا۔

چنانچہ فرانسیسی محقق ڈاکٹر گستاؤلی بان لکھتا ہے:

''عربوں کے کتب خانے علمی تحقیقات کے کارخانے اور آلات تعلیم و تحقیق کے لازمی وسائل ہیں۔ علمی تحقیق کے اصولوں کے موجد عرب تھے جو عرصہ ہائے دراز کے بعد، ہمارے یورپی محققین کے ہاتھوں میں بڑی بڑی انکشافات اور ایجادوں کا ذریعہ بنے۔''

-3 سائنسی طریقہ کار:

اسلامی علمی تحریک کا ایک اور امتیاز سائنسی طریق کار ہے۔ سائنسی طریق کار سے مراد وہ طریقہ کار ہے جس پر عمل کرتے ہوئے ایک سائنس دان نئے فارمولے اور اصول دریافت کرتا ہے۔ سائنسی طریق کار کے چار مراحل مشاہدہ، تجربہ، اخذ نتائج اور تنظیم نتائج ہیں۔ اس سائنسی طریق کار کی بدولت انسان کی معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوتا ہے۔ یہ سائنسی طریقہ کار فی الحقیقت مسلمانوں کا وضع کردہ ہے۔ جابر بن حیان نے کیمیاء میں تجربات کی بنیاد رکھی وہ کہا کرتا تھا کہ

''تجربہ کیا کرو کیونکہ وہ علم جو تجربے کے بغیر حاصل ہو اس کی کوئی حیثیت نہیں۔''

اسی طرح ابن الہیثم نے طبیعات میں آلات بنا رکھے تھے، جن کی مدد سے وہ ایک جدید سائنس دان کی طرح تجربات کرتا تھا۔

''مسلمانوں کے اس کارنامے کا اعتراف مشہور مغربی محقق رابرٹ بریفالٹ نے ان الفاظ میں کیا ہے''۔

''یونانی علوم، سائنسی تجربے کے بغیر محض نظریات ہی تھے۔ سائنس تجربے ہی کا نام ہے اور اسے مسلمانوں نے ہی متعارف کرایا۔ موجودہ سائنسی تہذیب میں اگر مسلمانوں کا تجربہ شامل نہ ہوتا تو اس تہذیب کی ترقی جدید معیار تک کبھی نہ پہنچ سکتی۔''

اسلامی تہذیب کے عالمی اثرات

ا۔ انصاف پسند مغربی مصنفین کا اعتراف:

تہذیب انسانی آج جس بلند مقام پر ہے اسے یہاں تک پہنچانے میں اسلامی تہذیب نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ موجودہ علمی، فکری، سائنسی، فنی اور ثقافتی ترقی کی اساس وہ شاندار تہذیب ہے جو تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی اور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آٹھویں صدی ہجری/ چودھویں صدی عیسوی کے درمیانی عرصے میں مسلمانوں کے ہاتھوں معرض وجود میں آئی۔ اس امر کا اعتراف کئی انصاف پسند مغربی مصنفین نے کیا ہے مثلاً کارادادو (Cara De Vaux) کہتا ہے کہ ''مسلمانوں نے مختلف علوم میں بہت بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ انھوں نے ریاضیات میں اعداد کا استعمال سکھایا حالانکہ وہ ان کے موجد نہ تھے اور اس طرح وہ روزانہ زندگی میں علم حساب کے بانی بن گئے۔ انھوں نے الجبرا کو زیادہ صحیح علم بنایا اور اس کو بے انتہا ترقی دی۔ اس کے علاوہ ہندسۂ تحلیلی کی بنیادیں استوار کیں۔ وہ بلاشبہ سطحی وکروی مثلثات (Trignometry) کے موجد تھے جن کا یونان میں کوئی وجود نہیں تھا۔ علم ہیئت میں انہوں نے بیش بہا ایجادات کیں۔ انہوں نے ایسی متعدد یونانی تصانیف کا ترجمہ کر کے انھیں ہمارے لیے محفوظ کر دیا جن کے اصل متن تلف ہو چکے تھے۔ جس زمانے میں مسیحی مغربی بربریت کے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا ان دنوں عربوں نے بلند تر علمی زندگی اور مطالعے کی شمع روشن رکھی۔

۲۔ فرانسیسی محقق ڈاکٹر گستاؤلی بان:

عربوں کی علمی تحقیقات کے طریقے پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''کتب خانے علمی تحقیقات کے کارخانے اور آلات تعلیم وتحقیق کے لازمی وسائل ہیں۔ لیکن یہ محض وسائل ہی ہیں اور ان کا کارآمد ہونا محض ان کے طریقہ استعمال پر موقوف ہے۔ ممکن ہے کہ کسی شخص کا دماغ دوسروں کے علوم وفنون سے بھرا ہوا ہو مگر اس میں خود تحقیق یا اختراع کا مادہ ہی نہ ہو اور وہ شاگردی کی حالت سے استادی کی حالت کو پہنچ ہی نہ سکے۔ ان ایجادوں اور اختراعوں سے جن کا ذکر آگے آئے گا معلوم ہوگا کہ عربوں نے اس علم سے جو انہوں نے دوسروں سے اخذ کیا کس قدر کام لیا۔ یہاں ہم محض ان اصولوں کو بیان کریں گے جن پر انہوں نے اپنی علمی تحقیق کا مدار رکھا۔ یونانیوں کی شاگردی کرنے اور ان کی تصنیفات کو پڑھنے کے بعد انہیں بہت جلد معلوم ہو گیا کہ تجربہ اور مشاہدہ کو عمدہ سے عمدہ کتاب پر ترجیح ہے۔ اگرچہ یہ قول اس وقت ایک قضیہ مسلمہ ہے لیکن پہلے ایسا نہ تھا۔ زمانہ متوسط کے علماء نے ایک ہزار برس کی محنت میں اس مسئلہ کو سمجھا۔ تجربہ اور مشاہدہ کو اقوال اساتذہ کے مقابل میں تحقیقات علمی کے اصول قرار دینا عموماً بیکن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن اس وقت تسلیم کرنا چاہیے کہ اس کے موجد عرب تھے۔ کل محققین یورپ علی الخصوص ہمبولڈ جنہوں نے عربی تصنیفات کو دیکھا ہے اب اس امر کے قائل ہیں۔ ہمبولڈ اس لکھنے کے بعد کہ علمی ترقی کا اصلی درجہ یہ ہے کہ انسان خود اور اپنے ارادہ سے یعنی بذریعہ تجربہ حوادث طبعیہ کو پیدا کر سکے بطور تمثیل لکھتا ہے۔ عربوں نے یہ درجہ جس سے متقدمین بالکل ناواقف تھے حاصل کر لیا تھا۔''

موسیو سدی یو لکھتے ہیں: ''دار العلوم بغداد کی تعلیم میں بہت بڑی بات یہ کہ اس کی طرز استدلال بالکل علمی اصول پر مبنی تھی یعنی معلوم کے ذریعہ سے غیر معلوم کو دریافت کرنا۔ حوادث کا درست مشاہدہ کر کے ان معلومات کے ذریعہ سے علل کو نکالنا۔ ان ہی قضایا کو ماننا جو تجربہ سے ثابت ہو چکے ہوں یہ ان اساتذہ کے اصول تحقیق تھے۔ نویں صدی عیسوی کے عربوں کو یہ پر نتائج طریقہ تحقیق معلوم تھا۔ جو سالہائے دراز کے بعد ہمارے حال کے محققین کے ہاتھوں میں بڑی بڑی انکشافات اور ایجادوں کا آلہ بن گیا۔''

۳۔ رابرٹ برفالٹ (Robert Briffault)

نے اپنی کتاب Making of Humanity میں مسلمانوں کی علمی خدمات کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے: ''دنیائے حاضر پر اسلامی علوم وفنون کا بڑا احسان ہے۔ عربوں (مسلمانوں) نے علم کے ان تمام سرچشموں سے جو دستیاب ہو سکتے تھے اپنا علم حاصل کیا۔ انھوں نے قدیم علم میں تحقیق کی نئی روح پیدا کی ریاضیات کو ترقی دی اور تجربے مشاہدے اور پیمائش کے اسلوب اختیار کیے۔ عربوں نے یونانیوں کے علمی نظریات پر تنقید بھی کی اور ان پر اضافہ بھی کیا۔ انھوں نے بطلمیوس کے علم الکائنات کو تو قبول کر لیا لیکن اس کی فہرست نجوم یا ستاروں کی جدول یا اس کی پیمائشوں کو قبول نہیں کیا۔ انھوں نے خود ستاروں کی بے شمار فہرستیں مرتب کیں۔ کسوف کے ترچھے پن اور استقبال اعتدالین کی صحیح اقدار معلوم کیں اور سمت الراس کی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دوالگ الگ پیمائشوں سے کرہ ارضی کی جسامت کو متعین کیا۔ البیرونی نے معدنیاتی نمونے جمع کیے اور وہ اب تک صحیح ہیں۔ مختلف اشیاء کو الگ الگ تول کر اوزان مخصوصہ کے جو نقشے تیار کیے وہ اب تک صحیح ہیں۔ عربوں نے صفر کا استعمال رائج کر کے ترسیم اعداد کے نظام اعشاریہ کو مکمل کیا۔ انھوں نے الجبرا ایجاد کیا اور اسے چوتھے درجے کی تعدیلات کے حل تک پہنچا دیا۔ انھوں نے علم مثلث کا استعمال شروع کیا اور یونانیوں کے وتر (Chort) کی جگہ جیب زاویہ اور مماس (Sine, Tangent) کو ترویج دی۔ البتانی نے سورج کے اوج مدار کی حرکت کا انکشاف کیا اور ابوالوفا نے قمر کے ثانوی اختلافات کا پتا چلایا۔ ابن الہیثم نے قوس قزح پر لکھا۔ اس طرح انھوں نے انسانی تحقیق وتجسس کی قوتوں میں ہزار گنا اضافہ کیا اور یورپ کی نشاۃ الثانیہ عربی علوم وفنون کے مطالعے ہی کے زیر اثر وجود میں آئی۔"

۴۔ جارج سارٹن:

لاطینی، انگریزی اور ہندی ریاضیات کا ذکر کرنے کے بعد جب مسلمانوں کی علمی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو لکھتے ہیں: یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم اندھیرے سے روشنی میں آ گئے ہیں یا ایک خوابیدہ عالم سے غیر معمولی طور پر بیدار اور سرگرم عمل دنیا میں آ گئے ہیں۔"

ایک اور جگہ وہ یوں رقمطراز ہیں:

"قرن یازدھم میں علم وحکمت کا حقیقی ارتقا مسلمانوں کا رہین منت تھا۔ اس زمانے کی اچھوتی اور نادر خدمات کا تعلق صرف ریاضی سے ہے اور از اول تا آخر مسلمانوں ہی کی سعی وکاوش کا نتیجہ۔ عمر خیام ان کا سب سے زیادہ فطین اور بدیع الفکر نابغہ ہے۔ جو اس عہد میں گزرا اور جس کے ہم ان تخلیقات کے لیے ممنون احسان ہیں۔ عمر خیام کا زمانہ اسلامی علم وحکمت کے عصر زریں کا اختتام ہے۔ عمر خیام کے عہد کے بعد مسلمان علمائے ریاضی کی تعداد کم ہو گئی۔ مسیحی ریاضی دانوں کی جدوجہد سے اگرچہ زیادہ کاوش اور سرگرمی کا اظہار ہوا، بایں ہمہ ان کی سطح اس قدر پست تھی کہ اس سے اسلامی کوششوں کے انحطاط کی تلافی نہیں ہوئی۔ پھر اس انحطاط کے باوجود اس وقت کے بعد مسلمان علماء کے کارنامے بڑے شاندار اور معرکہ خیز ہیں۔"

۵۔ ڈاکٹر گستاؤلی بان:

مغرب پر مسلمانوں کے اثرات کے بارے لکھتے ہیں:

"عربوں کا علمی اور ادبی اثر۔ اب ہم اس امر کو ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ عربوں کا اثر مغرب میں بھی اتنا ہی ہوا جتنا مشرق میں ہوا اور ان ہی کی بدولت یورپ نے تمدن حاصل کیا۔ ان کا اثر یورپ پر مشرق سے کم نہ ہوا لیکن البتہ اس اثر کی نوعیت میں فرق ہے۔ مشرق میں یہ اثر زیادہ تر مذہب اور زبان اور فنون وحرفت پر پڑا بر خلاف اس کے مغرب میں مذہبی اثر بالکل نہیں ہوا اور فنون وحرفت کا اثر بہت کم لیکن علوم وادب کا اثر بے انتہا ہوا۔ عربوں نے جو اثر یورپ پر ڈالا اس کا اندازہ کرنے کے لیے ہمیں یورپ کی اس زمانہ کی حالت دیکھنی چاہئے جس وقت تمدن عرب یہاں پہلے آیا۔

اگر ہم یورپ کی نویں اور دسویں صدی عیسوی کی حالت کو جس وقت مسلمانوں کا تمدن اندلس میں اعلیٰ درجہ کی ترقی پر تھا دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہمارے علمی مرکز وہ بڑے بڑے بے ڈھنگے قید خانے تھے جہاں امراء اپنی نیم وحشی حالت میں رہتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے کہ انہیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔ عیسائیوں میں سب سے زیادہ باعلم وہ بیچارے جاہل راہب تھے جو اپنے وقت کو خانقاہوں کے کتب خانوں سے یونان روم کی پرانی تصانیف کو نکال کر ان کو چھیلنے اور ان چرمی ورقوں پر اپنی مہمل مذہبی تصانیف لکھنے میں صرف کرتے تھے۔

اہل یورپ کی وحشیانہ حالت ایک زمانہ دراز تک ایسی شدید رہی کہ خود ان کو اس کا احساس نہ تھا۔ البتہ گیارہویں صدی عیسوی میں اور زیادہ تر بارہویں صدی میں کسی قدر علمی امنگیں پیدا ہونے لگیں۔ جس وقت چند روشن خیال اشخاص کو اس جہالت کے کفن کو پھاڑنے کی ضرورت معلوم ہوئی تو انھوں نے عربوں کی طرف جو اس زمانہ کے اساتذہ تھے رجوع کیا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جیسا کہ بار بار کہا جاتا ہے یورپ میں عربوں کے علوم جنگ صلیبی کے ذریعہ سے نہیں پھیلے بلکہ اندلس اور جزیرہ صقلیہ اور اطالیہ کے ذریعہ سے۔ 1130ء سے طلیطلہ میں رئیس الاساقفہ ریمانڈ کی سرپرستی میں ایک مدرسہ مترجمین کا قائم ہوا اور اس نے تمام مشہور عربی تصانیف کا لاطینی میں ترجمہ شروع کیا ان ترجموں نے غایت درجہ کامیابی حاصل کی۔ یورپ کی آنکھوں کے آگے ایک نئی دنیا نظر آنے لگی اور بارہویں، تیرہویں چودھویں صدی تک انہوں نے اس ترجمہ کے سلسلہ کو جاری رکھا۔ نہ فقط عربی تصانیف الرازی ابلقاس ابن سینا اور ابن رشد کا ترجمہ لاطینی میں کیا گیا بلکہ ان مصنفین یونان کی تصنیف کا بھی ترجمہ لاطینی میں ہوا جن کو عربوں نے زبان یونانی سے اپنی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ مصنفین جالینوس بیوقراطیس، افلاطون، ارسطو، اقلیدس، آرکی مدوس اور بطلیوس تھے۔ ڈاکٹر الکلرک اپنی تاریخ طب عرب میں تین سو سے زیادہ تصنیفات عرب کا ذکر کرتے ہیں جن کا ترجمہ لاطینی مین ہوا۔ زمانہ متوسط میں قدمائے یونان کی تصانیف کا علم ان کے عربی ترجمہ ہی کے ذریعے سے پھیلا تھا ان ہی ترجموں کی بدولت وہ تصانیف قدیمہ ہم تک پہنچتی ہیں جن کی اصلیں بالکل تلف ہوگئیں مثلاً اپولونس کی کتاب الحر وطیات جالینوس کی کتاب امراض متعدیہ اور ارسطو کی کتاب الاعجاز وغیرہ وغیرہ۔

صرف عربوں کی بدولت نہ ان راہبوں کی وجہ سے جو زبان یونانی کا نام بھی نہ جانتے تھے تصانیف قدیمہ ہم تک پہنچی ہیں اور دنیا کو ہمیشہ ان کا ممنون رہنا چاہیے کہ انہوں نے ذخیرہ بے بہا کو تلف ہونے سے بچایا۔ موسیو لی بری لکھتے ہیں کہ اگر عربوں کا نام تاریخ میں سے نکال دیا جاتا تو یورپ کی علمی نشاۃ الثانیہ کئی صدی تک پیچھے ہٹ جاتی۔"

بعض دیگر مصنفین:

یورپ کے ان انصاف پسند علماء اور مصنفین نے جو مغرب کی موجودہ علمی و فکری ترقی کو مسلمانوں کی مرہون منت قرار دیتے ہیں درج ذیل اسماء قابل ذکر ہیں:

1- اندریاس الباغوس (Anudreas Alpagus)۔ اس کا نام عربوں کا دفاع کرنے والوں میں سب سے نمایاں ہے۔ اس نے دمشق میں تین برس قیام کیا پھر 1515ء میں پاڈوا (Padua) واپس چلا گیا اور بہت سی عربی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ انہی کتابوں میں ابن النفیس کی وہ مشہور کتاب بھی ہے۔ جس کو ہسپانیہ کے مائیکل سروٹ (Michel Servet)(1553-1511) نے اپنی طرف منسوب کر لیا۔

2- ویڈیمان (E.Widemann) اور شرام (M.Schramm) جیسے بعض ماہرین اور راجر بیکن اور لیونارڈو ڈاونشی Leonardo (Davinci)(1519-1452) جیسے لوگوں پر ان کے نمایاں اثرات کی نشاندہی کر دی ہے۔

3- Jakob Reisk (1774-1716)

4- کرٹ سپرنگل (Kurt Sprengel)

5- جرمنی کا مشہور شاعر و ادیب گوئٹے (J.W.Goethe)(1832-1749)

6- جرمنی کا مشہور سیاح اور محقق الیگزنڈر فون ہمبولڈ (Alexander Van Humbollt)(1859-1769)

7- پرانٹل C. Prantal (م 1893) یہ لکھتے ہیں: راجر بیکن نے وہ تمام نتائج عربوں سے اخذ کیے تھے جو علوم طبیعہ میں اس سے منسوب چلے آئے ہیں۔

8- اطالوی عالم و مصنف نلینو کارلو الفانسو Nallino Carlo Alfanso (1938-1872) عربوں کے علوم کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس نے مختلف علوم اسلامیہ پر بہت سے مقالات لکھے۔ جن کا مجموعہ چھ جلدوں میں 1942 تا 1939ء میں شائع ہوا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مسلمانوں کے علمی کام کی نوعیت:

مختلف علوم وفنون میں مسلمانوں کی سرگرمیوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1- متقدمین کے چھوڑے ہوئے علمی ورثے کو محفوظ کرنا خاص طور پر یونانیوں نے جو علمی ورثہ چھوڑا تھا، جو انتہا پسند مسیحی علماء کے ہاتھوں یورپ بدر ہو چکا تھا۔ پوپ گریگوری اعظم (Popgregory the Great) نے قیصر آگسٹس (Caeasar Augustus) کے قائم کردہ شاہی کتب خانہ کو نظر آتش کر دیا تھا۔ ان کی جگہ اس نے وہ صنمیاتی عیسائیت رائج کی جس کا رکن رکین مقدس شخصیتوں کے واقعات اور تبرکات کی پرستش تھی۔

2- علم وفکر کی آزادی مکمل طور پر چھین لی گئیں تھی۔ جو شخص انفرادی طور پر فلسفہ اور سائنس کا مطالعہ کرتا کلیسا اسے زندہ جلا دیتا۔ یورپ کے عہد تاریک کی تاریخ ایسے اندوھناک واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ اگر مسلمان اس قدیم ورثے کی حفاظت نہ کرتے تو یہ بالکل ضائع ہو جاتا۔ مسلمانوں نے تمام علوم وفنون میں گراں قدر اضافے کیے۔ مسلمانوں نے بہت سے نئے علوم کی بنیاد رکھی مثلاً کیمیا، بصریات، مثلثات، بطور ایک مستقل علم، فلسفہ تاریخ اور عمرانیات۔ مسلمانوں کی علمی وفکری خدمات کی تفصیل آئندہ صفحات میں بیان کی جائے گی۔

مسلمانوں کے علوم یورپ میں کیسے پہنچے:

یہ بات اب خود یورپی علماء نے ہی ثابت کر دی ہے کہ مسلمانوں کے علوم وافکار ہی یورپ کی علمی وفکری ترقی کی بنیاد ہیں۔ یورپی ممالک کی تمام یونیورسٹیوں میں عربی کتابوں کے متراجم شامل نصاب رہے ہیں۔ یورپ میں مسلمانوں کے علوم پہنچنے کے دو ذریعے تھے:

1- اندلس میں یورپی طلبہ آ کر براہ راست مسلمان فلاسفہ اور سائنسدانوں سے اکتساب علم کرتے۔ مسلم اساتذہ کے شاگردوں میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو بعد میں عیسوی کلیسا کے سربراہ بنے مثلاً گربرٹ (Gerbert) جو بعد میں پوپ سلوسٹر ثانی (Pope Sylvesterii II) بنا قرطبہ سے فارغ التحصیل ہوا۔

2- عربی کتب کے یورپی زبانوں میں ترجموں کا سراغ ملتا ہے۔ ترجمے کا یہ سلسلہ برابر چلتا رہا۔ جیراڈ کوموٹی (بارھویں صدی عیسوی) نے نوے سے زائد عربی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ ترجمے کے لیے باقاعدہ طور پر دو مدرسے قائم کیے گئے تھے۔ ایک مدرسہ بحر اسود کے ساحل پر طرازون میں قائم ہوا تھا اور دوسرا چودھویں صدی عیسوی میں قسطنطنیہ میں قائم ہوا تھا۔ ان مدرسوں میں مسلمانوں کی تازہ ترین کتب کا ترجمہ کر کے یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھجوایا جاتا تھا۔ تحریک احیا (Renaissance) کے زمانے میں بہت سے علوم مثلاً حیوانات، نباتات، حجریات، آثار علویہ اور کیمیا کا بانی مشہور ترین شخصیت عظیم البرٹس (Albertus Magnus) کو سمجھا جاتا ہے۔ اب یقینی طور پر معلوم ہو چکا ہے کہ وہ یونانی زبان سے ناواقف تھا اور اس کا ماخذ ابن سینا ابن رشد اور جابر بن حیان کی کتابیں ہیں۔ راجر بیکن (Roger Bacon) البرٹس میگنس (Albertus Magnus) اور رابرٹس گروسٹیٹے (Robertus Grosseteste) جو تیرھویں صدی عیسوی میں سائنسی علوم کے ستون سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں ثابت ہو گیا ہے کہ انہوں نے عربی کتب کے تراجم سے استفادہ کیا تھا اور ان کی بنیاد مسلمانوں کی کتابیں ہیں۔ اس طرح یہ بات بھی اب ثابت شدہ ہے کہ لیوی بن گرسون (Leviben Gerson)، کوپرنیکس گلیلیو اور کیپلر کے اہم ماخذ بھی عربی کتب تھیں۔ اٹھارہویں صدی عیسوی تک یورپ کے سائنسدان اور فلاسفہ مسلمانوں کی بہت سی کتابوں اور ایجادات کو غلط طور پر اپنے سے منسوب کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح حجرہ تاریک (Camera Obscura) مثلثات کرویہ (Spherical Triangles) اور عصائے یعقوب (Jacob's Staff)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کی ایجاد کو غلط طور پر لیوی سے منسوب کر دیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں یورپی محققین نے ثابت کیا کہ حجرہ تاریک کی ایجاد کا کارنامہ ابن الہیثم نے انجام دیا تھا۔ مثلثات کروی کو چوتھی صدی ہجری کے مسلمان علماء، ابوالفاء، البوز جانی اور ابونصر بن عراق نے دریافت کیا تھا اور یعقوب نام کے آلے کا اصل موجد ابن سینا ہے۔

اسلامی تہذیب کے عالمی اثرات کے بارے تحقیقات ابھی جاری ہیں اور امید ہے کہ اس سلسلے میں مستقبل میں مزید اہم انکشافات ہوں گے اور قدرت کے انصاف کے تحت حق داروں کو ان کا حق مل کر رہے گا۔

اسلام کی علمی تحریک

مسلمانوں کے مختلف علوم وفنون میں کارہائے نمایاں (Contributions) پر روشنی ڈالنے سے پہلے چند باتیں اسلام کی علمی تحریک کے حوالے سے ضروری محسوس ہوتی ہیں۔

اسلام اور علم وحکمت لازم وملزوم ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: مجھے تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔ نیز آپ ﷺ کا فرمان ہے: حکمت مومن کی گمشدہ چیز ہے، جہاں بھی اسے حکمت ملے وہ اس کے لینے کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہ دعا کرتے رہنے کی تعلیم دی: اور کہیے اے میرے رب میرا علم بڑھا دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کو چھوڑ کر صرف انسان کو خلافت ارضی یعنی زمین کی حکومت اور اس میں تصرف کرنے کے اختیار صرف علم کی بنیاد پر عطا کیا ہے۔ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کے اسماء تعلیم فرما دیئے سے یہی مراد ہے کہ انسان کے اندر اشیاء کے خواص معلوم کرنے اور کائنات میں جاری وساری قوانین قدرت دریافت کر کے انہیں اپنے استعمال میں لانے کی صلاحیت بخشی ہے۔ زمین میں جو کچھ ہے سب انسان کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب کو انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ یہ سب باتیں وہ حقیقتیں ہیں جو قرآن حکیم میں بیان کر دی گئی ہیں۔ خلافت ارضی کے منصب کا تقاضا ہے۔ کہ انسان کائنات میں غور وفکر کرے۔ قوانین قدرت کو دریافت کرے اور اشیاء کے خواص معلوم کرے تا کہ وہ انہیں اپنی خدمت میں لا سکے۔ اس نے کائنات کو تسخیر نہیں کرنا ہے۔ اس کے لیے کائنات کو اللہ نے پہلے ہی مسخر کر رکھا ہے۔ اس نے صرف علم حاصل کر کے اسے استعمال میں لانا ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے علم کی جستجو کو ہر مسلمان مرد وزن پر فرض قرار دیا ہے۔ قرآن وحدیث میں علم حاصل کرنے اور کائنات میں غور وفکر کرنے کی بہت زیادہ تلقین کی گئی ہے۔ جو مسلمان اپنی خداداد صلاحیتوں کو استعمال میں لا کر علم حاصل نہیں کرتا وہ امانت میں خیانت اور کفران نعمت کا مرتکب ہے۔

علمی تحریک کی ابتدا:

رسول کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے یہ منصب سونپا تھا کہ آپ ﷺ لوگوں کا تزکیہ کریں یعنی ان کی اخلاقی تعلیم وتربیت کریں تا کہ وہ نیک سیرت بن جائیں اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیں۔ آپ ﷺ نے اپنے فرائض منصبی احسن واکمل طریقے سے انجام دیے۔ آپ ﷺ ہمہ وقت معلم تھے۔ آپ ﷺ کی احادیث مبارک کا ایک عظیم ذخیرہ ہمارے پاس محفوظ ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے لوگوں کو حکمت (دانائی) کی تعلیم کا فرض کس خوبی سے نبھایا۔ آپ ﷺ کے جوامع الکلم علم وحکمت کا بے مثال خزانہ ہیں۔ آپ ﷺ نے مسجد نبوی ﷺ کا ایک حصہ جو صفہ کے نام سے مشہور ہے باقاعدہ تعلیم وتعلم کے لیے مخصوص کر رکھا تھا اور وہاں پڑھنے پڑھانے والوں کو اصحاب صفہ کہتے ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو وہ تمام مفید علوم و فنون سیکھنے کی ہدایت فرمائی جو اس زمانے میں متداول ومیسر تھے۔ آپ ﷺ نے حکم فرما رکھا تھا کہ مسلمانوں کو نشانہ بازی، پیراکی، تقسیم ترکہ کی ریاضی، مبادی طب، علم ہیئت علم انساب اور علم تجوید قرآن کی تعلیم دی جایا کرے۔ تعلیم کے لیے آپ ﷺ کی مساعی جمیلہ اور احکام ہدایات کی اہمیت اس وقت اور بھی اجاگر اور واضح ہو جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کا قیام مدینہ کا پورا دس سالہ دور مسلسل جنگوں کا دور تھا۔ جہالت کے شیدائیوں اور علم

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

باہر کے دشمنوں نے مسلمانوں پر پے در پے جنگیں مسلط کیں اور ایک پل بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ ان حالات میں انسانیت کے معلم و محسن ﷺ کے علم و
تعلیم سے شغف اور اس کی سرپرستی کا یہ عالم تھا۔

علمی تحریک کا ارتقاء و عروج:

اسلام نے شرک وادھام پرستی اور مظاہر فطرت کی پرستش کا خاتمہ کر کے اور کائنات میں انسان کا اعلیٰ مقام قرار دے کر تمام علوم کی ترقی کا
دروازہ کھول دیا۔ نیز مسلمانوں کو علم حاصل کرنے اور تفکر فی الخلق کا حکم دے کر علوم کی ترقی کو یقینی بنا دیا تھا۔ پہلی صدی ہجری فتوحات ملکی اور حکومت کے
انصرام و استحکام کا دور تھا۔ پھر بھی اس دور میں قرآن و حدیث فقہ، عربی زبان کی گرامر عربی لغت و ادب اور طب کی ترقی کی طرف بھرپور توجہ دی گئی۔
اموی دور میں طب کیمیا اور ہیئت وغیرہ پر یونانی سے عربی میں کئی کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ جملہ متداول علوم کے باقاعدہ ارتقاء کا دور عباسی خلیفہ
ابوجعفر منصور (158ھ تا 136ھ) کے عہد حکومت سے شروع ہوتا ہے اور ارتقاء کا یہ عمل عباسی خلیفہ مامون (218ھ تا 198ھ) کے دور میں اپنے
عروج کو پہنچ جاتا ہے۔ یہ ایک صدی مختلف ملکوں مثلاً یونان، ہندوستان، ایران اور مصر وغیرہ کے تہذیبی ورثے کو عربی زبان میں منتقل کر کے مسلمانوں
میں اسے متعارف کرانے کا زمانہ ہے۔ منصور عباسی علوم کا شیدائی تھا۔ نئے شہر کی تعمیر سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اطراف ملک سے علماء و حکماء کو بلوا
کر بغداد میں جمع کیا اور ان کی قدر افزائی کی۔ اس کے عہد میں بہت سی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ مامون الرشید (193ھ تا 170ھ) نے اپنے
عباسی پیشرووں کی شروع کی ہوئی علمی تحریک کو اور آگے بڑھایا۔ اس نے غیر ملکی زبانوں سے عربی میں ترجمے کے لیے ایک عظیم الشان ادارہ قائم کیا جو
بیت الحکمت کے نام سے بہت مشہور ہے۔ اس میں ایک وسیع کتب خانہ تھا۔ جہاں علماء اور خصوصی ماہرین بیٹھ کر دوسری زبانوں میں لکھی گئی کتب فلسفہ و
علوم کا عربی میں ترجمہ کرتے تھے۔ مامون کے زمانے میں تراجم کرنے اور ان سے استفادہ کا کام اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ مامون نے قیصر روم کے پاس
حکماء کا ایک وفد بھیجا اور فرمائش کی کہ قدمائے یونان کی کتابیں اسے دے دے۔ روم میں فلسفہ و سائنس کی کتابوں کو ایک ویران عمارت میں چھپا کر رکھا
ہوا تھا تاکہ لوگ ان کا مطالعہ کر کے گمراہ نہ ہو جائیں۔ مسیحی راہبوں نے مامون کی فرمائش کا سن کر خوشی کا اظہار کیا چنانچہ قیصر روم نے وہ تمام علمی خزانہ اس
وفد کے حوالے کر کے اطمینان محسوس کیا۔ مامون نے بیت الحکمت کے لیے قدیم کتب اور دستاویزیں مختلف ممالک سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر مہیا کیں۔ مامون
علم و فنون کا عظیم اور بے مثال جویا اور سرپرست تھا۔ ترجمہ کا کام کرنے والے علماء میں حنین بن اسحاق، محمد بن موسیٰ خوارزمی اور یعقوب الکندی، بہت ممتاز
اور نمایاں ہیں۔

عباسی دور کے آغاز میں ہی اندلس میں آزاد و خود مختار اموی خلافت قائم ہو گئی۔ جس کا بانی عبدالرحمان الداخل تھا۔ اندلس رفتہ رفتہ علوم و
فنون کا گہوارہ بن گیا اور اندلس میں مسلمانوں کی حکومت یورپ کے لیے رحمت بن گئی۔ جہالت اور اوہام کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے یورپ میں
اندلس کی روشن شمع علم سے مستنیر ہونے والے دیے جگمگانے لگے جو رفتہ رفتہ عظیم علمی تحریک کا ذریعہ بن گئے۔

مسلمانوں نے غیر ملکی کتب کے عربی تراجم کا مطالعہ کیا ان کا گہرا فہم و ادراک پیدا کیا اور پھر جلد ہی ان کا تجزیہ اور ان کی تنقیح و تنقید کا ارفع
کام شروع کر دیا۔ تنقید و تجزیہ کے بعد اگلے مرحلے میں انہوں نے قدماء کے علوم و افکار میں قیمتی اور دقیع اضافے اور ایجادات شروع کر
دیں۔ 656ھ/1258ء میں ہلاکو خان کے ہاتھوں سقوط بغداد اور تاتاریوں کے ہاتھوں اسلامی مملکت کے بہت سے علاقوں کی تاخت و تاراج کے بعد
اور ادھر اندلس میں مسلمانوں کے زوال سے اسلام کی اس علمی تحریک کو زبردست دھچکا لگا۔ اس کے بعد یہی تحریک یورپ میں منتقل ہو گئی۔ ذیل میں
مسلمانوں کی مختلف علوم میں اختراع و ایجاد کا مختصر حال بیان کیا جائے گا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

1- علم ریاضیات (Mathematics):

محمد بن موسیٰ خوارزمی (م220 ہجری) نے الجبرا کو الگ اور مستقل حیثیت دی۔ ازمنہ متوسطہ (Middle ages) میں یورپی علمائے ریاضیات کی معلومات کا انحصار خوارزمی کی کتابوں پر رہا ہے اور لاطینی زبان میں اس کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔

ثابت بن قرہ (م288 ہجری) نے جیومیٹری کی بعض اشکال کے متعلق ایسے مسائل اور کلیات دریافت کیے جو اس سے پہلے معلوم نہ تھے۔

ابوالوفا البوزجانی (م387 ہجری) علم المثلثات کے اولین موجدوں میں سے ہیں۔ زاویے کی چھ نسبتیں یعنی Cosine، sine، Tangent، Secant، co-tangent اور Co-secant اس کی طرف منسوب ہیں۔ اس نے چاند کی تیسری حالت کا انکشاف کیا جسے انحراف کہتے ہیں۔

ابوعبداللہ البتانی (م317 ہجری) نے علم المثلثات کے تناسبات کے متعلق جو تصورات رائج کیے وہ اب تک مستعمل ہیں۔ اس کی شہرت کا مدار ایک زیج پر ہے، جو زیج الصابی کہلاتی ہے۔ اس کا لاطینی ترجمہ 1537ء میں شائع ہوا تھا۔

الجریطی (م1007 عیسوی) نے تجارتی حساب پر ایک کتاب لکھی جو اس موضوع پر پہلی تصنیف ہے۔

عمر خیام (م515 ہجری) نے تحقیقات سے شمسی سال کی پیمائش 365 دن 5 گھنٹے 49 منٹ بتائی۔ اس کی پیمائش اور موجودہ زمانے کی پیمائش میں صرف 11.3 سیکنڈ کا فرق ہے۔ عمر خیام نے الجبرا پر بھی ایک کتاب تصنیف کی۔ جس میں خوارزمی کی بعض غلطیوں کی تصحیح کی گئی ہے اور بہت سے نئے مسائل کا اضافہ کیا گیا ہے۔

نصیرالدین طوسی (م672 ہجری) کی مثلثات کرویہ پر تحقیقات اعلیٰ نتائج کی حامل ہیں۔

البیرونی (م404 ہجری) نے علم المثلثات کے طریقوں کے اطلاق سے پائی کی قیمت 3.14174 نکالی ہے۔ جو موجودہ زمانے کی مسلمہ قیمت سے صرف 00016. کم ہے۔ البیرونی نے اپنے نظریہ عوامل کی وضاحت کی ہے۔ اس کلیے کو نیوٹن سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ البیرونی نے کروی مثلثات کے بعض نئے مسائل بھی اختراع کیے ہیں۔ منصور بن علی بن عراق نے کروی مثلث کے متعلق Sine theorem کا مسئلہ ایجاد کیا۔

پوری دنیا میں رائج ہندسوں کے موجودہ طریقے کو عربی ہندسے Arabic Numerals کہا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ریاضیات میں صفر کا رواج، حروف ابجد کی عددی قیمت، اعداد کی اقسام اور ان کے خواص زاویے کی تین مساوی اقسام میں تقسیم، قطوع المخروط (Conic Sections) کی مدد سے معادلات مکعب (Cubic equations) کا حل، عددوں کے مجموعی ربعات کی دریافت، جزر (Surd) کے استعمال مثلثات القائمۃ الزاویہ والمائلہ (Right anglie Trigonometry) کے حل، حرکات کواکب کے تعین خط نصف النہار سے مختلف رجوں کے طول کے حساب سے زیجوں کی تیاری اور ارتفاع قطع کی تعین وغیرہ کئی امور مسلمانوں کی اولیات ہیں۔

کسر اعشاریہ کی دریافت جسے غلطی سے لیوی بن گرسون سے منسوب کر دیا گیا تھا اصل میں الاقلیدسی کی ہے جو چوتھی صدی ہجری کا ایک مسلمان حساب دان تھا۔

2- علم طبعیات (Physics):

احمد بن موسیٰ بن شاکر کی کتاب الحیل جو مامون عباسی کے زمانے کی تصنیف ہے میکانیات (Mechanics) پر دنیا کی سب سے پہلی کتاب ہے اور یہ آج بھی محفوظ ہے۔ اس میں بیان کردہ ایک سو میکانکی آلات میں سے تقریباً بیس 20 آلات عملاً کارآمد ہیں۔ احمد نے ایسی ایسی کلیں اور مشینیں ایجاد کیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

الکندی نے جو فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ سائنسدان بھی تھا کوئی پندرہ 15 کتابیں علم المناظر (Science of Perspective) پر لکھیں، جن میں سے صرف اس کی ایک کتاب علم البصر (Optics) کا لاطینی ترجمہ محفوظ ہے، جو از منہ متوسط میں ہوا تھا۔ راجر بیکن سمیت یورپ کے سائنسدانوں نے اس سے بہت استفادہ کیا۔

ابن سینا (م 1037ء) نے فاصلوں کی صحیح پیائش کے لیے ایک آلہ ایجاد کیا تھا جسے عصائے یعقوب (Jacob's staff) کا نام دے کر چودھویں صدی عیسوی کے لیوی گرسون سے منسوب کر دیا گیا۔ تاہم بعد میں مشہور عالم ویڈیمان (Wiedemann) نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس آلے کا اصل موجد ابن سینا ہے۔ نیز یہ کہ ابن سینا نے اس آلے کو جس درجہ کمال تک پہنچایا تھا سترھویں صدی عیسوی کے یورپی علماء کے ہاں وہ اس درجے کو نہیں پہنچ سکا۔

البیرونی (م 1048ء) نے آٹھ قیمتی پتھروں اور دھاتوں کا وزن مخصوص تقریباً پوری صحت کے ساتھ متعین کیا۔ چشموں وغیرہ سے پانی ابھر آنے کی اس نے جو توجیہات بیان کی ہیں انہیں جدید (Hydrostasties) کی ابتدا قرار دیا جاتا ہے۔

علم طبیعات بالخصوص علم المناظر اور بصریات میں ابن الہیثم کو امامت کا درجہ حاصل ہے۔ اس کی تصنیف کتاب المناظر کا یورپ میں بارھویں صدی عیسوی میں ترجمہ ہو گیا تھا، جو اب تک محفوظ ہے۔ اہل یورپ نے صدیوں تک اس کتاب سے استفادہ کیا۔ ابن الہیثم نے یونانی علماء کے اس نظریے کی تردید کی کہ روشنی آنکھ پر پڑتی ہے۔ تو آنکھ میں سے نظر کی کرنیں نکلنے لگتی ہیں اور یہ کرنیں جس چیز پر پڑتی ہیں وہ چیز آنکھ کو نظر آنے لگتی ہے۔ اس کے برعکس ابن الہیثم نے تجربے کی مدد سے یہ نظریہ پیش کیا کہ جب روشنی کسی چیز پر پڑتی ہے تو اس کی کچھ شعاعیں اس چیز کی مختلف سطحوں سے پلٹ کر فضا میں پھیل جاتی ہیں جس میں سے بعض دیکھنے والے کی آنکھ میں داخل ہوتی ہیں تو وہ چیز آنکھ کو نظر آنے لگتی ہے۔ یہ نظریہ آج بھی صحیح تسلیم کیا جاتا ہے۔ ابن الہیثم کی کتاب المناظر روشنی پر دنیا کی پہلی صحیح مستند اور جامع کتاب ہے۔ ابن الہیثم حجرہ تاریک (Camera obscura) کا موجد ہے۔

عالم طبیعات عبدالرحمان الخازن کی تصنیف میزان الحکمۃ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس نے البیرونی کے اصولوں پر مائعات کے وزن مخصوصہ (Specific gravity) کا جدول تیار کیا اور Gravitation کے نظریے کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا۔ الخازن نے قیمتی پتھروں کا صحیح وزن معلوم کرنے کے لیے ایک ترازو ایجاد کیا۔ اسی طرح اس نے پانی اور ہوا میں چیزوں کا وزن معلوم کرنے کے لیے بھی ترازو تیار کی۔

3- علم کیمیا (Chemistry):

جابر بن حیان تجرباتی کیمیا کا بانی تھا۔ اس نے اپنی کتابوں میں، جن سے یورپ میں بہت زیادہ استفادہ کیا گیا دھاتوں کے مرکبات بنانے، دھاتوں کو صاف کرنے، فولاد بنانے، لوہے کو زنگ سے بچانے کے لیے اس پر وارنش کرنے، چمڑا رنگنے وغیرہ بیسیوں مفید چیزیں بنانے کے طریقے بیان کیے ہیں۔ اس نے تین معدنی تیزاب دریافت کیے۔ علم کیمیا میں جابر بن حیان کی عظمت کو ساری دنیا تسلیم کرتی ہے۔

مشہور طبیب ابوبکر محمد بن زکریا رازی کا علم کیمیا میں بھی بہت اونچا مقام ہے۔ اس نے اپنی کتابوں میں کیمیا سے متعلق بہت سے انکشافات کیے ہیں۔

4- علم طب (Medicine):

علم طب میں مسلمانوں کی خدمات بہت قابل قدر ہیں اور تقریباً تمام فلاسفہ اور سائنسدان علم طب میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ مسلمانوں نے علم طب کے صرف علمی پہلو یعنی دوا سازی تک ہی اپنے آپ کو مرتوف نہیں رکھا بلکہ اس کے نظریاتی پہلو پر بھی اہم تحقیقات پیش کیں۔ طب کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میدان میں مسلمانوں کی اہم خدمات میں سے چند ایک کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

ابوبکر رازی جس کا شمار دنیا کے عظیم ترین علمائے طب میں ہوتا ہے، اس نے سب پہلے یہ نظریہ پیش کیا کہ آنکھ کی پتلی اس میں داخل ہونے والی روشنی کی نسبت سے سکڑتی اور پھیلتی ہے۔

بصارت کے مسئلے پر ابن سینا اور ابن الہیثم کی تحقیقات بھی بہت نمایاں ہیں۔

ابوالحسن طبری نے چوتھی صدی ہجری میں یہ دریافت کیا کہ خارش کا سبب خارش کا کیڑا ہوتا ہے۔

ابن سینا نے سرطان، تپ دق اور سوزش دماغ کی بیماریوں کے سلسلے میں اہم تحقیقات پیش کیں۔

چوتھی صدی ہجری میں ابوالقاسم الزہراوی نے خون کے امراض کا مفصل جائزہ پیش کیا ہے اور اس نے جوڑوں کی سوزش اور ریڑھ کی ہڈی کی دق پر بھی لکھا ہے۔

پانچویں صدی ہجری کا عبدالملک ابن زہر ان سوزشوں کے بارے میں وضاحت پیش کرتا ہے جو سینے کو تقسیم کرنے والے پردے کو لاحق ہوتی ہیں۔ وہ غلاف قلب کے ورم کا بھی ذکر کرتا ہے۔ وہ پہلا طبیب تھا جس نے غذا کی نالی کے مفلوج ہو جانے کی صورت میں سانس کی نالی کو کھولنے نیز غذا کی نالی کی راہ سے مصنوعی طور پر غذا پہنچانے کی تجویز پیش کی۔ اس نے معدے کے سرطان سمیت بہت سے امراض کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔

لسان الدین ابن الخطیب نے پیتھالوجی کے شعبے میں جو خدمت انجام دی وہ چھوت کے قانون کی دریافت ہے۔ ابوبکر رازی کی کتاب الطب المنصوری کو علم التشریح (Anatomy) پر اولین مکمل کتاب قرار دیا گیا ہے۔

علی بن العباس المجوسی کی کتاب کامل الصناعۃ تنظیم و ترتیب میں رازی کی کتاب سے بہتر ہے۔

ابن سینا کی شہرہ آفاق کتاب القانون جو صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں شامل نصاب رہی ہے اس میں بھی اس علم پر بہت مواد موجود ہے۔ ابن النفیس نے دوران خون صغیر (Lesser Circulation of Blood) کو دریافت کیا۔

عبداللطیف بغدادی (م 629 ہجری) نے قاہرہ کے نواح میں ہڈیوں کے ڈھانچوں پر تحقیق میں شہرت پائی اور ہڈیوں سے متعلق بہت سی نئی تحقیقات پیش کیں۔

چوتھی صدی ہجری کے ابوالقاسم الزہراوی نے علم جراحت (Surgery) کو حیران کن ترقی دی۔ اس کی تصنیف کتاب التصریف کا بارہویں صدی عیسوی میں لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا۔ عصر حاضر کے علم طب کا امتیازی پہلو علم جراحت ہے۔ جس کی بنیاد زاہراوی کی یہ کتاب ہے۔ کئی جراحی عمل (Surgical operations) جو یورپ کے نامور ڈاکٹروں سے منسوب ہیں زاہراوی کی کتاب میں موجود تھے۔

جراحت چشم میں عمار الموصلی کا مقام بہت بلند ہے۔ اس کے بارے طب چشم کا مشہور مورخ Julius Hirschberg لکھتا ہے:

"اہم ترین چیز جو ہمیں عمار الموصلی کے ہاں ملتی ہے وہ دھات کی بنی ہوئی اس کی ایک خود ساختہ اندر سے خالی سوئی کے ذریعے چوس پھینکنے کے طریقے سے موتیا بند کا مکمل آپریشن ہے۔ اس کی کتاب میں ایک اور اہم بات بینائی کو محفوظ رکھتے ہوئے قزحیہ چشم (Iris) کو نکال دینا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل یونان اور عمار کے عرب پیش رو یہ آپریشن کر چکے تھے۔ لیکن انہوں نے اسے خوبصورتی پیدا کرنے کی غرض سے استعمال کیا تھا بینائی کے لئے نہیں۔ Hirschberg عمار کی شخصیت کی مداحی میں کہتا ہے کہ وہ ان اطباء میں سے ایک تھا جن کی مثال تاریخ میں بہت کم پیدا ہوتی ہے۔"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

5- علم ہیئت/فلکیات (Astromony):

فلکیات میں مسلمانوں کو یونان، ہندوستان اور ایران سے جو تہذیبی ورثہ ملا اس میں یہ تصور پایا جاتا تھا کہ زمین دنیا کا مرکز ہے اور تمام افلاک اور اجرام فلکیہ زمین کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اس علم میں مسلمانوں نے دوسروں سے ملی ہوئی (خاص طور پر ہندوستان کی کتاب سدھانت، عربی میں السند ھند اور یونان کے بطلیموس Ptolemy کی کتاب المجسطی (Almagest) غلط بنیاد پر کام کا آغاز کیا اور رفتہ رفتہ اپنی ذہانت اور محنت کے ساتھ قدماء کے نظریات کی نہ صرف تصحیح کی بلکہ گراں قدر نئے نتائج اخذ کئے۔ خلیفہ مامون کے حکم سے بغداد اور دمشق کے نواح میں ایک رصدگاہ قائم کی گئی جو غالباً دنیا میں اس قسم کی پہلی رصدگاہیں تھیں۔ مسلمان فلک شناسوں نے ان رصدگاہوں کی مدد سے نہایت اہم نتائج برآمد کیے۔ اس ضمن میں فواد سیزگین لکھتے ہیں:

غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان فلک شناسوں نے محض مشاہدے اور حساب کی بنیاد پر وہ تحقیقات بیشتر مکمل کر لیں جو سترھویں صدی کے بعد ایجاد ہونے والے بعض جدید آلات کے بغیر ممکن ہو سکتی تھیں۔

اس میدان میں ان کی تحقیقات کے جو نتائج اب تک پایہ ثبوت کو پہنچ چکے ہیں ان سب کا شمار ممکن نہیں حالانکہ یہ مطالعہ ہنوز ابتدائی مراحل میں ہے۔

اختراع و تازہ کاری کے مرحلے میں ان کی عظیم کامیابی کو ہم مندرجہ ذیل وجوہات پر محمول کر سکتے ہیں۔

1- وہ فلکیاتی مسائل کے حساب کے لئے ریاضی کو استعمال کر سکتے تھے اور ریاضی میں ان کے وسائل یونانیوں کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ تھے۔
2- وہ رصدی آلات کا استعمال بھی یونانیوں کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ شکل میں کر سکے۔
3- وہ ایسے رصدی طریقے استعمال میں لا سکے جن میں بعض یونانیوں سے بڑھ کر ترقی یافتہ تھے اور بعض ایسے تھے جن کا یونانیوں کو مطلق علم نہ تھا۔
4- مسلمان فلک شناسوں کے ہاں عملی تجربات کا تناسب قدماء سے بڑھ کر تھا۔

مسلمانوں کے بہتر ریاضیاتی وسائل میں ان کا ایجاد کردہ علم المثلثات شامل تھا جس سے اہل یونان ناآشنا تھے۔ نیز مسلمانوں نے فلکی قیاسات میں تفرقی احصا (Differential Calculus) اور جدول الخنیات سے بھی کام لینا شروع کر دیا تھا

فلکیات میں مسلمانوں کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے فواد سیزگین لکھتے ہیں:

"ایک مثال یہ ہے کہ تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں انھوں نے اپنی رصدگاہوں کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی کہ رات اور دن کے مساوی ہونے کے وقت کے آگے بڑھنے جانے کی مقدار جسے وہ الحرکتہ البطیئہ یعنی ست حرکت کا نام دیتے تھے۔ سو برس میں ایک درجہ نہیں ہے۔"

جیسا کہ اہل یونان نے حساب لگایا تھا بلکہ ہر 66 برس میں ایک درجہ ہے۔ پھر وہ اس مدت کی تصحیح میں مسلسل مصروف رہے حتی کہ اسے ہر 70 برس میں ایک درجہ طے کیا اور یہ تجدید دور جدید کے سائنس دانوں کی تحدید یعنی ہر 72 برس میں ایک درجہ سے کچھ زیادہ دور نہیں۔

اسی طرح ہم یہ ذکر کرنا چاہیں گے کہ تیسری صدی ہجری میں مسلمان فلک شناسوں نے پہلی بار اس نکتے پر توجہ دی کہ سورج کا اوج یعنی اس کے زمین سے زیادہ سے زیادہ فاصلے کا نقطہ یکساں نہیں رہتا۔ بعد ازاں وہ اس جنبش کی حد متعین کرنے میں مصروف رہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ پانچویں صدی ہجری میں البیرونی چاروں موسموں میں چار بار کی رصد کے نتیجے میں یہ کوشش کرتا ہے کہ اس جنبش کی مقدار حساب

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تفاضلی (Differential Calculus) کے ذریعے معلوم کرے۔ اس جنبش کی آخری تعین جو مسلمان فلک شناسوں نے طے کی وہ 12.09 سیکنڈ سالانہ تھی اور یہ تحدید بھی دور حاضر کی تحدید یعنی 11.46 سیکنڈ سالانہ سے کچھ زیادہ اختلاف نہیں رکھتی۔

اسی طرح ایک مثال اس کوشش کی بھی دی جا سکتی ہے جو انہوں نے میل اعظم (Greatest Obliquity of the Ecliptic) کا حساب لگانے کے لئے کی۔ بطلیموس اسے 23 درجہ اور 51 منٹ تصور کرتا تھا۔ ہندوستانی علماء کے نزدیک یہ 24 درجے سے عبارت تھا۔ مسلمان فلک شناسوں کی توجہ تیسری صدی ہجری کے اوائل ہی میں اس امر کی طرف مبذول ہو چکی تھی کہ میل اعظم کی تعیین کے بارے میں بطلیموس کا بیان اصلاح طلب ہے۔ چنانچہ انھوں نے مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر اپنے دقیق آلات رصد کے ذریعے اس کی پیمائش شروع کی اور چوتھی صدی ہجری کے وسط میں یہ سوال اٹھانا شروع کر دیا کہ آیا یہ جھکاؤ یکساں ہے یا متغیر۔ ابراہیم بن سنان بن ثابت اور ابو جعفر الخازن نے یہ مشاہدہ کیا کہ مختلف رصدی مطالعہ کے نتائج میں تفاوت آسمان کے قطبین کی یکبارگی اور بے ترتیب حرکتوں سے عبارت ہے۔ اس سے تقریباً پچاس برس بعد حامد بن الخضر الخجندی نے یہ دریافت کیا کہ میل اعظم وقت کے ساتھ ساتھ کم ہو رہا ہے۔ دور جدید میں اس کی اس دریافت کی تائید ہوئی مگر دور احیائے علوم اور بعد کے فلک شناسوں کو اس امر کا احساس نہیں ہوا۔ خجندی نے میل اعظم کی جو تعیین کی تھی وہ 23 درجہ 32 منٹ 22 سیکنڈ تھی۔ جدید علم فلک سے اس کا فرق بہت معمولی ہے، یعنی صرف دو منٹ۔

تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں رصد آسمانی اور سیارات کی حرکت کے حساب پر توجہ مرکوز رکھنے کے بعد چوتھی صدی کے اواخر میں مسلمان فلک شناسوں نے روز بروز نئے فلکیاتی نظریات وضع کرنے میں دلچسپی لینی شروع کی۔ مثال کے طور پر ابو العباس ایرانشہری نے یہ دریافت کیا کہ بطلیموس کی رائے کے برخلاف مکمل سورج گرہن صرف اس بعد میں ممکن ہے جو البعد کی نسبت وسط سے قریب تر ہو"

ابن الہیثم نے پانچویں صدی ہجری میں پہلی بار سیاروں کی حرکات کی سائنسی وضاحت پیش کی اور بطلیموس کے نظریات کو رد کیا۔ اسی طرح اندلس میں ابن باجہ، ابن طفیل اور ابن رشد (تینوں کا تعلق چھٹی صدی ہجری سے ہے) نے بھی بطلیموس کے نظریات کے رد میں اپنے دلائل پیش کیے۔ ابو جعفر البطروجی (م 600 ہجری) نے نئے علم ہیئت کی بنیاد رکھی۔ بطروجی کی تصنیف کتاب المرتعش کا ترجمہ اس کی تالیف کے چند سال بعد ہی لاطینی اور عبرانی زبانوں میں ہو گیا تھا۔ یورپ کے کوپرنیکس کا علم ہیئت بروجی ابن الہیثم، الزرقالی، جابر بن افلح، ثابت بن قرۃ، نصیر الدین طوسی، قطب الدین شیرازی اور ابن الشاطر کی تصانیف سے ماخوذ ہے۔ اس بارے ڈاکٹر فواد سیزگین رقمطراز ہیں:

اس میدان میں متعدد تحقیقات کے بعد اس امر میں کوئی شک باقی نہ رہا کہ مسلمان فلک شناسوں کے نظریات پوری تفصیلات کے ساتھ کوپرنیکس کے علم میں تھے اور اس نے حرف بہ حرف انہیں اخذ کیا۔

6- فلسفہ تاریخ و عمرانیات:

ان دونوں علوم کا بانی بلاشک وشبہ ابن خلدون (1406-1332) ہے۔ ابن خلدون نے اپنی تاریخ کی ایک مقدمہ لکھا جس میں اپنا فلسفہ اور عمرانیات (علم الاجتماع Sociology) سے متعلق اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ ابن خلدون کا یہ مقدمہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے مقدمہ ابن الخلدون کے نام سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس سے پہلے پوری دنیا ان دو علوم سے قطعی طور پر نا آشنا تھی۔

7- علم الحیات (Biology):

مسلمان سائنس دانوں نے علم نباتات اور حیوانات میں بھی قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ باغبانی اور کاشتکاری مسلم اسپین میں انتہائی عروج پر پہنچ چکی تھیں۔ علم نباتات کی تعلیم کے لئے قرطبہ، بغداد اور قاہرہ میں باقاعدہ نباتاتی باغ لگائے گئے۔ جن میں ہر قسم کے تجربے کیے جاتے تھے۔ مسلمانوں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میں علم نباتات کا سب سے بڑا ماہر ابن بیطار تھا اسی طرح دنیائے اسلام میں سب سے بڑے ماہر حیوانات جاحظ اور دمیری تھے۔ جاحظ کی مایہ ناز تصنیف "کتاب الحیوان" اور دمیری کی "حیات الحیوان" ہے۔ ابوعبیدہ نے صرف گھوڑے کی جنس سے متعلق کئی تصانیف چھوڑی ہیں۔

8- علم جغرافیہ (Geography):

عباسی خلیفہ مامون الرشید نے اپنے عہد حکومت میں 69 سائنس دانوں کو جغرافیائی تحقیقات اور دنیا کے نقشہ کی ترتیب و تدوین پر مقرر کیا تھا۔ ان تحقیقات سے حاصل ہونے والے مواد کی بنا پر محمد بن موسیٰ خوارزمی نے عربی میں جغرافیہ کی پہلی کتاب "صورۃ الارض" کے نام سے لکھی۔ احمد بن ابی یعقوب بن جعفر نے "کتاب البلدان" اور ابن سعید نے "المغرب" کے نام سے ایک ضخیم کتاب تصنیف کی۔ ابوزاہد احمد بن سہیل بلخی پہلے جغرافیہ دان تھے جنہوں نے دنیا کے مختلف ملکوں اور خطوں کے رنگ دار نقشے اور چارٹ تیار کیے۔ البیرونی کی بھی علم جغرافیہ پر متعدد تصانیف ہیں۔ انہوں نے طول بلد اور عرض بلد کا پیمانہ بنایا۔ اسی طرح قطب نما بھی عربوں کی ایجاد ہے۔

9- تاریخ و عمرانیات (History and Sociology):

مشہور مسلمان مورخ علامہ ابن خلدون ان دونوں علوم کا بانی مانا جاتا ہے۔ ابن خلدون نے اپنی تاریخ کا ایک مقدمہ لکھا، جس میں تاریخ کا فلسفہ، اصول اور عمرانیات کے متعلق اپنے نظریات تحریر کیے۔ علامہ ابن خلدون کا یہ مشہور مقدمہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے مقدمہ ابن خلدون کے نام سے دنیا میں مشہور و معروف ہے۔ ابن خلدون سے قبل علمی دنیا فلسفہ تاریخ اور عمرانی علوم سے ناواقف تھی۔ مسلمانوں نے تاریخ کو ایک باقاعدہ فن کا درجہ دیا۔ ابن اسحاق، ابن ہشام، الواقدی، بلاذری، المسعودی، خطیب بغدادی اور ابن کثیر جیسے اسلامی مورخین کا ایک طویل سلسلہ ہے۔

10- دیگر علوم:

مسلمانوں نے مذکورہ بالا علوم کے علاوہ بہت سے دوسرے علوم پر بھی اپنی نہایت قیمتی اور قابل قدر تصانیف چھوڑی ہیں۔ مثلاً نباتات (Botany) حیوانیات (Zoology) جغرافیہ، علم المعادن وغیرہ۔ دینی علوم سے متعلق بے شمار کتابوں کا ذخیرہ اس کے علاوہ ہے۔

اسلامی تہذیب و ثقافت کے عالمی اثرات

اسلامی تہذیب و ثقافت دنیا پر چودہ سو سال تک غالب رہی۔ اس نے ہر لحاظ سے دنیا کی امامت کی۔ اس کی روشنی سے پوری دنیا منور ہوئی اور عالمی سطح پر مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ ہم آفاقی اور عالمگیر طور پر اس کے اثرات کا مختلف عنوانات کے تحت جائزہ لیتے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسلامی تہذیب وثقافت کے عالمی اثرات

اسلامی تہذیب کے تاریخی اثرات

تہذیبیں تاریخ انسانی میں فکری، اخلاقی اور مادی اعتبار سے جتنے زیادہ جاودانی اثرات چھوڑتی ہیں اتنا ہ زیادہ خلود اور دوام انھیں حاصل ہوتا ہے۔ اسلامی تہذیب نے انسانی ترقی کی تاریخ میں ایک عظیم الشان کردار ادا کیا اور عقائد ونظریات، علم وفن، حکومت، فلسفہ اور ادب کے میدانوں میں نہایت دور رس اثرات اور مستحکم یادگاریں چھوڑی ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ وہ آثار اور یادگاریں کیا ہیں اور ان کی اہمیت کیا ہے؟

ہم اسلامی تہذیب کے زندہ جاوید آثار کو پانچ بڑی اقسام میں تقسیم کرتے ہیں:

۱۔ عقیدہ دین:

اسلامی تہذیب کے اصول ومبادی کا نہایت گہرا اثر یورپ کی ان اصلاحی تہذیبوں پر پڑا ہے جو ساتویں صدی عیسوی سے لے کر عہد جدید تک وہاں اٹھتی رہی ہیں۔ اسلام ہی وہ دین ہے جس نے اللہ کی وحدانیت کا درس دیا اور بتایا ہے کہ اس کی حاکمیت واقتدار میں کوئی شریک نہیں، اور وہ جسم، ظلم اور نقص سے منزہ ہے۔ اسلام نے یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ انسان کو اللہ کی بندگی کرنے، اس سے تعلق پیدا کرنے اور اس کے قوانین کو سمجھنے کے لیے پجاریوں، یا پادریوں کی طرح کے کسی طبقہ کو واسطہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اقوام کے ذہنوں کو کھولنے اور ان محکم اصولوں تک ان کی رہنمائی کرنے میں اسلام نے ایک زبردست عام سی حیثیت سے کام کیا ہے۔ اس سے پہلے قومیں ایک شدید قسم کے مذہبی استبداد اور پیشوائیت کے تسلط میں جکڑی ہوئی تھیں۔ جس نے ان کے افکار وآراء پر بند باندھ رکھے تھے، اور ان کے جسم اور مال کو اپنے شکنجے میں کس رکھا تھا۔ اسلام کو مشرق ومغرب میں جو فتوحات نصیب ہوئیں، اس کا یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ آس پاس کی قومیں سب سے پہلے، اسلام کے عقائد ونظریات سے متاثر ہوں، اور واقعہ میں یہی کچھ ہوا بھی۔ چنانچہ ساتویں صدی عیسوی میں یورپ کے اندر ایسے ریفارمر اٹھے جو بت پرستی اور تصویر پرستی کے مخالف تھے۔ بعد میں ایسے لوگ اٹھے جنہوں نے اللہ اور اس کے بندوں کے مابین انسانوں کو وسیلہ بنانے سے انکار اور پادریوں اور پاپاؤں سے بے نیاز ہو کر کتب مقدسہ کے افہام وتفہیم کی دعوت دی۔ بہت سے محققین نے پورے زور کے ساتھ کہا ہے کہ مارٹن لوتھر اپنی اصلاحی تحریک میں فلاسفہ عرب اور علمائے مسلمین کے دینی عقائد سے متاثر تھا۔ ایک مدت سے حکمائے اسلام کی تصانیف کا ترجمہ لاطینی میں ہو چکا تھا اور لوتھر کے عہد میں یورپ کی یونیورسٹیاں تعلیم وتدریس میں ان پر انحصار واعتماد کرتی تھیں۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فرانسیسی انقلاب میں، مذہب اور ریاست کے درمیان علیحدگی کی جو تحریک اٹھی تھی وہ ان زبردست فکری تحریکات کی پیداوار تھی جو تین سو سال بلکہ اس سے زیادہ عرصے تک پورے یورپ پر چھائی رہیں اور صلیبی جنگوں اور اندلس کے واسطے سے اسلامی تہذیب نے ان تحریکوں پر اپنا اثر ڈالا تھا۔

۲۔ علوم وفلسفہ:

طب، ریاضیات، کیمیا، جغرافیہ اور فلکیات کے میدان میں بھی ہمارے تہذیبی اثرات نمایاں ہیں۔ یورپ میں جو علمی بیداری ہوئی وہ اس درس وتدریس کا نتیجہ تھی۔ جیسے اہل یورپ نے ہمارے علماء وحکماء کے سامنے اشبیلیہ، قرطبہ اور غرناطہ کی مساجد میں زانوئے ادب تہ کر کے حاصل کیا تھا۔ مغرب کے طالبین علم جب ہماری تعلیم گاہوں میں وارد ہوتے تھے تو انھیں سخت تعجب ہوتا کہ ہر متنفس کے لیے ان علوم وفنون کے دروازے کھلے ہیں۔ اور ہر شخص آزاد فضا میں پورے شغف وانہماک کے ساتھ ان علوم وفنون سے بہرہ مند ہو سکتا ہے کیونکہ اس کی مثال ان کے اپنے ملک میں موجود نہ تھی۔ جس وقت ہمارے علماء اپنے حلقوں اور اپنی تالیفات میں زمین کی گردش، اس کی گولائی اور اجرام سماویہ کی حرکت پر بحث کرتے تھے، اس وقت اہل یورپ کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

وہاں ان مسائل سے متعلق اوہام وخرافات سے بھرے ہوئے تھے۔ یہیں سے عربی کتب کے لاطینی میں تراجم کی تحریک شروع ہوئی اور ہمارے علماء کی تصانیف یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جانے لگیں۔ ابن سینا کی طب پر "القانون" کا ترجمہ بارہویں صدی میں ہوا۔ رازی کی تصنیف "الحاوی" کا ترجمہ تیرھویں صدی کے اواخر میں ہوا جو ابن سینا کی "القانون" سے زیادہ مفصل اور ضخیم ہے۔ سولہویں صدی تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں علم طب کا انحصار انہیں دو کتابوں پر تھا۔ جہاں تک کتب فلسفہ کا تعلق ہے، تو ان کی تعلیم وتدریس اس سے زیادہ عرصے تک جاری رہی اور یورپ نے فلسفہ یونان سے تعارف ہماری تالیف وتراجم ہی کے ذریعے سے حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مغربی مصنفین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ قرون وسطی میں کم از کم چھ سو سال تک مسلمان یورپ کے استاد رہے ہیں۔

فاضل گستاولی بان کہتے ہیں "عام عربی کتب اور بالخصوص علمی تصانیف پانچ چھ سو سال تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں تقریباً واحد ماخذ درس رہی ہیں۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ بعض علوم مثلاً علم طب میں عربی کے اثرات اب تک ہمارے ہاں کام کر رہے ہیں۔ ابن سینا کی کتابوں کی تشریح گزشتہ صدی کے اواخری موںلیہ میں کی گئی ہے۔ یہی عالم مزید لکھتے ہیں" روجر بیکن، لیونارڈ ارنوفیلیتونی، ریمون لول، سان تھوما، البرٹ اور ازنوش وہم شتالی نے فقط عربی کتب پر انحصار کیا ہے اور موسیو رینان کہتے ہیں" البرٹ دی اعظم ابن سینا کا ممنونِ احسان ہے اور سان تھوم فلسفہ میں ابن رشد کا رہین منت ہے۔ "مشہور مستشرق سیدیو لکھتے ہیں" قرون وسطی میں وہ صرف عرب ہی تھے جو تہذیب کے علمبردار تھے"۔ شمالی قبائل نے جس یورپ کو غارت اور پامال کر دیا تھا، اس کے وحشی پن کو عربی ہی نے زائل کیا۔ عربوں نے یونان کے فلسفہ قدم تک رسائی حاصل کی اور صرف اس کی معرفت اور اکتساب پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسے وسعت دی اور مطالعہ کائنات کے نئے ابوب کو وا کیا، نیز موصوف کہتے ہیں کہ" عربوں نے جب علم ہیئت میں مہارت حاصل کی تو علوم ریاضیہ کو اپنی خاص توجہ کا مرکز بنایا۔ چنانچہ اس میں انہیں کامل حاصل ہو گیا اور اس میدان میں وہ فی الحقیقت ہمارے استاد تھے۔" وہ کہتے ہیں کہ ابتدائی دور میں لاطینیوں نے عربی سے جو کچھ لیا، ہم جب اس کی تلاش کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جربرٹ سلفسنز دوئم کے نام سے ایک دروازہ بن جاتا ہے، جس کے ذریعے سے ۹۷۰ء اور ۹۸۰ء کے درمیانی عرصے میں وہ تمام علوم یورپ میں داخل ہو جاتے ہیں جو اس نے اندلس میں حاصل کیے تھے، اور انگریزی فاضل اوہیلاڈ ۱۱۰۰ء اور ۱۲۰۰ء کے درمیان اندلس اور مصر کا دورہ کرتا ہے اور عربی زبان سے اقلیدس کی کتاب "الارکان" کا ترجمہ کرتا ہے جس سے اس وقت تک پورا مغرب نابلد تھا، ایک عالم افلاطون نیتولی، تھیوڈسیوس کی کتاب "الاخر" کا عربی سے ترجمہ کرتا ہے۔ روڈلف بروجی عربی سے بطلیوس کا معمورۂ ارض کے متعلق تصنیف کردہ جغرافیہ کا ترجمہ کرتا ہے۔ لیونارڈ بیزی نے ۱۲۰۰ء کے قریب الجبرے سے متعلق رسالہ لکھا ہے جو اس نے عربوں سے سیکھا تھا۔ کنبانوس نیوی نے تیرھویں صدی میں عربی میں مرتبہ کتاب اقلیدس کا بہترین ترجمہ کیا ہے۔ نیز اس صدی میں فیتلون بولونی نے حسن بن ہیثم کی کتاب "البصیرات" سے استفادہ کر کے فلکیات کا علم مغرب میں پھیلایا۔ ۱۲۵۰ء میں ازفونش قشتالی نے فلکی زیچ شائع کرنے کا حکم دیا، جو اسی کے نام سے ہے۔ اس دور میں ایک طرف راجر اول نے صقلیہ میں عربی علوم وفنون، خصوصاً ادریسی کی کتابیں پڑھنے کا حکم دیا اور دوسری طرف فریڈرک ثانی نے علوم وآداب کے سیکھنے پر حد سے زیادہ زور دیا۔ ابن رشد کے بیٹے ہر وقت اس کے دربار میں رہتے تھے اور اسے نباتات وحیوانات کی طبعی تاریخ کی تعلیم دیتے تھے۔ ہومیلڈ سائنس سے متعلق اپنی کتاب میں لکھتا ہے "وہ عرب ہی ہیں جنہوں نے سب سے پہلے کیمیاوی دواسازی کا طریق ایجاد کیا اور اس باب میں ہمارے ہاں ابتداً محکم مشورے اور تجربات عربوں ہی سے آئے جو سارئم کے مدرسے نے لیے اور وہاں سے ایک عرصہ بعد جنوب یورپ میں پھیلے۔ پھر دواساز اور طبعی عناصر جس پر معالجہ کا دارومدار ہے، نباتات اور کیمیا کے مطالعہ کا باعث بنے۔ یوں یہ دونوں کام بیک وقت اور دو مختلف طریقوں سے ہوتے رہے اور اس طرح عربوں کے ذریعے اس علم کے نئے دور کا فتح باب ہوا۔ دنیائے نباتات میں عرب کی وسعت معلومات کے ثبوت کے لیے یہی کافی ہے کہ انہوں نے "زلیفوریدس" کی جڑی بوٹیوں پر دو ہزار نباتات کا اضافہ کیا۔ ان کی دواسازی میں کئی ایسی جڑی بوٹیاں تھیں جن کی یونانیوں کو ہوا بھی نہ لگی تھی۔ سیدیو، رازی اور سینا کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ دونوں اپنی کتابوں کی وجہ سے پورے یورپ کے مدارس

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پر عرصۂ دراز تک چھائے رہے۔ خصوصیت سے ابن سینا جو یورپ میں ایک طبیب کی حیثیت سے متعارف ہوئے، پورے چھ سو سال تک یورپ کے مدارس پر ان کا سکہ جاری رہا۔ ان کی کتاب ''القانون'' کا پانچ جلدوں میں ترجمہ ہوا اور کئی دفعہ چھپا، کیونکہ فرانس اور اٹلی کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کا دارومدار اسی پر تھا۔

۳۔ لغت و ادب:

اہل مغرب اور بالخصوص اسپین کے شعراء عربی ادب سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ مغربی ادب میں شہسواری، شجاعت، مجاز واستعارہ، اور عمدہ اور اچھوتے مضامین اندلس کے ذریعے عربی ادب کے راستے میں داخل ہوئے ہیں۔ اسپین کا مشہور اہل قلم ابانیز لکھتا ہے ''عربوں کے اندلس میں داخلے اور جنوبی یورپ میں ان کے اصطبل گھوڑوں اور سواروں کے پھیل جانے سے قبل یورپ، فن شہسواری اور آداب مردانگی سے آشنا نہیں تھا۔'' ڈوزی نے اسلام کے موضوع پر جو کتاب لکھی ہے اس میں اس نے ہسپانوی انشاء پرداز الغارو کا ایک مراسلہ نقل کیا ہے جس میں اس نے اہل یورپ کی لاطینی زبان سے بے پروائی اور عربی زبان سے شغف پر شدید افسوس کا اظہار کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مغربی ادباء عربی علم وادب سے کس درجہ متاثر تھے۔ وہ کہتا ہے ''ذہین اور صاحب ذوق اصحاب پر عربی ترانوں کا جادو اثر کر چکا ہے۔ پس وہ لاطینی کو بنظر حقارت دیکھتے ہیں اور دوسری زبانوں کو چھوڑ کر ارباب اقتدار کی زبان لکھتے ہیں۔ ہمارے ایک وطنی حمیت سے سرشار معاصر نے اس پر سخت اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہمارے عیسائی بھائی عربی اشعار اور قصص پر فریفتہ ہو گئے ہیں اور ان کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں جنہیں مسلمان فلاسفہ اور فقہاء نے لکھا ہے۔ یہ مطالعہ وہ ان کتابوں کی تغلیط وتردید کے لیے نہیں کرتے بلکہ فصیح عربی اسلوب سیکھنے کی غرض سے کرتے ہیں۔ مذہبی لوگوں کے سوا آج کون ہے جو تورات وانجیل کی تفاسیر کا مطالعہ کرتا ہے؟ آج کون ہے جو اناجیل انبیاء ورسل کے صحیفوں کی قرأت کرتا ہے؟ افسوس کہ عیسائیوں کی جدید ذہین نسل عربی ادب اور عربی زبان کے ماسوا کسی زبان اور کسی لٹریچر کو اچھا نہیں سمجھتی۔ یہ لوگ عربوں کی کتابوں سے روشنی اخذ کرتے ہیں۔ ان کتابوں پر مشتمل بیش قیمت لائبریریاں جمع کرتے ہیں اور ہر جگہ عربی ذخائر کی تعریف وتوصیف کے گیت گاتے ہیں۔ جب وہ مسیحی لٹریچر کے بارے میں سنتے ہیں تو اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور یہ استدلال کرتے ہیں کہ یہ شے لائق التفات نہیں ہے۔ ہائے افسوس! عیسائی اپنی زبان بھلا چکے ہیں۔ ان میں آپ ایک فی ہزار بھی نہیں پائیں گے جو اپنے دوست کو اپنی زبان میں خط لکھے۔ لیکن جہاں تک عربی کا تعلق ہے کتنے ہی لوگ ہیں جو اسے کتنے بہترین اسٹائل میں اظہار خیال کرتے ہیں، اور اس میں ایسے اشعار نظم کرتے ہیں جو خود شعرائے عرب کے کلام پر بھی صحت وبلاغت کے لحاظ سے فائق ہیں۔''

چودھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد یورپ میں متعدد نامور ادیب ایسے گزرے ہیں جن کے ادب وانشاء پر عربی ادب کا مستقل اثر رہا ہے۔ ۱۳۴۹ء میں بوکا شیو نے ''اپنے افسانے ''دس مجلسیں'' کے نام سے لکھے ہیں جن میں الف لیلہ کا تتبع کیا ہے۔ شیکسپیئر نے اپنے ایک ڈرامے کا موضوع یہیں سے اخذ کیا ہے، اور جرمنی کے ڈرامہ نویس لسنگ نے اپنے ڈرامے ''نادان حکیم'' کا پلاٹ بھی وہیں سے مستعار لیا ہے۔ انگریزی میں جدید شعروشاعری کے بانی چاسر نے بوکا شیو کے ہاں سے سب سے زیادہ اکتساب فیض کیا ہے۔ دونوں کی اٹلی میں ملاقات ہوئی تھی اور اس کے بعد چاسر نے اپنی مشہور حکایات ''کنٹر بری ٹیلز (Canterberry Tales)'' لکھیں۔ اسی طرح ڈانٹے کی مشہور نظم ''ڈیوائن کامیڈی (Divine Comedy)'' جس میں اس نے ایک دوسرے عالم کے سفر کی داستان بیان کی ہے، اس کا یہ خیال ہے کہ اس کو لکھتے وقت ابوالعلاء المعری کے رسالہ ''غفران'' اور ابن عربی نے جو کچھ جنات کے متعلق لکھا ہے، اس کے اثرات ڈانٹے کے ذہن پر کام کر رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایمپرر فرڈرک ثانی کے عہد میں صقلیہ میں اقامت پذیر رہا تھا۔ یہ بادشاہ ثقافت کا شیدائی تھا اور عربی ہی میں تہذیبی لٹریچر کے مطالعہ کا شائق تھا اور ان دونوں کے مابین ارسطو کے نظریات پر مذاکرات ہوا کرتے تھے۔ ان کا ذریعہ معلومات عربی کتابیں تھیں۔ ڈانٹے نے نبی ﷺ کی سیرت طیبہ، قصۂ معراج واسراء اور آسمانوں سے متعلق جو تفصیلات بیان کی ہیں، ان سے واقف تھا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پیٹرآف یارک کا عہد حیات وہ ہے جبکہ عربی ثقافت اٹلی اور فرانس میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے موبلیہ اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی تھی اور یہ دونوں درسگاہیں اندلس کی یونیورسٹیوں کے فاضل اصحاب نے قائم کی تھیں اور ان میں عربی مولفات پڑھائی جاتی تھیں۔ قرون وسطیٰ میں عربی کے ہاں جو قصص و حکایات رائج تھے، یورپ نے نشاۃ ثانیہ میں ان سے اثر قبول کیا ہے۔ ان میں "مقامات مردانگی" وشہسواری کی داستانیں اور وہ کارنامے شامل ہیں جو مشاہیر عرب نے محبت وعظمت کی خاطر سرانجام دیے تھے۔ اس سلسلہ میں الف لیلیٰ کے جو تراجم یورپ کی زبانوں میں بارہویں صدی میں ہوئے ان کا اثر نہایت نمایاں طور پر ہوا ہے۔ اب تک جملہ یورپ زبانوں میں اس کتاب کے تین سو سے زائد ایڈیشن نکل چکے ہیں حتی کہ یورپ کے متعدد ناقدین کا یہ خیال ہے کہ سوفٹ کا سفرنامہ، ڈیفو کا سفرنامہ رابنسن کروسو دونوں الف لیلیٰ، اور عرب فلسفی ابن طفیل کی تصنیف "حی بن یقظان" کے رہین منت ہیں۔ کوئی شخص اس امر میں شک نہیں کرسکتا کہ الف لیلیٰ کی کثرت اشاعت یہ ظاہر کرتی ہے کہ اہل یورپ نے اس کتاب کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے، اور اس سے متاثر ہوئے ہیں۔

یہاں اس بات کے ذکر کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ یورپ کی مختلف زبانوں میں ضروریات زندگی سے متعلق بہت سے عربی الفاظ تقریباً اپنی اصل شکل میں رائج ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی کاٹن، سقس مسک، لیمن، زیرو، دراصل عربی کے قطن، حریر، مشتق، مسک، لیموں اور صفر ہیں۔ اسی طرح اور بے شمار الفاظ بھی ہیں۔ اس سلسلہ میں تفصیل میں جائے بغیر یہاں مسٹر مائیکل کا قول نقل کر دینا ہی کافی ہے "یورپ اپنے ادب لطیف میں عربی ممالک کا ممنون احسان ہے۔ اسی طرح قرون وسطیٰ کے یورپ میں جو روحانی اور فکری انقلاب آیا تھا۔ اس کی پشت پر جو قوتیں کارفرما تھیں، انھیں بروئے کار لانے میں بھی عربی اقوام کا بہت بڑا دخل تھا۔"

۴۔ قانون سازی:

یورپ کے طلبہ جو اندلس کے اسلامی مدارس میں زیر تعلیم تھے، انہوں نے مسلمانوں کے بہت سے فقہی اور تشریعی لٹریچر کا اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا۔ اس وقت یورپ کے ممالک میں کوئی مستحکم سیاسی نظام نہ تھا اور نہ کسی قسم کے منصفانہ قوانین رائج تھے۔ مصر کو جب نپولین نے فتح کیا تو مالکی فقہ کی مشہور کتابیں فرانسیسی میں ترجمہ کی گئیں۔ سب سے پہلے "کتاب خلیل" کا ترجمہ ہوا جس نے فرانس کے قانون کے لیے بیج کا کام دیا۔ چنانچہ اس وقت کا فرانسیسی قانون بڑی حد تک فقہ مالکی کے مشابہ تھا۔ سیدیو کہتے ہیں "ہماری نظر خاص طور پر جا کر مذہب مالکی پر ٹھہرتی ہے کیونکہ افریقہ کے ساتھ ہمارے روابط رہے ہیں اور فرانسیسی حکومت نے ڈاکٹروں، پیروں کو ہدایت کی تھی کہ وہ خلیل بن اسحاق بن یعقوب (المتوفی ۱۴۲۲ء) کی مختصر فقہی کتاب کا ترجمہ فرانسیسی میں کریں۔"

۵۔ حکومت وسلطنت:

زمانہ قدیم ومتوسط میں عوام کا یہ حق تسلیم نہیں کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے حکام کے اعمال کا محاسبہ کریں۔ حاکم ومحکوم کا تعلق آقا وغلام کی طرح تھا۔ حاکم مطلق العنان ہوتا تھا اور رعایا کے ساتھ جو چاہتا تھا سلوک کرتا تھا۔ مملکت ایک موروثی جائداد سمجھی جاتی تھی جو دوسرے اموال کی طرح ورثہ میں منتقل ہوتی تھی۔ حتی کہ ایک شہزادی اگر تخت کی وارث ہوتی تھی اور اس کی شادی دوسری مملکت میں ہو جاتی تھی تو دونوں سلطنتوں میں تخت وتاج میں حصہ داری کے مسئلے پر جنگ چھڑ جاتی تھی۔

پھر دو فریقین کے درمیان اگر لڑائی ہوتی تھی تو غالب فریق کے لیے مغلوب کی جان ومال، عزت ناموس اور آزادی ہر شے مباح تھی۔ یہ حالت بدستور ایک مدت تک قائم رہی حتی کہ اسلامی تہذیب کا دور دورہ ہوا، اور اس نے دوسرے اصولوں کے ساتھ اس کا بھی اعلان کیا کہ قوم اپنے حکمرانوں کے اعمال پر تنقید ومحاسبہ کا حق رکھتی ہے، اور ارباب حکومت محض امین واجیر ہیں جن کا کام بس یہ ہے کہ وہ امانت ودیانت کے ساتھ قوم کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مفادات کی نگرانی کریں۔ چنانچہ تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ یہ صورت پیش آئی کہ محکوم نے حاکم سے برسر مجلس یہ پوچھا جو لباس اس نے پہن رکھا ہے وہ کہاں سے آیا ہے؟ اور حاکم نے اس شخص کو نہ پھانسی کی سزا دی، نہ اسے قید میں ڈالا اور نہ جلاوطن کیا بلکہ حاکم نے اپنی صفائی پیش کی اور پوزیشن واضح ہو جانے پر سائل اور دوسرے سب لوگ مطمئن ہو گئے۔

تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ واقعہ بھی رونما ہوا کہ رعایا کے افراد میں سے ایک نے صدر ریاست کو یوں مخاطب کیا "السلام علیکم، اے اجیر!" اور امیر نے تسلیم کیا کہ وہ اجیر ہے، اور ایک اجرت پر کام کرنے والے کی طرح اخلاص کے ساتھ قوم کی خدمت کرنا اور خیر خواہی کے ساتھ امانت کا حق ادا کرنا اس کا فرض ہے۔ اسلامی تہذیب نے اس اصول کا اعلان کیا اور عملاً اسے نافذ اور منطبق کر کے دکھایا۔

یہ حریت فکر و ضمیر کی روح تھی جو ان تمام اقوام میں پھونکی گئی جو اسلامی معاشرے کے گرد و نواح میں آباد تھیں۔ ان سب نے آہستہ آہستہ کروٹ لی، متحرک ہوئیں، آمادہ انقلاب ہوئیں اور آخر کار اپنے بدھنوں سے آزاد ہو کر رہیں۔ پورے یورپ میں یہی کچھ ہو کر رہا۔ صلیبی لڑائیوں کے دوران یورپ کے لوگ بلاد شام میں داخل ہوئے اس سے پہلے وہ اندلس کی خلافت میں اس بات کا مشاہدہ کر چکے تھے کہ عوام حکام پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں، اور حکام کسی غیر کے سامنے نہیں، صرف اپنی قوم کے سامنے جوابدہ ہیں۔ یورپ کے حکمرانوں نے دیکھا کہ مسلمان اسلام اور مسلمانوں کے لیے ہر دور اور ہر زمانے میں دشمنان اسلام اور ان کے حکام کسی خاص فرد یا طبقے کے ماتحت ہونے کے بجائے پوری قوم کے سامنے مسئول ہیں اور اس کے برعکس وہ رومن امپرر کے ماتحت ہیں اور جب تک وہ روم کی دینی سیادت کو تسلیم نہ کریں تو آئے دن انھیں ناکامی و نامرادی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ جب یہ حکمران اپنے ملکوں میں واپس لوٹے تو انھوں نے رومی اقتدار کے خلاف بغاوت کی حتیٰ کہ اس سے آزاد ہو گئے اور اس کے بعد ان بادشاہوں کے خلاف ان کے اپنے ہم قوموں نے بغاوت کی، یہاں تک کہ انہوں نے اپنی گردنیں چھڑا لیں۔ انقلاب فرانس اس کے بعد وقوع پذیر ہوا ہے اور اس نے کسی ایسے نئے اصول کا اعلان نہیں کیا، جس کا اعلان بارہ سو سال پہلے ہماری تہذیب نہ کر چکی ہو۔

اسلامی تہذیب نے جنگ کے سلسلے میں جن اصولوں کا اعلان کیا تھا وہ یہ ہیں کہ عہد و پیمان کا احترام کیا جائے، عقائد میں آزادی دی جائے، عبادت گاہوں کو اہل عبادت کے پاس رہنے دیا جائے، لوگوں کی شخصی آزادی اور عزت و ناموس پر دست درازی نہ کی جائے جس کے نتیجہ میں اسلامی حکومت کے تحت آنے والی اقوام کے اندر عزت و خودداری کی روح پیدا ہوئی اور ان کے اندر شرافت و انسانیت کا جوہر بیدار ہو۔ چنانچہ تاریخ نے پہلی مرتبہ یہ منظر دیکھا کہ غیر مسلم رعایا کا ایک فرد رئیس مملکت کے پاس جا کر شکایت کرتا ہے کہ آپ کے گورنر کے لڑکے نے میرے لڑکے کے سر پر ناحق کوڑے لگائے ہیں۔ صدر مملکت یہ سن کر غضب ناک ہو جاتے ہیں، گورنر کے بیٹے سے محاسبہ کرتے ہیں اور اس سے قصاص لیتے ہیں۔ پھر گورنر کو سختی سے ڈانٹتے ہیں اور تنبیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں "تم نے کب سے لوگوں کو اپنا غلام بنا لیا ہے حالانکہ ان کی ماؤں نے انھیں آزاد جنا تھا؟"

یہ ایک نئی روح تھی جو ہماری تہذیب کے طفیل اقوام و افراد میں پھونکی گئی، ورنہ جس والد نے یہ شکایت کی تھی اسے ہماری حکومت اور تہذیب سے قبل مارا پیٹا جاتا تھا، اس کا مال لوٹا جاتا تھا، عقائد کے معاملے میں اس پر زبردستی کی جاتی تھی، مگر بغاوت کرنا تو درکنار وہ احتجاج اور اظہار غم و الم بھی نہ کر سکتا تھا، بلکہ عزت نفس کا احساس تک بھی اس کے اندر نہیں پایا جاتا تھا، جب ہماری تہذیب کا آفتاب اس پر طلوع ہوا تو اس کی آواز بلند ہوئی اور اس نے امیر المؤمنین سے مخاطب ہو کر کہا: "میں اللہ سے آپ کے ظلم کے خلاف پناہ طلب کرتا ہوں"۔ یہ ظلم کیا تھا؟ نہ خون ریزی تھی، نہ آبرو ریزی تھی، نہ مذہب کے معاملے میں جبر تھا اور نہ جائداد کا غصب تھا، فقط اتنی سی بات تھی کہ ایک لڑکے نے دوسرے لڑکے کو چابک مار دیے تھے۔

اہل مغرب کا اسلامی تہذیب سے تعارف قرون وسطیٰ میں شام اور اندلس کے واسطے سے ہوا۔ اس سے پہلے بادشاہ دینی پیشواؤں کے خلاف اور عام بادشاہوں کے خلاف دم نہیں مار سکتے تھے۔ انھیں اس امر کا علم و احساس بھی نہ تھا۔ حاکم کا محاسبہ یا مظلوم کی امداد ان کا ایک بنیادی حق

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہے۔ ان کا حال تو یہ تھا کہ مذہب وعقیدہ میں اختلاف کی بناء پر ایک دوسرے کو اس طرح ذبح کر دیتے تھے جس طرح قصاب بکرے کو ذبح کرتا ہے، جب انھیں ہم سے واسطہ پڑا تو ان میں بیداری وحریت کا جذبہ پیدا ہوا۔ جس نے بالآخر انھیں آزاد کرایا۔ کیا اس کے بعد بھی آزادی وانسانیت وحریت عمل کے سلسلہ میں ہماری تہذیب نے جو پارٹ ادا کیا ہے اور اس کا انکار ناممکن ہے؟ یہ اگر زندگی کے پانچ مختلف بڑے بڑے شعبوں میں اسلامی تہذیب کے چند دائمی آثار ہیں۔ قوموں اور تہذیبوں کی زندگی میں یہ نمایاں ترین مظاہر ہیں۔

آفاقی تہذیب کے عالمگیر اثرات:

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ اس وقت دنیا میں صرف ایک ہی تہذیب ہے جس نے دنیا کی تمام تہذیبوں پر اپنا خوشگوار اثر چھوڑا ہے۔ ان کے شعبہ ہائے زندگی میں اسلامی تہذیب کے ابدی اور فطری اصول کارفرما نظر آتے ہیں۔ اسلامی تہذیب قومی، ملکی یا نسلی تہذیب نہیں بلکہ بین الاقوامی اور بین الملکی تہذیب ہے۔ ہر وہ شخص جو توحید، رسالت اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسلام کے قصر قومیت میں داخل ہو سکتا ہے۔ اسلامی تاریخ کے مطالعہ کے دوران یہ عجب منظر دکھائی دیتا ہے کہ مختلف نسلوں اور قوموں کے فرزند اسلام کا پرچم اٹھائے فاتح انداز میں قدم بڑھائے چلے جاتے ہیں۔ ہاشمی، اموی، عباسی، سلوقی، ترکان، عثمانی، آل بویہ، افغان، مغل اور جانے کتنے خانوادے، اسلامی تہذیب وتمدن کی پاسبانی کا فرض انجام دیتے رہے ایک قوم تھک ہار جاتی ہے تو دوسری قوم آگے بڑھتی ہے اور اسلام تہذیب کی مشعل درخشاں کو تھام لیتی ہے۔ دنیا کی دوسری تہذیبیں صرف ایک قوم یا ایک نسل کے سپوتوں کے کارناموں پر فخر کر سکتی ہیں لیکن اسلامی تہذیب ان گنت قوموں اور نسلوں کے ان تمام مشاہیر پر فخر کر سکتی ہے جنہوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں اسلامی تہذیب کا عالی شان محل تعمیر کرنے کی خدمت انجام دی ہو۔ امام بخاری، امام جعفر صادق، امام ابوحنیفہ، خلیل، سیبویہ، الکندی، فارابی، ابن سینا، ابن خلدون، امام غزالی، ابن تیمیہ، رومی، سعدی، شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ کتنی مختلف قوموں اور نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں اور سب اسلام کے مایہ ناز فرزند کہلاتے ہیں۔

مشرقی ملکوں پر بہت سی قوموں نے تسلط واقتدار حاصل کیا، ایران، یونان اور روم نے مختلف زمانوں میں ان پر حکومت کی مگر ان ملکوں پر ان کا تہذیبی اثر بہت کم پڑا۔ ان میں وہ نہ اپنا مذہب پھیلا سکے نہ اپنی زبان اور اپنے علوم فنون وصنعت کو فروغ دے سکے۔ مصر بطلیموسیوں اور رومیوں کے زمانہ میں نہ صرف اپنے مذہب پر قائم رہا بلکہ خود فاتحین نے مفتوحہ قوموں کا مذہب اور طرز تعمیر اختیار کر لیا چنانچہ ان دونوں خاندانوں نے جو عمارتیں تعمیر کیں، وہ فراعنہ کے طرز کی تھیں لیکن جو مقصد یونانی، ایرانی اور رومی مصر میں حاصل نہ کر سکے وہ عربوں نے بہت جلد اور بغیر کسی جبر کے حاصل کر لیا۔ مصر جس کے لئے کسی غیر قوم کے خیالات قبول کرنا بہت دشوار تھا، اس نے ایک صدی کے اندر اپنے سات ہزار سال پرانے تمدن کو چھوڑ کر ایک نیا مذہب اور نئی زبان اختیار کر لی، جو انقلابات کے باوجود اب تک قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے افریقہ کے ملکوں اور شام وایران پر بھی اثر ڈالا۔ ان سب میں تیزی کے ساتھ اسلام پھیل گیا بلکہ جن ملکوں سے وہ گزر گئے مثلاً چین تک میں جہاں ان کی حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی اور عرب محض تاجر کی حیثیت سے آتے جاتے تھے۔ اسلام پھیل گیا۔ تاریخ عالم میں مفتوح قوموں پر کسی فاتح قوم کے اثرات کی ایسی مثال نہیں ملتی ان تمام قوموں نے جن کا عربوں سے صرف چند ہی دنوں کے لئے واسطہ رہا ان کا تمدن قبول کر لیا بلکہ بعض فاتحہ قوموں تک نے مثلاً ترک اور مغل وغیرہ جنہوں نے مسلمانوں کو فتح کرنے کے بعد نہ صرف ان کا مذہب اور تمدن اختیار کر لیا، بلکہ اس کے بہت بڑے حامی ومبلغ بن گئے۔ علامہ اقبال نے اس شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

اور آج بھی جبکہ صدیوں سے عربی تمدن کی روح مرچکی ہے۔ بحر الکاہل سے لے کر دریائے سندھ تک اور بحر متوسط سے لے کر افریقہ کے ریگستان تک ایک مذہب اور ایک زبان جاری ہے اور وہ پیغمبر اسلام کا مذہب اور ان کی زبان ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسلامی تہذیب کے اس درخشاں پہلو پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر ویلڈ لکھتا ہے۔

''مسلمانوں میں نسلی شعور کا خاتمہ اسلام کے غیر معمولی کارناموں سے تھے۔''

اور فلپ حتی رقم طراز ہے۔

''دنیا کے تمام مذاہب میں قومیت کی دیواریں گرانے میں اسلام کو سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔''

غرض دنیائے اسلام میں علوم وفنون کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ منگولیا، تاتار، ایران، عراق، شام، مصر، شمالی افریقہ مراکش اور اندلس میں کثرت سے مدرسے درسگاہیں موجود تھیں۔

معاشرتی وسماجی اثرات

اسلامی تہذیب کے معاشرتی وسماجی اثرات درج ذیل ہیں:

وقار انسانی کا شعور:

اسلامی تہذیب وثقافت نے معاشرے میں انسانی وقار پیدا کیا۔ اس نے انسان کے مقام ومرتبے کا شعور معاشرے میں اجاگر کیا۔ ارشاد ربانی ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (بنی اسرائیل 70:17)

ترجمہ: ''اور ہم نے بنی آدم کو عزت دی۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (التین:4)

ترجمہ: ''بے شک ہم نے انسان کو احسن انداز میں بنایا۔''

اسلام سے پہلے انسان کو عیسائیوں اور ہندوؤں نے پیدائشی گنہگار قرار دیا تھا۔ اس لیے ان کے ہاں جسمانی سزائیں قبول کرنے پر زور دیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس اسلام نے انسان کے اشرف المخلوقات ہونے پر زور دیا۔

مساوات:

اسلام نے سماجی اثرات کے ضمن میں مساوات انسانی کا تصور دیا: اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ج (آل عمران 195:3) ''بے شک میں تم میں سے کسی مرد یا عورت کے نیک عمل کو ضائع نہیں کرتا'' اور اس کو عملی طور پر نافذ کر کے دکھایا۔ اسلام سے پہلے دولت، جاگیر، خاندان اور علاقے کی بنیاد پر لوگوں کا استحصال ہوتا تھا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: کسی عربی کو عجمی پر، کسی عجمی کو عربی پر، کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی برتری حاصل نہیں مگر تقویٰ کے سبب۔ تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آدم علیہ السلام مٹی سے بنے تھے۔ عبادت ہو یا معاملات کسی انسان کو اسلام نے کسی شعبے میں برتری نہیں دی بلکہ تمام انسانوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا۔ حتی کہ غلام زادے اس وقت کے سب سے بڑے عالم اور حکمران ٹھہرے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حقوق نسواں:

اسلام کے معاشرتی اثرات میں سے عورتوں کو حقوق دینا بھی ہے۔ یہ طبقہ غلاموں کے بعد سب سے محروم گروہ تھا۔ اس کو شیطان کا آلۂ کار سمجھا جاتا تھا اور روحانی ترقی میں رکاوٹ سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے اس ضمن میں درج ذیل اقدامات کیے:

(الف) بلند مقام دینا:

اسلام نے عورت کو ماں کی حیثیت سے جنت کے حصول کا ذریعہ قرار دیا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: "جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔" بیٹی کی حیثیت بلند کرتے ہوئے فرمایا: جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے گا یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں تو قیامت کے دن میرا اور اس کا ساتھ (دو انگلیوں کو ملا کر فرمایا) اس طرح ہوگا۔

(ب) ان کو نکاح اور طلاق کے ضمن میں اختیار دے مثلاً ان کی مرضی کے بغیر نکاح کو حرام قرار دیا اور اگر مرد کے ساتھ گزارہ نہ ہو تو خلع کے ذریعے سے طلاق کا حق دیا۔ اس کے علاوہ ہر عورت کا حق مہر مقرر کیا گیا اور مرد کو حق مہر ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔ اللہ نے فرمایا: ٥ تُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ط (نساء 24:4) "تم ان کے مہر بطور فرض ادا کرو۔"

(ج) اس کو خاوند، ماں باپ اور اولاد کی جائیداد میں سے حصے دار بنایا۔ ارشاد باری ہے: وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ (نساء 7:4) "اور عورتوں کے لیے والدین اور قریبی رشتے داروں کے ترکے میں سے حصہ ہے۔"

(د) حق تعلیم و ملازمت:

اسلام نے خواتین کی تعلیم پر بہت زور دیا۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے: "علم حاصل کرنا ہر مرد اور عورت پر فرض ہے۔" پھر ان کے حسب حال مختلف شعبوں میں ملازمت کا حق دیا اور ان کو تقریر و تحریر کی جازت اور بنیادی حقوق عطا کیے۔ ان اقدامات سے دوسرے مذاہب میں بھی عورت کا مقام بلند ہوگیا۔

محنت کی عظمت:

اسلام نے محنت کش کی عزت کو بحال کیا، معاشرے میں پہلے دولت ہی کو معیار عزت و شرافت سمجھا جاتا تھا اور محنت کار کو کمین کہہ کر مطعون کیا جاتا تھا۔ اسلام نے محنت کرنے والے کی عظمت پر زور دیا۔ اس سے اس پسے ہوئے طبقے کی عزت بحال ہوئی۔ نبی ﷺ نے فرمایا: "سب سے بہتر کھانا انسان کے اپنے ہاتھ کی کمائی ہے۔" اس کے علاوہ مزدوروں کی مزدوری ادا کرنے کا حکم دیا۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ: "مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔" یوں اسلام نے معاشرے میں دولت، عہدہ، جاگیر اور خاندانی امتیازات کو ختم کر کے محنت کی عظمت بحال کر دی۔

بنیادی حقوق کا شعور:

اسلام نے معاشرتی اثرات میں بنیادی حقوق کا شعور پیدا کیا۔ انسانوں کو ملکیت، تحریر، تقریر اور انجمن سازی کا حق دیا۔ اس کے علاوہ حکومتی معاملات میں ان کی مداخلت کا دروازہ کھولا۔ اسلام سے پہلے لوگ ان حقوق سے محروم چلے آ رہے تھے۔

خاندانی نظام:

اسلام نے خاندانی نظام کی مضبوطی پر زور دیا۔ نکاح کو اہمیت دی اور خاندان کو عزت عطا کی۔ نکاح سے معاشرے کو حسب ذیل فوائد ثمرات حاصل ہوئے:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

(الف) نکاح نگاہ کو نیچا کر دیتا ہے اور شرمگاہ کی حفاظت کرتا ہے۔

(ب) جس نے نکاح کیا اس نے اپنا آدھا دین محفوظ کر لیا، اسے چاہیے کہ دوسرے آدھے میں اللہ سے ڈرتا رہے۔

اسلام سے پہلے عورت کو روحانی ترقی میں رکاوٹ سمجھا جاتا تھا جبکہ اسلام نے نکاح کو روحانیت کا سب سے بڑا محافظ قرار دیا۔ اس طرح خاندانی نظام قائم کر دیا۔ اس طرح لوگ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے۔ اس سے دوسرے مذاہب پر بھی مثبت اثر پڑا۔

آداب معاشرت:

اسلام نے جو معاشرتی نقوش چھوڑے ان میں سے آداب معاشرت بہت اہم ہیں۔ مثلاً سفر کے آداب، کھانے پینے کے آداب، ملنے جلنے کے آداب، سونے جاگنے کے آداب اور مجلس کے آداب اس سے معاشرتی زندگی میں حسن اور رعنائی پیدا ہوئی جس نے معاشرے کو محبت کی حلاوت و شیرینی سے بھر دیا۔ سورہ حجرات معاشرتی احکام پر مبنی ہے جس پر انسانیت کی کامیابی کا انحصار ہے۔

نظافت و پاکیزگی:

پاکیزگی کے بارے میں اللہ نے نبی ﷺ کو حکم دیا: وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (مدثر 4:74) ''اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ''۔ اسلام نے انسان کی جسمانی پاکیزگی پر زور دیا۔ مثلاً عبادت کے لیے غسل، اور وضو کو لازمی قرار دیا، کپڑوں کی صفائی پر زور دیا۔ حتیٰ کہ نبی ﷺ نے الطھارہ نصف الایمہ۔ ان طہارت آدھا ایمان ہے فرما کر صفائی کو نصف ایمان قرار دیا۔ اس سے اسلامی دنیا میں ذوق جمالیات پروان چڑھا۔ کھلی اور خوبصورت رہائش گاہیں: اچھے لباس اور کھانے رواج پا گئے۔ اس کے علاوہ درخت لگانا باعث ثواب قرار دیا گیا۔ نبی ﷺ نے درخت لگانے کو صدقہ جاریہ قرار دیا تاکہ اس کے سائے اور پھل سے انسان یا پرندے فائدہ اٹھائیں۔ اس طرح ہر درخت لگانے والے کو اجر کی بشارت دی۔

غلامی کا خاتمہ:

اسلام نے آہستہ آہستہ غلامی کا خاتمہ کر دیا۔ اسلامی تعلیمات کے سرچشمۂ صافی کی بدولت بہت سے غلام وقت کے سب سے بڑے عالم بنے۔ مزید برآں لونڈیوں کی اولاد (مثلاً مامون الرشید) منصب خلافت پر فائز ہوئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جیسا تم خود کھاؤ ویسا غلاموں کو کھلاؤ۔ جیسا خود پہنو ویسا غلاموں کو پہناؤ۔'' آج بھی اسلام لوگوں کی ذہنی اور جسمانی غلامی کے سخت مخالف ہے۔ اسلام سے زیادہ فکری آزادی کہیں نہیں ہے۔

برداشت اور صبر و تحمل:

اسلام کے تحت مل جل کر رہنے کا جذبہ پیدا ہوا، کیونکہ معاشرے میں مسلمان اور غیر مسلم مل کر رہتے تھے اور ہیں۔ دنیا کا بڑا مذہب تو اسلام ہی ہے عددی کثرت عیسائیت کا الگ پہلو ہے۔ اسلامی تہذیب نے ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا جذبہ پیدا کیا اور ایک دوسرے کے ساتھ معاشرتی میل جول رکھنا ثواب قرار دیا۔ اس کے علاوہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

معاشرتی اور سماجی اثرات

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام سے پہلے معاشرہ طبقات میں بٹا ہوا تھا، ایک حکمران طبقہ دوسرا امراء، وزراء کا طبقہ، تیسرا محکوم رعایا کا طبقہ تھا۔ ہندوستان میں سماج پیشہ کے لحاظ سے منقسم تھا۔ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر۔ چار ذاتوں کا ظالمانہ نظام رائج تھا۔ یہی حال ایران اور روم کا تھا۔ ایک حکمران اور مذہبی مراعات یافتہ طبقہ تھا جنہیں ہر قسم کا آرام و آسائش میسر تھا جبکہ دوسرا عوام کا طبقہ تھا جو بدترین معاشی اور معاشرتی استحصال کا شکار تھا۔ محصولات کے ناقابل برداشت بوجھ تلے دبے ہوئے مظلوم عوام جانوروں کی سی زندگی گزار رہے تھے۔

مساوی انسانی حقوق:

اسلام کے انسانیت پر بے شمار معاشرتی و سماجی احسانات ہیں۔ اسلام نے ہر قسم کے نسلی، لسانی اور طبقاتی امتیازات کا خاتمہ کر کے ہر انسان کو مساوی حقوق دیئے۔ اسلام نے تمام بنی آدم کو ایک اصل کی مختلف شاخیں قرار دیا ہے اور روئے زمین کے تمام انسانوں کو وحدت نسل انسانی کی بنیاد پر اخوت کی لڑی میں پرو دیا ہے۔ تمام انسان خدا کا کنبہ ہیں۔ سب بھائی بھائی اور یکساں حقوق کے حامل ہیں اسلام نے برتری اور عظمت کے دنیاوی امتیازات کا خاتمہ کر کے، سیرت اور تقویٰ کو برتری کا معیار قرار دیا۔ اسلام نے کالے گورے اور آقا و غلام کا فرق مٹا دیا۔ پیدائش کے لحاظ سے تمام انسان برابر ہیں۔

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (النساء:۱)

یعنی اللہ نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا۔

تمام انسان عالمگیر برادری کے افراد ہیں لہٰذا وہ حقوق کے لحاظ سے برابر اور بھائی بھائی ہیں۔ کونوا عباداللہ اخوانا یعنی اللہ کے بندو تم بھائی بھائی بن جاؤ۔

حقوق نسواں کا تحفظ:

اسلام سے قبل معاشرہ میں عورت کا مقام نہایت پست تھا۔ قانون کی نظر میں عورت کا کوئی حق یا مرتبہ نہیں تھا۔ اسے جائیداد میں سے کوئی حصہ نہیں ملتا تھا بیوی اور غلام کو ایک ہی مقام پر رکھا گیا تھا۔ ہندوستان میں خاوند کے مرنے کے بعد بیوی کو بھی اپنے شوہر کے ساتھ آگ میں جل مرنا ہوتا تھا۔ اسے ستی کی رسم کہا جاتا ہے۔ ایران میں دو قسم کی بیویاں ہوتی تھیں، ایک بیوی کی اولاد جائیداد کی وارث ہوتی تھی اور دوسری بیوی کی اولاد جائیداد سے محروم رکھی جاتی تھی۔ مغربی ممالک میں بھی جائیداد کا وارث صرف بڑا بیٹا ہوتا تھا۔

عرب میں ایک عورت کے کئی خاوند ہوتے تھے۔ بعض قبائل لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی دفن کر دیتے تھے۔ عیسائیوں میں عورت کو ہی تمام گناہوں کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا تھا۔ ہندوستان میں عورت کو تمام برائیوں کا مجموعہ سمجھا جاتا تھا۔ عورت مال سے محروم تھی۔ عورت کو جوئے میں ہارنے کا رواج عام تھا۔ راجاؤں کی رانیوں کی کوئی تعداد قانوناً مقرر نہ تھی۔ یونان میں عورت کو ایک کم درجہ مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ مصر میں عورت کا مقام پست تھا۔ قحبہ گری عام تھی۔ مصری بادشاہوں کے حرم میں بے شمار عورتیں ہوتی تھیں۔ روم میں عورت کی حالت زار کے متعلق کہا جاتا ہے کہ عورت کا مرتبہ رومی قانون میں ایک عرصہ تک پست رہا۔ خاندان کا سربراہ باپ ہوتا یا شوہر، اسے اپنی بیٹی یا بیوی پر پورا اختیار تھا اور وہ عورت کو جب چاہے گھر سے نکال سکتا تھا۔

یہودی مذہب میں عورت کو نہایت پست اور گھٹیا مقام دیا گیا تھا۔ یہودی قانون میں مرد وارث کی موجودگی میں عورت وراثت سے محروم ہو جاتی تھی اور عورت کو بیوہ ہونے پر دوسری شادی کا حق نہیں تھا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسلام نے معاشرتی طرز زندگی کو سنوارنے کے لئے عورت کے مقام کو بلند کیا عورت کی مظلومیت ختم کر کے اسے مرد کے برابر معزز اور قابل احترام مقام دیا ہے۔ عورت کو وراثت کا حصہ ملا۔ نکاح اور خلع کی اجازت ہے۔ مذہبی فرائض کی ادائیگی میں آزادی ملی تعلیم کے دروازے اس پر کھلے ہیں۔ جس پر ہر ایک غیر مسلم عیسائی کو بھی کہنا پڑا کہ "اسلام نے عورت کو مملوکیت سے نکال کر مالکیت کا مرتبہ بخشا اور اسے پہلا شرعی وارث قرار دیا جس کے اموال کی حفاظت قانون اسلام پر واجب ہے۔"

آج ہر معاشرہ میں عورتوں کو حقوق دے کر ان کی حالت بہتر بنائی جا چکی ہے۔ اکثر معاشروں میں نکاح وطلاق کے قوانین میں بہتری پیدا ہو چکی ہے اور عورت کو بھی علیحدگی حاصل کرنے کا حق مل چکا ہے۔ سیاسی زندگی میں شراکت، ووٹ کا حق اور وراثت میں حق دیا جاتا ہے۔

غلامی کا خاتمہ:

عورت کے علاوہ دنیا کے ہر ملک میں ایک اور طبقہ بہت مظلوم تھا جو غلام کہلاتا تھا۔ غلامی کا رواج عام تھا۔ غلام کو معاشرہ میں کوئی مقام حاصل نہیں تھا۔ غلاموں کو معمولی غلطی پر سخت ترین سزا ملتی تھی۔ اگر کوئی غلام بھاگتا ہوا پکڑا جاتا تو اسے گرم لوہے کی سلاخوں سے داغا جاتا۔ غلاموں کی خرید وفروخت کی منڈیاں لگتی تھیں۔

اسلام نے غلامی کی زنجیروں کو ہمیشہ کے لئے کاٹ دیا۔ غلامی کو بتدریج ختم کرنے کے لئے دو طریقے اختیار کیے اول ترغیب کا طریق یعنی اپنے مال سے غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے کی ترغیب دی۔ مصارف زکوٰۃ میں غلام کو آزاد کرانا بھی ایک مصرف رکھا۔ دوسرا طریقہ بعض گناہوں کے کفارہ میں غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔ مثلاً قتل خطا، اظہار اور قسم توڑنے کا کفارہ۔ علاوہ ازیں آنحضور ﷺ نے کسی انسان کو آئندہ کے لئے غلام بنانا حرام قرار دیا۔ اسی طرح اسلام نے غلامی کا بتدریج خاتمہ کیا جو انسانیت پر احسان عظیم ہے چنانچہ یہ اسلامی تعلیم ہی کا اعجاز ہے

الغرض اسلام کی اعلیٰ سماجی اقدار، عدل وانصاف، مساوات اور اخوت انسانی کے نتیجہ میں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جو بقول ایک انگریز مورخ ایچ جی ویلز

"دنیا کا سب سے اچھا سیاسی اور مثالی نظام تھا اور اسی وجہ سے اس کو غلبہ حاصل ہوا۔"

علمی اثرات

اسلامی تہذیب وثقافت نے دنیا میں جو علمی اثرات مرتب کیے وہ درج ذیل ہیں:

ترغیب علم:

اسلامی تہذیب وثقافت نے لوگوں کو جس شدت سے ترغیب علم دی ہے اس کی مثال اسلام سے قبل کے مذاہب میں نہیں ملتی۔ مثلاً ہندومت میں علم پر برہمنوں کی اور عیسائیت میں پادریوں کی اجارہ داری ہے حتیٰ کہ افلاطون جیسے روشن خیال سمجھے جانے والے فلسفی کے نظام فکر میں بھی معاشرے کے تمام طبقات کے لیے تعلیم کا حصول ضروری نہیں قرار دیا گیا، جبکہ اسلام ہر آدمی کے لیے علم کی ترغیب دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "کیا علم رکھنے والے اور علم نہ رکھنے والے برابر ہو سکتے ہیں؟" (زمر 9:39) اس طرح نبی ﷺ نے فرمایا: "ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔" ایک اور حدیث میں فرمایا: "اگر طالب علم کو علم کی تلاش میں موت آجائے تو وہ شہید ہے۔" نیز فرمایا: "جو آدمی تلاش علم کا راستہ اختیار کرے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔" گویا عالم انسانیت میں اس وقت علم وعرفان، حکمت ودانش، تحقیق وانکشاف اور سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی وعروج کی جو بہار ہم سب کی نظروں کے سامنے ہے یہ صرف اور صرف اسلام کے سراج منیر ﷺ کی علمی ضیا پاشیوں کا پرتو ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اہل علم کی قدر دانی:

اسلام میں اہل علم کی قدر دانی کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عالم کی قدر افزائی کرتے ہوئے فرمایا: "کیا علم رکھنے والے اور نہ رکھنے والے برابر ہو سکتے ہیں؟" (زمر 9:39)۔ کئی احادیث عالم کی شان ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً

1- علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

2- ایک فقیہ ہزار عابدوں پر بھاری ہے۔

3- اللہ تعالیٰ اس آدمی کو خوش رکھے جس نے میری بات کو سنا اور آگے پہنچایا۔

نبی ﷺ کے بعد مسلمانوں نے مختلف ادوار میں ارباب علم و دانش کی قدر دانی کی۔ انہیں انعامات سے نوازا اور انہیں سہولتیں فراہم کیں۔ اس کے علاوہ ان کی توقیر اور عزت کا خیال رکھا۔ خلیفۂ وقت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں خود شریک ہوتا تھا۔

تعلیم کا عام ہونا:

اسلام نے تعلیم عام کر دی۔ اسے چند لوگوں کی اجارہ داری سے نکال دیا۔ ہندومت میں برہمن علم کا اجارہ دار ہے۔ اسلام میں مسلمان عالم کے متعلق ایسا تصور نہیں ہے، حتیٰ کہ مذہبی پیشوائیت کا جو تصور دیگر مذاہب میں موجود ہے وہ اسلام میں سرے سے مفقود ہے بلکہ دینی اور دوسرے علوم پر سب کا حق تسلیم کیا گیا حتیٰ کہ بنو امیہ کے دور میں ہندوستان اور بنو عباس کے دور میں اندلس کے غیر مسلموں پر بھی علم کے دروازے کھول دیئے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلموں میں علم کا احیاء بھی اس دور سے ہوا۔ امیر و غریب علم کی دوڑ میں شریک ہو سکتے تھے۔ یہاں تک کہ عبدالملک بن مروان کے دور میں سات بڑے علماء میں سے چھ غیر عرب تھے۔ محدثین میں سے اکثریت غیر عرب لوگوں پر مشتمل ہے۔

مفت تعلیم:

اسلام نے ایک اور کام یہ کیا کہ تعلیم کو عام کرنے کے ساتھ مفت بھی کر دیا۔ حکومت نے مدارس/سکول قائم کر کے مفت تعلیم دینے کا کام کیا۔ ساتھ ساتھ علمائے وقت بھی مفت تعلیم دیتے بلکہ بعض طلبہ کے اخراجات بھی اساتذہ برداشت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مالدار طبقات بھی مفت تعلیم پر اپنا مال خرچ کرنا باعث فخر سمجھتے تھے۔

مفید علوم کی ترویج:

مسلمانوں کی مفید علوم کی ترویج پر زور دیا اور غیر نافع علوم مثلاً جادو، موسیقی کی مذمت کی۔ اس لیے نبی ﷺ نے دعا سکھائی: "اے اللہ! ہمیں علم نافع عطا فرما۔" مفید انسانی علوم دینی علوم، عمرانی علوم اور سائنسی علوم پر زور دیا اور ان کے مثبت استعمال پر زور دیا تا کہ انسانیت کو فائدہ پہنچے اور فلاح انسانی کے لیے استعمال ہو اور اس علم کے مضر اثرات سے انسانیت محفوظ ہو جائے۔ اس نے غیر مفید علوم مثلاً موسیقی، گانا بجانا، نجوم و رمل، شرکیہ علوم سے منع کیا ہے جو انسانوں کے لیے مفید نہیں ہیں۔

تعلیمی اداروں کا قیام:

مسلمانوں نے علم کے لیے تعلیمی اداروں کو قائم کیا تا کہ طلبہ کو حصول علم میں پریشان نہ ہونا پڑے۔ عباسی دور میں باقاعدہ اداروں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ نظام الملک طوسی نے مدرسہ نظامیہ 459ھ میں بغداد میں قائم کیا۔ اس کے علاوہ جامع ازہر 365ھ، مدرسہ سعدیہ 395ھ مدرسہ مستنصریہ 432ھ اور مدرسہ نظامیہ نیشاپور قائم ہوئے۔ اس طرح عالم اسلام میں مدارس کا لامتناہی سلسلہ معرض وجود میں آیا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قبل از اسلام علوم سے استفادہ:

مسلمانوں نے اسلام سے پہلے علوم سے استفادہ کیا۔ فلسفہ جیسے علم کو جو گوشہ گمنامی میں جا چکا تھا، احیاء کیا۔ اس کے علاوہ قبل از اسلام طب اور سائنس کے علوم سے بھی استفادہ کیا۔ اس طرح مختلف علوم کی ترویج و اشاعت کے ضمن میں کوئی تعصب نہیں برتا گیا۔ یوں سابقہ علوم ضائع ہونے سے بچ گئے اور ان کے مفید پہلوؤں سے انسانیت آج بھی مستفید ہو رہی ہے۔

علمی تمدن کا قیام:

مسلمانوں نے حکومتی اور معاشرتی سطح پر علمی تمدن قائم کیا۔ تعلیمی اداروں، مساجد، گھروں، مکتب خانوں، کتب بازاروں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلا۔ جس نے ہر گھر کے تمدن کو علمی رنگ دے دیا۔ مسلمانوں کے گھروں میں زیادہ سے زیادہ کتابیں سجانے کا مقابلہ ہوتا تھا۔ جس سے تعلیمی تمدن عام ہوا اور ہر گھر علم و دانش کا مرکز بن گیا۔

سائنسی تجربات:

مسلمانوں سے پہلے سائنس ایک نظریاتی علم تھا۔ مسلمانوں نے اس کو تجربات کا علم بنا دیا۔ اس کے لیے تجربہ گاہیں اور رسدگاہیں اور ہسپتال قائم کیے گئے۔ جس سے سائنسی آلات اور ایجادات معرض وجود میں آئیں۔ اس کے علاوہ سائنس دانوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جس سے سائنسی علوم میں بہت ترقی ہوئی۔

ایجادات:

مسلمانوں نے اپنے دور میں بے شمار ایجادات کیں مثلاً ورنیئر، کیلکولیٹر، حجرہ تاریک، کیمرہ، طبعی ترازو، عدسی شیشے، پن چکیاں، گھڑیاں، قطب نما، ریٹارٹ، تیزابات، اصطرلاب، کیلنڈر، آلات جراحی اور عالمی نقشہ جات وغیرہ۔ اس سے یورپ نے فائدہ اٹھایا اور سائنس کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔

تعلیم کے ساتھ تربیت:

مسلمانوں نے علم کے ساتھ ساتھ انسانی تربیت پر بھی زور دیا کیونکہ صرف علمی معلومات سے اچھا انسان نہیں بنتا جب تک اس کی عملی تربیت نہ ہو۔ نبی ﷺ نے مسلمانوں کی اخلاقی تربیت کی۔ بعد میں خلفائے راشدین، صحابہ، علماء اور اولیاء نے یہ فریضہ سرانجام دیا۔ حدیث نبوی ﷺ ہے:
''اولاد کے لیے حسن ادب سے اچھا کوئی تحفہ نہیں۔''

صلاحیت کو ترجیح:

دین اسلام میں علم کو چند مخصوص گروہوں تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ صلاحیت کی بنا پر ہر شخص کو آگے بڑھنے کا حق دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ بڑے بڑے علماء میں سے اکثر غلام زادے تھے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مذہبی وفکری اثرات

اسلامی تہذیب وثقافت نے دنیا کے فکری زاویے کو تبدیل کر دیا اور مختلف شعبوں میں مذہبی وفکری انقلاب برپا کیا۔ ہم ترتیب وار ان کا جائزہ لیتے ہیں:

مذہبی اصلاحی تحریکیں:

اسلامی تہذیب وثقافت کے زیر اثر ہندومت اور عیسائیت میں اصلاحی تحریکوں نے جنم لیا۔ لوگ اسلام کے قریب ہو رہے تھے۔ اس لیے ان مذاہب کو اپنا وجود خطرے میں نظر آیا۔ ان کے درد دل رکھنے والے افراد نے اصلاحی تحریکیں شروع کیں۔ جیسے:

(الف) عیسائی پروٹسٹنٹ تحریک:

یورپ میں اسلام کے زیر اثر آٹھویں صدی میں عیسائیت میں اصلاحی تحریک شروع ہوگئی۔ جن کا عقیدہ تھا کہ توبہ اور التجا صرف خدا کے حضور کرنی چاہیے۔ پادریوں کے سامنے ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ تصویروں اور مجسموں کی تعظیم کے خلاف تحریک چلی۔ نویں صدی کا ایک اسقف کلوڈیوس تصویروں اور صلیبوں کو جلاتا تھا اور ان کی عبادت سے روکتا تھا۔ مزید برآں عیسائی فرقہ پروٹسٹنٹ کے ایک رہنما لوتھر نے ایک اصلاحی تحریک شروع کی جو اسلام کے زیر اثر تھی۔ آج یہ فرقہ کروڑوں کی تعداد میں ہے اور انگلستان میں اس کی اکثریت ہے۔

(ب) ہندوستان میں بھگتی تحریک:

اسلام کے زیر اثر ہندوستان میں بھگتی تحریک شروع ہوئی۔

رامانج اور رامانند نے اس تحریک کو پروان چڑھایا۔ یہ توحید اور مساوات کے قائل تھے۔ اس کے علاوہ اس تحریک کے لیے بھگت کبیر نے بھی بہت کام کیا۔ وہ بت پرستی، شراب اور ذات پات کا سخت مخالف تھا۔ ان کے علاوہ جے تنیہ بھی انسانی تکریم کا قائل اور ذات پات سے نفرت کرتا تھا۔ اس سلسلے میں آخری نام سکھ مذہب کے بانی بابا گرونانک کا ہے جس نے مسلمان صوفیاء سے علم حاصل کیا اور مکہ اور مدینہ منورہ بھی گیا اور اس کی کتاب گرنتھ صاحب میں توحید اور مساوات کا نمایاں اثر ملتا ہے جو اسلام کا فیضان ہے۔ سکھ مذہب اس کا ایجاد کردہ ہے۔ جس نے آہستہ آہستہ سے الگ مذہبی گروہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ ہندوؤں میں ایک اور تحریک لنگایت کی تھی جس نے ستی کی مخالفت کی اور عورتوں کو دوسرے نکاح کی اجازت دی۔

حریت فکر:

اسلام نے دنیا میں حریت فکر کا بیج بویا۔ اسپین کی اسلامی سلطنت کے زیر اثر یورپ میں عیسائیت کے جبر کے خلاف تحریکیں شروع ہوئیں۔ اس کی بنیاد ممتاز مسلمان فلسفی ابن رشد کی تعلیمات تھیں۔ مشہور مغربی مفکرین دیدرو، ہابز، روسو اور لاک اس کی فکر کے خوشہ چیں تھے۔

اسلام نے انسانیت کے پاؤں کی بیڑیاں اور گلے کے طوق کاٹ پھینکے۔ ان نظریات کا خاتمہ کیا جنہوں نے لوگوں کے پاؤں کی زنجیر اور گردنوں کا طوق بن کر حریت فکر کا جذبہ دبا رکھا تھا۔ حق تقریر وتحریر اور فکر ونظر کی آزادی اسلام کی عطا کردہ ہے۔ اس کے زیر اثر ہندوستان میں برہمنیت اور یورپ میں کلیسا اور پوپ کی باطل قوت پر ضرب لگائی گئی۔

شعور حیات کا اجاگر کرنا:

اسلام سے پہلے لوگوں کو ان کی زندگی کا شعور ہی حاصل نہ تھا۔ اسلام نے انسان کی قدر و قیمت بتائی اور اس کو زندگی کا صحیح شعور دیا۔ جس میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

خدائے واحد کی رضا اور خدمت انسانیت کا وصف نمایاں تھا۔ تمام دنیا کے لوگوں کی خدمت کا اجر انسان کے بجائے خدا سے وصول کرنے کے جذبے سے متاثر ہو کر اہل دنیا نے زندگی کا صحیح تصور اسلام سے مستعار لیا۔

کائنات میں تفکر کی دعوت:

اسلام نے کائنات میں تفکر، تدبر، مشاہدہ اور تجربہ کی دعوت دی۔ یہ اسلام کا سب سے بڑا فکری احسان ہے جو انسان پر کیا گیا۔ یہی سے دینی، سائنسی اور سماجی علوم کے سرچشمے پھوٹے جنھوں نے انسانوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا۔ مشاہدہ، تدبر اور غور و فکر نے انسان کے لیے مختلف میدانوں میں اصلاح کا دروازہ کھول دیا۔ جس نے آگے چل کر دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔

انداز حکمرانی میں تبدیلی:

اسلام سے پہلے بادشاہتوں کا دور تھا اور آمرانہ طرز حکومت کا رواج تھا۔ اسلام نے خلافت کا نظام دیا اور اسی خلافت کے ادارے کے ذریعے عوام سے مشاورت کے ذریعے حکومت کا نظام چلنا شروع ہوا اور عوام کا حکومتی سرگرمیوں میں شریک کر لیا گیا۔ اسی نے آگے چل کر جمہوریت کی شکل اختیار کر لی اور پھر عدل اجتماعی اور فلاحی ریاست کا تصور مقبول و مضبوط ہوا۔ آج کا مقبول جمہوری نظام دراصل اسلامی فکر کا نتیجہ ہے۔

مغربی تہذیب وثقافت اور اسلام اور ان کے باہمی اثرات

مغربی تہذیب اور اسلام اس وقت دو مقابل قوتیں ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لئے مغربی تہذیب وثقافت اور اسلام کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں سب سے پہلے مغربی تہذیب کی خصوصیات کا جائزہ لینا ناگزیر ہے۔

دور حاضر میں دو تہذیبیں موجود ہیں:

1- مغربی تہذیب 2- اسلامی تہذیب

روس کی شکست کے بعد اب مغربی تہذیب نے اسلامی تہذیب پر یک طرفہ حملہ کیا ہوا ہے۔ اب ہم تہذیبوں کے تصادم کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں:

مغربی تہذیب (Western Civilisation):

یہ تہذیب دراصل یہودیت اور عیسائیت کے نظریات کی حامل ہے۔ اس تہذیب کو اختیار کرنے والے ممالک میں یورپ اور امریکہ شامل ہیں جبکہ آسٹریلیا، کینیڈا اور سکینڈے نیویا کے دوسرے ممالک بھی اسی تہذیب کا حصہ ہیں۔

مغربی تہذیب کے خصائص واثرات (Features and Impacts of Western Civilisation):

اس تہذیب کے خصائص درج ذیل ہیں:

عیسائیت (Christianity):

اس تہذیب کی بنیاد عیسائیت ہے جو دنیا کا ایک اہم مذہب ہے۔ گو مغربی باشندوں کا مذہب کے ساتھ تعلق معمولی ہے۔ اس کا تعلق عبادات تک محدود ہے بلکہ بعض اوقات یہ تعلق صرف نظریات تک رہتا ہے۔ عملی زندگی اس مذہب سے آزاد ہے۔ لیکن اس ساری صورتحال کے باوجود ان کے اندر عیسائی تعصب پوری طرح موجود ہے۔ اس لیے ان مغربی معاشروں میں مسلمان عورتوں کے حجاب پر شدید ردعمل پایا جاتا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

لادینیت (Secularism):

مذہب کے ساتھ ان کے معمولی تعلق کے بعد عملی زندگی میں ان کے ہاں لادینیت ہے اور سیاست، معیشت اور معاشرت پر اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس پر فخر بھی کیا جاتا ہے۔ کیونکہ عیسائیت عملی زندگی میں رہنمائی سے قاصر ہے۔ اس سے اسی معاشرے میں اخلاقی مفاسد عام ہیں۔

مادیت (Materialism):

مغربی تہذیب کا بڑا انحصار صرف اور صرف مادیت پر ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں: بہر حال جس کا خطرہ تھا وہ پیش آیا اور یورپ کا رخ ایک مکمل اور وسیع مادیت کی طرف ہو گیا۔ خیالات، نقطۂ نظر، نفسیات و ذہنیت، اخلاق و اجتماع، علم و مادیت، حکومت و سیاست غرض زندگی کے تمام شعبوں میں مادیت غالب آگئی۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کے اثرات 245) اس طرح ہر چیز کو مادی نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

شخصی آزادی (Individual Liberty):

مغربی ممالک میں ان کے ہم مذہب باشندوں کو بڑی حد تک شخصی آزادی حاصل ہے۔ کسی پر کوئی پابندی نہیں جب تک کہ وہ دوسروں کے حقوق میں دخل اندازی نہ کرے اور یہ آزادی دوسرے مذاہب مثلاً مسلمانوں کو بھی ایک حد تک حاصل ہے، اگرچہ وہ آزادیوں سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس معاملے میں مغربی تہذیب کا دہرا معیار ہے۔ جیسے مسلم خواتین کو پردہ کرنے یا سکارف پہننے کی اجازت نہیں۔

خاندانی نظام کا خاتمہ (Abolition of Family System):

مغربی تہذیب میں خاندان کا ادارہ تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ لڑکیاں اور لڑکے بلوغت کے بعد آزاد ہو کر نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ ماں باپ اپنی راہ لیتے ہیں جبکہ بوڑھے افراد کو Old Houses کی زینت بنا کر قید تنہائی میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ چھوٹے بچوں کو سنبھالنے والے ادارے (Day Care Center) بھی موجود ہیں لیکن خاندانی نظام ٹوٹنے سے ایک بحران اور زبردست خلا پیدا ہو گیا ہے۔

جنسی بے راہ روی (Unchecked License):

آزادی کے نتیجے میں جنسی بے راہ روی نے بہت فروغ پایا ہے اور بغیر نکاح کے مرد و عورت اکٹھے رہ سکتے ہیں جس سے یہاں میاں بیوی کا تعلق کھیل بن گیا ہے اور طلاق کے مقدمات اس کثرت سے پیش آتے ہیں کہ عدالتیں ان کو نمٹانے سے قاصر رہ جاتی ہیں۔ طلبہ دورِ طالب علمی میں جنسی تجربات سے گزر جاتے ہیں اور دوسرے افراد انہی تجربات میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس طرح شادی کا مقدس عمل ختم ہو گیا ہے۔ نتیجتاً نئی نسل تربیت سے محروم ہو گئی ہے۔

جمہوریت (Democracy):

مغربی تہذیب کا ایک اہم حصہ وہاں کے نظام حکومت کا جمہوری نظام ہونا ہے۔ اس کی وجہ سے مغربی ممالک نے بہت ترقی کی ہے۔ جس نے وقتی طور پر اس تہذیب کو غلبہ عطا کر دیا ہے اور یہ دوسری تہذیبوں پر غلبہ حاصل کر رہی ہے۔ لیکن مغربی ممالک مسلمان ملکوں میں جمہوریت کے مخالف ہیں مثلاً مصر، شام، الجزائر اور فلسطین میں انہیں جمہوریت پسند نہیں ہے۔

علوم و فنون میں ترقی (Advancement in Science and Knowledge):

مغربی تہذیب کے نظریات میں علوم و فنون میں ترقی بھی شامل ہے۔ آج اس تہذیب کے حامل دنیا میں علوم و فنون کے امام ہیں۔ یہاں اس میدان میں لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور دنیا کے بہترین دماغ جمع کیے جاتے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تہذیبوں کا تصادم: حقیقت یا افسانہ

"As a genuine advocate of the often-elusive dialogue of religions and cultures Pope John Paul II once observed: "A clash ensues only when Islam or Christianity is misconstrued and manipulated for political or ideological ends." This insight -- most applicable to current crises -- perfectly mirrors that of Edward Said dispelling the myth of Clash of Civilization as a mere clash of ignorance."

(Hatim Salih)

The theory of Clash of Civilizations is the brainchild of Samuel P. Huntington (1927-2008), the renowned western political scientist. The theory argues that people's cultural and religious identities will be the primary source of conflict in the post-Cold War world. It continues with a clarion-call that the age of ideological conflict is over and has been replaced by civilization-based conflict. He says, "All the civilizations are human tribes and the future conflicts will be tribal conflicts." He identifies seven distinct current civilizations: Western, Confucian, Japanese, Islamic, Hindu, Slavic-Orthodox and Latin American. In Huntington's view inter-civilizations conflicts manifest themselves into two forms: Fault Line Conflicts and Core States Conflicts. He provides a variety of reasons substantiating as to why future conflicts will occur among civilizations. The conflict may arise due to: cultural differences; globalization; economic modernity; hegemonic and imposing role of the West and rejection of western values as the universal ones. These factors will ignite the inferno of conflicts among civilizations. The conflict will be in West-versus-non-West framework as the Kin Country Syndrome assumption will work. The countries having same civilization will co-operate one another. He even predicts that, "a central focus of conflict for the immediate future will be between the West and several Islamic Confucian states." Many pundits and demagogues accepted the theory as a reality including western radicals such as Bernard Lewis, Patrick Buchanan and Muslim radicals such as Maulana Maududi, Sayyid Qutb of Egypt, Khurshid Ahmad and Osama bin Laden. This clique considers that Clash of Civilizations is inevitable. On the other hand the theory received a barrage of bitter criticism. Paul Bermanan, Fouad Ajami, Bartley and Stephen Walt fall in this category. This group of giant intellectuals calls it a myth; a preposterous interpretation of human nature and a self-fulfilling prophecy. According to them it fuels Islamophobia in the West and xenophobia in the Islamic World. The Communists call it the bases for the perpetuation of the imperialistic hegemony of the West across the globe. The refuters of the theory call it a myth that is bent on to mould the world to conform a theory. Some oppositional concepts such as the "Dialogue among Civilizations", the "Interfaith Dialogue" and the "Alliance of Civilization" have also been put forward in response to the Clash of Civilizations theory.

Now, we delve deep into the nature of the theory, analyze its central concepts and observe the views of its supporters and opponents in depth to reach a conclusion.

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

Origin of Term Clash and Civilization:

The academic who shaped the term the "Clash of Civilizations", was Bernard Lewis, a prominent scholar on the Middle East and Islam. Lewis wrote the 1993 article "The Roots of Muslim Rage" in which he actually coined the term.

Lewis believed that the Muslim world has tried the western political and economic systems. But the result was tyranny and poverty. The Muslims held the US and Europe responsible for the "twin" evils and the both would be the legitimate targets of Islamic extremist movements and that the conflict will culminate into Clash of Islamic and Western Civilizations.

Samuel P. Huntington accepted the idea as taken for granted and even he went a step ahead. He wrote an article "the Clash of Civilizations" in the journal Foreign Affairs in 1993 in response to Francis Fukuyama' 1992 book "The End of History and The Last Man." The article unleashed a debate on the topic that continued in an unabated manner some refuted the idea; some gave the nod of approval. In 1996 he developed the thesis into a book.

Huntington Thesis Elaborated:

Huntington's work has become more and more accepted in the wake of terrorist attack of 9/11 on the US, 7/7 attacks on London and internationalization of terrorism and insurgency of Islamic extremism some thought that these attacks had validated the theory. They took to describing the ongoing battle between religious extremist and the US and Europe as a Clash of Civilizations. But after tracing out the alpha and omega of the clash theory it would seem a grotesque and distorted picture of facts and realities.

The central concepts of Huntington's Clash of Civilizations thesis is that post-Cold War world has entered a new era of conflict and this new era will be different from the past few hundreds years of conflict. The conflict will be between civilizations and world is divided into specific group of civilizations that will replace the identification with the nation state. The bipolar world of the Cold War has been replace by a new international era that can best be understood as a division of the world into seven or eight groups of civilizations and in which conflict will be defined by a conflict of values among them.

Before analyzing this scheme of ideas, we must define the very concept of civilization. To Huntington, civilization is, "the highest cultural grouping of people in broadest level of cultural identity people have short of that which distinguished human from other species." Each civilization is defined by certain distinct characteristics including religion, language, customs and institutions. He identifies seven distinct current civilizations: Western, Confucian, Japanese, Islamic, Hindu, Slavic-Orthodox and Latin Americans. He argues that future conflict will be among these civilizations.

Huntington substantiates the theory with variety reasons as to why future conflicts will occur between the civilizations. He says, "The differences among civilizations are not only real, but they are basic." The causes of conflicts are summarized as below.

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

Causes of Clash of Civilization as Espoused by Huntington:

i. Cultural Differences:

"The cultural differences" is the paramount factor in the inevitability of clash, because these are "less easily compromised and resolved." For instance one cannot be half-Catholic and half-Muslim at the same time.

ii. Globalization:

A second factor is the rapidly developing process of globalization. While argue that the globalization will bring people closer and brake down the barrier -- through communication and transportation -- Huntington unconvincingly argues the opposite that interactions will "intensify civilizations consciousness and awareness of differences between civilizations and commonalities within civilization."

iii. Economic Modernity:

A third factor is the economic modernity. People want to be grounded. They want stability and continuity. But the economic modernity cannot fulfil its promise to everyone, so the resulting gap would be filled by religion that will sow the seeds of fundamentalism which may lead to the Clash of Civilizations.

iv. Rejection of Western Values:

A fourth factor is the rejection of western values as the universal ones. He argues that the culture of western and non-western civilization will continue to clash especially in the areas of "individualism, liberalism, constitutionalism, human rights, equality, liberty, the rule of law, democracy, free markets and the separation of church and state." He also argues that Muslims have offensive attitude towards western secularism and modernism.

v. Increased Contacts Among Civilization Intensify the Difference:

Finally he argues that increase contacts between two civilizations helps develop a new sense of identity within each and highlights difference between them. "The Clash of Civilizations" concludes by observing that "so long as Islam remains Islam (which will) and the West remains the West (which is more dubious) this fundamental conflict between two great civilizations and ways of life will continue to define their relations in the future as it has defined them for the past fourteen centuries." He argues that many of the future conflict in west-versus-non-west framework as the Kin Country Syndrome assumptions will work. That is to say the countries of same civilizations will support to one another in a conflict. He even further predicts that "a central focus of conflicts for the immediate future will be between the West and several Islamic Confucian states."

He prescribed certain policy measures for the West so as to hold control over Islamic and Confucian worlds: simply by depriving them of technology and modernity; limiting their military expansions; and preventing any localized conflict from escalating into a global war, that might lead to the Clash of Civilizations.

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

Now, we analyzed the theory on the grounds of its acceptance or rejection vis-à-vis its central theme.

Supporters of the Theory

As for as its acceptance is concerned, the radicals both westerns and Islamists ratify it and think that the Clash of Civilizations is inevitable. They take it as a reality. And they are inclined to fuel the already existing conflagration between Islam and the West, transforming it into hell inferno.

i. Western Radicals:

Barnard Lewis who actually coined the term is the staunch supporter of the clash theory. He argues in his essay "The Roots of Muslim Rage" that tyranny and poverty coupled with Islamic fundamentalism will lead the Islamists to clash with the West. And the clash will be a fait accompli. Patrice Buchanan, a well-known American conservative believes that the Clash of Civilizations is coming and it is imperative for the West to win the battle.

ii. Muslim Radicals:

In Islamic world, Maulana Maududi (1903-1979), Sayyid Qutb (1906-1966), and Osama Bin Laden are of the view that Islam and the West are in a state of perpetual conflict and everything in the way of Islamic rule should be eliminated through violent jihad. Professor Khurshid Ahmad is of the view that the backlash against the imposition of western values in the Islamic world will lead to the Clash of Civilizations.

Opponents of the Theory

There are conspicuous flaws in the theory; many academics rejected it on the bases of these flaws. The intellectuals jettisoned the thesis in toto or in part, denouncing it as a self-fulfilling prophecy, a preposterous streak of thought and a nebulous hypothesis.

i. Fouad Ajami:

The main flaw that is clear from the very outset of the theory is the notion of shifting of identities from national to civilizational level. Nations always pursue their national interest. Professor Fouad Ajami refuted the theory on this ground.

ii. Robert Bartley:

Huntington argues that globalization will derive people a part. But indeed the case is vice versa. This is a preposterous assumption. According to the late "wall street journal" editor Robert Bartley, the globalization will bring people closer and it will promote pluralism and understanding rather xenophobia and paranoia.

iii. Paul Berman:

Islamic world has intimate relations with the West. Paul Bermanan in his opus "Terror and Liberalism" argues that the distinct cultural boundaries do not exist today. He argues that, "we are disillusioned with the clash theory when we see relations between Saudi Arabia and the US."

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

iv. Edward Said:

The clash theory is based not on harmony but on the clash between the civilizations. Edward Said holds the same view. He writes in his essay entitled "The Clash of Ignorance" that the interactions and interdependence between the civilizations will bring them closer rather apart, as oppose to Huntington's view.

As for as the rejection of western values is concerned, democracy, freedom, tolerance, human rights, liberty, the rule of law, respect for others and moderation are not only the universal values but also the basic building blocks of Islamic faith as once Tony Blair said, "tolerance is the defining characteristic of Islam." These values are the source of reconciliation among civilizations as oppose to the Clash of Civilizations.

v. Alan Woods:

The communist especially Alan Woods, in his condemnation of the clash theory call it the bases for the continuation of the imperialistic designs of the West across the globe.

Alternatives to avert the Clash of Civilization

The theory also received a number of alternative concepts such as the Dialogue among Civilizations by President Khatami of Iran, the Interfaith Dialogue by King Abdullah of Saudi Arabia and the Alliance of Civilizations by the President of Spanish Government Zapareeto along with the Turkish Prime Minister Erdogan. The latter initiative intended to galvanize collective action across diverse societies to combat extremism, to overcome cultural and social barriers, mainly, between Islam and the West.

Conclusion:

After scrutinizing the ins and outs of the clash theory in length, analyzing its central concept and the views of its supporters and opponents we can conclude that this theory has actually helped provoke the confrontation it predicts. It is a self-fulfilling prophecy of fear that disregards history and human nature, molding the world, to conform a theory. The assertions about Islam are widely misinformed. The notion that culture of Islam is antithetical to democratic values not only is unsubstantiated by Quranic reference and Islamic clerical interpretation, but also plays into Islamic extremist views that the West is disrespectful and antagonistic to Islam's belief and history. The assertion that social, political and economic interactions between Islam and the West precipitate conflict as oppose to promoting understanding is a preposterous and antithetical to what we know about human nature and international relations. Such a thesis could pre dispose the West to accepting the inevitability of armed conflict with Islamic societies. It shamelessly prescribes methods of the West to hold Islamic nations in check by denying them the tools of modernity and technology. The Clash of Civilization theory is not just intellectually provocative: it fuels xenophobia and paranoia both in the West and the Islamic world. Its methodology is flawed and its conclusions are historically unsupported. Its morbid conclusions are certainly not inevitable. Stephen Walt concludes his refutation of the clash theory with a warning. The Clash of Civilizations, if accepted, can lead to future conflicts because "if we treat all states that are part of some other "civilization" as intrinsically hostile, we are likely to

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

create enemies that might otherwise be neutral or friendly." Thus Walt warns us that in this sense "The Clash of Civilizations offers a dangerous self-fulfilling prophecy: the more we believe it and make it bases for action, the more likely it is to come true. Thus there will be clash of civilizations only if we allow it by believing that it is inevitable and unavoidable. In myth, we cannot believe.

عالم اسلام کے موجودہ مسائل اوران کا حل

عالم اسلام پچاس سے زائد آزاد اسلامی ممالک پر مشتمل ہے جس کی آبادی تقریباً سوا ارب ہے گویا کہ دنیا کا ہر پانچواں شخص مسلمان ہے۔ مسلمان دنیا کے تمام براعظموں میں آباد ہیں۔ اسلامی ممالک کے پاس اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بیش بہا اور گوناں گوں وسائل ہیں۔ وہ بہترین افرادی قوت کے مالک ہیں جن کے پاس علم وذہنی سرمایہ کی کمی نہیں ہے۔ اسلامی دنیا زرعی پیداوار، قیمتی معدنیات اور معاشی دولت سے مالا مال ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے دنیا کے اہم ترین علاقے ان کے پاس ہیں۔ وہ دنیا کے انتہائی اہم زمینی، سمندری اور ہوائی راستوں کے مالک ہیں۔ اس طرح عالم اسلام کے پاس اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا سب کچھ ہے۔ وہ ہر لحاظ سے خود کفیل ہے ان سب وسائل کے باوجود اسلامی دنیا میں اتحاد، منصوبہ بندی اور تعاون کی کمی ہے۔ وہ اپنے وسائل کو نہ تو صحیح طور پر استعمال کرنے کے قابل ہیں نہ ہی موجودہ دنیا اور جدید دور میں کوئی موثر اور اہم کردار ادا کرنے کے لائق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ متعدد مسائل اور مشکلات سے دوچار ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ملی تشخص اور اتحاد امت کا مسئلہ:

امت مسلمہ برسوں کی بیرونی/مغرب غلامی سے اپنا ملی تشخص کھو چکی ہے۔ احساس کمتری میں مبتلا ہوگئی ہے اور اسلام کی فوقیت اور حقانیت پر ایمان کمزور ہوگیا ہے۔ پچھلی صدی میں گو مسلمان ممالک نے ایک ایک کر کے مغربی سامراج سے سیاسی آزادی تو حاصل کر لی ہے لیکن ذہنی غلامی میں تا حال مبتلا ہیں۔ خاص طور پر مسلمانوں کا حکمران طبقہ منافقت کا شکار ہے۔ یہ طبقہ زبانی طور پر تو اسلام اور اسلامی نظام کی رٹ لگاتا ہے لیکن ذہنی طور پر اسلام کی فوقیت اور حقانیت کا قائل نہیں بلکہ حیلے بہانے سے اسلام سے فرار کی راہ اختیار کرنا چاہتا ہے بلکہ اسلامی ممالک میں اسلام کے عملی نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی حکمران طبقہ ہے جو امریکہ اور یورپ کی ظاہری چمک دمک سے متاثر اور مادی ترقی سے مرعوب ہے۔ نیز مغرب کی اندھا دھند تقلید کو ہی قابل فخر خیال کرتا ہے۔ مغربی آقاؤں کے اشارے پر یہ طبقہ امت مسلمہ میں پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو "Divide and Rule" کے اصول پر کاربند ہے اور اس طرح امت مسلمہ میں ہر قسم کے لسانی، نسلی علاقائی اور طبقاتی امتیازات پیدا کر کے عالم اسلام کو کمزور کر رہا ہے۔

پھر یہی طبقہ مغرب کی خوبیوں مثلاً دیانت، امانت، حب الوطنی اور خدمت خلق کو تو اپناتا نہیں بلکہ مغربی ثقافت، معاشرت، نظام تعلیم، عریانی اور فحاشی کو مسلمان ملکوں میں رائج کر کے اسلامی ملی تشخص کو تباہ کر رہا ہے۔ اس طرح امت مسلمہ کا اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ملی تشخص کی بحالی اور اتحاد امت ہے۔

حل:

اول تو مسلمان ممالک میں اسلامی تعلیمات کو عام کیا جائے اور اسلام کو ایک غالب قوت کے طور پر عملاً نافذ کیا جائے۔ مغرب سے مرعوب ہونا اوران کی اندھا دھند تقلید ترک کر دی جائے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اہل مغرب کی خوبیوں کو بھی نہ اپنائیں۔ عربی زبان کا ایک مشہور مقولہ ہے:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

"خذ ماصفی ودع ماکدر"

یعنی صاف ستھری چیزوں کو لے اور گندی چیزوں کو ترک کر دے۔

لہٰذا اس پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ہمیں اہل یورپ کی فحاشی، عریانی اور بے حیائی کی عادات واطوار اور ملحدانہ تعلیمات سے تو کنارہ کشی اختیار کر لینی چاہیے مگر سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں نہ صرف ان کی پیروی بلکہ ان سے سبقت لے جانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جیسا کہ پاکستان نے ایٹمی دھماکہ کر کے عالم اسلام کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے کیونکہ موجودہ دور میں اس کے بغیر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسلام کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مسلمان جنگی اعتبار سے اس قدر مضبوط ہوں کہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے۔ قرآن میں علم کا تصور بہت وسیع ہے اس میں دینی علوم کے ساتھ کائنات کے تمام علوم بھی شامل ہیں بلکہ علم ان سب کے مجموعے کا نام ہے چنانچہ یہ علم وحکمت جہاں سے بھی ملے مسلمانوں پر اس کا حاصل کرنا فرض ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

"حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے جہاں سے بھی ملے وہ اسے لے لے کیونکہ وہی اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔"

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک ونسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری

معاشی مسائل:

عالم اسلام کے بڑے بڑے مسائل میں معاشی پسماندگی، سائنس اور ٹیکنالوجی میں مغرب کی محتاجی، غربت، بے روزگاری، تجارتی بد دیانتی، باہمی معاشرتی عدم تعاون وغیرہ شامل ہیں۔

ہمارے اقتصادی مسائل اور معاشی مشکلات کی ابتداء اس وقت ہوئی جب ہم نے غیروں کے معاشی نظام کو اپنایا، مسلمان اپنے دور عروج میں اسلام کے معاشی نظام پر عمل پیرا تھے اور اس کی برکات وثمرات سے مالا مال تھے۔ زکوٰۃ وعشر کا نظام اجتماعی لحاظ سے نافذ تھا۔ دولت چند ہاتھوں میں جمع ہونے کی بجائے پورے معاشرے میں گردش کرتی تھی۔ سوسائٹی عدل، احسان، تعاون اور خیر خواہی پر قائم تھی اور مسلمانوں میں معاشی خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا لیکن جب عالم اسلام غیروں کا غلام اور محکوم بن گیا اور مغربی ممالک نے اسلامی ممالک پر سیاسی غلبہ حاصل کر لیا تو انہوں نے سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کو رائج کر دیا جس کی بنیاد سود، لوٹ کھسوٹ اور خود غرضی پر مبنی ہے پھر بعض اسلامی ممالک پر اشتراکیت نے غلبہ پالیا اور معاشی وسائل پر حکمران طبقہ نے قبضہ کر لیا چنانچہ ان دونوں نظاموں نے عالم اسلام میں نہ صرف معاشی مسائل پیدا کیے بلکہ مرحلہ وار اضافہ کا باعث بنے۔ عرب ممالک تیل کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ان کی تمام دولت امریکہ اور یورپ کے بینکوں میں جمع ہے۔ اس طرح یہ دولت بھی عالم اسلام کی معاشی ترقی کی بجائے مغربی ممالک کی معاشی فلاح کے لئے استعمال ہو رہی ہے۔ پورا عالم اسلام مغرب کا معاشی طور پر محتاج ہے کیونکہ وہ جدید ٹیکنالوجی میں پسماندہ ہے۔ اپنا خام مال مغرب کو سستے داموں دیتا ہے اور تیار شدہ مصنوعات مہنگے داموں خریدتا ہے پھر مغربی ممالک معاشی امداد کے نام پر سیاسی اور معاشی مفادات حاصل کرتے ہیں عالمی مالیاتی ادارے اسلامی ممالک پر ملی مفاد کے خلاف سخت اور رسوا کن شرائط عائد کرتے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حل:

ہمارے معاشی مسائل کا حل اسلامی معاشی نظام رائج کرنے میں ہے پھر جدید ٹیکنالوجی اور جدید سائنسی طریقوں کا اپنانا ہے کیونکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کسی قوم کی میراث نہیں ہے بلکہ یہ پوری انسانیت کی مشترکہ میراث ہے۔ علاوہ ازیں اسلامی ممالک کو باہم معاشی تعاون اور اشتراک سے کام لینا چاہیے۔ جس کی مثالیں اسلامی بین الاقوامی بینک، اسلامی مشترکہ منڈی وغیرہ ہیں۔ ضرورت ان اداروں کو مزید وسعت دینے اور موثر بنانے کی ہے تاکہ ہم اپنے وسائل سے خود استفادہ کر سکیں۔ نیز پیداوار میں اضافہ، صنعتوں کا قیام اور برآمدات میں اضافہ بیروزگاری اور غربت کا حل ہے۔

الغرض عالم اسلام کو اپنے وسائل کا زمانہ حال میں بہترین استعمال کرنا چاہیے تاکہ ان کا مستقبل روشن اور تابناک ہو۔

بقول علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ:

وہ قوم نہیں لائق ہنگامہ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

سیاسی مسائل:

سیاسی لحاظ سے عالم اسلام دو قسم کی مشکلات سے دوچار ہے۔ اولاً عالم اسلام مختلف دھڑوں میں تقسیم ہے۔ اسلامی ممالک میں وحدت یک جہتی اور اتحاد کا فقدان ہے اور وہ بوقت ضرورت کوئی متفقہ لائحہ عمل اور موثر موقف اختیار کرنے سے قاصر ہیں۔

ثانیاً ہر اسلامی ملک مستحکم سیاسی نظام سے محروم ہے۔ نتیجتاً انتشار، خلفشار اور طوائف الملوکی کا شکار ہے۔

پہلی جنگ عظیم تک عالم اسلامی ایک سیاسی وحدت تھا۔ خلافت عثمانیہ کے نام سے مسلمانوں کی ایک وسیع اور عظیم مملکت موجود تھی جس میں ترکی، مصر، مشرق وسطی اور افریقہ کے مسلم ممالک شامل تھے۔ جنگ عظیم کے بعد خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کر کے اسے متعدد خود مختار ریاستوں میں تقسیم اور کمزور کر دیا گیا۔ آج پچاس سے زیادہ اسلامی ممالک ہیں لیکن ان میں اتحاد اور یگانگت مفقود ہے۔ اپنی نادانی اور غیروں کی سازش سے باہم برسرپیکار رہتے ہیں۔ انتشار اور لامرکزیت کا شکار ہیں۔ سابق سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد پورا عالم اسلام کسی نہ کسی طرح مغرب اور امریکہ کی مخالفت اور چیرہ دستی کا شکار ہے۔

دوسری طرف ہر اسلامی ملک میں غیر اسلامی نظام، ڈکٹیٹر شپ، نام نہاد مغربی جمہوری بادشاہت اور سوشلزم رائج ہیں۔ عوام الناس کو بنیادی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ عوام کو امور مملکت میں کوئی دخل حاصل نہیں حکمرانوں کی جڑیں عوام میں نہیں حکمران اور رعایا میں دوری اور بیگانگی ہے۔ اس لیے اکثر اسلامی ممالک کی حکومتیں امریکہ کے اشارے پر بنتی اور بگڑتی ہیں عوام کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔

شاعر مشرق علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ مایوسی اور ناامیدی کی کوئی بات نہیں اگر ملت اسلامیہ کاہلی اور سستی چھوڑ دے تو مستقبل روشن بنایا جا سکتا ہے۔

ناامید نہ ہو ان سے اے رہبر فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حل:

ان مسائل کا حل اسلام کی سیاسی تعلیمات کے نفاذ میں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کا اخوت، مساوات اور عدل احسان اور شورائیت پر مبنی سیاسی نظام قائم کیا جائے۔ عوام میں سیاسی شعور پیدا کیا جائے انہیں امور مملکت میں پوری طرح شریک کیا جائے تاکہ بڑی طاقتوں کو مداخلت کا موقع نہ مل سکے۔

علاوہ ازیں عالم اسلام کا اتحاد اور یک جہتی وقت کی ضرورت ہے۔ عالمگیر اسلامی اخوت کو رواج دیا جائے۔ مسلمان ممالک کی دولت مشترکہ قائم کی جائے۔ جہاں مسلمان اپنے مسائل اور اختلافات خود حل کرسکیں۔ موتمر عالم اسلامی، عرب لیگ اور او آئی سی اوجیسی عالمی تنظیموں کو مزید مضبوط بنا کر ایک موثر اسلامی بلاک معرض وجود میں لایا جائے تاکہ بقول حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کاشغر

معاشرتی مسائل:

امت مسلمہ کے زوال سے اسلامی معاشرتی نظام بھی زوال پذیر ہوا۔ غیر اسلامی نظریات مسلمانوں میں رواج پا گئے جس سے متعدد معاشرتی مسائل اور برائیاں عالم اسلام میں پیدا ہوگئیں۔ یہ برائیں دو اسباب سے پیدا ہوئیں۔ اول غربت و افلاس، جس کے متعلق آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ قریب ہے کہ فقر اور افلاس کفر تک پہنچ جائے چنانچہ غربت کی وجہ سے معاشرہ میں بددیانتی، سمگلنگ، چوری، ڈکیتی اور بدکاری نے مسلم معاشرہ میں راہ پائی پھر بعض مسلم ممالک میں دولت کی فراوانی اور مال کی کثرت نے معاشرتی مفاسد کو جنم دیا۔ محنت کی جگہ راحت، جہاد کی جگہ عیش وعشرت اور جدوجہد کی جگہ سہل پسندی اور آرام طلبی نے لے لی۔ دولت کی کثرت نے طبقاتی کش مکش میں پیدا کی جس سے مسلمانوں میں باہمی بغض حسد، نفرت اور حقارت نے جنم لیا۔ جب اسلامی اخوت کا رشتہ کمزور ہوا تو معاشرے سے عدل و انصاف ختم ہوگیا اور ظلم وستم، انتشار اور خلفشار نے جگہ لے لی۔ ناجائز دولت اور کثرت مال سے عریانی فحاشی کی برائیاں بھی پیدا ہوئیں۔ قومی اور علاقائی تعصبات کو ہوا ملی۔ جس سے مسلم معاشرے کا داخلی استحکام مجروح ہوا اور وہ غیروں کے لئے تر نوالہ ثابت ہوئے۔

حل:

ان مشکلات اور برائیوں کا حل یہ ہے کہ اخوت، مساوات، سادگی، محنت، عفت اور دیانت کی اسلامی تعلیمات کو عام کیا جائے تاکہ قرآن مجید کا یہ حکم انما المومنون اخوۃ عملی صورت میں نافذ ہوسکے۔

اخلاقی مسائل:

آج عالم اسلام کو اخلاقی انحطاط اور کردار کے بحران کا سنگین مسئلہ درپیش ہے۔ اسلامی ممالک میں اعلیٰ اخلاقی اقدار ختم ہو رہی ہیں۔ ہماری نوجوان نسل بے راہ روی اور اخلاقی فساد کا شکار ہے۔ آج مسلم معاشرہ میں وہ تمام اخلاقی برائیاں پائی جاتی ہیں جن میں سے کسی ایک میں مبتلا ہونے کی وجہ سے گزشتہ اقوام پر تباہی نازل ہوتی رہی مسلمان اخلاق فاضلہ سے محروم ہیں۔ معاشرہ میں ہر طبقہ، اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار ہے۔ رشوت، کرپشن، اسراف، خیانت، جھوٹ، فریب، حرص و لالچ عام ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

کیسا نبی، کیسا خدا، پیسہ نبی، پیسہ خدا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

فی الحقیقت مال و دولت کی ہوس مسلمانوں کی کمزوری کا باعث بن چکی ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ اپنے دین وایمان دنیا وآخرت، قومی وقار اور ملکی مفاد کو بیچ دیتے ہیں۔

حل:

ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی تعلیمات یعنی فکر آخرت، خوف خدا، قناعت وامانت کو عام کیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ انفرادی اور اجتماعی محاسبہ کا نظام قائم کیا جائے قومی خیانت کے مرتکب کسی شخص کو معاف نہ کیا جائے۔ غرض قلبی تطہیر، ذہنی تزکیہ کے ساتھ ساتھ اسلامی تعزیرات اور قرآنی حدود کا نظام عملاً نافذ کیا جائے۔

تعلیمی مسائل:

تعلیمی میدان میں بھی ہمیں متعدد مسائل کا سامنا ہے۔ مسلم ممالک میں شرح خواندگی کی کمی، بے مقصد اور مہنگا نظام تعلیم ہر سطح پر دوعملی اور غیر ملکی زبانوں کا تسلط اور ناقص نظام امتحان، ہمارے بڑے بڑے تعلیمی مسائل ہیں۔ ہمارا نظام تعلیم بے مقصد، مہنگا اور غیروں کا وضع کردہ ہے۔ یہ قومی امنگوں کی ضد اور ملکی تقاضوں کے خلاف ہے۔ ہر سطح پر تعلیم میں دوعملی ہے اگر ایک طرف دینی مدارس اور جدید تعلیمی اداروں میں خلیج حائل ہے تو دوسری طرف اردو میڈیم اور انگلش میڈیم کا مسئلہ ہے۔ غریب اور امیر کے لئے تعلیمی ادارے علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اس طرح ایک ہی ملک میں متعدد تعلیمی نظام رائج ہیں پھر منصوبہ بندی کا فقدان ہے۔ فارغ التحصیل طلباء کی کھپت اور روزگار کا کوئی معقول انتظام نہیں جس کی وجہ سے ہمارا قابل ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ یورپ اور امریکہ کا رخ کرتا ہے جہاں انہیں سازگار فضا اور مشاہرے ملتے ہیں۔

حل:

یہ سنگین اور سنجیدہ مسائل ہیں جو عالم اسلام کے لئے فوری حل کے متقاضی ہیں۔ اس کے لئے اولاً تو مسلمان ممالک میں اسلامی نظام تعلیم قومی امنگوں ملی مقاصد اور جدید تقاضوں کے تحت وضع کیا جائے پھر قدیم مکتب سکیم کو نافذ کیا جائے نیز ہر سطح پر دوعملی کو ختم کیا جائے اور بجٹ میں تعلیم کی مد کے لئے زیادہ فنڈ رکھے جائیں کیونکہ تعلیم کی ترقی سے ہی قوم معاشی، اخلاقی اور معاشرتی ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتی ہے۔

عالم اسلام کا مستقبل

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

(بال جبریل)

عالم اسلام کے تابناک اور بہتر مستقبل کے لئے ہمارا سیاسی استحکام اور ملی اتحاد ضروری ہے پھر سیاسی استحکام کے لئے مسلمان ممالک کے مضبوط بلاک کی ضرورت ہے تاکہ اسلامی ممالک کے وسائل کو عالم اسلام کی مضبوطی اور استحکام کے لئے بہتر طور پر استعمال کیا جا سکے۔ عالم اسلام پچاس سے زائد ممالک پر مشتمل ہے اس کی کل آبادی سوا ارب ہے جو پوری دنیا کا پانچواں حصہ ہے۔ مسلم ممالک دنیا کے تیل کے ستر فیصد ذخائر کے مالک ہیں اور تیل کی تجارت میں ان کا حصہ ساٹھ فیصد ہے۔ دنیا کی اسی فیصد پٹ سن، پچھتر فیصد ناریل کا تیل، پچیس فیصد مونگ پھلی اور لونگ۔ پندرہ فیصد چاول، چائے اور کافی، دس فیصد چینی، نو فیصد گندم، پانچ فیصد قلعی اور چھ فیصد ربڑ مسلم ممالک پیدا کرتے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اس وقت عرب ممالک کا کثیر سرمایہ یورپی اور امریکی بینکوں میں پڑا ہے۔ پٹرول کی رائلٹی کی صورت میں زرمبادلہ کے یہ ذخائر عالم اسلام کے ترقیاتی منصوبوں کے لئے استعمال نہیں ہوتے اس سرمایہ سے اگر وہ ٹیکنیکی مہارت خریدیں اور مسلمان ترقی یافتہ اور صنعتی ممالک کا فنی تعاون حاصل کریں تو عالم اسلام میں صنعتی اور معاشی انقلاب آسکتا ہے اور وہ اپنے وسائل کو یکجا کر کے، خود کفالت کی منزل حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح اگر عرب ممالک کا سرمایہ اور ترکی، پاکستان اور مصر کی اسلحہ سازی کی صلاحیت متحد ہو جائیں تو اسلامی دنیا کم از کم روایتی ہتھیاروں میں خود کفیل ہو سکتی ہے نیز ہمارے مشترکہ دفاع کی وجہ سے غیر مسلموں پر ہماری ہیبت اور دبدبہ بیٹھ جائے گا۔ اب تو ماشاء اللہ پاکستان ایک ایٹمی قوت بن گیا ہے جس سے عالم اسلام کا دفاع مضبوط ہو گیا ہے۔

اگر یورپی ممالک کی مشترکہ منڈی بن سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان ممالک مشترکہ اسلامی مارکیٹ قائم نہ کرسکیں۔ جو اقتصادی میدان میں ان کے اشتراک کی اساس ہو۔ اس طرح اگر پورے یورپ کی ایک مشترکہ پارلیمان بن سکتی ہے جہاں ویزے اور پاسپورٹ کی کوئی پابندی نہ ہو عالم اسلامی کی مشترکہ پارلیمان تو اس سے بھی زیادہ آسان ہے۔ اہل دانش مسلمانوں میں یہ فکر اور سوچ دن بدن تقویت پکڑ رہی ہے اس ضمن میں اسلامی عالمی بینک کی پیش رفت حوصلہ افزا ہے۔

اسلامی خبر رساں ایجنسی کا منصوبہ بھی ہنوز تشنہ تکمیل ہے اس وقت ذرائع ابلاغ میں یہودی چھائے ہوئے ہیں اور وہ عالمی رائے کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی سعی کرتے رہتے ہیں۔ اسلامی ممالک خبروں کے حصول کے لئے ایسی خبر رساں ایجنسیوں کے محتاج ہیں۔ یہ خبر رساں ایجنسیاں مسلمانوں میں افتراق اور علیحدگی کا بیج بوتی رہتی ہیں اور خبروں کو اپنا مخصوص رنگ دیتی ہیں۔ اس لیے عالم اسلام اپنی خبر رساں ایجنسی قائم کر کے استحکام کی طرف مزید پیش رفت کر سکتا ہے۔

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے ایک عالمگیر دین ہے جسے ہر دین اور نظریہ پر غالب آنا ہے اور یہی منشائے خداوندی ہے کہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (الفتح:۲۸) اللہ تعالیٰ یہ کام امت مسلمہ سے لینا چاہتا ہے لہٰذا امت مسلمہ کا فرض ہے کہ اس مکمل اور عالمگیر ضابطہ حیات کو پوری دنیا میں عملاً نافذ کرے تاکہ وہ صحیح معنوں میں امت وسط اور بہترین ملت قرار پائے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (البقرہ:۱۴۳)

لیکن اس سے قبل خود مسلمانوں کو اپنی زندگیاں اسلام کے مطابق ڈھالنی ہوں گی۔ اسلامی معاشروں میں اسلامی ضابطہ حیات پورے طور پر لاگو کرنا ہوگا۔ اخلاقی بحران اور ایمان کی کمزوری سے نجات پانا ہوگی۔ کیونکہ آج امت مسلمہ ایمان کی کمزوری کا شکار ہے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت کا وعدہ ایمان کی مضبوطی کے ساتھ مشروط ہے۔

اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران:۱۳۹)

یعنی اگر تم صحیح کامل اور پکے مومن ہوگے تو تم ہی غالب رہو گے۔

فی الحقیقت مسلمان قوم کے اندر وَھَن کی بیماری پیدا ہوگئی ہے۔ وَھَنْ سے مراد حب الدنیا و کراھیة الموت یعنی دنیا کی محبت اور موت سے نفرت نے امت مسلمہ کو اپنا مشن اور مقصد بھلا دیا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

انتہاپسندی کا فروغ

RISE OF EXTREMISM AND MODERN MUSLIM FUNDAMENTALISM: THE ROOTS AND THE CAUSES

Introduction:

Once Albert Camus warned, "We cannot 'Escape History', as we are up to our necks in it". History helps us judge the present day situation. In the same fashion Ted Grant (1911-2006), the veteran Marxist said, "Neither pessimism nor stupendous optimism can play a role in determining the analysis of events. The first necessity is to understand the meaning of the conjecture of historical forces leading to the present world situation". When the past deliberately or otherwise is winked at on the part of scholars, then the conclusion may be "a riddle wrapped inside an enigma". Same is the case with the study of Modern Muslim Fundamentalism that is now morphed into a "conundrum". But a dispassionate and historical analysis may lead to unmorbid and healthy conclusion.

Fundamentalism is basically the attachment with the fundamentals and basic building blocks of a certain ideology or a subject. Then it should be bliss not a malaise as it is commonly conceived. To scrutinize as why the Modern Muslim Fundamentalism is perdition as it harms more Muslims and Islam than its enemies. Abiding by the pieces of advice rendered by Camus and Grant, we delve deep into the history of the Muslim Fundamentalism which has led to rise of rabid extremism and militant terrorism.

Historical Perspective:

Generally Ahmed Ibne Hanbal and Ibne Taimyah are considered the "ancestors (Salf)" of Modern Muslim Fundamentalism. Did they deviate from the right path of Islam? We peruse it here gingerly. The sort of fundamentalism that was propagated by Ibne Hanbal and Ibne Taimyah, Mohamed Heikal in his book Autumn of Fury defined it as, "Muslim Fundamentalism is a movement which aims at a return to the basic ideals and practices which characterized Islam in its early days". The Prophet Mohammad (SAW) not only instituted religious beliefs and observances, but a whole code of life by which society was to be organized. Muslims believe in the universality of their religion that is valid for all the times, milieus and peoples.

Within a short span of time, that elapsed after the demise of the Prophet (SAW) the Muslims humbled the rival superpowers of the time: the Roman and the Persian Empires. But victory brought the seeds of decay in it. The luxury of the city replaced the simplicity of the desert. Egalitarian ethos practiced by the Prophet (SAW) were on the wane, and supplanted with aristocratic and elitist influence of the ruling dynasties. Innovations and accretions into the creed were being augmented to suit the needs of the ruling clan, not the public welfare. Verily, Muslims throughout the history have been alert on one important advice of the Prophet, "Anyone of you, who sees evil, should change it, by his hand if he can, by his word if he can, and by his heart if he can, and this least in the faith".

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

At the zenith and decline of Abbasid Empire, came two theologians: Ahmed Ibne Hanbal (780 - 855) and Ibne Taimyah (1263 - 1328).

"They Denounced the luxury of the ruling class.

i. Purged the creed from the unwarranted innovations (Bidat).

ii. Laid emphasis on the egalitarian values of the Islamic system.

iii. Did Ijtihad to meet the needs of the time. Ibne Hanbal said, "If there is to be greatness again, it can be achieved by the same means which produced the original greatness". Ibne Taimyah reasserted, "The adherence to the pristine principals of Islam may lead to glory and greatness".

iv.

Their movement maybe regarded as the puritanical movement. They preached in a peaceful way. For these reasons, Ibne Hanbal enjoyed the greatest following in the Arab world, even does today, while Ibne Taimyah is considered as the 'Martin Luther' of Islam. And seemingly there was nothing objectionable in their teachings.

A finger is raised on the persona of Jamaluddin Afghani (1839 - 1897) as to be the contributor in the fundamentalist ideology. This is a fallacy. He was of Iranian origin, adept at various languages, scholar of unmatched erudition, and orator of unequalled locution. He is regarded as the 'father of Pan-Islamism' __ aimed at unifying all the Muslims politically. His teachings can be epitomized as:

i. He saw the Muslim world everywhere under pressure from the west.

ii. Materialism, rationalism, corruption and western thought have subtle undermining effects.

iii. "But, if Muslims examine their religion," he said, "it is strong enough to resist the west materially and spiritually".

iv. He advocated political unity Islamic world.

v. He emphasized a 'Renaissance' and 'Reformation' in Islam to open the 'closed gates' of Ijtehad and to accouter the Muslims with modern and scientific methods.

Afghani's Egyptian alter ego and disciple Mohammad Abduh (1849 - 1905); an educator and reformer, though wished the golden age of early Islamic Caliphate, also admired the fairness and equity in Europe. We have it on the authority of a person no less than that of Karen Armstrong. Abduh said, "I see Islam in Paris but not Muslims, and I see Muslims is Cairo but not Islam". He was referring to the equity and fairness that was in vogue in Europe and is also the integral part of Islam.

The movements of Mehdi of Sudan (d.1885), Sinusi of Libya (d.1835), Ibne Abdul Wahhab of Arabia (1703 - 1792) and Shah Waliullah of the Indian Sub-continent were basically revivalist and centered on the public welfare both materially and spiritually. They preached to return to original teachings of Islam and discouraged unjustified accretions and augmentations.

Now take a sojourn here. Up to the twentieth century, the fundamentalists movements were basically revivalists and puritanical in their nature. They preached the observance of the fundamental principles of Islam. They were true manifestation of

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

Amr bil Marufwa nahy anil munkar. But Modern Muslim Fundamentalism is a "complex" phenomenon. As we have seen above this "complexity" is historically unsupported. So this is the product of modern era. At this critical juncture, we delve deep into the various factors, problems and events that contributed into the emergence of that malaise and gave rise to extremism.

Causes of Rise of Muslim extremism:

i. Colonization of Islamic World by West and Emergence of Muslim religious Parties:

During the first half of the twentieth century the Muslim world was under the tutelage of western imperialism. Most of the anti-imperialistic resistance came from the religious groups and parties. So, by this ensconced fact these parties were successful in ingraining their following in the masses. In Egypt, the Muslim Brotherhood was founded in 1928 under the aegis of Hassan Al-Banna. It augmented itself with a secret wing that was to carry out violent targets even against Muslims collaborating with the west. Hassan Al-Banna was murdered in 1949, succeeded by Hodeibi and then by Sayyid Qutb (1906 - 1966).

ii. Political use of Religion:

Gamal Abdel Nasser (1918 - 1970), the greatest of the Arab nationalists, brokered the July Revolution in 1952. The Brotherhood demanded the imposition of Sharia, Nasser refused, escaped an attempt on his life in 1954, the Brotherhood was blamed for the abortive attempt, and was banned subsequently. But the Brotherhood had a member in Karachi, Maulana Maududi (1903-1979)."The only reason for the existence of Pakistan as a nation, as a state was the religion of its inhabitance". So Maududi was in a position to manipulate the religion in Pakistan.

iii. Absolutist teachings Propagated by Maududi and Syed Qutb:

According to Karen Armstrong, the decades of 1950s and 1960s were secular across the globe. So the religious zealotry was in an impervious situation. But the theoretical ferment beneath the surface was being warmed. Maududi and Qutb contributed the most in this realm of scholarly erudition. Maududi was a prolific writer, jotted down absolutist teachings and showed uncompromising rejection of the western system. He wrote books on each and every topic: Jehad, economics, politics, modernity, socialism, capitalism, exegesis of the Quran and Hadith and founded a party Jamaat e Islami. He gave blatant place to Jihad in the religion as an obligatory. He made an important contribution to fundamentalist Islamic thought. He distinguished between two stages of development in contemporaries Islamic countries: 1) The stage of weakening (Istidhaf) during which Muslims would have to withdraw and prepare themselves, and 2) stage of action (Jihad)__ when they would be strong enough to accomplish their aims. The prototype of Istidhaf was the Makki period, and of Jihad was Madni period of the Prophet's life. Maududi wrote a small book called four expressions in which he discussed the Hakmiya, Ululiya, Rabbania and Wahadania. These were to have great impacts on Muslims everywhere subsequently. Qutb was

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

influenced very much by Maududi's writings. He further wrote: In the shadow of Quran, Marks on the road, Milestone, Social Justice in Islam and Islam; the religion of the future.

iv. Demise of Arab nationalism and rise of religiosity:

During 1950s and 60s the Arab world was haunted by the scepter of Nasserism -- an admixture of socialism, secularism, anti-imperialism and Arab nationalism. "Gamal Abdul Nasser was" as Nixon said in his magnum opus Leaders, "a pyrotechnic personality. He shot like a meteor across the sky of the Arab world". But two events changed the tide of the time. 1967, the naksa, the disastrous defeat of the Arabs at the hands of Israel, "Though Nasser's popularity", according to Heikal, "went undiminished as he was popularly obliged withdraw from his resignation that he rendered on the eve of the naksa".But Karen Armstrong states that this was the beginning of religiosity in the Arab world. People turned eye from Nasserism towards Islam propounded by Maududi and Qutb. On 28 September 1970, Nasser died, extraordinary scenes at his funeral ceremony vindicated the position he held among the masses, 7 million people poured onto the streets to pay homage to "the Last Arab". A vacuum was created; something was bound to fill that gap. Saadat lacked the charisma and "the Free Officers" did not back him. He freed the Brotherhood members to gather support and legitimacy. The books of Maududi and Qutb became the Bible for the Brotherhood members. They accepted their absolutist teachings. In their views, everybody had to choose between Islam and Jahilyah, between good and evil, between belief and infidelity and between God and renegade (Taghuti).

v. Political use of Jihad as Proxy of West against USSR and Socialists:

Heikal pointed out, "Religion can take many forms and face demand and challenges according to the climate of the time". Then came the Soviet-Afghan war. The teachings of Maududi and Qutb were in practice under the umbrella of the west. During 1980s Afghans were lionized as Mujhideen but after the war was over, they were demonized as terrorists. Previously the Arabs of Al Qaida were freedom fighters now they are "Frankenstein Monsters". Due to the dual standard of the West "Modern Muslim Fundamentalism", according to Lal Khan, "is the brainchild of John Foster Dulles". He used the Brotherhood against Nasser. During 1970s and 80s the regimes in Egypt, Saudi Arabia and Pakistan used the religious groups under the auspices of the U.S especially against the defunct Soviet Union. Now all are withdrawn and launching a purging campaign against them.

vi. Political use of Muslims by certain Muslim Regimes:

During 1970s and 80s consciously or unconsciously the regimes in Pakistan, Egypt and Saudi Arabia seemed determined to put to the test Marx dictum that religion is the opium of the people. The trouble was that they did not know the sort of religion with which they were dealing. In fact the new strain of Modern Fundamentalism which was being so recklessly encouraged was largely superficial, concentrating on the visible attributes of religion and the letter of the law but ignoring the real lessons of

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

history. This was not an attempt to understand and recover the high ideals of the early days of Islam as Ibne Hanbal and Ibne Taimyah had done, but a rough and ready attempt to mask political and social problems beneath the Chador. Other strains of fundamentalism were at worked elsewhere unseen and uncontrolled by the authorities. The regimes and their backer were creating a monster and one day sooner than they had expected it was going to turn and rend them. Heikal also categorically elaborated this scheme of ideas.

Intellectual debate on Rise of Extremism in Muslim Societies

Now we come to intellectual and analytical discourse that would divulge the underlying causes of Modern Muslim Fundamentalism and extremism.

i. Extremism: Shadow side of Modernity:

Karen Armstrong, the foremost authority, on the comparative religions, wrote with erudition in her seminal work; The Battle for God and her latest The Case for God that fundamentalism is the reaction to modernity. "Modernity cannot fulfil its promises to everyone". The People marginalized by the forces of modernity, tend to fall back upon religion. She is of the view that every major religious tradition suffered from fundamentalism and interestingly Islam was last to be influenced by this wave after Judaism and Christianity. Hinduism, though a non-Semitic religion, is not exception to this wave and recently Buddhism also resorted to extremist/Militant acts in ongoing persecution of Rohingya Muslim in Burma.

ii. Rise of Extremism: Malaise of 20th Century

"Fundamentalism is malaise of the twentieth century" A.G Noorani said. He went on to say in his book Islam and Jihad." It has afflicted every major religious tradition -- including Hindu, Jewish, Christian and Muslim". This fundamentalism banishes reason from religion and compassion from faith. Its main traits are "revivalism, hostility towards other minorities, anti-intellectualism, intolerance and moral blindness". And on the prima facie, it is blatantly obvious that these anachronistic and obscure vices are antithesis to altruistic and pragmatic Islam virtues. Islam promotes tolerance, pluralism and freedom of expression.

iii. Economic impoverishment:

Human nature is the delicate and sublime balance of materialism and spiritualism. Whenever people are barred from materialistic prosperity, they tend more towards spirituality. And whenever you fail to achieve something, though due to your own deficiencies, you start to hate that thing to the point of contempt. So the fundamentalists hate worldly success in toto. Muhammad Heikal in his book, The Return of the Ayatullah, said, "Whenever a forward step in the historical process becomes impossible, people are obliged to look to the past and religion is at hand". Economic impoverishment is a cause of unbridled and rabid religious zealotry.

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

iv. Psychological vagaries:

There is a paramount role of psychology in the justification of terrorist attacks. Sigmund Freud (1856 - 1939) in his grand book Civilization and its Discontents said that human nature had two basic instinct: The instinct of life and the instinct of death. When life seems to be a burden then death may relieve it from unavoidable suffering and when people are denied of basic necessities and rights, the death is available. It is pertinent to discuss here the oft quoted blanket statement, "Every Muslim is not a terrorist but every terrorist is a Muslim". This is totally fallacious as Karen Armstrong in her essay The Pattern of Global Terrorism said that more anti-American terrorist attacks were carried out in the Latin America than that in the Middle East.

v. Dictatorship causes extremism:

When people are politically under-represented as it happens in the authoritarian rule, that is the defining characteristic of Muslim political systems, people are compelled to have recourse to violence. Benazir Bhutto (1953 - 2007) in her posthumous book Reconciliation: Islam, Democracy and the West declared dictatorship and poverty the causes of extremism -- a trait attach to fundamentalism. "Dictatorship breeds extremism, hunger breeds extremism and poverty breeds extremism", She wrote.

vi. Foreign invasion/occupation of Muslim countries:

The final question is whether fundamentalism is the wholly-solely cause of terrorism. A plausible study came on behalf of Robert A Pape. He studied every act of terrorism since 1980 in his book The Dying to Win. He said, "There may be several causes of terrorism (personal, social, religious, political, etc.). But the most common is the threat of the foreign occupation". Muslims in Palestine, Iraq, Kashmir and Afghanistan feel besieged by the foreign occupation. They daily suffered unmitigated atrocities and feel homelessness in their homes. An international community is always silent. The U.N has totally been failed in protecting the rights of Muslims .As a reaction the Muslims tend to violent means. Roughly the US vetoed 39 resolutions that were against Israel! When you are not doing justice with people then how do you expect that they would behave with you properly. As Persian proverb runs, "Tang Aamad Bajang Aamad" (When you are teased you resort to war).

Conclusion:

To conclude, it can be said that the recent surge in the Muslim Fundamentalism is historically unsupported, ideologically morbid and simply the "Shadowside" of modernity and a malaise of the twentieth century. The past movements were puritanical, revivalist in their nature. But today's fundamentalism is the outgrowth of various factors. When people are economically impoverished (poverty), politically under-represented (dictatorship), socially marginalized (lack of accommodation), individually on Nihilistic mode (pessimism), intellectually sterile (Vacuity), psychologically intense and in impervious situations (Vagaries), culturally on the wane (Cultural decay) and externally insecure (foreign occupation); then religion

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

shields the cloak that make good for these deficiencies. Moreover, this monolithic religious fervour gives birth to extremism. People are obliged, faut de miux, to look to the past, when a forward step in the historical process becomes impossible. Crass ignorance awash people with extremist ideas and rabid religious passion. These "areas of deficiencies" need to be redressed in order to kill that "monster" and to solve that "conundrum".

☆☆☆☆☆

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

باب 6: اسلام میں پبلک ایڈمنسٹریشن کا تصور اور طرز حکمرانی

آؤٹ لائن

— پبلک ایڈمنسٹریشن کا اسلامی تصور

— اچھے طرز حکمرانی کے لئے قرآنی تعلیمات

— قرآن وسنت اور فقہ کی روشنی میں طرز حکمرانی کا تصور اور عمل درآمد کا طریقہ کار

— اسلامی نظام حکمرانی کا ڈھانچہ (شوریٰ، مقننہ، اسلامی قانون کے ماخذ)

— خلفاء راشدین کا طرز حکمرانی

خلافت راشدہ کی خصوصیات

خلافت راشدہ کا نظام

— حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکومتی عہدے داروں کے نام خطوط

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طرز حکمرانی / ایڈمنسٹریشن کی خصوصیات اور ان کے سرکاری خطوط

— حضرت علی رضی اللہ عنہ کا طرز حکمرانی / ایڈمنسٹریشن کی خصوصیات اور ان کے سرکاری خطوط

— سرکاری ملازمین کی ذمہ داریاں

— اسلام میں احتساب کا نظام

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پبلک ایڈمنسٹریشن

(معانی، مفہوم اور دائرہ کار)

Administration is concerned with the service of the people. It consists of doing the work or getting the work done by others. Administration is necessary activity of every human association. It involves national organization and management of men and material.Public Administration is any kind of administration in the public interest or it has simply come to mean governmental administration in service of the public.

The word administration has been derived from the Latin words 'ad' and 'ministiare', which means to serve. From its meaning ***E.N.Gladden*** chose to define administration as to care for or to look after people, to manage affairs".

i. ***L.D. White*** observes that "Public Administration consists of all those operations having for their purpose, the fulfilment or enforcement of public policy."

ii. According to ***Marshall E. Dimock,*** "Public administration is the fulfilment or enforcement of public policy as declared by the competent authorities. It deals with the problems and powers, the organization and techniques of management involved in carrying out the laws and policies formulated by the policy-making agencies of government. Public administration is law in action. It is executive side of government".

iii. According to ***Prof. Herbert Simon,*** "Public administration is concerned with the activities of the executive branches of national state and local governments."

iv. ***Goerge G. Gordon*** is of the opinion that public administration may be defined as "all processes, organizations and individuals associated with carrying out laws and other rules adopted or issued by legislatures, executives and courts."

v. Recently, the advocates of the ***New Public Administration*** attached great importance to administration and its objectives. According to H.G.Frederickson, who simply puts, "New Public Administration seeks to change those policies and structure that systematically inhibit the social inequality".

To summarize, these definitions we identify public administration with:

- The formulation and implementation of public policies;
- The carrying out the orders and directions of the executive branch of government;
- The implementation of all the laws and rules as adopted or issued or interpreted by executive, legislature and courts;

Thus, public administration is a cooperative group effort in a public setting, covering all three branches and their relationship, playing an important role in policy

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

formulation, providing service to the community and differentiating itself from private administration. It is government in action for public interest.

Scope of Public Administration:

Public administration not only deals with planning, organizing, staffing and budgeting of human and other resources but alsocovers such wide ranging public activities as law and order, defence, social security, education, public health provision of justice.

Walker has given a comprehensive account of the scope of public administration, dividing it into two parts i.e. administrative theory and applied administration.

a. ***Administrative theory*** includes the study of structure, organization, and functions andmethods of all types of public authority engaged in carrying out administration at all levels i.e. national, regional and local. Further it is study of all problems connected with parliament, cabinet and judiciary and their control over administrative machinery, administrative tribunals, planning, programming and execution of public actions, recruitment of personnel and problems connected therewith, research, information, public relations etc.

b. ***Applied administration:*** Walker has made an attempt to classify the main forms of applied administration on the basis of principal functions i.e. political, legislative, financial, defensive, educational, social, economic, foreign, imperial and local.

- ***Political*** mean the study of executive- legislature relationship, politico-administrative activities of cabinet and cabinet officials relationships etc.
- ***Legislative*** includes the delegated legislation, drafting of bills and enactment of bills etc.
- ***Financial*** includes the preparation of budget and enactment of budget and financial bills.
- ***Defensive*** includes the study of military administration and operations.
- ***Educational*** covers all the aspects of educational administration.
- ***Social*** includes housing, provision of food, social security and employment etc.
- ***Economic*** covers all the activities in the economics field.
- ***Foreign*** includes the international co-operation, peace prosperity and international agencies.
- ***Imperial*** includes problems and techniques of imperial domination over other nations.
- ***Local covers*** the administration of local bodies and local self-government.

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

Public administration is not only a means to the attainment of the objects of a state, but it is attainment of good life. It maintains peace and order, the progressive achievement of justice, protection against disease and insecurity, the adjustment and compromise of conflicting groups and interest -- in short, the attainment of good life.

اچھے طرز حکمرانی کے لئے قرآنی تعلیمات

قرآن وسنت اور فقہ کی روشنی میں طرز حکمرانی کا تصور اور عمل درآمد کا طریقہ کار

تعارف:

اسلامی نظریہ پبلک ایڈمنسٹریشن کی دنیاوی اور دینی بنیادیں ہیں۔ یہ ان نظریات پر مشتمل ہیں جو کہ آفاقی طور پر قابل عمل ہیں اور کسی بھی سیاسی تنظیم کے اندر بہتر طرز حکمرانی کی ضمانت دیتے ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد دنیا کے اندر انسان کی بہتر معیار زندگی کو فروغ دینا اور آخرت میں اس کی دائمی کامیابی کو یقینی بنانا ہے۔ اسلامی پبلک ایڈمنسٹریشن کے سنہری اصول جو قرآن وسنت سے اخذ کر سکتے ہیں ان میں بنیادی باتیں یہ ہیں: ''علم وعمل، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اختیار بطور امانت، انصاف اور اجتماعی عدل، شورائی جمہوریت، انسانی اخوت، احتساب، قانون کی حکمرانی'' یہ وہ قابل عمل سنہری اصول ہیں جو تمام حکمرانوں اور ریاستوں کے لیے بہتر طرز حکمرانی (Good Governance) کو یقینی بناتے ہیں۔

گورننس کیا ہے؟

Governance refers to the conducting of public affairs and management of public resources. Governance is "the process of decision-making and the process by which decisions are implemented (or not implemented)".The concept centers on the responsibility of governments and governing bodies to meet the needs of the masses as opposed to select groups in society.

Definition of Good Governance:

As per the criterion laid down by the United Nations (UN), good governance should have eight characteristics:

- Consensus Oriented
- Participatory
- Following the Rule of Law
- Effective and Efficient
- Accountable
- Transparent
- Responsive
- Equitable and Inclusive

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسلامی نظریے کے مطابق پبلک ایڈمنسٹریشن کی ضرورت/گڈ گورننس:

Conceptual Framework within the Islamic Ideology of Life; and need for Public Administration/Good Governance:

ڈاکٹر محمد البرائے نے اپنی کتاب Administrative Development: An Islamic Perspective میں اس پر یوں روشنی ڈالی ہے:

Islam is first and foremost an ethical, practical and spiritual understanding of the world and the cosmos mediated by the concept of the absolute unity of God (tawhid). By subscribing to unity of God one undertakes a covenant with oneself, one's Creator and all other creatures. A person's belief in One God calls him to be responsible not only to himself and fellow human beings, but to everything in the plant and the animal world and the overall environment, as everything in the universe is created by the one God, and has a purpose. In order for man to understand this purpose, the Qur'an repeatedly asks mankind to observe, ponder, and use reason. (Consider, for example, 4:82; 23:68; 38:29; 47:24.). The emphasis on the role of reason in determining man's relationship with everything in the universe is central to man's ability to utilize it for the benefit of humanity. By highlighting the rights and obligations of God over man, and man over man, the Qur'an establishes the point that man serves God mainly by serving humanity.

In this journey of life one is happy and successful when one enjoys one's life in an orderly and civilized manner. It gives spiritual satisfaction when one fulfils one's responsibilities to God and the society. In this process the individual will not only satisfy his material and spiritual needs, but also contribute positively to human civilization. Naturally, for the realization of this vision of human life, good governance is a prerequisite. The importance of good governance is underscored by the fact that no civilization in history was established without a good government. Therefore an individual may seek happiness and success in his personal life by obtaining guidance from the Most Merciful -- the Creator of the universe -- in fulfilling his obligations toward society. The Islamic worldview integrates the role of the individual in absolute terms with the overarching concern for peace and general human well-being. Human beings are a special creation of God. God has created man as His representative (Khalifa). God has made everything else in the universe subservient to man, and if he utilizes them positively, he participates in God's continuous process of creation. This participation is neither by chance nor optional, but a responsibility -- the purpose of one's very life and existence. God has not left man empty-handed to fulfil his responsibilities in this life. He has endowed man with reason, physical and intellectual capabilities, knowledge and other resources. These potentialities and resources - including one's very own life -- are given to man as a trust (amanah). Hence he is not the absolute owner of any one of them. Even his own body and life has been given to him on trust; hence, he is not allowed to abuse them or harm himself. That is why drug abuse and suicide are forbidden (haram) in Islam. Potentially there is an enormous

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

prospect for innovative creativity and growth in this process of creation. But this cannot occur without a direct involvement of man

Since human beings have been endowed with the ability to think, rationalize and understand, they must strive to cultivate their potentials in order to qualify to be contributors to this process of creation and growth initiated and spearheaded by God. Thus the underlying principle guiding man's life and relationships with all the other creatures is that everything in the universe is a trust (amanah) from God to man, and as representative of God on earth, man has been assigned the duty of establishing civilization and a peaceful society.

God has fashioned the nature -fitrah - of every human being in such a way that no one can survive alone. In other words social organization is vital for mankind, and no human organization can be established without some form of universal principles accommodating the interests of all or most members of a given group. Therefore it may be safely suggested that some form of political organization existed from the very beginning of human history. Unfortunately very little information is available about the early formation of ancient civilizations. The Qur'an tells that mankind originally belonged to one community (ummah), and God has guided them by sending prophets with glad tidings and warnings, but they disagreed among themselves for selfish motives; this led to division in the society (2: 213). These divisions occurred because some "holders of religion" sold the sacred message "at a cheap price" (2: 102-103) for their personal worldly gains. Every individual is free to choose between an ethical life and a life motivated by selfishness, greed, and evil desires. The challenge for mankind is to overcome this negative power and thereby contribute to the growth of civilization. Good governance is indispensable for the peace and prosperity of human civilization.It has been observed that with the passage of time human beings have grown more mature and they have acquired greater enlightenment to understand properly the purpose of life. They are also supposed to have acquired better judgment and self-control to understand Divine guidance.

Islamically Good Governance: Meaning and Concepts:

The Holy Quran describes good governance as the law of justice, a just and principled order and compliance of rights and responsibilities in a society. Islamically good governance is that which:

- strives to achieve justice in society;
- aspires to maintain the dignity of individuals (both male and female) and protect group freedom, regardless of religious or national affiliation;
- steers individuals toward achieving a means of sustainable livelihood before aspiring for other luxuries;
- encourages virtue, limits vice, and rejects compulsion in matters of religion; and,

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

achieves its aims through consultation, participation, representation, accountability mechanisms, and through legal conventional regulations in all social formations, low or high.

Quranic Injunctions Regarding Good Governance:

The Qur'an declares:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط

ترجمہ: "یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں تو نماز قائم کرتے ہیں، زکوۃ دیتے ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔"

قرآن پاک مزید یہ کہتا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ ز وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا قف ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ز

ترجمہ: "اے ایمان والو! اللہ کے لیے شاہد بن جاؤ انصاف کے معاملے میں اور جان رکھو کہ کسی قوم سے تمہاری دشمنی تمہیں انصاف سے بھٹکنے پر مجبور نہ کردے، عدل کرو چونکہ یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔"

اسلام میں گڈ گورننس کے اصول:

اسلام کے اندر بہتر طرز حکمرانی کے بنیادی اصول درج ذیل ہیں:

۱۔ امانت: اختیار بطور اللہ کی امانت (Amanah/Trust)

۲۔ خلافت: انسان دنیا پر اللہ کا خلیفہ ہے۔ (Khilafat/Leadership)

۳۔ شوریٰ (Shura/Consultation)

۴۔ انصاف (Justice)

۵۔ اجتماعی عدل (Social Justice)

۶۔ احتساب/حسبہ (Accountability)

۷۔ شفافیت (Transparency)

۸۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر

۹۔ قانون کی حکمرانی (Rule of Law)

۱۰۔ معیار کی ضمانت (Quality Assurance)

۱۱۔ اچھائی کے لئے کوششیں (Striving for Excellence)

۱۲۔ مصلحہ/عوامی فلاح و بہبود (Public Welfare)

۱۳۔ مؤثر اور اہل ایڈمنسٹریشن (Effective and Efficinet Administration)

JOIN ME FOR EASY ACCESS TO EBOOKS & NOTES
+92-310-545-450-3
Css Aspirants ebooks & Notes
https://m.facebook.com/groups/458184410965870
Css Aspirants Forum
http://t.me/CssAspirantsForum
Rules of the group.
*No irrelevant text/pic Islamic pic/videos
*No Smiley No Pm otherwise Removed + Block
*Personal text w/o Mutual consent Consider harassment
Separate Group For Females with verification
The CSS Group does not hold any rights
I,m not Responsible for Copyrights.
This book/notes downloaded from

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۱۔ امانت: اختیار بطور اللہ کی امانت (Amanah/Trust)

امانت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو اختیار دیا ہے اور ساری کائنات اس کے لیے مسخر کر دی ہے وہ اس کے لیے بطور امانت ہے اور اس کو ایک امانت کی طرح اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق استعمال کرے گا۔ ڈاکٹر محمد البرائے نے اس کی تفصیل یوں کی ہے:

> The concept of amanah determines the individual's relationship with the family, society, state, government and the humanity at large. Man is attached to these institutions both materially and spiritually. Amanah establishes man's responsibility toward his kin, other human beings and socio-political institutions. The concept resolves the issues pertaining to the rights and responsibilities of individuals in every facet of life. Someone's right is someone else's responsibility; the individual has a weighty contract with his society, with the animal world, with the plant and mineral worlds, and with the overall environment.

وہ آگے مزید وضاحت کرتے ہیں:

> This understanding of man's role as God's vicegerent on earth and the use of its resources by him as God's amanah to man gives a much deeper meaning to the concept of ownership is Islam. It implies that in the Islamic society or economic system private or public ownership is not absolute. Resources are only an amanah whose actual owner is God, the Almighty. Whatever one owns is actually held in trust and must be used for achieving just ends. Thus every economic activity, decision and plan-whether it is production or exchange, whether it concerns an employer-employee relationship or a producer-user relationship, or consumer's preferences and their impact on society -- must be rooted in the intention to achieve just ends. From this goal-oriented utilization of resources emerges a whole dynamic of business ethics with social responsibility, respect for private property, dignity of labor and its fair share in production, and one's duty to earn one's living with honesty.

۲۔ خلافت: انسان دنیا پر اللہ کا خلیفہ ہے۔ (Khilafat/Leadership)

خلافت کا مطلب ہے ایک خلیفہ، ایک زمین اور اس پر لاگو ایک قانون ”اللہ کا قانون، اللہ کی حاکمیت نظام خلافت ایک سیاسی نظام ہے جو اندرونی امور میں اسلامی قوانین کو عملی جامہ پہناتا ہے اور خارجی امور میں اس کو دعوت اور جہاد سے ساری دنیا پر غالب کرتا ہے۔ اسلامی نظام حکومت ایک منفرد نظام ہے جو باقی تمام موجودہ نظاموں سے بالاتر اور اپنے اصول وفروع میں ہر انسانی نظام سے دستور کے لحاظ سے، اپنے قوانین میں ان کے نفاذ کے لحاظ سے منفرد ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

خلیفہ کے لغوی معنی ہیں پیچھے آنے والا یعنی نائب یا قائم مقام۔ خلافت کی ابتداء اس وقت ہوئی جب مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ اس نظام کی بدولت جاہلیت کے اندھیرے اسلام کی روشنی میں ڈوبتے چلے گئے یہ خلفائے راشدین کے دور میں اپنے عروج تک جا پہنچا اس کے بعد خلافت امیہ کا دور آیا جس نے اندرونی طور پر خلافت کو مستحکم کیا اور اس کے خدوخال کو نئی بلندیوں تک پہنچایا۔ اس کے بعد خلافت عباسیہ کا دور آیا جس میں مسلمانوں نے اپنی قوت دفاع سے دنیا کو متعارف کرایا اور پھر خلافت عثمانیہ کے دور میں مسلمانوں نے یورپ کو اسلام کی قوت سے آگاہ کیا۔

1924ء میں سلطنت عثمانیہ کے خاتمے پر خلافت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

قرآنی منصب خلافت:

منصب خلافت کے بارے میں قرآن پاک میں متعدد آیات ملتی ہیں جن میں انسان کو خلیفہ کا منصب سونپنے کا اعلان کیا گیا ہے۔

مثلاً سورہ البقرہ آیت 30 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ط قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ ج وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ ط قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ.

ترجمہ: ''جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں (اپنا) نائب بنانے والا ہوں۔ انہوں نے کہا کیا تو اس میں ایسے شخص کو نائب بنانا چاہتا ہے جو خرابیاں کرے اور کشت وخون کرتا پھرے اور ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح وتقدیس کرتے رہتے ہیں۔ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔''

سورہ الانعام آیت 165

وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ ط اِنَّ رَبَّکَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ صلے وَاِنَّہٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ.

ترجمہ: ''اور وہی تو ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا اور ایک کے دوسرے پر درجے بلند کیے تا کہ جو کچھ اس نے تمہیں بخشا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے بے شک تمہارا پروردگار جلد عذاب دینے والا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔''

سورہ النور آیت 55 میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے وعدہ کیا کہ اللہ تعالیٰ خلیفہ مقرر کرے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں پر خلیفہ مقرر کیا گیا تھا تاہم اس وعدے کے سلسلے میں مزید وضاحت یہ بھی فرمادی کہ یہ خلافت یا حکومت موجودہ امت مسلمہ (جو امت محمدی ﷺ ہے) کو اسی طرح عطا کی جائے گی جس طرح اس سے پہلے کی امت مسلمہ (بنی اسرائیل) کو عطا کی گئی تھی ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ ص وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا ط یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا وَ مَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ O

ترجمہ: ''وعدہ کرلیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے ہیں اور کیے ہیں انہوں نے نیک کام البتہ پیچھے خلیفہ بنائے گا ان کو ملک میں جیسا خلیفہ بنایا تھا ان سے اگلوں کو اور جمادے گا ان کے لیے دین ان کا جو پسند کردیا ان کے واسطے اور دے گا ان کو ان کے ڈر کے بدلے میں امن۔ میری بندگی کریں گے۔ شریک نہ ٹھہرائیں گے میرا کسی کو اور جو کوئی ناشکری کرے گا اس کے پیچھے سو وہی لوگ ہیں نافرمان۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو بھی خلافت عطا فرمائی تھی اس ضمن میں سورہ ص آیت 26 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یٰا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ

ترجمہ: "اے داؤد ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا۔"

منصب خلافت کے لیے اوصاف:

خلافت کا منصب بڑا اہم منصب ہے اور اس منصب پر فائز شخص (خلیفہ) کی بھی بڑی ذمہ داریاں ہیں اور ان ذمہ داریوں کو نبھانے کے لیے خلیفہ میں مندرجہ ذیل اوصاف کا ہونا ضروری ہے بصورت دیگر وہ خلافت کا اہل نہیں ہوگا۔

-1 ایمان اور عمل صالح کا ہونا:

ایک اسلامی ریاست میں صرف اس شخص کو خلیفہ مقرر کیا جائے گا جو نیکوکار اور ایماندار ہوگا اور لوگوں کی امانتوں کا امین، غمگسار اور حقوق العباد اور حقوق اللہ کا بھی خیال رکھتا ہو جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ۔

(سورہ النور آیت 55)

ترجمہ: "اللہ کا وعدہ ہے کہ (اے مسلمانو) تم میں سے جو لوگ ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کردیں گے ہم انہیں لازماً زمین میں خلافت عطا کریں گے۔"

-2 خودسپردگی:

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول:

ایں امانت چند روزہ نزد ماست
در حقیقت مالک ہر شے خداست

اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ ط

ترجمہ: "ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور خرچ کردو ان تمام چیزوں کو اللہ کے راستے میں جن میں اس نے تمہیں خلافت عطا فرمائی۔"

-4 غلبہ دین کے لیے سرگرم:

خلیفہ کے منصب کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کو پھیلانے کا فریضہ سرانجام دے اور اس کے لیے اپنی تمام تر کوششوں کو بروئے کار لائے لیکن یہ کوششیں ایسی نہیں ہونی چاہئیں کہ لوگوں کی جان و مال، عزت و آبرو خطرے میں پڑ جائے۔ جہاں تک کافروں کا سوال ہے انہیں اللہ کے دین کی طرف راغب کرنے کی دعوت دی جائے اگر وہ دعوت کو تسلیم کر کے اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لے آئیں تو ان سے جہاد و قتال نہ کرو بصورت دیگر جہاد و قتال لازم ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ط ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ لا

(سورہ الصف آیت 11)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ترجمہ: ''اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ۔ اگر تم علم (حقیقی) رکھتے ہو تو تم (جان لو گے کہ) یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔''

6- امانت دار:

خلافت حاصل کرنے والوں کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ امانت دار ہو اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کو محض اپنے استعمال میں نہ لائے بلکہ انہیں مخلوق خدا کی خدمت کے لیے وقف کردے۔

7- حاکم مطلق کا داعی نہ ہونا:

خلیفہ ہونے کے لیے یہ شرط بھی لازمی ہے کہ وہ حاکم مطلق نہ بن جائے بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے اختیارات کو بروئے کار لائے۔ اور بلا امتیاز لوگوں سے مساوی سلوک کرے اور کسی شخص پر ظلم و زیادتی نہ کرے۔ اسلام کے نزدیک حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے چنانچہ اسلامی نقطہ نظر سے جو کوئی بھی اپنی حاکمیت کا دعوے دار ہو گا وہ گویا خدائی کا دعویدار ہے فرعون کا دعویٰ بھی تو یہی تھا۔

۳۔ شوریٰ (Shura/Consultation)

شوریٰ اسلام کے طرز حکمرانی میں اولین اصولوں میں سے ایک ہے۔ یہ اسلام کے جمہوری اصولوں کی عکاسی کرتا ہے۔ شوریٰ کا ذکر نہ صرف قرآن پاک میں ہے بلکہ سنت نبوی ﷺ سے بھی اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور اسلام کے اندر کسی قسم کے عامرانہ اور غاصبانہ حکمران کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں حکومت مسلمانوں کے باہمی صلاح مشورے سے ان کے بہتر مفاد اور اسلامی کی سربلندی کے لیے کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران)

ترجمہ: ''اور (اے نبی ﷺ) ان (مسلمانوں) سے ان کے معاملات میں مشورہ کریں۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ کے نبی ﷺ سے زیادہ کسی کو مشورہ کرنے والا نہیں دیکھا۔ اسی طرح ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کبھی بھی گمراہی پر یکجا نہیں ہو گی۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ

لا خلافه الا الشوری

''یعنی مشورہ کے سوا خلافت نہیں ہے۔''

۴۔ انصاف (Justice)

اسلامی طرز حکومت کے اندر انصاف کی فراہمی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۚ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ کے لیے شاہد بن جاؤ انصاف کے معاملے میں اور جان رکھو کہ کسی قوم سے تمہاری دشمنی تمہیں انصاف سے بھٹکنے پر مجبور نہ کردے، انصاف کرو چونکہ یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔''

۵۔ اجتماعی عدل (Social Justice)

اسلامی تہذیب عدل وانصاف پر مبنی ہے۔ حکم الٰہی ہے:

اِعْدِلُوْا قف هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ز

''عدل کرو یہ تقویٰ کے سب سے زیادہ قریب ہے۔'' (مائدہ:۸)

ایک دوسرے مقام پر نبی ﷺ کا فریضہ یہ بتایا گیا ہے کہ

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ. (شوریٰ:۱۵)

''اور مجھے حکم ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں۔''

اسلام ہر شعبہ زندگی اور ہر طبقہ انسانی سے عدل وانصاف کی تاکید کرتا ہے۔ اسلام میں عدل وانصاف بے لاگ اور سب کے لئے ہے۔ اس میں غریب، امیر، اپنے بیگانے، دوست، دشمن، ملکی وغیر ملکی کی کوئی تمیز نہیں۔ اسلام میں یہ بے لاگ عدل وانصاف ہی اسے دنیا کی بہترین تہذیب بناتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ خود عادل ہیں۔ عدل وانصاف کو پسند کرتے ہیں اور عدل ہی کا حکم دیتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (النحل:۹۰)

''بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور حسن سلوک کا حکم دیتے ہیں۔''

اسلام نے حق وعدل پر مبنی ایک نظام ریاست وضع کیا ہے جو دین وعقیدہ پر مرتکز ہے، بغیر اس کے کہ دین وریاست کی ترقی اور تہذیب کے نشوونما میں کوئی رکاوٹ بن سکے۔ لیکن حکمرانی حاکم کی ذات کے لیے نہیں بلکہ حق کے قائم رکھنے کے لیے ہوتی ہے۔ بلاشبہ ریاست چلانا مسلمان خلفاء اور امراء کا کام ہے اور قانون سازی ماہرین شریعت کا کام ہے اور اہل علم کے ہر طبقے کے سپرد ایک خاص خدمت ہے لیکن قانون کے سامنے سب برابر ہیں اور فضیلت، تقویٰ اور خدمت خلق پر موقوف ہے۔ فاطمہ نامی ایک عورت پر چوری کے جرم میں مقدمہ قائم ہوتا ہے اور اس کے لیے سفارش کی جاتی ہے تو نبی ﷺ غضب ناک ہو کر فرماتے ہیں ''اگر فاطمہ بنت محمد (ﷺ) بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ ڈالتا۔'' (بخاری ومسلم) ایک مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا:

الخلق كلهمه عيال الله فاجهه اليه انفعهه ليعاليه (البزاز)

ترجمہ: ''ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ پس اللہ کو سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبے کو زیادہ فائدہ پہنچائے۔''

اسلام میں کسی رئیس، کسی دینی رہنما، کسی خاندانی یا دولت مند آدمی کے لیے کوئی خاص امتیاز نہیں ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (کہف:۱۱۰)

ترجمہ: ''کہہ دو کہ میں تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۶۔ احتساب/حسبہ (Accountability)

اتق دعوة المظلوم، فإنها ليس بينها وبين الله حجاب. (رواه الترمذی)

''مظلوم کی بد دعا سے بچو کیونکہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔''

احتساب اسلامک پبلک ایڈمنسٹریشن میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام میں احتساب کے دو پہلو ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ سرکاری ملازمین اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہیں اور دوسرا یہ ہے کہ وہ عوام کے سامنے بھی جواب دہ ہیں۔ لہٰذا احتساب کا یہ نظریہ سرکاری ملازمین کے اوپر ایک اخلاقی اور نفسیاتی اثر رکھتا ہے جس سے وہ ایمانداری اور انصاف کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ سنت نبوی ﷺ کے مطابق کوئی بھی شخص اسلامی ریاست کے اندر احتساب سے بالاتر نہیں کیونکہ تمام لوگ قانون کے سامنے برابر ہیں۔

احتساب قرآن میں:

مسلمان یہ یقین رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے تمام اعمال کا آخرت میں حساب دینا ہوگا۔ اس لیے ہر مسلمان پر یہ فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرے تاکہ وہ اس کی رضا اور آخرت میں کامیابی حاصل کر سکے۔ انہی بنیادوں پر تمام افعال اور اعمال اسلامی تعلیمات کے مطابق ہونے چاہئیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا

(بنی اسرائیل:۳۶)

ترجمہ: ''بے شک کانوں اور آنکھوں اور دلوں میں سے ہر ایک کے متعلق سوال کیا جائے گا۔''

احتساب/حسبہ حدیث کی روشنی میں:

عن ابی سعید ن الخدری رضی الله عنه قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول من رأی منکم منکرا فلیغیره بیده فان لم یستطع فبلسانه فان لم یستطع فبقلبه وذلک أضعف الإیمان (رواه مسلم)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا:

میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اسے چاہیے کہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے تو اگر یہ نہ کر سکے تو اپنی زبان سے (روکے) اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو اپنے دل میں (اسے برا جانے) اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔ (اس حدیث کو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے)

عن عبدالله بن عمر رضی الله عنهما ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال ألا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته فالإمام الذی علی الناس راع وهو مسئول عن رعیته والرجل راع علی أهل بیته وهو مسئول عن رعیته والمرأة راعیة علی أهل بیت زوجها وولده وهی مسئولة عنهم وعبدالرجل راع علی مال سیده وهو مسئول عنه الافکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته.

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

روایت ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

غور سے سنو، تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنی رعیت کی بابت جوابدہ ہے پس امام جو لوگوں پر نگران ہے اپنی رعایا کے بارے جوابدہ ہے اور مرد اپنے اہل خانہ کا نگہبان ہے اور وہ اپنی رعیت کے بارے جوابدہ ہے اور عورت اپنے خاوند کے اہل خانہ اور اس کی اولاد کی نگہبان ہے اور وہ ان کے لئے جوابدہ ہے اور مرد کا غلام اپنے آقا کے مال آقا اس (کا) اور وہ جوابدہ بابت اس (کی) آگاہ رہو تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنی رعیت کے بارے جوابدہ ہے۔ (متفق علیہ)

ابن الاخوہ، مشہور مسلم عالم، احتساب سے متعلق لکھتے ہیں:

''احتساب اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے اور اس کا مقصد عوامی بہبود اور اصلاحات کے لیے کام کرنا ہے۔ ایسے معاملات میں جس کا اللہ تعالیٰ حکم کریں یا روکیں۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسلامی نظریہ احتساب کو اس طریقے سے بیان کیا جب انہوں نے مالک الاشتر کو ایک خط میں لکھا:

"Let me remind you once again that you are made responsible to guard the rights of poor people and to look after their welfare."

۷۔ شفافیت (Transparency)

شفافیت اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں یوں بیان فرمایا ہے:

''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ط وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ م بِالْعَدْلِ''

ترجمہ: ''اے ایمان والو! جب تم کوئی باہم معاہدہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور کاتب کو چاہیے کہ اسے انصاف اور عدل کے ساتھ لکھے۔'' (البقرہ:۲۸۲)

ڈاکٹر البرائے شفافیت پر اس طرح تبصرہ کرتے ہیں:

Applying the concept of transparency, government should disclose information regarding its strategy, actions, contribution to the community and the use of resources and protection of environment.Transparency is the necessity for openness in all public affairs.

Transparency entails that: citizens have a right to available information pertaining to for example, award of contracts, privatization of state enterprises, rules against corruption or the funding of political parties. A transparent government is that which offers chance to citizens to find out the true proofs at first hand, without the material being changed or presented through a misrepresenting mirror.

In core, transparency is basically concerned with open and established system of government, the extermination of corruption and the institutionalization of a system that is fair, just and based on the rule of law. Transparency or openness in governance

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

is important in the process of growth. It is desired in the elimination of corruption and the promotion of responsibility in the conduct of government business. Today, the quest for transparent performance has become a world-wide phenomenon with the Transparency International.

۸۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر

بھلائی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں میں سے ایک ہے کہ:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط

ترجمہ: "یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں تو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔"

عن ابی سعید ن الخدری رضی الله عنه قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول من رای منکم منکرا فلیغیره بیده فان لم یستطع فبلسانه فان لم یستطع فبقلبه وذلک أضعف الإیمان (رواہ مسلم)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا:

- میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اسے چاہیے کہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے تو اگر یہ نہ کر سکے تو اپنی زبان سے (روکے) اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو اپنے دل میں (اسے برا جانے) اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔ (اس حدیث کو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے)

۹۔ قانون کی حکمرانی (Rule of Law)

ایک اسلامی ریاست میں تمام شہریوں پر ایک ہی طرح کے قانون کا اطلاق ہوتا ہے اور اس سلسلے میں کوئی مراعات یافتہ جماعت نہیں ہوتی۔ قانون تمام شہریوں کو یکساں طور پر تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ قرآن حکیم کا یہ اٹل اصول ہے کہ انسان کے ساتھ عدل وانصاف کیا جائے گا۔ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک قریشی عورت کو لایا گیا جس پر چوری کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ جرم ثابت ہو جانے پر آپ ﷺ نے اس عورت کے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم صادر فرمایا۔ بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس سزا کو سخت محسوس کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "خدا کی قسم اگر فاطمہ (رضی اللہ عنہا) بنت محمد (ﷺ) بھی چوری کرتی، میں یہی سزا تجویز کرتا۔" آپ ﷺ نے مزید فرمایا: "پچھلی قوموں کو تباہ کر دیا گیا، کیونکہ وہ اونچے طبقے کے مجرموں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھتی تھیں۔"

۱۰۔ معیار کی ضمانت (Quality Assurance)

Public transactions and dealings when done with honesty and fairness lead to confidence building in society. The Qur'an enjoins use of one and same standards for quality control in delivering systems.

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

> "Fill the measure when you measure and weigh with a right balance; this is better, and excellent its consequences" (Bani Isra'il 17:35)

۱۱۔ اچھائی کے لئے کوششیں (Striving for Excellence)

A ruler and Public servant has been urged to strive utmost to dispense his duties diligently. This concept stems from authority being as trust of God on man to fulfill and his accountability before God as well as public. The Prophet (SAW) said:

> "An amir (ruler) who accepts an office but does not make his utmost effort with sincerity (ikhlas), he will never ever enter jannah with other Muslims" (Muslim, Sahih, Kitabal-Imarah)

۱۲۔ مصلحہ عوامی فلاح و بہبود (Public Welfare)

Public welfare is perhaps the most important function of good governance. The Qur'an introduces the zakah (sometimes written as Zakat) system as one of the fundamental pillars for the re-distribution of wealth in society. It is the government's responsibility to ensure a fair and just administration of the system. In short, it must ensure public welfare as a part of the amanah or trust discussed earlier.

۱۳۔ مؤثر اور اہل ایڈمنسٹریشن (Effective and Efficinet Administration)

Islam enjoins public administration to make and implement decisions on time and effectively in order to ensure the good governance. Red-tapism, bureaucratic and lengthy process lead to inefficiency and making governance ineffective and have been discouraged.

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

فقہ کی روشنی میں طرز حکمرانی کا تصور اور عملدرآمد کا طریقہ کار

شوکت علی اپنی کتاب Administrative Ethics in a Mulsim State میں فقہ کی روشنی میں اسلامی گورننس اور اس کی عملیت کے ارتقاء کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

Concept of Governance and its Applications in the Light of Fiqh:

Islamic Shariah lays down principles for governmental affair and the establishment of good and ethical administration. Quran, Sunnah and Fiqh constitute a single unit, which is the Shariah. The Shariah contains only general principles and broad outlines and leaves the details of administrative behavior to the discretion of Muslims as the circumstances of the age and place require.

- The spirit of Islamic Shariah differs a great deal from the spirit of modern administrative law. It aims at its supremacy over the individual; while Islamic administrative system works in the light of two principles (a) that Shariah is divine; and (b) that Shariah is independent and open allowing the individual to work according to his conscience and faith.
- As a result of first principle the Islamic Shariah is comprehensive regarding administrative affairs and it gives the individual an opportunity to respect the public interest and to work scrupulously through the proper administrative channels on its behalf. As a result of the second principle, it is characterized by a public or people's spirit which makes the individual an independent working administrator, who performs his duty without any pressure or coercion. The free man behaves according to his own ideology and conscience and expresses his faith through work. Thus the Shariah offers Yard-Sticks by which right can be distinguished from wrong, moral from immoral and ethical from unethical. The Shariah is based upon the idea that the people or member of Ummah will administer themselves by themselves.
- It has been noted that Muslim scholars' understanding of Quranic guidance in good governance has been very accommodative of changes in time and circumstances. Originally, the political aspects of the Qur'an were understood as part of the 'aqidah-or faith-in what has been called usul al-din or principles of religion. Discussion on the subject mainly revolved around the concept of imamat or leadership during the early days of the development of the discipline of good governance.
- In the 9th century, al-Shafi interpreted verse 4:59 to mean that the commandment to obey those in authority did not apply to the government of his time. Because of the civil conflict and uncertainty in the government in Baghdad during his time, al-Shafi went into self-exile in Egypt and perceived his role from among the 'ulama' or scholars and not from the umara' or

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

politicians. Gradually Muslim jurists developed the methodology of ijtihad or independent reasoning in understanding God's guidance.

- In the 12th century al-Mawardi wrote al-Ahkam al-Sultaniyyah (i.e., principles of governance) dealing with various institutions in the government.
- In the 13th century, al-Juwayni developed a new science called Maqasid al-Shariah or objectives of the Shariah when the government of the caliph became very weak under the influence of some autocratic sultans and the government lost the spirit of the Quranic guidance and developed mere formalism. The focus of works on maqasid al-Shariah became more inclusive as it expanded good governance to incorporate the welfare of the people.
- Following the fall of Baghdad at the hands of the Mongols in 1258, Ibn Taymiyah gave a whole new interpretation of the above two verses (4:58 and 59) and redefined his understanding of good governance under the principles of al-Siyasah al-Shar'iyyah. The concept of maslahah or public interest was developed and Quranic guidance was freshly understood and implemented to ensure public interest. All these attempts may be considered a form of Islamic humanism that generated new ideas under new circumstances.
- Therefore, although in Islam God is the Sovereign power; man is absolutely free to choose because he is solely capable of understanding God's will.The Shariah encourages positive utilization of available resources. As opposed to the current capitalist belief that material goods are scarce and limited, the Qur'an suggests that there are plenty of resources for every being in God's creation and there is a potential for the discovery of more assets and access to them for the rising population. This process of growth can be realized only by the use of endlessly increasing human knowledge, which is one of the ingredients of man's composition that contributes to his being the best of all creatures. However, the Qur'an emphasizes the distribution of resources as against the concentration of wealth in a few hands while maintaining the legitimacy of private ownership. Mankind is supposed to utilize resources with a sense of socio-moral responsibility as prescribed by the objectives of Shariah. And it is because of this that God strongly warns mankind against the abuse of resources. The Qur'anic idea of good governance also demands assurance of fair access of every individual to resources. The idea of amanah demands that if a person is appointed to a certain public position, he should not use it for self-aggrandizement or for the benefit of his associates.

Concluding Remarks:

The above discussion on the Quranic guidance for good governance brings to the fore Islam's concerns for humanity, the objective of Shariah being the preservation of peace and prosperity of the human race. These concerns and ideals have a lot in common with the concerns and ideals of other civilizations. From this convergence

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

may emerge a vision of a common destiny for humanity? In order to realize this vision, however, the need of the hour is to establish forums, networks, and institutions through which all the civilizations and their concerned members can work together for the common good of humanity.

حضور ﷺ کی ایڈمنسٹریشن کی نمایاں خصوصیات

نبی ﷺ مصلح معاشرہ ہی نہیں ایک ریاست کے سربراہ بھی تھے۔اس حیثیت سے انہوں نے اسلامی حکومت کے خدوخال متعین کیے۔ان کی تشکیل کردہ ریاست کے دستوری خدوخال کچھ اس طرح تھے۔

ملت نو کی تعمیر:

سرزمین عرب کے لوگ بہت باصلاحیت تھے۔لیکن ان کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔قبائلی نظام نے ان کے ٹکڑے کر رکھے تھے۔آپ نے سب قبائل کو ایک جھنڈے تلے لا جمع کیا۔اب ان کا انتشار اور طوائف الملوکی ختم ہو چکی تھی اور ملت بیضہ وجود میں آ چکی تھی۔اس نئی ملت میں یمنی اور مصری کے درمیان، شہری اور بدوی کے درمیان، سرخ اور سیاہ کے درمیان، عربی اور عجمی کے درمیان امتیاز مٹا دیا گیا تھا اور یہ ایک ایسی منظم قوت بن چکی تھی کہ اس سے ٹکرا کر روم و ایران کی عظیم سلطنتیں پاش پاش ہو گئیں اور ان کے کھنڈرات پر اسلام کی عظیم حکومت کی تعمیر کی گئی۔آنحضرت ﷺ نے ملت کا ایک نیا مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا جو رنگ و نسل کے محدود تصورات سے بہت بلند اور انسانیت کے لیے موجب خیر و برکت تھا، بیسویں صدی کے قوم پرستی کے مارے ہوئے انسان کو جس نے قومی سربلندی کے خواب دیکھتے ہوئے پوری انسانیت کو تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا ہے آج پھر اس تصور ملت کی ضرورت ہے۔

اسلامی ریاست کی تشکیل:

مدینہ تشریف آوری کے فوراً بعد حضور ﷺ نے میثاق مدینہ کے ذریعے ایک منظم ریاست قائم کی۔جس پر خدا اور رسول کو آخری فیصلہ کن اتھارٹی تسلیم کیا گیا۔اس طرح یہ نئی قائم ہونے والی حکومت اسلامی ریاست تھی جس میں امن و امان کو برقرار رکھنے کے لیے خصوصی اقدامات کیے گئے تھے اور فتنہ و فساد کے خاتمے اور اخلاق و قانون کے احترام کے لیے موثر تدابیر اختیار کی گئیں۔مدینہ کے اردگرد کے قبائل اس ریاست سے منسلک ہوئے تو خطہ امن کی حدود وسیع تر ہو گئیں۔

تحریری دستور:

عہد نبوی میں اسلامی حکومت کا ایک باقاعدہ دستور موجود تھا۔غالباً تاریخ عالم میں سب سے پہلا تحریری دستور میثاق مدینہ ہی ہے۔اس میں اسلامی حکومت میں شامل ہونے والے مختلف قبائل کے حقوق و فرائض معین کیے گئے ہیں۔اس لحاظ سے یہ دستور وفاقی (Fedral) تھا۔یہودی اور دوسری غیر مسلم رعایا کے اسلامی حکومت کے سربراہ کے ساتھ تعلقات کے بارے میں ضابطے بنائے گئے تھے اور قیام امن کے متعلق قانون وضع کیا گیا تھا۔یہ پہلا دستور ہے جس میں عوام کے حقوق و فرائض کا تعین کیا گیا تھا۔

اللہ و رسول ﷺ کی برتری:

اسلامی حکومت کے حاکم (Sovereign) کا درجہ خدا کو دیا جاتا ہے۔قرآن پاک میں بھی اس بات کو واضح کر دیا گیا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

الا له الخلق و الامر

ترجمہ: "لوگو! مخلوق اللہ تعالیٰ کی ہے، اس لیے حکم بھی اسی کا چلے گا۔"

حاکمیت کا امتیاز یہ ہے کہ حاکم مطلق کے حکم کی خلاف ورزی ناممکن ہے چنانچہ علم سیاسیات کے ماہرین حاکم مطلق کی صفات میں سے ایک صفت یہ بیان کرتے ہیں کہ اس کے حکم پر کوئی اور غالب نہیں آسکتا (Whose will can not be overriden) قرآن پاک میں یہ صفت اللہ تعالیٰ کی بتائی گئی ہے (فعال لما یرید وہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے) کا یہی مفہوم ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آنحضرت ﷺ سے احکام کے متعلق پوچھ لیا کرتے تھے کہ یہ آپ کی ذاتی رائے ہے یا حکم خداوندی ہے۔

اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کی بنیاد پر جو نظام بنتا ہے اس میں ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم نہیں کرسکتا۔ اس لیے کہ انسان نہ غیر جانبدار ہو سکتا ہے نہ اپنے جذبات سے بالاتر اس لیے اللہ کی حاکمیت اعلیٰ (Sovereignty) انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اور اسلام سے پہلے دور جاہلیت میں جب قبائلی شیوخ یا بادشاہوں نے خدائی اختیارات پر قبضہ کیا تو انسانیت ظلمتوں میں بھٹکنے لگی تھی۔

اللہ کی رضا انسانوں تک محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذریعے پہنچی۔ اس لیے اسلامی ریاست میں رسول اللہ ﷺ کی یہ حیثیت تسلیم شدہ تھی کہ آپ ﷺ کے ہر حکم کو واجب الاطاعت سمجھا جائے اور اس اطاعت کے لیے حاکم مطلق کی طرف سے سند موجود تھی۔ سورہ نساء میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا تھا کہ:

"خدا کی قسم یہ لوگ اس وقت تک ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے باہمی تنازعات میں رسول اللہ ﷺ کو فیصلہ کن حیثیت نہ دیں اور اس کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم نہ کریں۔ بلکہ اس کے فیصلے کے خلاف دل میں بھی کوئی ملال و (حرج) محسوس نہ کریں۔"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے کسی حکم کی کبھی مخالفت کرسکتے ہیں اور غیر مسلم رعایا سے یہ بات میثاق مدینہ کی رو سے منوائی گئی تھی، بعد کی فتوحات میں غیر مسلم جب ذمی قرار پاگئے تو وہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا وعدہ کرتے تھے۔

شورائیت:

رسالت مآب ﷺ کے واجب الاطاعت ہونے کے باوجود اسلامی نظام حکومت آمرانہ نہ تھا بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورے سے تمام امور طے ہوتے تھے۔ قرآن پاک میں واضح الفاظ میں فرمادیا گیا تھا کہ مومنین کے معاملات باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں (وامرھم شوری بینھم) چنانچہ حضور ﷺ کا طریقہ تھا کہ تمام اہم مسائل پر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ مسجد نبوی ﷺ گویا پارلیمنٹ کا اجلاس منعقد کرنے کی جگہ تھی۔ اس مشورے میں مومنین کے علاوہ منافقین بھی شامل ہوتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورے اکثر و بیشتر قبول کرلیے گئے۔ صرف خدا تعالیٰ کے حکم ہی کی بناء پر یہ مشورے مسترد ہوتے تھے اور ایسی صورت میں خود مومنین بھی اصرار نہیں کرتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مسلم ہے۔ صلح حدیبیہ اس کی واضح مثال ہے۔

قانون سازی......عدلیہ اور انتظامیہ:

حضرت محمد ﷺ دنیا کے عظیم ترین قانون ساز ہیں۔ جن کے بنائے ہوئے قوانین آج تک اعلیٰ و برتر ہیں۔ ان قوانین کا پہلا ماخذ وحی الٰہی ہے۔ جس کے ذریعے خود خالق انسان نے انسانی زندگی کے لیے ضابطے و قوانین وضع کیے۔ چور کے ہاتھ کاٹنے کا قانون، شراب پینے پر 80 کوڑے کی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سزا، کنوارے زانی کے لیے سو درے اور جھوٹی تہمت لگانے پر 80 کوڑے کی سزا، قرآن پاک میں واضح طور پر بیان کر دی گئی ہے۔ قصاص و دیت کا قانون بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ خود نبی ﷺ کو بھی خدا کی طرف سے یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ قانون سازی کریں۔ کیونکہ قرآن کا حکم تھا کہ:

ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ

ترجمہ: ''جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی۔''

لہٰذا ان کا حکم قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر کسی معاملہ کے بارے میں خدا اور رسول کے احکام کی وضاحت (صریح نص) موجود نہ ہو تو صحابہ کرام قرآن و سنت کی روشنی میں خود اجتہاد فرماتے تھے۔ چنانچہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل کو یمن کا قاضی مقرر کیا گیا تو آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ معاملات کا فیصلہ کیسے کرو گے؟ عرض کیا کتاب اللہ کی روشنی میں۔ پوچھا اگر وہاں وضاحت نہ ہو۔ عرض کیا رسول اللہ کی سنت سے۔ پھر پوچھا اگر یہاں بھی وضاحت نہ ہو تو عرض کیا کہ پھر کتاب و سنت کی روشنی میں خود اجتہاد کروں گا۔ آپ ﷺ نے اس پر خدا کا شکر ادا کیا جس نے آپ ﷺ کے ساتھیوں کو فیصلہ کرنے کا صحیح طریقہ سمجھایا۔

نفاذ قانون کے سلسلے میں حضور ﷺ کسی سے رعد رعایت کے قائل نہ تھے۔ آپ ﷺ خود سب سے بڑے جج تھے اور مدینہ اور دوسرے شہروں کے لیے الگ الگ قاضی مقرر فرمائے تھے۔ سب لوگ قانون کی نظر میں مساوی تھے اور سب پر قانون یکساں نافذ ہوتا تھا۔ اس کی بہترین مثال ہمیں اس وقت ملتی ہے، جب مکہ کے با اثر قبیلہ بنو مخزوم سے متعلق فاطمہ بنت الاسود چوری کے الزام میں پکڑی گئی اور جرم ثابت ہو گیا تو قریش نے اسے اپنی عزت کا مسئلہ بنا کر سزا سے بچانے کی کوشش کی تو آپ ﷺ نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو جو سفارشی بن کر حضور ﷺ کے پاس آئے تھے، مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

> ''تم حدود الٰہی میں سفارش کرتے ہو۔ سنو، اگر فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد ﷺ بھی ایسا جرم کرتی تو میں حد جاری کرتا۔'' تم سے پہلے بنی اسرائیل کی ہلاکت کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ جب ان کے عام لوگ جرم کرتے تو ان پر قانون نافذ کیا جاتا۔ جب امراء غلط کام کرتے تو ان پر قانون نافذ نہ ہوتا۔''

چنانچہ آپ ﷺ نے اس عزت پر حد جاری فرما دی اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ عدل کے معاملے میں آپ ﷺ کا رویہ اس حد تک بے لاگ تھا کہ ایک مسلمان جو در اصل منافق تھا اور ایک یہودی کے درمیان ایک تنازعہ میں آپ ﷺ کے سامنے لایا گیا اور آپ ﷺ نے یہودی کو حق پر پا کر فیصلہ اس کے حق میں دے دیا۔

عدلیہ کے سربراہ آپ ﷺ خود ہی تھے۔ آپ ﷺ کی عدالت آخری عدالت تھی لیکن متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم کو مدینہ میں قضاء کے منصب پر فائز کیا گیا تھا۔ مدینہ کے باہر دور دراز کے علاقوں میں بھی قاضی متعین تھے۔

احتساب:

بد معاملگی، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی اور کم تولنے کے انسداد اور اخلاقی مفاسد کے خاتمے کے لیے با قاعدہ شعبہ احتساب کا اہتمام تو بعد کے ادوار میں ہوا لیکن نبی ﷺ اس مسئلہ کو ذاتی دلچسپی سے حل فرماتے تھے۔ جہاں کہیں اخلاقی برائیوں کی اطلاع ملتی بہ نفس نفیس تشریف لے جاتے۔ سٹہ بازی، قمار بازی اور جوئے کی دوسری اقسام سے منع فرماتے۔ اس مقصد کے لیے خود مارکیٹ جاتے اور تاجروں کے طرز عمل کا جائزہ لے کر انہیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مناسب ہدایات دیتے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے گندم کے ایک ڈھیر میں ہاتھ ڈال کر دیکھا تو نمی محسوس کی۔ آپ ﷺ نے دکاندار کو حکم دیا کہ اس کے اندر نقص نمایاں کردیا کہ کوئی شخص دھوکا نہ کھا جائے۔

سیکرٹریٹ:

آنحضرت ﷺ کے زمانے میں کوئی باقاعدہ سیکرٹریٹ نہ تھا۔ تاہم اہم فرائض کو تقسیم کار کے طریقے پر ہی سرانجام دیا جاتا تھا۔ کتابِ وحی کے لیے زید رضی اللہ عنہ بن ثابت اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور آخری دور میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا گیا تھا۔ دوسری حکومتوں کے ساتھ خط و کتابت زید رضی اللہ عنہ بن ثابت کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کی مہر مبارک حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کے پاس ہوتی تھی جو خط کی تکمیل کے بعد ثبت کی جاتی تھی۔ معاشی امور کا حساب کتاب مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ کے ذمے تھا۔ عہدنامے بالعموم حضرت علی رضی اللہ عنہ لکھتے تھے۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ مالِ غنیمت کے حساب پر مامور تھے۔ زکوٰۃ و صدقات کا حساب زبیر رضی اللہ عنہ بن العوام رکھتے۔ اس طرح سے دربارِ رسالت سے مختلف ذمہ داریاں مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سپرد کی گئی تھیں جن کو وہ اپنی سعادت سمجھ کر سرانجام دیتے تھے۔

مذہبی آزادی:

رسول مقبول ﷺ نے جو اسلامی حکومت قائم کی تھی۔ اس میں یہودی و نصرانی بھی آباد تھے، جو یمن اور شام کے علاقوں میں رہائش پذیر تھے۔ بحرین کی آبادی کا ایک حصہ مجوسی مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ اسلام حکمران قوت تھا لیکن دیگر مذاہب کو کامل آزادی تھی۔ ان کی عبادت گاہیں نہ صرف حکومت کے ہاتھوں محفوظ تھیں بلکہ حکومت خود ان کی محافظ تھی۔ غیر مسلموں سے ان کی حفاظت کے عوض ایک معمولی سا ٹیکس (جزیہ) لیا جاتا تھا۔ انہیں اپنے عقائد کے اظہار کی کامل آزادی تھی۔ ان کے معاشرتی معاملات، ان کے نجی قانون کے تحت ہی حل ہوتے تھے۔

ایک متوازن معاشی نظام کی تشکیل:

ظلم و گمراہی کا ایک بڑا سبب معاشی استحصال ہے جو پیغمبروں کی ہدایت سے انحراف کرنے کا بنیادی سبب رہا ہے اس لیے اس پہلو کو منضبط کرنے کے لیے محمد مصطفیٰ ﷺ نے خصوصی اقدامات کیے۔

آنحضرت ﷺ نے جو معاشی نظام قائم فرمایا اس میں نہ تو امیر اور غریب کے درمیان بُعد تھا اور نہ ہی معاشی مساوات کا غیر فطری نظام۔ تمام لوگوں کی بنیادی ضروریات پوری ہوتی تھیں لیکن وہ تمام ذرائع بند کردیے گئے تھے جن سے دولت چند ہاتھوں میں جمع ہوتی تھی۔ مثلاً سود ممنوع تھا۔ شراب کی کشید اور فروخت پر پابندی تھی۔ جوا اور شرط کی تمام صورتیں جن میں راتوں رات امیر ہونے کے مواقع پائے جاتے ہیں، حرام قرار دے دی گئیں۔ اس اسلامی حکومت کی اخلاقی تعلیمات اتنی بلند تھیں کہ مومن ایک دوسرے کی ضرورت کا احساس رکھتے تھے۔ جو رقم بیت المال میں جمع ہوتی، وہ بھی حاجت مندوں میں تقسیم کردی جاتی۔ ذرائع آمدن حسب ذیل تھے:

خمس غنائم:

مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ۔ جو شرعاً رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت اور ناداروں و یتیموں اور غریبوں کا حق تھا۔

زکوٰۃ:

صاحبِ نصاب مسلمانوں سے نقد روپیہ مویشیوں اور مال کی تجارت پر اڑھائی فیصد سالانہ زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی جو مساکین، ناداروں، مسافروں، قیدیوں اور غلاموں پر خرچ کی جاتی تھی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

عشر:

زمین کی پیداوار پر عشر وصول کیا جاتا تھا۔ بارانی زمینوں پر اس کی شرح 10% اور چاہی زمین پر 5% فیصد ہوتی تھی۔

خراج:

مفتوحہ علاقے بعض اوقات خراج ادا کرنے کے وعدہ پر صلح کرتے تھے۔ معاہدہ کے مطابق ان سے خراج وصول کیا جاتا تھا اور مجاہدین میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

جزیہ:

غیر مسلم رعایا سے ان کی حفاظت کے عوض ایک ٹیکس وصول ہوتا تھا۔ یہ ٹیکس ہر عاقل بالغ مرد سے وصول کیا جاتا تھا۔ بوڑھوں، ناداروں اور راہبوں کو یہ ٹیکس معاف تھا۔

فے:

بعض زمینیں حضورﷺ نے اجتماعی کاموں کے لیے وقف کر دی تھیں۔ ان کی آمدنی آنحضرتﷺ کے اہل بیت اور دیگر مستحقین پر صرف ہوتی تھی۔

صدقات:

مومنین ان ٹیکسوں کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرتے رہتے تھے۔ وہ یہ مال آنحضرتﷺ کی خدمت میں پیش کرتے اور آپﷺ اسے مستحقین میں تقسیم فرما دیتے۔

حضورﷺ کے قائم کردہ معاشی نظام میں نہ تو اشتراکیت کی طرح کی ''مساوات'' تھی جس میں تمام لوگ تہی دامن (بھوکے ننگے) رہیں اور ساری دولت ریاست کے پاس مرتکز (جمع) ہو جائے اور نہ ہی ارتکاز زر کا وہ نظام جس میں دولت صرف چند ہاتھوں میں جمع ہو جائے اور عام لوگ بھوکوں مرتے رہیں۔ اس میں:

- ☆ کمائی کے ناجائز ذرائع پر پابندی ہے۔
- ☆ راتوں رات امیر ہونے کے راستے (لاٹری، جوا وغیرہ) بند کر دیے گئے ہیں۔
- ☆ زکوٰۃ و صدقات سے غریبوں کی جیبیں بھرنے کا نظام بنایا گیا ہے۔
- ☆ ایسے ذرائع اختیار کیے گئے ہیں کہ ''دولت صرف اغنیاء میں ہی گردش نہ کرتی رہے بلکہ غرباء کو بھی ضروریات زندگی میسر آئیں۔''
- ☆ جائز ذرائع سے جمع شدہ دولت اور جائیداد منقولہ و غیر منقولہ اسلام کے قانون وراثت کی رو سے تمام اولاد میں اس طرح تقسیم کی جاتی ہے کہ نہ کوئی بڑا سرمایہ دار بنتا ہے اور نہ ہی بڑے بڑے جاگیر دار پیدا ہوتے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سنت نبوی کی روشنی میں طرز حکمرانی کا تصور اور اس کے عملدر آمد کا طریقہ کار

حضور ﷺ بحیثیت عظیم مدبر و منتظم

رسول اکرم ﷺ نے اپنے حسن تدبر اور حسن انتظام سے روئے زمین پر ایک ایسی مثالی سلطنت اور نمونے کا ایسا معاشرہ قائم کیا جس کے لیے چشم فلک آج تک ترس رہی ہے۔ حضور ﷺ کی عظمت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جب تاریخ کا طالب علم یہ جانتا ہے کہ آپ ﷺ نے یہ کارنامہ اس ماحول اور ان حالات میں سرانجام دیا جب کہ عام آدمی کو معمولی سی تبدیلی بھی کوہ گراں معلوم ہوتی تھی۔ بقول موسیو گال لیبام: ''ساری دنیا کا مطلع فتنہ و فساد کے سیاہ بادلوں سے تیرہ و تار تھا۔۔۔ عالم ارضی کی فضا وحشیانہ بے چینیوں کے غلیظ و کثیف بادلوں سے تاریک تھی۔ دنیا کے ہر حصہ میں ہر انسان اچھے ذرائع اختیار کرنے کی بجائے شرارت آمیز وسائل پر اعتماد کرتا تھا۔ امن و اطاعت پر جنگ اور میدان جنگ کو تفوق حاصل تھا۔ مال غنیمت سے خزانوں کو بھرنا، قوموں، شہروں اور شرفاء پر غارت ڈالنا ایسے کارنامے تھے جو اس ساری تاریخ میں قابل ذکر ہیں۔''

ان حالات میں آپ ﷺ نے ایک صالح نظام حکومت (Good Governance) کی بنیاد رکھی۔ آپ ﷺ کی شخصیت کے اس پہلو پر ایک غیر مسلم مصنف بازورتھ (Bosworth) کا بیان ملاحظہ ہو:

''آپ ﷺ مذہب کے ساتھ ساتھ ریاست کے سربراہ بھی تھے۔ اگرچہ آپ ﷺ کی شخصیت میں قیصر و پوپ (دونوں کا اقتدار) شامل تھا۔ لیکن نہ تو آپ ﷺ کو پوپ کا سا جھوٹا فخر و غرور تھا اور نہ ہی قیصر کی طرح کوئی فوج آپ ﷺ کے پاس تھی، نہ کوئی پاسبانوں کا گروہ تھا۔ نہ کوئی محل تھا اور نہ کوئی مقرر آمدنی تھی۔ اگر کبھی کسی انسان کو حکومت کرنے کا خدائی حق نصیب ہوا ہے تو وہ محمد ﷺ تھے کیونکہ اگرچہ انہیں اقتدار مطلق حاصل تھا مگر اس کے سب ظاہری اشکال اور مادی سہارے مفقود تھے۔''

ایسا مثالی معاشرہ جس کی تعریف دشمن بھی کرتے ہیں اس عظیم شخصیت کا رہین منت ہے، جسے قرآن نے خاتم النبین ﷺ کہا ہے۔ یہاں ہم آپ ﷺ کے تدبر اور انتظام سلطنت کے بارے میں چند نکات بیان کریں گے۔ نبی کریم ﷺ کی زندگی دو ادوار پر مشتمل ہے۔ مکی اور مدنی۔ حضور ﷺ کے تدبر و فراست کے سلسلے میں ایک بنیادی نکتہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ آپ ﷺ کے تمام فیصلے، احکام اور ارشادات، دو بنیادوں پر مبنی ہوتے تھے۔ ایک وحی والہام اور دوسرے پیغمبرانہ بصیرت۔ وحی والہام ایک بے خطا حقیقت ہے لہٰذا اس سے بہتر فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک پیغمبرانہ بصیرت کا تعلق ہے وہ بھی ہدایت خداوندی سے فیض یاب ہے اس لیے اس کی روشنی میں انجام پانے والے تمام امور عام انسانی بصیرت سے بدرجہا بہتر اور بلند ہیں۔ نبی اکرم ﷺ چونکہ امی تھے اس لیے آپ ﷺ کی جملہ تربیت الٰہی تجلیات و انوار ہی سے ہوئی تھی۔ خالق کائنات نے آپ ﷺ کی پیغمبرانہ حیات سے پہلے قلب و دماغ اور روح و مزاج کی تربیت اس نہج پر کی کہ آپ ﷺ بلا تکلف درست اور صحیح فیصلے فرماتے۔ قرآن پاک نے آپ ﷺ کی حیات قبل از نبوت کو بطور دلیل پیش کیا ہے:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ

ترجمہ: ''بلاشبہ میں نے تمہارے درمیان ایک عرصہ گزارا، کیا سمجھتے نہیں۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مکی زندگی:

آنحضور ﷺ کی مکی زندگی دو ادوار پر مشتمل ہے۔ قبل از نبوت اور بعد از نبوت۔ قدرت نے آپ ﷺ کو اخلاقی عظمت کے ساتھ جس تدبرو فراست سے نوازا تھا وہ بھی ایک مسلمہ امر ہے۔ زمانہ قبل از نبوت کے کم از کم دو واقعات ایسے ہیں، جن سے آپ ﷺ کے اجتماعی شعور اور تدبر کا پتہ چلتا ہے۔

حلف الفضول:

ان میں سے پہلا واقعہ حلف الفضول کا ہے۔ حرب فجار کے بعد عبداللہ بن جدعان کے مکان میں کچھ لوگ جمع ہوئے اور ایک انجمن کی بنیاد رکھی۔ اس کا مقصد ظالموں کو ظلم سے روکنا اور مظلوموں کی مدد کرنا تھا۔ نبی ﷺ اس معاہدے میں شریک تھے۔ معاہدین نے جو حلف اٹھایا تھا، ابن سعد اور ابن ہشام نے اس کے الفاظ نقل کیے ہیں:

> عن جبير بن مطعم رضى الله عنه: قال: قال رسول الله ﷺ: ما احب ان لى بحلف حضرته بدار ابن جدعان حمر النعم وانى اغدربه هاشم وزهره وتيم تحالفوا ان يكونوا مع المظلوم مابل بحر صوفة ولو دعيت به لا جبت. فتعاقدوا وتعاهدوا على ان لا يجدوا بمكة مظلوما من اهلها وغيرهم ممن دخلها من سائر الناس الاقاموا معه وكانوا على من ظلمه حتى ترد عليه مظلمة.

ترجمہ: ''جبیر بن مطعم کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں ابن جدعان کے گھر جس حلف میں شریک ہوا تھا۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ سرخ رنگ کے اونٹ ملیں تو میں اس کو توڑ دوں۔ ہاشم، زہرہ و تیم نے قسمیں کھائی تھیں کہ کوئی دریا جب تک کسی صوف کو بھگو سکتا ہے وہ مظلوم کا ساتھ دیں گے اور اگر مجھ کو (اب بھی) اس میں بلایا جائے تو میں قبول کرلوں گا۔ اس بات پر معاہدہ ہوا کہ مکہ میں کسی کو مظلوم پائیں گے تو اس کی امداد کے لیے کھڑے ہو جائیں گے، خواہ وہ مظلوم مکہ کا باشندہ ہو یا باہر کا ہو۔ جس نے بھی ظلم کیا، اس کا مقابلہ کریں گے۔ یہاں تک کہ وہ مظلوم کا حق لوٹا دے۔''

نبی ﷺ فخریہ یہ بات فرمایا کرتے تھے کہ میں اس معاہدے میں شریک تھا۔

آپ ﷺ نے اس معاہدے پر عمل درآمد کرانے کے لیے بھی تگ و دو فرمائی۔ مثلاً ایک دفعہ ایک شخص کو آپ ﷺ نے ابو جہل سے اس کا حق دلوایا تھا، حالانکہ ابو جہل شروع میں ایسا کرنے کو راضی نہ تھا لیکن آپ ﷺ کے کہنے سے اس شخص کو اس کا حق دے دیا۔ جس زمانے میں یہ معاہدہ ہوا تھا وہ زمانہ ایسا تھا جب معاشرتی سطح پر ایک دوسرے کے حقوق کو تسلیم کرنے کا مسئلہ آسان نہ تھا۔ یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ مجلس اقوام اور اقوام متحدہ نے عصر حاضر میں جس منصوبے کا تصور پیش کیا ہے، وہ عربوں کے حلف الفضول میں موجود تھا۔

حجر اسود کے نصب کرنے کا واقعہ:

آنجناب ﷺ کے سیاسی تدبر کی دوسری شہادت حجر اسود نصب کرنے کا واقعہ ہے۔ اعلان نبوت سے غالباً پانچ برس پہلے کی بات ہے کہ قریش نے کعبۃ اللہ کی از سر نو تعمیر کا منصوبہ بنایا، کیونکہ بارش کی وجہ سے اس کی عمارت کو نقصان پہنچا تھا۔ تعمیر کے دوران حجر اسود نصب کرنے کے سوال پر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

زمانہ پیدا ہو گیا۔ ابراہیمی آثار وعقائد کی بنا پر چونکہ یہ پتھر مقدس تصور کیا جاتا تھا، اس لیے ہر قبیلے کی یہ خواہش تھی کہ اسے نصب کرنے کا اعزاز وہ حاصل کرے۔ اس اعزاز کے حصول کی تگ ودو نے قریش کو لڑائی تک پہنچا دیا۔ آخر اس جھگڑے کا فیصلہ ابوامیہ بن مغیرہ کے ان الفاظ پر ہوا کہ "اے قریش! اپنا خون نہ بہاؤ۔ کسی کو منصب کیوں نہ بنا لیا جائے؟ جو کوئی مسجد میں سب سے پہلے داخل ہو، وہی تمہارا فیصلہ کرے۔" حسن اتفاق سے کعبۃ اللہ میں سب سے پہلے جو شخص داخل ہوا، وہ آنحضور ﷺ کی ذات گرامی تھی۔ سب لوگوں نے بیک آواز کہا:

هذا الامين! رضينا بحكمه.

ترجمہ: "ہاں یہ امین ہیں۔ ہمیں ان کا فیصلہ بسر وچشم منظور ہے۔"

آپ ﷺ نے ہر فریق کا بیان غور سے سنا۔ سب نے اپنا اپنا حق تفوق پیش کیا۔ اختلاف ومنافرت کی آگ جو کتنے خاندانوں کے خرمنوں کو خاکستر کرنے والی تھی، آپ ﷺ کے تدبر سے بجھ گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا! ایک چادر لاؤ۔ اس چادر کو زمین پر بچھایا گیا اور آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے حجر اسود اٹھا کر اس پر رکھ دیا اور فرمایا: "ہر خاندان کا سردار چادر کے کنارے کو پکڑ کر محل نصب کے قریب لے آئے۔" جب حجر اسود محل نصب کے قریب لایا گیا تو آپ ﷺ نے پتھر اٹھا کر اس مقام پر رکھ دیا۔ بقول محمد حسین ہیکل: "اسی طرح یہ امر بھی بلا اختلاف مسلم ہے کہ مشیت نے یہ اعزاز جناب رسالت مآب ﷺ کو بخشا، جن کے حکم سے زمین پر چادر پھیلا کر حجر اسود کو اس میں رکھا گیا اور آخر میں چادر پر سے اٹھا کر اسے سیدنا محمد ﷺ ہی نے اس کے محل پر نصب فرمایا، جس سے اہل مکہ کے نزدیک آپ ﷺ کی عظمت کے ساتھ آپ ﷺ کی فراست بھی واضح ہو گئی۔ آپ ﷺ امین کے لقب سے مشہور تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ آپ ﷺ کے تدبر اور آپ ﷺ کی سیاسی بصیرت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"نبوت سے پہلے ہی وہ (مکہ والے) آپ ﷺ کو "الامین" کہہ کر پکارتے تھے۔ کیونکہ انہوں نے آپ ﷺ کی امانت اور مروت کو، آپ ﷺ کو صداقت قولی اور آپ ﷺ کے جواب میں حسن معاملت کو دیکھا تھا اور مبعوث ہونے سے پہلے اکثر اوقات آپ ﷺ اپنی حکمت سے ان کے پیچیدہ مسائل کا صحیح حل دے دیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ حلف الفضول میں بھی حاضر تھے۔ قبائل آپ ﷺ کے فیصلے سے اسی دن راضی ہو گئے۔ وہ اپنے فعل پر حیران تھے کہ انہوں نے عمر میں اپنے سے چھوٹے اور مال میں اپنے سے کمتر کی اطاعت کی۔ اس طرح ان سب نے آپ ﷺ کو اپنے اوپر حاکم اور رئیس بنا لیا۔"

چالیس برس کی عمر میں آپ ﷺ نے اعلان نبوت فرمایا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی آپ ﷺ کی حیثیت بدل گئی۔ شخصی عظمت اور انفرادی صلاحیت کی جگہ قائد تحریک کی سرگرمی آئی۔ ظاہر بات ہے کہ شخصی معاملات میں تدبر وفراست کا دائرہ مختلف ہوتا ہے اور تحریکی زندگی کے لیے تدبر وفراست کا دائرہ مختلف۔

ہم دیکھتے کہ مخالفتوں کے طوفان اٹھتے ہیں، مصائب وآلام کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں۔ معاشرتی مقاطعہ ہوتا ہے۔ رفقاء کے لیے عرصہ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ خود قائد تحریک کے لیے خوف ولالچ کے بے شمار مراحل آتے ہیں۔ لیکن آپ ﷺ کاروان شوق کو اپنی پیغمبرانہ بصیرت وتدبر اور جانبازی کے ذریعے بچا کر لے جاتے ہیں۔ اگر آپ ﷺ میں فراست کی ذرہ بھر کمی ہوتی تو مکہ میں تصادم ہو جاتا اور مٹھی بھر مسلمان ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے۔

انتہائی نامساعد حالات میں اپنی دعوت کو وسعت دی اور اپنے تدبر سے قریش کی ہر تدبیر کو ناکام بنا دیا۔ یہ امر بھی واضح رہنا چاہیے کہ نبی کے طرز عمل میں تائید خداوندی کا عنصر خصوصی ہوتا ہے۔ دعوت اسلام کو پھیلانے، مختلف قبائل تک جانے اور عمومی انداز تخاطب اختیار کرنے کے تمام پہلو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آپ ﷺ کی فراست کی بین دلیل ہیں۔ وحی الٰہی کی ہدایت اور پیغمبرانہ بصیرت اپنا کام مسلسل سرانجام دیتی رہی۔ جب آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ اب تحریک کے لیے اچھا مرکز ثابت نہیں ہو سکتا تو آپ ﷺ نے گردوپیش پر نگاہ دوڑائی اور مکہ سے باہر اپنی مرکزیت واجتماعیت کے لیے راہیں ہموار کرنا شروع کیں۔ حبشہ کی ہجرتیں تحریک اسلامی کے لیے ساعد ماحول اور معاون حالات کی تلاش کی طرف پہلا اقدام تھا۔ آخری مکی دور میں اہل یثرب کی بیعتیں اسی تدبر کا حصہ تھیں۔ اس کا ثبوت اس تقریر سے بھی ملتا ہے جو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بیعت عقبہ ثانیہ کے وقت کی تھی:

فقال یمعشر الخزرج انکم قد دعوتم محمدا الی مادعو تموہ الیہ و محمد مز أعز الناس فی عشیرتہ، یمنعہ واللہ منا من کان علی قولہ ومن لم یکن منا علی قولہ یمنعہ للحسب والشرف، وقد ابی محمد، الناس کلھم غیرکم فان کنتم اھل قوۃ وجلد وبصر بالحرب واستقلالا بعد اوۃ العرب قاطبۃ ترمیکم عن قوس واحدۃ، فارتا وارایکم واتمر وابینکم ولا تفرقوا الا عن ملامنکم واجتماع فان اصدق الحدیث اصدقہ.

ترجمہ: ”اے گروہ خزرج تم نے محمد ﷺ کو اپنے ہاں بلایا ہے۔ محمد ﷺ اپنے خاندان میں معزز ترین فرد ہیں۔ ہم میں سے جو ان کے قول پر ہے ان کی حمایت کرتا ہے جو ان کے قول پر نہیں، وہ بھی بہ اعتبار حسب شرف آنحضرت ﷺ کی حفاظت کرتا ہے۔ محمد (ﷺ) نے تمہارے سوا اور سب کے قبول کرنے سے انکار دیا ہے۔ اگر تم صاحب قوت و شوکت ہو۔ جنگ میں ماہر اور سارے عرب کی عداوت میں جو تم پر ایک ہی کمان سے تیراندازی کریں گے، مستقل ہو تو اپنی رائے پر غور کرو۔ آپس میں مشورہ کرو، باہم اختلاف نہ کرو۔ جو کچھ کرو اتحاد و اتفاق سے کرو۔ سب سے بہتر وہی بات ہے جو سب سے زیادہ سچی ہے۔“

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی گفتگو اور رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے بعد انصار کے یہ جملے قابل غور ہیں:

نقبلہ علی مصیبۃ الاموال و قتل الاشراف.

ترجمہ: ”ہم اس کو اموال کی مصیبت اور اشراف کے قتل پر قبول کرتے ہیں۔“

۱۔ بقول ڈاکٹر حمید اللہ آخر مدینے والوں سے بیعت عقبہ ہوئی اور انہوں نے اقرار کیا کہ آنحضرت ﷺ اور دیگر مکی مسلمانوں کے مدینہ آنے پر وہ ویسی ہی حفاظت کریں گے جیسی وہ اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی کرتے ہیں اور چند سو مسلمان جو مکے میں تھے مدینہ منورہ چلے گئے۔

ہجرت مدینہ بھی دوررس سیاسی اثرات کی حامل ہے۔ آپ ﷺ کی صبرو استقامت کی پالیسی اور بالآخر اپنی قوت کو ایک مرکز پر مجتمع کرنا اور کفار کے لیے ایسے حالات پیدا کرنا کہ وہ آپے سے باہر ہو کر جارحیت کی روش اختیار کریں، آپ ﷺ کے تدبر کی بہترین مثالیں ہیں۔ مدینہ کے ایک مرکز بن جانے پر آہستہ آہستہ تمام مسلمان وہاں پہنچتے ہیں اور قائد تحریک سب سے آخر میں کوچ کرتا ہے، تاکہ کسی مسلمان کے ذہن میں یہ بات نہ آئے کہ ہمارا قائد خود محفوظ ہے اور ہمیں مشکلات کے حوالے کر رہا ہے، آپ ﷺ مدینہ تشریف لے گئے اور وہاں بعد میں بھی مسلمان ہجرت کر کے آتے رہے، تاآنکہ آپ ﷺ نے اعلان فرمایا:

لاھجرۃ بعد الفتح

ترجمہ: ”فتح مکہ کے بعد کوئی ہجرت نہیں۔“

۲۔ مختصر یہ کہ عہد نبوی میں ہجرت کا یہ مفہوم بھی تھا کہ نومسلموں کو اسلامی علاقے میں بسایا جائے۔ اور آیت ﴿وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْ بَیْتِہٖ مُھَاجِرًا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

الی اللہ ورسولہ ؕ میں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح سے رفتہ رفتہ اسلامی علاقے کی توسیع ہوتی رہے گی، تا کہ اس بڑھنے والی آبادی کے لیے خدا کی زمین تنگ نہ ہو جائے۔ اصل منشا یہ تھی کہ خدا کے ملک میں خدا ہی کا راج ہو۔

مدنی زندگی:

آپ ﷺ کے تدبر اور فراست کے لیے عملی آزمائش مدینہ منورہ میں پیش آئی۔ آپ ﷺ کی مدنی زندگی ایک بھرپور مصروفیت کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ انتہائی مشکل اوقات میں بھی آپ ﷺ نے اپنی خداداد بصیرت سے سلامتی کی راہیں نکالی ہیں۔ مدینہ طیبہ میں تشریف لانے کے بعد آپ ﷺ کی حیثیت مکے سے مختلف ہوگئی تھی، مکے میں مسلمان ایک مختصر اقلیت کے طور پر رہ رہے تھے، جب کہ یہاں انہیں اکثریت حاصل تھی۔ پھر آپ ﷺ نے یثرب کی اسلامی تنظیم کا آغاز کیا، جس میں آپ ﷺ کو منتظم ریاست کا درجہ حاصل ہوگیا۔ اس میں شک نہیں کہ مکی زندگی کے مقابلے میں یہ بڑی کامیابی تھی، لیکن پرسکون معاشرے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔ مستحکم معشرت اور پرسکون اجتماعیت کے لیے آپ ﷺ نے شاندار اقدامات کیے۔ یوں تو آپ ﷺ کی حیات طیبہ کا ہر واقعہ تدبر و فراست کا نمونہ ہے، لیکن ہم اختصار کے ساتھ چند امور کی نشاندہی کریں گے۔ ہمارے نزدیک اس کی حیثیت داخلی اور خارجی ہے۔

یہ درست ہے کہ مدینے میں مسلمانوں کو عددی اکثریت حاصل تھی اور انصار مدینہ کا مضبوط گروہ شہر میں خصوصی اہمیت رکھتا تھا، مگر آنحضور ﷺ کی حیثیت ایک نوواردکی تھی۔ یہودیوں کی فعال اور موثر اقلیت اس نئی شہری ریاست کے لیے مستقل خطرہ تھی۔ آپ ﷺ نے مدینہ تشریف لاتے ہی دو ایسے اقدامات کیے جن سے اس نوزائیدہ سوسائٹی کو استحکام مل گیا۔ معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا آدمی بھی یہ محسوس کرے گا کہ یہ دونوں اقدامات آپ ﷺ کے تدبر و فراست کی بہترین مثالیں ہیں۔

مواخات:

ہجرت کے بعد پہلا مسئلہ مسلم معاشرے کے ہم آہنگی، یک جہتی اور استحکام کا تھا۔ مسلم معاشرہ دو عناصر پر مشتمل تھا۔ ایک مہاجر اور دوسرے انصار۔ ان دونوں میں نسلی اعتبار سے بھی اور ماحول و مزاج کے اعتبار سے بھی اختلاف تھا۔ مہاجرین وہ لوگ تھے جنہوں نے اللہ کے لیے اپنا گھر بار چھوڑا تھا اور اسلام کے لیے جان و مال کی بے پناہ قربانیاں دی تھیں۔ قرآن پاک نے ان کی قربانیوں کو بڑے دلآویز طریق پر بیان کیا ہے۔ مثلاً:

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ

ترجمہ: "اور حاجت مند مہاجرین کا (بالخصوص) حق ہے جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے "جبراً" نکالے گئے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کے طالب ہیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مدد کرتے ہیں۔ یہی لوگ ایمان کے سچے ہیں۔"

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ

ترجمہ: "سو جن لوگوں نے ترک وطن کیا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے۔ اور تکلیفیں دیے گئے میری راہ میں اور جہاد کیا اور شہید ہو گئے۔ ضرور ان لوگوں کی تمام خطائیں معاف کردوں گا، اور ضرور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اور یہ عوض ملے گا اللہ سے۔"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

انصار مدینے کے شہری تھے۔ انہوں نے عظمت اسلام کے لیے پورے عرب کی مخالفت کو قبول کیا تھا، لہٰذا ضروری تھا کہ ان دو طبقات میں یک جہتی پیدا ہو جائے اور مسلم معاشرت کی بیاد مضبوط ہو جائے۔ آپ ﷺ نے انصار اور مہاجرین کے پینتالیس یا پچاس آدمیوں کے درمیان رشتہ مواخات قائم کیا تھا۔ ان لوگوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے گھر قسم کھائی۔

مواخات کے طرز عمل نے مسلم سوسائٹی کو استحکام بخشا اور اسے ہر جارحیت کے خلاف مجتمع ہو کر لڑنے میں مدد دی۔ جن لوگوں میں مواخات قائم کی گئی تھی، ان کے متعلق دلچسپ اور حیرت انگیز تفصیلات کتب سیرت میں موجود ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی فکر نو جس میں آپ ﷺ سابقہ انبیائے کرام سے منفرد تھے، ایک نئی طرح کی فکر تھی، جسے آنحضرت ﷺ نے اس وقت نظر اور دور اندیشی کے بعد قائم کیا کہ صاحب دانش کو آپ ﷺ کی اصابت فکر کے سامنے سر جھکائے بغیر چارہ نہ رہے، یہ کہ جدید وطن کو ایسی وحدت میں منسلک کیا جائے جو آج تک عرب کے وہم و خیال میں بھی نہ آ سکی۔ رسول عالمین ﷺ کو مسلمانوں کے درمیان مواخات قائم ہو جانے سے ایک گونہ طمانیت حاصل ہو گئی۔ اگر اس پر غور کیا جائے کہ مدینہ کے منافقین قبیلہ اوس اور خزرج کے مسلمانوں میں کسی طرح پھوٹ ڈلوانے کے لیے پر تول رہے تھے تو اس مواخات کی حکمت و سیاست کی اہمیت تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ مدینہ کے انہی منافقوں نے مہاجر و انصار کے درمیان منافرت پھیلانے کی مہم بھی شروع کر رکھی تھی۔ مگر مواخات نے ان کی چالیں ختم کر دیں۔ مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کی بات سمجھ میں آتی ہے کیونکہ عبداللہ بن ابی حضور ﷺ کی آمد کے وقت بادشاہ بننے والا تھا۔ آنحضور ﷺ کی فراست تھی جس نے منافقین اور یہود کی تمام ریشہ دوانیوں کے خلاف مسلمانوں کو ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیا۔

میثاق مدینہ:

اکثریتی جماعت کو آپ ﷺ نے مواخات کے ذریعے مستحکم کر دیا۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ اہل مدینہ کو بیرونی خطرات سے بچانے کے لیے مسلم اور غیر مسلم کسی خاص نکتے پر متفق ہوتے، اہل مدینہ کے باہمی اختلافات کو بھی ہوا نہ ملتی اور بیرون مدینہ کے لوگ بھی مدینہ پر جرأت مندانہ حملہ نہ کرتے۔ آپ ﷺ کے تدبر سے مدینے کو حفاظت و سکون کے حالات میسر آئے۔ آپ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں خراج کی کیفیت تھی۔ مختلف قبائل کے درمیان چپقلش تھی اور یہود اوس و خزرج کے درمیان مستقل اور پائیدار امن نہیں ہونے دیتے تھے۔ اوس و خزرج کے بارہ قبائل تھے۔ اسی طرح یہودی بھی دس قبائل میں بٹے ہوئے تھے۔ حلیف ہونے کی مختلف صورتوں میں یہ لوگ آپس میں برسر پیکار رہتے تھے۔ گو مسلسل جنگوں کی وجہ سے تنگ تھے۔ ہر قبیلہ اپنے امور خود طے کرتا تھا اور کوئی مرکزی شہری نظام نہ تھا۔ ان حالات میں رسول اکرم ﷺ تشریف لائے۔ بقول ڈاکٹر حمید اللہ اس وقت متعدد فوری ضرورتیں تھیں۔

1۔ اپنے اور مقامی باشندوں کے حقوق و فرائض کا تعین۔
2۔ مہاجرین مکہ کے توطن اور بسر برد کا انتظام۔
3۔ شہر کے غیر مسلم عربوں اور خاص کر یہودیوں سے سمجھوتہ۔
4۔ شہر کی سیاسی تنظیم اور فوجی مداخلت کا اہتمام۔
5۔ قریش مکہ سے مہاجرین کو پہنچے ہوئے جانی و مالی نقصانات کا بدلہ۔

انہی اغراض و مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے ہجرت کر کے مدینے آنے کے چند مہینے بعد ہی ایک دستاویز مرتب فرمائی جسے اسی دستاویز میں کتاب اور صحیفہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور یہ بظاہر اشخاص متعلق سے گفت و شنید کے بعد ہی لکھا گیا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ عام قانون ملک کتاب اللہ یا قرآن کی صورت میں جیسے جیسے نافذ یا نازل ہوتا رہا تحریری صورت میں مرتب کر دیا جاتا تھا اور منکسر المزاج اور احتیاط پسند پیغمبر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

...نے اس زمانے میں اپنے ذاتی اقوال و ہدایات کو لکھنے کی عام طور سے ممانعت فرما دی تھی۔ اس کے باوجود زیر بحث دستاویز کا لکھا جانا معنی خیز ہے، ...ب اور صحیفہ کے اہم ناموں سے یاد کیا گیا ہے، جس کے معنی دستور العمل اور فرائض نامے کے ہیں۔ اصل میں یہ شہر مدینہ کو پہلی دفعہ "شہری مملکت" ...کے انتظام کا دستور مرتب کرتا تھا۔ اس معاہدے سے، جسے ڈاکٹر حمید اللہ حکم اور اور فرض قرار دیتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے مدینہ کی شہری ...زادا اور اس کے لیے خارجی خطرات سے نمٹنے کے لیے بنیاد قائم کی۔ اس دستاویز نے نبی اکرم ﷺ کو ایک منتظم اعلیٰ کی حیثیت ...ت کو ایک مستحکم نظم عطا کیا اور اس کی زبردست کامیابی تھی۔ دستاویز کی مختلف دفعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر معاملے میں آپ ﷺ کی شخصیت کو ہی آخری حیثیت دی ...ہ آپ ﷺ کی زبردست کامیابی تھی۔ ...اس دستاویز میں ایک دفعہ لفظ "دین" بھی برتا گیا ہے۔ اس لفظ میں بیک وقت مذہب اور حکومت دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے اور یہ ایک ایسا اہم ...ے کہ اس کو پیش نظر رکھے بغیر مذہب اسلام اور سیاسیات اسلام کو اچھی طرح نہیں سمجھا جا سکتا۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس دستور کی دفعات کو مختلف کتب کی ...سے مرتب کیا ہے۔ ہم اسے انہی کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے متعدد حوالے نقل کیے ہیں:

یہ حکم نامہ نبی اور اللہ کے رسول محمد ﷺ کا قریش اور اہل یثرب میں سے ایمان اور اسلام لانے والوں اور ان لوگوں کے مابین ہے جو ان کے تابع ہوں اور ان کے ساتھ شامل ہو جائیں اور ان کے ہمراہ جنگ میں حصہ لیں۔

تمام دنیا کے لوگوں کے بالمقابل ان کی ایک علیحدہ سیاسی وحدت (امت) ہوگی۔

قریش سے ہجرت کر کے آنے والے اپنے حملے کے ذمہ دار ہوں گے اور اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے۔ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیں گے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

اور بنی عوف اپنے حملے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

اور بنی الحارث بن خزرج۔۔۔۔۔

اور بنی ساعدہ۔۔۔۔۔

اور بنی جشم۔۔۔۔۔

اور بنی النجار۔۔۔۔۔

اور بنی عمرو بن عوف۔۔۔۔۔

اور بنی النبیت۔۔۔۔۔

اور بنی الاوسط

(الف) ایمان والے کسی قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے کو مدد دیے بغیر نہیں چھوڑیں گے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

(ب) اور یہ کہ کوئی مومن کسی دوسرے مومن کے مولا (معاہداتی بھائی) سے نہیں الجھے گا۔

اور متقی ایمان والوں کے ہاتھ ہر اس شخص کے خلاف اٹھیں گے جو ان میں سے سرکشی کرے یا استحصال بالجبر کرنا چاہے یا گناہ کرے یا ایمان والوں میں فساد پھیلانا چاہے اور ان کے ساتھ سب مل کر ایسے شخص کے خلاف اٹھیں گے۔ خواہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۱۴۔ اور کوئی ایمان والا کسی ایمان والے کو کسی کافر کے بدلے قتل نہ کرے گا اور نہ کسی کافر کی کسی ایمان والے کے خلاف مدد کرے گا۔

۱۵۔ اور خدا کا ذمہ ایک ہی ہے ان (مسلمانوں) کا ادنیٰ ترین فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب پر پابندی عائد کر سکے گا اور ایمان والے باہم بھائی بھائی ہیں (ساری دنیا کے) لوگوں کے مقابل۔

۱۶۔ اور یہ کہ یہودیوں میں سے جو ہماری اتباع کرے گا تو اسے مدد اور مساوات حاصل ہوگی۔ نہ اس پر ظلم کیا جائے گا اور نہ ان کے خلاف کوئی مددی جائے گی۔

۱۷۔ اور ایمان والوں کی صلح ایک ہی ہوگی۔ اللہ کی راہ میں لڑائی ہو تو کوئی ایمان والا کسی دوسرے ایمان والے کو چھوڑ کر (دشمن سے) صلح نہیں کرے گا۔ جب تک کہ (یہ صلح) سب کے لیے برابر اور یکساں نہ ہو۔

۱۸۔ اور ان تمام ٹکڑوں کو جو ہمارے ہمراہ جنگ کریں۔ باہم نوبت بہ نوبت چھٹی دلائے جائے گی۔

۱۹۔ اور ایمان والے باہم اس چیز کا انتقام لیں گے جو کہ خدا کی راہ میں ان کے خون کو پہنچے۔

۲۰۔ (الف) اور بلاشبہ متقی ایمان والے سب سے اچھے اور سب سے سیدھے راستے پر ہیں۔

(ب) اور یہ کہ کوئی مشرک (غیر مسلم رعیت) قریش کی جان اور مال کو پناہ نہ دے گا اور نہ اس سلسلے میں کسی مومن کے آڑے آئے گا۔

۲۱۔ اور جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کرے اور ثبوت پیش ہو تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔ بجز اس کے کہ مقتول کا ولی خون بہا پر راضی ہو جائے اور تمام ایمان والے اس کی تعمیل کے لیے اٹھیں اور اس کے سوائے انہیں اور کوئی چیز جائز نہ ہوگی۔

۲۲۔ اور کسی ایمان والے کے لیے جو اس دستور العمل (صحیفہ) کے مندرجات (کی تعمیل) کا اقرار کر چکا اور خدا اور یوم آخرت پر ایمان لا چکا ہو، یہ بات جائز نہ ہوگی کہ کسی قاتل کو مدد یا پناہ دے اور جو اسے مدد یا پناہ دے گا تو قیامت کے دن اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہوں گے اور اس سے کوئی رقم یا معاوضہ قبول نہ ہوگا۔

۲۳۔ اور یہ کہ جب تم میں سے کسی چیز کے متعلق اختلاف ہو تو اسے خدا اور محمد ﷺ سے رجوع کیا جائے گا۔

۲۴۔ اور یہودی اس وقت تک مومنین کے ساتھ اخراجات برداشت کرتے رہیں گے جب تک وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔

۲۵۔ اور بنی عوف کے یہودی، مومنین کے ساتھ ایک سیاسی وحدت (یا ملت) تسلیم کیے جاتے ہیں یہودیوں کو ان کا دین اور مسلمانوں کو ان کا دین، موالی ہوں کہ اصل، ہاں جو ظلم اور عہد شکنی کا ارتکاب کرے تو اس کی ذات یا گھرانے کے سوا کوئی مصیبت میں نہ پڑے گا۔

۲۶۔ اور بنی النجار کے یہودیوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۲۷۔ اور بنی الحارث کے یہودیوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۲۸۔ اور بنی ساعدہ کے یہودیوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۲۹۔ اور بنی جشم کے یہودیوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۳۰۔ اور بنی الاوس کے یہودیوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۳۱۔ اور بنی ثعلبہ کے یہودیوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۳۲۔ اور بنی جفنہ (جو ثعلبہ کی ایک شاخ ہے) کے یہودیوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۳۳۔ اور بنی الشطیبہ (جو قبیلہ ثعلبہ کی ایک شاخ ہے) کے یہودیوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۲۴۔ اور بنو ثعلبہ کے یہودیوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۲۵۔ اور یہودیوں (کے قبائل) کی ذیلی شاخوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

۲۶۔ (ا) اور یہ کہ ان میں سے کوئی بھی محمد ﷺ کی اجازت کے بغیر (فوجی کارروائی کے لئے) نہیں نکلے گا۔

(ب) اور کسی مار، زخم کا بدلہ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی اور خونریزی کرے تو اس کی ذات اور اس کا گھرانہ ذمہ دار ہوگا۔ ورنہ ظلم ہوگا اور خدا اس کے ساتھ ہے جو اس (دستور العمل) کی زیادہ سے زیادہ وفاشعارانہ تعمیل کرے۔

۲۷۔ (ا) اور یہودیوں پر ان کے خرچے کا بار ہوگا اور مسلمانوں پر ان کے خرچے کا۔

(ب) اور جو کوئی اس دستور والوں سے جنگ کرے، تو ان پر (یہودیوں اور مسلمانوں) میں باہم امداد باہم عمل میں آئے گی اور ان میں باہم حسن مشورہ اور بہی خواہی ہوگی اور وفاشعاری ہوگی نہ کہ عہد شکنی۔

۲۸۔ اور یہودی اس وقت تک مومنین کے اخراجات برداشت کرتے رہیں گے جب تک وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔

۲۹۔ اور یثرب کا جوف (یعنی وہ میدان جو پہاڑوں سے گھرا ہوا ہو) اس دستور والوں کے لیے ایک حرم (مقدس مقام) ہوگا۔

۳۰۔ پناہ گزین سے وہی برتاؤ ہوگا جو اصل (پناہ دہندہ) کے ساتھ نہ اس کو ضرر پہنچایا جائے گا اور نہ خود وہ عہد شکنی کرے گا۔

۳۱۔ اور کسی پناہ گاہ میں وہاں والوں کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہیں دی جائے گی (یعنی پناہ دینے کا حق پناہ گزیں کو نہیں)

۳۲۔ اور یہ کہ اس دستور والوں میں کوئی قتل یا جھگڑا رونما ہو جس سے فساد کا ڈر ہو تو اسے خدا اور خدا کے رسول محمد ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اور خدا اس شخص کے ساتھ ہے جو اس دستور کی زیادہ سے زیادہ احتیاط اور زیادہ سے زیادہ وفاشعاری کے ساتھ تعمل کرے۔

۳۳۔ اور قریش کو کوئی پناہ نہیں دی جائے گی اور نہ اس کو جو انہیں مدد دے۔

۳۴۔ اور ان (یہودیوں اور مسلمانوں) باہم مدد ہی ہوگی اگر کوئی یثرب پر ٹوٹ پڑے۔

۳۵۔ اور اگر ان کو کسی صلح میں مدعو کیا جائے۔ تو وہ بھی صلح کریں گے اور اس میں شریک رہیں گے اور اگر وہ کسی ایسے ہی امر کے لیے بلائیں تو مومنین کا بھی فریضہ ہوگا کہ ان کے ساتھ ایسا ہی کریں، بجز اس کے کہ کوئی دینی جنگ ہو۔

۳۶۔ اور قبیلہ الاؤس کے یہودیوں کو، موالی ہوں کہ اصل، وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اس دستور والوں کو اور وہ بھی اس دستور والوں کے ساتھ خالص وفاشعاری کا برتاؤ کریں گے اور وفاشعاری ہوگی نہ کہ عہد شکنی۔ جو جیسا کرے گا ویسا خود ہی بھرے گا اور خدا اس کے ساتھ ہے جو اس دستور کی مندرجات کی زیادہ سے زیادہ صداقت اور زیادہ سے زیادہ وفاشعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

۳۷۔ اور یہ کہ یہ حکم نامہ کسی ظالم یا عہد شکن کے آڑے نہ آئے گا۔ اور جو جنگ کو نکلے تو بھی امن کا مستحق ہوگا۔ جو مدینے میں بیٹھ رہے تو وہ بھی امن کا مستحق ہوگا اور ظلم اور عہد شکنی نہیں ہوگی اور خدا اس کا نگہبان ہے جو وفاشعاری اور احتیاط (سے تعمیل عہد) کرے اور اللہ کے رسول محمد ﷺ بھی جن پر خدا کی توجہ اور سلامتی ہو۔

بقول محمد حسین ہیکل:

"یہ تحریری معاہدہ ہے جس کی رو سے حضرت محمد ﷺ نے آج سے تیرہ سو سال قبل ایک ایسا ضابطہ معاشرہ انسانی میں قائم کیا جس سے شرکائے معاہدہ میں سے ہر گروہ اور ہر فرد کو اپنے اپنے عقیدے کی آزادی کا حق حاصل ہوا۔ انسانی زندگی کی حرمت قائم ہوئی۔ اموال کے تحفظ کی ضمانت مل گئی۔ ارتکاب جرم پر گرفت اور مواخذہ نے دباؤ ڈالا اور معاہدین کی یہ بستی (شہر مدینہ) اس میں رہنے والوں کے لیے امن کا گہوارہ بن گئی۔ غور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

فرمائیے کہ سیاسی اور مذہبی زندگی کو ارتقاء کا کتنا بلند مرتبہ حاصل ہوا۔ جس سیاست اور مدنیت (دونوں) پر دست استبداد مسلط تھا اور دنیا فساد و ظلم کا معمل بنی ہوئی تھی۔"

اسلامی حکومت:

یہ معاہدہ اسلامی ریاست کی بنیاد تھا۔ یہاں سے آنحضور ﷺ کی زندگی نیا رخ اختیار کرتی ہے۔ اب تک آپ ﷺ کے تدبر و فراست کے تمام پہلو ایک ایسے مرکز کے قیام کے لیے تھے، جہاں سے دعوت اسلام موثر طریق پر دی جا سکے۔ آپ ﷺ کی سابقہ کوششیں ایک مدبر کی تھیں لیکن منتظم سلطنت کی نہ تھیں۔

اب آپ ﷺ منتظم ریاست کے طور پر سامنے آ رہے ہیں۔ لہٰذا آپ ﷺ کے تدبر کا مطالعہ اس ربط میں کرنا ہوگا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ذہن نشین رہنی چاہیے کہ آپ ﷺ کے پیش نظر ایک صالح معاشرے کا قیام تھا اور اس کے لیے حکومت کا ہونا ناگزیر تھا۔ یہاں سے اب درست اسلامی ریاست کے قیام کی حرکت تیز ہوگئی۔ آپ ﷺ کی حکومت دینی حکومت تھی اور اس کا مقصد دعوت دین، اصلاح اخلاق اور تزکیہ نفس تھا۔

قرآن پاک نے اسلامی ریاست کا مقصد متعین کر دیا ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ

ترجمہ: "یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخش دیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے اور سب کاموں کا اختیار خدا کے حکم میں ہے۔"

یہ آیت آپ ﷺ کی حکومت کے طریق کار کو متعین کرتی ہے۔ آپ ﷺ کی حکومت کا مقصود رضائے الٰہی کا حصول اور عوامی بہبود تھا۔ اس حکومت کی بنیاد خاندانی عصبیت اور نسلی شعور کی جگہ دینی وحدت پر قائم تھی۔ اس انوکھی اور اپنی نوعیت کی منفرد ریاست کے منتظم کا انداز بھی عام حکمران سے مختلف تھا۔ منتظم ریاست کی حیثیت سے آپ ﷺ کے تدبر کی بے شمار مثالیں آپ ﷺ کی حقیقی عظمت کا پتہ دیتی ہیں۔ مدبر کے طور پر آپ ﷺ کے کارناموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ امور داخلہ

۲۔ امور خارجہ

ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ایک زبردست مدبر اور منتظم کی حیثیت سے داخلہ اور خارجہ پالیسیوں کو مرتب کیا کہ ہمیشہ کامیابی نے آپ ﷺ کے قدم چومے۔

امور داخلہ:

امور داخلہ میں آپ ﷺ نے خصوصی توجہ استحکام امن اور اخلاقی تربیت کی طرف رکھی۔ آپ ﷺ نے جس سلیقے سے ان امور کو ملحوظ خاطر رکھا، ان سے آپ ﷺ کے تدبر اور فراست کا پتہ چلتا ہے۔ آنجناب ﷺ کے انتظام سلطنت میں جو امور بہت اہمیت کے حامل رہے ان میں سے چند ایک پیش خدمت ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اشاعت اسلام:

آپ ﷺ کی حکمت عملی میں سب سے زیادہ اہمیت اشاعت اسلام کو حاصل تھی۔ اس لیے آپ ﷺ ہر قسم کی جانی و مالی قربانی کے لیے تیار رہتے تھے۔ اسلامی ریاست کی حدود میں تعلیم و تبلیغ کا ایک مربوط اور مسلسل انتظام تھا۔ آپ ﷺ نے سعید بن العاص کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم پر مامور کیا تھا۔ صفہ ایک باقاعدہ درسگاہ تھی جہاں مقیم طلبا کے علاوہ عام شہری بھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ حضور ﷺ عام قبائل میں دینی تعلیم کے لیے لوگوں کو بھیجتے تھے۔ عہد نبوی کے اختتام پر اسلامی ریاست خاصی وسعت اختیار کر گئی تھی اور حضور اکرم ﷺ نے دینی تعلیم کی ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اچھا انتظام کر لیا تھا۔ بعض بڑے بڑے مقامات پر تربیت یافتہ معلم بھیجے جاتے تھے اور کچھ صوبہ دار اور گورنروں کے فرائض منصبی میں یہ امر صراحب کے ساتھ شامل کر دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے ماتحت علاقوں کی تعلیمی ضرورتوں کا مناسب انتظام کریں۔ یمن کے گورنر عمرو بن حزم کے نام جو طویل تقرر نامہ آپ ﷺ نے لکھا تھا، اس میں علوم دینیہ کی تعلیم کا ذکر موجود ہے۔ آپ ﷺ نے جن علاقوں کو فتح کیا، وہاں لوٹ مار اور قتل و غارت کرنے کی بجائے امن و آشتی کے اصولوں کو پیش نظر رکھا، تاکہ تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کے لیے بات بن سکے۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے جس صبر و تحمل سے کام لیا وہ اسی جذبے کا اثر تھا۔

طائف کے مقام پر جو مصیبت برداشت کی اور دعائے رحمت کی وہ اس مشن کی تکمیل تھی۔ آپ ﷺ نے اندرون مملکت تبلیغ و اشاعت کے لیے بھرپور کوششیں فرمائیں۔

استحکام:

شہری ریاست کو اندرونی خلفشار سے بچانے اور اسے استحکام بخشنے کے لیے آپ ﷺ نے مسلسل تدابیر کیں۔ مواخات اور میثاق مدینہ کے علاوہ قریبی قبائل سے معاہدے کیے۔ اس طرح مدینے کے گرد و نواح میں دوستی کا اضافہ ہوا اور مخالفتوں میں مسلسل کمی ہوتی چلی گئی۔ آپ ﷺ نے ایک تدبیر یہ اختیار فرمائی کہ عرب میں جو شخص، خاندان یا قبیلہ مسلمان ہو وہ ہجرت کر کے مدینہ یا مضافات میں آ بسے تاکہ آبادی بڑھنے سے فوجی و سیاسی پوزیشن مضبوط ہو۔ اس طرز عمل کا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمان فوج کے لیے محفوظ رضا کاروں میں روز افزوں اضافہ ہوا اور نومسلموں کے لیے تربیت و تعلیم کا انتظام ہوا۔

نومسلموں کا اعزاز اور ان سے انتظامی امور میں مدد لینا:

مسلم سوسائٹی کو مستحکم رکھنے کے لیے آپ ﷺ نے ایک اور اہم تدبیر اختیار فرمائی۔ صورت حال یہ تھی کہ بعض بڑی اہم شخصیتیں مسلم معاشرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ اب یہ ہوسکتا تھا کہ یا تو انہیں نظرانداز کر کے عام حالات پر چھوڑ دیا جاتا یا انہیں سوسائٹی میں ان کا مقام دیا جاتا۔ پہلی صورت میں وہ مسلم سوسائٹی کے استحکام کی راہ میں رکاوٹ بنتے کیونکہ ذہنی و معاشرتی لحاظ سے وہ اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر سکتے نیز معاشرے کے اندر طبقاتی خلیج وسیع ہوتی جاتی۔ دوسری صورت میں وہ اسلام کے دفاع میں اگلی صفوں کے اندر شامل ہو کر لڑتے اور عظمت اسلام کے لیے نمایاں ہو کر کام کرتے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ ان کی تربیت بھی ہوتی اور دور جاہلیت کے جو آثار باقی تھے مٹ جاتے۔

رسول اکرم ﷺ نے اپنی پیغمبرانہ بصیرت سے دوسری راہ کو اختیار کیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہیں فی الواقع تفوق مل گیا۔ بلکہ یہ ایک اعزاز تھا اور اسے اس سوسائٹی کا ہر فرد جانتا تھا۔ آپ ﷺ نے اعزاز بخشی کے اس اصول کو ان الفاظ میں بیان فرمایا:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اخیارھم فی الجاھلیة خیارھم فی الاسلام إذا فقھوا

ترجمہ: ''ان میں سے عہد جاہلیت کے معزز اسلام لانے پر بھی معزز رہیں گے۔ بشرطیکہ وہ اسلامی قوانین سے واقف ہو جائیں۔''

آپ ﷺ کے پیش نظر یہی حکمت عملی تھی کہ آپ ﷺ نے عمرو بن العاص کو اسلام لانے پر انہیں سابقین الاولین کا سردار بنا کر فوجی مہموں میں بھیجا۔ ابوسفیان نے اسلام قبول کیا تو نہ صرف انہیں انعام واکرام دیا گیا بلکہ ان کا گھر امن گاہ قرار دیا۔ انہیں لشکروں کی سرداری اور صوبوں کی گورنری بھی فوراً دی جانے لگی۔ خالد بن ولید کو (باوجود احد میں مسلمانوں کی شکست کا واحد سبب ہونے کے) اسلام لاتے ہی ''سیف اللہ'' کے قابل رشک خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

احترامِ آدمیت:

نبی اکرم ﷺ کی داخلی سیاست کا ایک اہم جز واحترام انسانیت تھا۔ گو آپ ﷺ کو انتظامی لحاظ سے معاشرے کے مختلف عناصر کو مربوط رکھنا تھا۔ نیز اسلامی ریاست کی حدود کو وسیع کرنا تھا۔ مگر آپ ﷺ نے کشت وخون سے گریز کی پالیسی پر عمل کیا۔ بیجا تشدد کا کوئی موقعہ نہیں آنے دیا۔ آپ ﷺ نے ملک کے دفاع اور اسلام کی عظمت کے لیے جنگیں بھی لڑیں۔ لیکن یہ جنگیں عام جنگوں سے مختلف نوعیت کی تھیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ کے بقول ''عہدِ نبوی میں دس سال میں دس لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح ہوا۔ جس میں یقیناً کئی ملین آبادی تھی۔ اسی طرح روزانہ تقریباً ۲۷۴ مربع میل کے اوسط سے دس سال سے فتوحات کا سلسلہ ہجرت سے وفات تک جاری رہا۔ ان فتوحات میں دشمن کا ماہانہ ایک آدمی قتل ہوا۔ اسلامی فوج کا نقصان اس سے بھی کم ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

أنا نبی الرحمة أنا نبی الملحمة.

ترجمہ: ''میں رحمت کا پیغمبر ہوں۔ میں جنگ کا پیغمبر ہوں۔''

اس کا اس سے بہتر کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ دشمن کے ۷۰ آدمیوں کا مارا جانا (جنگ بدر میں) سب سے بڑی تعداد ہے۔ یاد رہے کہ یہ عہد نبوی ﷺ کی سب سے بڑی جنگ ہے۔ نبی ﷺ کے سامنے اصولی لحاظ سے یہ بات محکم تھی کہ انسانی خون کا احترام کرنا ہے۔ مدینہ کے جن یہودیوں اور بعض مفسدین کے قتل کے جو احکام آپ ﷺ نے صادر فرمائے تھے وہ ناگزیر تھے۔ ان کے معاملے میں اس اقدام کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔

تطہیر:

آپ ﷺ کی داخلی سیاست کا ایک قابل ذکر پہلو معاشرتی تطہیر تھی۔ ابتدائی ایام میں آپ ﷺ نے یہودیوں کے وجود کو برداشت کیا لیکن وہ جلد ہی اپنی سازشوں کی وجہ سے بے نقاب ہو گئے۔ اسی طرح مشرکین ومنافقین بھی مسلم معاشرے کا حصہ تھے۔ آپ ﷺ نے بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ اسلامی معاشرے کو جب تک ان عناصر سے پاک نہیں کیا جاتا، اس وقت تک استحکام نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے پہلے مدینہ طیبہ کو یہودیوں سے پاک کیا۔

قران پاک نے آپ ﷺ کے عمل کو اپنے انداز میں پیش کیا ہے:

وَلَوْلَا أَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ.

ترجمہ: ''اور اگر اللہ ان کی قسمت میں جلاوطنی نہ لکھ چکتا تو ان کو دنیا ہی میں سزا دیتا اور ان کے لیے آخرت میں دوزخ کا عذاب تیار ہے۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اس کے بعد آپ ﷺ نے پورے جزیرے کے لیے اہم اعلان فرمایا۔ مقصود صرف یہ تھا کہ پورے جزیرے کو مسلمانوں کے لیے خالص کر دیا جائے۔ قرآن پاک نے مشرکین کے بارے میں اپنی پالیسی کو ان الفاظ میں بیان فرمایا:

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

ترجمہ: ''مشرک (بوجہ عقائد خبیثہ) نرے ناپاک ہیں۔ سو یہ لوگ اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ آنے پائیں اور اگر تم کو مفلسی کا اندیشہ ہو تو خدا تمہیں اپنے فضل سے اگر چاہے تو (ان کا) محتاج نہ رکھے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔''

انتظامی تدابیر:

آنحضور ﷺ نے اسلامی ریاست کو مستحکم رکھنے کے لیے کچھ انتظامی اقدامات بھی فرمائے۔ آپ ﷺ کے نظام حکومت کے سلسلے میں ان کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ آپ ﷺ نے مختلف امور کی انجام دہی کے لیے چند شعبے قائم کیے تھے، جو دور حاضر کی طرح منظم محکمے تو نہیں کہے جا سکتے۔ لیکن ان کا کام نہایت منظم تھا۔ آپ ﷺ کے انتظام کی ایک ہلکی سی جھلک ملاحظہ فرمائیں:

وزارت نبوی ﷺ:

آنحضور ﷺ کی شخصیت میں عام تقسیم کے مطابق دینی و دنیاوی دونوں رخ موجود تھے۔ آپ ﷺ کی حکومت اولین طور پر دینی تھی۔ اس لیے آپ ﷺ کی سیاست بھی دینی سیاست تھی۔ انتظام سلطنت کے بعض امور وہ تھے جن کا تعلق وحی والہام سے ہوتا۔ اس میں کسی مشورے کی ضرورت نہ تھی۔ تاہم آپ ﷺ کا معمول تھا کہ مختلف معاملات میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ قرآن پاک آپ ﷺ کی الہامی حیثیت کو اس طرح بیان کرتا ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ

ترجمہ: ''ہم نے آپ ﷺ پر برحق کتاب اتاری تا کہ آپ ﷺ لوگوں کے درمیان حکومت اللہ کے احکام کے مطابق انجام دیں۔''

اگر چہ عہد نبوی ﷺ میں عرب ''وزارت'' کے لفظ سے نا آشنا تھے مگر بعد میں رومیوں اور ایرانیوں سے تعلق کی بنا پر اس سے باخبر ہو گئے۔ الفخری نے لکھا ہے کہ وزیر کا لفظ ''وزر'' سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ثقل کے ہیں۔ وزیر کے شانوں پر نظم و نسق کا بار ہوتا ہے۔ اس لیے اسے وزیر کہتے ہیں۔ ابن خلدون نے آپ ﷺ کے نظم حکومت کے متعلق لکھا ہے: ''انتظام حکومت کی ذمہ داریوں میں تنہا سلطان اپنی انفرادی زندگی کے معمولات میں جب دوسروں کا دست نگر ہوتا ہے تو نوع انسانی پر حکومت اور رعایا کے نظم و نسق میں کتنا حاجت مند ہوگا۔۔۔۔ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیا کرتے تھے اور عام و خاص مہمات ان کے سپرد کرتے تھے۔ خاص طور پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو دوسروں کی نسبت اہمیت دیتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ عرب جو قیصر و کسریٰ اور نجاشی کی سلطنتوں اور ان کے حالات سے واقف تھے وہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کا وزیر کہا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی شخصیت کے اس پہلو کو جس کا تعلق عام معاملات سے ہے قرآن پاک نے مشورے کے اصول سے واضح کیا۔ قرآن کا حکم ہے کہ آپ ﷺ مشورہ کریں:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ

ترجمہ: ''ان سے معاملات میں مشورہ کریں اور پھر جب آپ عزم کریں تو اللہ پر بھروسہ کریں۔''

مختلف معاملات میں آپ ﷺ کے مشیر یہ حضرات ہوتے: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عمار رضی اللہ عنہ، حضرت خذیفہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ، حضرت مقداد رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ۔ یہ لوگ آپ ﷺ کو مشورہ دیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کا نظم مملکت شورائی تھا۔ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ شوریٰ کے بارے میں آپ ﷺ عمومی انداز یہی اختیار فرماتے۔ اور خاص و عام مرد و عورت سب آنحضور ﷺ کو مشورہ دیتے۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب مسلمان دل شکستہ تھے اور غم کی وجہ سے آنحضور ﷺ کے اس حکم کو سن نہ سکے کہ سر منڈوا دیا جائے اور قربانی کی جائے۔ تو آپ ﷺ اپنی زوجہ محترمہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے جنہوں نے مشورہ دیا: یا رسول اللہ ﷺ مسلمان اس وقت بہت بڑی آزمائش سے دوچار ہیں۔ آپ ﷺ نے انہیں صلح کی ایسی شرائط قبول کرنے پر مجبور کیا ہے، جو انہیں دل سے ناپسند ہیں اور وہ حج کیے بغیر جا رہے ہیں۔ وہ لوگ اس لیے خدانخواستہ آپ ﷺ کی نافرمانی پر آمادہ نہیں۔ لیکن اس غیر متوقع صورت حال کا ان کے دل و دماغ پر اثر ہے۔ اس لیے جب آپ ﷺ نے انہیں قربانی کرنے اور سر منڈوانے کا حکم دیا، تو شدت رنج و الم کے باعث ان کے کانوں تک آپ ﷺ کی آواز پہنچی ہی نہیں۔ آپ ﷺ باہر جا کر خود قربانی کریں اور سر منڈوائیں تو آپ ﷺ کو دیکھ کر باقی لوگ بھی ایسا کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے مشورے پر عمل کیا جس کے نتیجے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی سر منڈوا دیئے اور قربانی کے جانور بھی ذبح کر دیئے۔

ملکی تقسیم (Provincial Administration):

آپ ﷺ کے حسن انتظام کا ایک پہلو وہ ملکی تقسیم ہے جس سے سلطنت داخلی طور پر مستحکم ہوئی۔ آپ ﷺ کے عہد میں بعض علاقے بذریعہ فتح اسلام کے زیر نگیں آئے۔ اور بعض معاہدات کے تحت قبضے میں آئے۔ جو علاقے فتح کے ذریعے قبضے میں آئے وہاں حضور ﷺ نے گورنر مقرر کیے۔ مثلاً حجاز اور نجد کے صوبہ کا گورنر عتاب ابن سید کو بنایا جس کا صدر مقام مکہ تھا اور جو علاقے صلح نامے کے ذریعہ اسلامی سلطنت میں شامل ہوئے ان کے حکمران وہیں کے امراء رہے۔ خواہ وہ مسلمان ہوں یا جزیہ دینے پر رضامند ہو گئے ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے اسلامی حکومت کے انتظام کو چلانے کے لیے مختلف اوقات میں مندرجہ ذیل عامل (گورنر) مقرر کیے:

۱۔ مملکت بحرین کا رئیس مسلمان ہو گیا تھا۔ جس کا نام منذر بن ساوی تھا۔ اس کے علاوہ علاء بن الحضرمی بھی اس کے گورنر رہے۔

۲۔ مملکت عمان: عمرو بن العاص کو گورنر مقرر کیا گیا۔

۳۔ امارت تیماء: یہودی حاکم تھا بعد میں یزید بن ابی سفیان کو مقرر کیا گیا۔

۴۔ مکہ: عتاب بن اسید کو گورنر مقرر کیا گیا۔

۵۔ امارت ایلہ: عیسائی حاکم تھا۔

۶۔ حضر موت: زیادہ بن لبید گورنر تھے۔

۷۔ امارت دومۃ الجندل: عیسائی حاکم تھا۔

۸۔ کندہ: خالد بن سعید گورنر بنے۔

۹۔ امارت نجران: عیسائی حکمران تھا، بعد میں عمرو بن حزم گورنر بنے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

یمن کا صوبہ: یہ صوبہ مختلف حصوں میں تقسیم تھا۔ اس میں صنعا کا حکمران مسلمان تھا۔ یہ خیال رہے کہ اس مملکت میں اگرچہ مسلمان، یہودی، عیسائی اور مجوسی آباد تھے لیکن اس کا سرکاری مذہب اسلام تھا۔

افسروں کا انتخاب:

آنحضورﷺ کے عہد میں چونکہ یمن و حجاز اسلامی حکومت میں شامل ہو چکے تھے اس لیے آپﷺ ان علاقوں میں والی مقرر کرتے ہوئے ان کے تقویٰ، علم و دانش اور عقل و عمل کا خالص طور پر خیال رکھتے تھے۔ آپﷺ افسروں کا امتحان بھی لیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب آپﷺ نے یمن کا عامل مقرر فرمایا تو آپﷺ نے دریافت کیا، وہاں تمہارا طرزِ عمل کیا ہوگا؟ انہوں نے کہا کہ میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کروں گا۔ آپﷺ نے فرمایا اگر تم اسے اللہ کی کتاب میں نہ پاؤ؟ معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا تو میں سنت رسول اللہﷺ کے مطابق فیصلے کروں گا۔ آپﷺ نے فرمایا اگر تم سنت رسولﷺ میں نہ پا سکو۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے جواب دیا تو میں اجتہاد کروں گا اور کوشش میں کمی نہ کروں گا۔ اس پر رسول اللہﷺ نے خدا کا شکر ادا کیا۔

یہ لوگ حاکم ملک اور والی صوبہ ہونے کے ساتھ ساتھ مبلغ اسلام اور معلم اخلاق کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ اس لیے آپﷺ ان کی صلاحیتوں کا جائزہ لے کر مقرر فرماتے۔ امراء کے انتخاب میں آنحضورﷺ کی پالیسی کا ایک اہم جز یہ تھا کہ جو لوگ درخواست کرتے ان کی درخواست رد کر دیتے۔ افسروں کے انتخاب کے سلسلے میں آپﷺ کی پالیسی قرآن پاک کی اس آیت کی تعبیر تھی:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰىٓ أَهْلِهَا

ترجمہ: ''بلاشبہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ عہدے ان کے اہل لوگوں کو دیے جائیں۔''

حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں: ''علماء نے فرمایا کہ یہ آیت والیانِ حکومت کے بارے میں نازل ہوئی یعنی ان پر لازم ہے کہ عہدے ان کے اہل لوگوں کے سپرد کر دیں۔ نبی اکرمﷺ کی اس بارے میں ایک حدیث بھی ہے کہ:

انا لا نولی امرنا هذا من طلبه

ترجمہ: ''ہم اپنے اس معاملے کو اس کے سپرد نہیں کرتے جو خود اس کا طالب ہو۔''

اسی طرح حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ مندرجہ ذیل آیت کو بھی عہدوں کے سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر کا ترجمان سمجھتے ہیں:

يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَخُونُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوٓا أَمٰنٰتِكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے خیانت نہ کرو۔ کیا تم ان امانتوں میں خیانت کرتے ہو اور تم اس کو جانتے بھی ہو۔''

فرماتے ہیں اگر زیادہ حقدار اور بہتر اہلیت رکھنے والے کو فراموش کر کے کسی دوسرے کا رشتہ دار ہونے، یا ہم مذہب ہونے یا ہم وطن اور ہم مشرب ہونے یا ہم جنس (ملکی) عربی، فارسی، ترکی، رومی وغیرہ ہونے یا کچھ رشوت کا مال لینے یا کسی بھی نفع وغیرہ حاصل کرنے یا اہل اور حق دار سے کینہ رکھنے یا کھلی دشمنی کی وجہ سے تقرر کر لیا جائے، تو اس نے اللہ سے، اس کے رسولوں سے اور مومنوں سے خیانت کی اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے تحت آ گیا جس کا اس آیت میں ذکر ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تنخواہیں:

عمال کو صرف اتنا معاوضہ ملتا جو ان کی ضرورت کو پورا کرتا چنانچہ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

من کان لنا عاملا فلیکتسب زوجة فان لم یکن له خادم فلیکتسب خادما فان لم یکن له مسکن فلیکتسب مسکنا من اتخذ غیر زلک فهو غال او سارق

ترجمہ: ''جو شخص عامل ہو اس کو ایک زوجہ کا خرچ لینا چاہیے۔ اگر اس کے پاس نوکر نہ ہو تو وہ نوکر رکھ سکتا ہے۔ اگر مکان نہ ہو تو ایک گھر بنا سکتا ہے لیکن اگر کوئی اس سے زیادہ لے گا تو وہ خائن ہوگا یا چور۔''

آنحضرت ﷺ نے سب سے پہلے عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کی تنخواہ جو کہ والی مکہ تھے، ایک درہم یومیہ مقرر کی تھی۔ اس سے قبل ان حاکموں کی باقاعدہ تنخواہ کا معمول نہ تھا۔ فتوحات اور مال غنیمت سے انہیں حصہ مل جاتا۔ یہی ان کی تنخواہ خیال کی جاتی تھی۔ عمال رشوتیں یا کسی قسم کے تحفے قبول نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی دوران ملازمت وہ کسی قسم کی تجارت کر سکتے تھے۔

احتساب:

اگرچہ نبی ﷺ کے عہد میں احتساب کا کوئی مستقل محکمہ قائم نہ تھا، مگر آنحضور ﷺ یہ فرض ملی انجام دیا کرتے تھے۔ تجارتی معاملات کی بھی نگرانی فرماتے۔ عرب میں تجارتی معاملات کی حالت نہایت قابل اصلاح تھی۔ مدینہ میں آنے کے بعد ہی آپ ﷺ نے ان اصلاحات کو جاری کر دیا۔ آپ ﷺ تمام لوگوں سے ان اصلاحات پر عمل کراتے۔ جو باز نہیں آتے تھے ان کو سزائیں دیتے تھے۔ آپ ﷺ کے عہد میں کوئی باقاعدہ جیل خانہ نہ تھا۔ اس لیے صرف اتنا خیال کیا جاتا تھا کہ مجرم کو کچھ مدت کے لیے لوگوں سے ملنے جلنے اور معاشرتی تعلقات قائم نہ رکھنے دیا جائے۔ اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ مجرم کو ایک گھر یا مسجد میں بند کر دیا جاتا تھا اور اس کے مخالف کو اس پر متعین کر دیا جاتا تھا تاکہ وہ مجرم کو لوگوں سے ملنے نہ دے۔ صحیح بخاری میں ہے:

عن ابن عمر رضی الله عنه قال: لقد رأیت النَّاسَ فِی عَهْدِ رسول الله ﷺ یبتاعون جزافا یعنی الطعام یضربون ان یبیعوہ فی مکانهم هتی یؤدده الی رحالهم.

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے عہد میں دیکھا کہ لوگ تخمیناً غلہ خریدتے تھے، ان کو اس بات پر سزا دی جاتی تھی کہ اپنے گھروں میں منتقل کرنے سے پہلے اس کو خود اسی جگہ بیچ ڈالیں جہاں اس کو خریدا تھا۔''

عمال اور افسروں پر کڑی نگاہ رکھتے۔ کسی عامل کی شکایت پہنچتی تو فوراً تحقیقات کراتے کیونکہ حکمران کی حیثیت ایک راعی کی ہے۔ اگر سلطنت عدل کی جگہ ظلم و تشدد قبول کر لے تو سلطنت کا نظام درہم برہم ہو جائے۔

پولیس:

آنحضرت ﷺ کے عہد میں اس کا ابتدائی نمونہ قائم ہو چکا تھا۔ آپ ﷺ کے عہد میں قیس بن سعد رضی اللہ عنہ اس خدمت کو انجام دیتے تھے اور اس غرض سے ہمیشہ آپ ﷺ کے ساتھ رہتے تھے۔ مجرموں کی گردن مارنے کی خدمت حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ، محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ، عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ، ضحاک بن سفیان کلابی رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوئی۔ خلفائے راشدین کے عہد میں اس کو خوب ترقی ہوئی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سیکریٹریٹ:

آنحضورﷺ کا سیکریٹریٹ یا مرکز حکومت مسجد نبویﷺ تھا۔ آپﷺ تمام وفود اور سفراء سے یہیں ملاقات کرتے تھے۔ گورنروں اور عائدین حکومت کو ہدایات مسجد نبوی سے روانہ کی جاتیں۔ سیاسی اور دینوی معاملات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہیں مشورہ کرتے۔ ہر قسم کی سیاسی اور مذہبی تقاریر کا انعقاد مسجد نبوی میں ہوتا۔ پروفیسر حتیٰ لکھتا ہے: ''مسجد مسلمانوں کی مشترکہ عبادت، فوج اور سیاسی اجتماع کی جگہ تھی۔ نماز پڑھانے والا امام ہی اہل ایمان کی فوج کا سپہ سالار ہوتا تھا اور جملہ مسلمانوں کو حکم تھا کہ ساری دنیا کے مقابلے میں ایک دوسرے کے محافظ و معاون رہیں۔ غنیمت وغیرہ کا مال مسجد نبوی میں آتا تھا اور یہاں پر ہی نبیﷺ اسے مستحقین میں تقسیم کیا کرتے تھے۔

امور خارجہ:

امور داخلہ میں سرفہرست استحکام ملت تھا اور آپﷺ نے وہ تمام طریقے اختیار فرمائے جن سے استحکام ملت ممکن تھا۔ اندرونی اطمینان و سکون کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ ریاست کے خارجی معاملات درست ہوں۔ آپﷺ کے تدبر و تنظیم نے خارجہ امور میں اسلامی ریاست کو عزت و وقار سے ہمکنار کیا۔ آپﷺ کی خارجہ پالیسی کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل امور کا سمجھنا ضروری ہے۔

۱۔ دشمن سے باخبر رہنا۔ اس کی تدبیروں کا توڑ کرنا اور اسے مصالحت پر مجبور کرنا۔

۲۔ غیر متعلق لوگوں تک دعوت پہنچانا اور ممکن حد تک تبلیغ اسلام اور توسیع دین کی کوشش کرنا۔

آپﷺ کی خارجہ سیاست کی تمام تدابیر انہی نکات کے گرد گھومتی ہیں۔ ہم اختصار کے ساتھ چند باتیں ذکر کیے دیتے ہیں:

1- دشمن کی قوت کو توڑنا:

ہجرت کے بعد مدینہ کی اس شہری ریاست کے چاروں طرف ایسے لوگ تھے جو اس ریاست سے کھلی دشمنی رکھتے تھے یا ناپسندیدگی کے جذبات۔ آپﷺ نے حسن تدبیر سے ریاست کے بقاء کے لیے کام شروع کیا۔ سب سے پہلے تو آپﷺ نے سراغرسانی کا ایک نظام مرتب کیا جس سے آپﷺ کو قریش مکہ اور دیگر قبائل کے احوال، ارادے اور منصوبے معلوم ہوتے رہتے اور اس کے مطابق تیاری کرتے تھے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ مکہ میں آپﷺ کے نامہ نگار موجود تھے۔ غزوہ خندق کے موقع پر آپﷺ کو حملے کی خبر مل گئی تھی۔ دشمن کے رویے کے متعلق دوسری اہم بات یہ تھی کہ اس کی قوت کو توڑا جائے۔ اس کے لیے آپﷺ نے مختلف تدابیر اختیار فرمائیں۔ ان میں سے چند ایک کو یہاں بیان کیا جا سکتا ہے۔

پہلی تدبیر آپﷺ نے یہ کی کہ مشرکین مکہ پر آپﷺ نے معاشی دباؤ ڈالا۔ یہ عام بات ہے کہ عرب تاجر تھے۔ گرمیوں میں شمال یعنی شام، فلسطین، مصر اور عراق وغیرہ جایا کرتے تھے اور سردیوں میں جنوب یعنی یمن وغیرہ میں کارواں لے جایا کرتے تھے۔ شمالی راستہ اس علاقے سے گزرتا تھا جو مدینہ اور ینبوع کے درمیان ہے۔ نبی اکرمﷺ نے ہجرت کے چند مہینے بعد اس علاقے کے باشندوں سے معاہدے کیے۔ ان معاہدوں کی تکمیل کے بعد قریشی کاروانوں کا راستہ بند کر دیا گیا اور جب وہ زوردکھا کر گزرنے لگے تو ان کے کاروانوں کو حق غنیم کے تحت لوٹ لیا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے ساحلی راستہ مجبوراً ترک کر دیا اور صحراء سے ہو کر عراق جانے لگے۔ لیکن جلد ہی آنحضرتﷺ کا اثر نجد تک پھیل گیا تو وہ راستہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ قریش کو بحرین سے غلہ ملتا تھا ان علاقوں پر اسلامی اثر کے پھیلنے، خاص کر ثمامہ بن اثال کے مسلمان ہونے پر غلے کی برآمد روک دی گئی۔ آپﷺ نے تدبر خاص سے قریش کے لیے معاشی سلسلے میں ایسی رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں کہ وہ مصالحت کے لیے آمادہ یا شکست کے لیے مجبور ہو گئے تھے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دوسری اہم تدبیر یہ اختیار کی کہ قریش کے دوستوں سے تعلقات استوار کیے جائیں تا کہ مسلمانوں کے دوست زیادہ ہوں اور ان کی پوزیشن مستحکم ہو۔ آپ ﷺ نے ابتداء ہی سے اس اصول کو پیش نظر رکھا تھا اور یہ اصول بڑا کامیاب ثابت ہوا۔ آپ ﷺ کے مختلف معاہدوں پر نظر ڈالی جائے تو آپ ﷺ کی سیاست کا یہ اصول بڑا موثر معلوم ہوتا ہے۔ بیعت عقبہ میں مدینے کے جو لوگ مسلمان ہوئے وہ اصل میں قریش سے معاہدہ کرنے آئے تھے۔ میثاق مدینہ میں یہی جذبہ کارفرما تھا۔ قریشی کاروانوں کے رک جانے سے متعدد قبائل نے روزگار کے لئے آنحضرت ﷺ سے مدد طلب کی تھی اور اشجع وغیرہ اسی طرح حلیف بنے تھے۔ اصل میں یہ لوگ کاروانوں کے آنے جانے سے ضروریات زندگی بیچتے تھے اور ان کو روزگار ملتا تھا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی صلح حدیبیہ ہے، جو بقول ڈاکٹر حمید اللہ عہد نبوی ﷺ کی سیاست خارجہ کا شاہکار ہے۔ مسلمانوں کو دو خطرے تھے۔ شمال میں خیبر اور جنوب میں مکہ۔ دونوں سے ایک ہی وقت میں مقابلہ ممکن نہ تھا۔ دونوں کی بڑھتی ہوئی دوستی کو روکنا ضروری تھا۔ آپ ﷺ کو اس بات کا احساس تھا کہ ان دونوں میں کسی ایک پر حملے کی صورت میں اس امر کا قوی اندیشہ تھا کہ دوسرا مدینے پر چڑھائی کر دے گا۔ صلح حدیبیہ میں قریش کو اس بات پر آمادہ کر دینا کہ وہ مسلمانوں کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں گے (اور اس کے معاوضے میں مسلمان قریش کا تجارتی راستہ کھول دیں گے اور دس سال تک باہم صلح رہے گی) ایک زبردست سیاسی فتح تھی جو مسلمانوں نے حاصل کی۔ کیونکہ قریش کو اس وقت موثر مدد دینے والے صرف اہل خیبر ہی رہ گئے تھے۔ ان کو بچھاڑ دینے اور پھر تباہ کر دینے سے قریش کا آئندہ کوئی مددگار نہ رہا۔ اس اصول کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ قریش کے چاروں طرف مسلمان یا مسلمانوں کے حلیف قبائل جمع ہو گئے۔ قبائل اسلم وخزاعہ کی مثال بہت نمایاں ہے جو مکے کے اطراف میں رہتے تھے۔

ایک اور تدبیر جو آپ ﷺ نے اختیار فرمائی، وہ دشمن کی تالیف قلبی تھی۔ قرآن پاک نے زکوٰۃ خرچ کرنے کی جو مدات مقرر کی ہیں، ان میں ایک مولفۃ القلوب بھی ہے۔ تا کہ دشمن کے ایک طبقے کا دل موہ لینے کے لیے دولت خرچ کی جائے۔ ڈاکٹر حمید اللہ اس اصول کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ہر زمانے میں اور ہر ملک میں متمدن سلطنتوں کو اس بات کی ضرورت رہتی ہے کہ

۱۔ دشمن کو دوست اور مددگار بنانے کے لئے۔

۲۔ یا کم از کم غیر جانبدار ہو جانے کے لئے۔

۳۔ اور دوستوں کو انعام دے کر مزید اور عظیم کارگزاریوں پر آمادہ کرنے کے لئے۔

۴۔ نیز دیگر دوستوں کو ترغیب و تشویق دلانے کے لئے۔

۵۔ یا ڈھلمل لوگوں کو تائید میں مستحکم کرنے کے لئے۔

۶۔ یا مماثل مصالح کے لیے اس کی ضرورت رہتی آتی ہے کہ سیکرٹ سروس سے کام لیں۔ نبی ﷺ کی بصیرت نے اس اصول سے کام لیا۔ سیرت النبی ﷺ کے مطالعے سے اس کی کئی نظیریں مل جاتی ہیں۔ دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کو بعض مراعات دینے سے اعداء کی قوت غالبہ میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔

اس سلسلے میں چند ایک مثالیں پیش خدمت ہیں۔

۱۔ فتح مکہ سے پہلے وہاں ایک مرتبہ سخت قحط پڑا۔ آنحضرت ﷺ نے ابوسفیان کے پاس پانچ سو اشرفیوں کی خطیر رقم بھیجی کہ مکہ کے محتاجوں اور غریبوں میں تقسیم کر دے۔ ابوسفیان نے بے بسی کے عالم میں جھنجھلا کر کہا کہ محمد ﷺ چاہتا ہے کہ اب مکے کے غرباء اور جوانوں کو ورغلا کر ہمارے خلاف کھڑا کر دے۔

۲۔ ابھی صلح حدیبیہ نہیں ہوئی تھی اور مسلمانوں کے معاشی دباؤ کے باعث قریش کی تجارت بند ہو کر روزگار ختم ہو چکا تھا۔ ابوسفیان کا روزگار بھی تجارت سے تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اسے مدینے کی اچھی کھجوروں کی ایک بڑی مقدار بھیجی اور معاوضے میں طائف کا چمڑا طلب کیا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کے میں قحط کا زمانہ ہے اور وہاں غلے کی درآمد مشرقی عرب خاص کر یمامہ سے ہوا کرتی تھی۔ یمامہ کے ایک سردار ثمامہ بن اثال نے اسلام قبول کرلیا اور آنحضرت ﷺ کی اجازت سے یہ حکم دیا کہ اس علاقے سے اب غلہ مکے کو برآمد نہ کیا جائے۔ مکے والے قحط سے تنگ آ گئے اور جناب رسالت مآب کو اپنی رشتہ داری اور صلہ رحمی کا واسطہ دے کر خط لکھا کہ یمامہ سے غلے کی مکے کو برآمد کی ممانعت منسوخ کردی جائے۔ آنحضور ﷺ نے اس ممانعت کو منسوخ کردیا۔

ان تمام اقدامات سے مقصد یہ تھا کہ دشمن یہ محسوس کرے کہ انسانی سطح پر ان سے ہمدردی کی جارہی ہے لہٰذا وہ بھی اپنی دشمنی کو شدت کی حد تک نہ پہنچائیں۔ آپ ﷺ کے حسن تدبر کا نتیجہ تھا کہ آپ ﷺ کو مکہ فتح کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی تھی اور اس سے بھی زیادہ یہ بات کہ فتح مکہ کے بعد قریشیوں میں اسلام جذب کرنے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

بیرون ملک اشاعت اسلام:

حضور ﷺ کی سیاست خارجہ کا بہت بڑا اصول اپنی دعوت کو وسیع کرنا تھا۔ چنانچہ اس کے لیے آپ ﷺ نے دو طریقے اختیار فرمائے۔

۱۔ دعوتی خطوط۔

۲۔ تبلیغ کی راہ میں حائل ہونے والوں کا انتظام۔

دعوتی خطوط:

جس وقت آپ ﷺ نے اعلانِ نبوت فرمایا اس وقت حجاز قبائلی نظام کے تحت تھا۔ اس وقت میں کسی مرکزیت کا تصور ممکن نہیں۔ ہر قبیلہ یا چند قبیلے اپنا مستقل نظام رکھتے اور اسی کے مطابق زندگی بسر کرتے۔ حجاز کے پڑوس میں دو عظیم سلطنتیں تھیں۔ ایک ایرانی سلطنت اور دوسری رومانی۔ ان دو عظیم سلطنتوں کے تحت کچھ امارتیں تھیں جو یا تو ان کے ماتحت تھیں یا ان کی حلیف۔ رسول اکرم ﷺ نے اندرون ملک استحکام حاصل کرنے کے بعد بیرون ملک دعوتی خطوط لکھنے شروع کیے۔ آنجناب کے وہ تمام خطوط ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی کتاب الوثائق السیاسیہ میں جمع کردیے ہیں۔ آپ ﷺ کا طریق کار یہ تھا کہ اپنا خط ایک سفیر کو دے کر روانہ کرتے اور مکتوب الیہ کا ردعمل معلوم کرتے۔ چند اہم سفراء کے نام یہ ہیں:

۱۔ دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ۔ ہرقل کے پاس بھیجا۔

۲۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ بن حذافہ السہمی۔ کسریٰ کی طرف۔

۳۔ عمرو رضی اللہ عنہ بن امیہ۔ نجاشی کے دربار میں۔

۴۔ حاطب رضی اللہ عنہ بن ابی بلتعہ۔ مقوقس والی مصر۔

۵۔ علاء رضی اللہ عنہ بن حضرمی۔ منذر بن ساوی والی بحرین۔

۶۔ مہاجر رضی اللہ عنہ بن امیہ، حارث بن عبد الحمدی والی یمن۔

۷۔ مہاجر رضی اللہ عنہ بن عاص السہمی۔ فرمانروائے عمان۔

۸۔ سلیط بن عمر عامری۔ فرمانروائے یمامہ۔

۹۔ شجاع بن وہب السہمی۔ والی غسان۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ان سفراء کے انتخاب میں اہلیت و شخصیت کے ساتھ زبان دانی اور زبان آوری کا لحاظ بھی رکھا جاتا تھا۔ آپ ﷺ نے خطوط کے لیے چاندی کی ایک مہر بنوائی جو ہر خط پر ثبت کی جاتی تھی۔ اس پر یہ الفاظ کندہ تھے۔

اللہ
رسول
محمد

شریعت کے ماخذ (Sources of Islamic Law)

ماخذ کا مطلب: لغوی اعتبار سے ماخذ کا مطلب ہے جہاں سے کوئی چیز اخذ کی جائے۔ لیکن شرعی اصطلاح میں اس سے مراد وہ مقام جہاں سے شرعی احکام حاصل کیے جائیں۔

اسلامی قوانین چونکہ باری تعالیٰ کے احکامات کے مظہر ہیں، اس لیے وہ کسی طبقاتی کشمکش کے آئینہ دار نہیں۔ اس بات کے باوجود کہ شرعی قوانین کے بنانے میں کسی نام نہاد سیاسی مقتدر اعلیٰ (عوامی منشا) کو دخل حاصل نہیں، ان ضابطوں کا وجود ہی شخصی آزادیوں کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ جمہوریت میں قوانین ایک مخصوص طبقہ کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ حالانکہ ظاہری طور پر قانون سازی کا اختیار عوامی نمائندگان کو حاصل ہوتا ہے۔

اسلام انسان پر انسان کی حاکمیت کے اصول کا مخالف ہے۔ قطع نظر اس کے یہ حاکمیت کسی فرد کو حاصل ہو یا اس کا حامل پورا معاشرہ ہو۔ قرآنی تعلیمات کے مطابق حاکمیت کا مکمل اختیار اللہ تعالیٰ کا حاصل ہے اور اسی کے احکامات قانون کا درجہ رکھتے ہیں۔ انسانی مفادات سے بالا اور تمام انسانی کمزوریوں سے مبرا ہستی کے بنائے ہوئے قوانین ہی انسان کو حقیقی آزادیوں اور صحیح مساوات سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔

اگرچہ اسلامی قوانین مقتدر اعلیٰ کی منشا کے مظہر ہیں، لیکن نوعیت کے اعتبار سے وہ جمہوری تصورات کے قریب تر ہیں۔ اس ضمن میں اجتہاد کے اصول کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ شریعت نے بنیادی قوانین فراہم کر دیے ہیں جبکہ فروعات میں جانے سے پرہیز کیا گیا ہے۔ اس طرح بدلتے ہوئے انسانی حالات اور وقت کے تقاضوں سے قوانین کو ہم آہنگ رکھنے کے لیے خدا تعالیٰ نے بے شمار انسانی معاملات اجتماعی قانون سازی کے لیے چھوڑ دیے ہیں تا کہ لوگ اپنے مخصوص حالات کے مطابق بنیادی شرعی قوانین کی روشنی میں خدا کی ودیعت کی ہوئی عقل و دانش کے مطابق قواعد و ضوابط بنالیا کریں۔ اسلامی شریعت کا انسانی معاملات سے متعلق فروعات سے پرہیز کرنا ہی اس کی جمہوری روح کی غمازی کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

> "اے ایمان والو! ایسی فضول باتیں مت پوچھو کہ اگر تم سے ظاہر کر دی جائیں تو تمہاری ناگواری کا سبب ہو اور اگر تم زمانہ نزول قرآن میں ان باتوں کو پوچھو تو تم سے ظاہر کر دی جائیں۔ سوالات گزشتہ اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیے۔۔۔۔۔۔ ایسی باتیں تم سے پہلے اور لوگوں نے بھی پوچھی تھیں پھر وہ لوگ انہی باتوں کی وجہ سے کفر میں مبتلا ہو گئے۔" (المائدہ 101، 102)

اسلامی قوانین اس اعتبار سے بھی اعلیٰ و ارفع ہیں کہ وہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ شرعی قوانین انسان کے اندر اچھائی کے محرکات کو ابھارتے ہیں تا کہ قانونی ضابطوں پر عمل پیرا ہونے کے لیے خود انسان کے اندر سے جذبہ بیدار ہو سکے۔ اس طرح قانون کے نفاذ میں جبری پہلو پس منظر میں چلا جاتا ہے اور لوگوں میں قانون کی رضا کارانہ اطاعت کا جذبہ اجاگر ہوتا ہے۔ دراصل اسلامی قانون کے نفاذ کے لیے قوت کے طریق کار

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پر عمل پیرا ہونے کی اتنی ضرورت نہیں رہتی، جیسا کہ لادین قوانین کے نفاذ کے لیے ریاست کو قوت استعمال کرنا پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں شراب کی ممانعت سے متعلق حکم الٰہی کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ جب شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا تو لوگوں نے اسی وقت بغیر چون و چرا مدینے کی گلیوں میں شراب بہا دی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ سیکولر قانون کے برعکس اسلامی قوانین انسان کے ظاہری افعال اور باطنی کیفیات دونوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ قوانین اس ہستی کے احکامات پر مبنی ہیں جو انسان کی خالق ہے اور جسے انسانی تمدن کے ماضی، حال اور مستقبل کا پورا علم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی قوانین پوری نسل انسانی کے لیے ہر دور میں راہنمائی فراہم کرتے ہیں۔

اقسام ماخذ:

اقسام ماخذ دو طرح کے ہیں یعنی

1- نقلی ماخذ　　　2- عقلی ماخذ

1- نقلی ماخذ:

قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ نقلی ماخذ ہیں۔ یہی ماخذ شریعت محمدیہ کی اساس ہیں اور ان ماخذ پر جملہ آئمہ و مجتہدین باہم متفق ہیں۔ بعض شرائط کے ساتھ اجماع اور مذہب صحابی کو بھی نقلی ماخذ کہا جاتا ہے۔

عقلی ماخذ:

آئمہ دین کے غور و فکر و تدبر سے حاصل ہونے والے احکامات کی بنیاد عقلی ماخذ ہیں۔ ان سے حاصل ہونے والے احکامات براہ راست تو نہیں بلکہ انہیں قرآن و سنت کی تعلیمات کی روشنی میں ہی حاصل کیا جاتا ہے۔ حصول احکام کے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ یہ قرآنی تعلیمات سے متصادم نہ ہوں۔

مسلمانوں کی اکثریت اور اجماع اور قیاس کو حصار و تشریح سے تعبیر کرتی ہے لیکن خوارج اور معتزلہ نے اجماع کو مصدر تشریع تسلیم نہیں کیا۔

جن ماخذ میں علماء کا اختلاف پایا جاتا ہے ان میں یہ شامل ہیں:

1- (استصحاب)
2- (استحسان)
3- (مصالح مرسلہ)
4- مقامی رسم و رواج و عرف
5- کسی ایک صحابی کس مسلک (مذہب صحابی)
6- استدلال

قرآن (Quran)

قرآن اسلامی قانون و شریعت کا سب سے پہلا اور بڑا ماخذ ہے۔ یہ مسلمانوں کے لیے سرچشمہ ہدایت بھی ہے اور روحانی فیض کا ذریعہ بھی۔ اس کی ہمہ گیر حیثیت سے کسی کو بھی کوئی انکار نہیں ہو سکتا۔ قرآن حکیم میں اس بات کی واضح ہدایت کی گئی ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہر معاملے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

میں سب سے پہلے اس (قرآن) کی طرف رجوع کر کے فیصلہ کریں اس ضمن میں قرآن پاک کی سورہ النحل آیت 89 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ وَّھُدًی وَّرَحْمَۃً وَّبُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ O

ترجمہ: "(اے محمد ﷺ) ہم نے آپ ﷺ پر وہ کتاب اتاری ہے جو ہر چیز کی خوبصورت وضاحت کرنے والی ہے اور وہ فرمانبرداروں کے لیے ہدایت، رحمت اور خوشخبری ہے۔"

اس آیت مبارکہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب میں ہر چیز کی خوب وضاحت کر دی گئی ہے اور یہ ان لوگوں کے لیے خوشخبری اور رحمت کا ذریعہ ہے جو اللہ کے قانون کو تسلیم کرتے ہیں۔

اللہ نے سورہ النساء آیت 105 میں فرمایا:

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰکَ اللّٰہُ ط وَلَا تَکُنْ لِّلْخَآئِنِیْنَ خَصِیْمًا۔

ترجمہ: "تحقیق ہم نے آپ ﷺ پر کتاب نازل کی حق کے ساتھ تاکہ آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ فرمادیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سمجھایا ہے اور آپ ﷺ نہ ہوں دغابازوں کے طرفدار"

گویا اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ قرآن کے مطابق فیصلہ صادر فرمائیں۔

سورہ ابراہیم آیت 1 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ اِلَیْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔

ترجمہ: "ایک کتاب ہے کہ ہم نے تمہاری طرف اتاری کہ تم لوگوں کو اندھیروں سے اجالے میں لاؤ"

اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ تم جتنا قرآن حکیم سے انحراف کرو گے خود ساختہ قوانین کو اپناؤ گے اتنا ہی تم تاریکی اور اندھیروں میں دھکے کھاتے رہو گے۔ کامیابی سے دور رہو گے اور جب تم حقیقی طور پر قرآن حکیم پر عمل کرو گے تو تم راہ راست پر آجاؤ گے۔

سبحان اللہ مندرجہ ذیل آیت سے حضور ﷺ کی شان کس قدر دوبالا ہو جاتی ہے اور آپ ﷺ کے حکم کو اللہ تعالیٰ سے کس قدر مقدم فرمایا اور حضور ﷺ کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا۔

اللہ تعالیٰ سورہ النساء آیت 65 میں فرماتے ہیں:

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔

ترجمہ: "تو اے محبوب! رب کی قسم وہ مسلمان نہ ہوں گے جب تک آپس کے جھگڑے میں آپ ﷺ کو حاکم نہ بنائیں پھر جو کچھ آپ حکم فرمادیں اپنے دلوں میں اس سے رکاوٹ نہ پائیں اور دل سے مان لیں۔"

اللہ تعالیٰ نے اختلاف کی صورت میں فرمایا کہ اس ضمن میں اللہ اور رسول کی جانب رجوع کرو۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سورہ النساء آیت 59 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ط

ترجمہ: "پھر اگر تم میں کسی بات کا جھگڑا اٹھے تو اسے اللہ اور رسول ﷺ کے حضور رجوع کرو اور اگر اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو۔"

اللہ تعالیٰ نے عدل وانصاف (قرآن حکیم کے مطابق) کے ساتھ فیصلہ کرنے کا حکم دیا ہے اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے سورہ النساء آیت 58 میں فرمایا:

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ط

ترجمہ: "اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔"

پھر یہ بھی فرمایا گیا کہ فیصلے کرتے وقت لوگوں کی دشمنی تمہیں انصاف چھوڑنے پر آمادہ نہ کرے اور وہی فیصلہ کرو جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہو اور اس میں اپنے اور بیگانے کی تخصیص نہیں ہونی چاہیے۔

جیسا کہ سورہ المائدہ آیت 8 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا.

ترجمہ: "اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ انصاف چھوڑ دو۔"

سورہ الاحزاب کی آیت 36 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے فیصلے کو ماننے سے انکار کردے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَی اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ یَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ط

ترجمہ: "اور کسی مومن اور مومنہ عورت کے لیے یہ گنجائش نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کسی امر کا فیصلہ کردیں تو ان لوگوں کو اپنے معاملات (اس فیصلے کے قبول وعدم قبول کا) کوئی اختیار باقی رہے۔"

سورہ الشوریٰ آیت 10 میں فرمایا:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْهِ مِنْ شَیْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَی اللّٰهِ ط

ترجمہ: "اور جس معاملے میں بھی تمہارے مابین اختلاف ہو اس کے فیصلے کا حق اللہ ہی کو ہے۔"

سورہ المائدہ آیت 44 میں اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو ظالم کہا ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ.

ترجمہ: "اور جو اللہ کے اتارے پر حکم نہ کرے تو وہ ہی ظالم لوگ ہیں۔"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسی سورہ کی آیت 48 میں فرمایا:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ

ترجمہ: "تو ان میں فیصلہ کرو اللہ کے اتارے سے اور لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا۔"

اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے لیے یہ فرمایا جو لوگ قرآن حکیم کے حکم کو چھوڑ کر جاہلیت کے دور کا حکم چاہتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ ہی یہ فرمایا کہ اللہ کے حکم سے بہتر کس کا حکم ہو سکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: سورہ المائدہ آیت 50

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ط وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْماً لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَO

ترجمہ: "تو کیا جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے بہتر کس کا حکم ہے یقین والوں کے لیے۔"

سورہ الانعام کی آیت 57 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ.

ترجمہ: "حکم تو صرف اللہ کا ہے وہی حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ دینے والا ہے۔"

سورہ الشوریٰ آیت 17 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِيْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ط

ترجمہ: "وہ اللہ ہی ہے جس نے اُتاری یہ کتاب حق کے ساتھ اور میزان نازل فرمائی۔"

سورہ البقرہ آیت 2 میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بتایا کہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں یعنی اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ برحق ہے لہٰذا جو چیز برحق ہوگی اس میں شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ج صلے فِيْهِ ج هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَO

ترجمہ: "یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے لیے۔"

سورہ الزخرف آیت 44

وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ج

ترجمہ: "اور بے شک یہ ذکر (قرآن) آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے نصیحت ہے۔"

سورہ طٰہٰ آیت 4

تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى.

ترجمہ: "یہ کتاب زمین و آسمان کے خالق کی نازل کردہ ہے۔"

سورہ بنی اسرائیل آیت 9

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ.

ترجمہ: "بے شک یہ قرآن اس راہ کی ہدایت کرتا ہے جو بہت ہی سیدھی ہے۔"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اس آیت جلیلہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے جس راہ پر چلنے کی ہدایت کی ہے وہ نہایت سیدھی راہ ہے اور اگر ایک مسلمان صمیم قلب کے ساتھ اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو تو وہ یقیناً نجات حاصل کر لے گا۔"

قرآن شریعت کا ماخذ اول:

قرآن حکیم کو شریعت کا ماخذ اول قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس میں انسانوں اور اللہ تعالیٰ کے تعلق، عبادات، تقویٰ، اقتصادیات، تجارت، جن و انس، شادی بیاہ، طلاق، موت اور زندگی، آسمانی کتابوں، ملائکہ، نباتات، جمادات، وراثت، صلح و جنگ کے قوانین، حدود و تعزیرات، نیکی و بدی، اوامر و نواہی، قیامت، اہل جنت، اہل دوزخ، پیغمبروں کے واقعات، قانون سازی کے بنیادی اصول، نزول قرآن، صاحب قرآن، پردہ اور دیگر ان گنت مضامین کے بارے میں جزوی یا تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب ایسی ہے کہ اس کا کسی دوسری آسمانی کتاب سے کوئی مقابلہ نہیں۔

یہ نہ صرف مسلمانان عالم کے لیے ایک رہنما کتاب کا درجہ رکھتی ہے بلکہ اس سے جمیع الناس بھی استفادہ کر سکتے ہیں کیونکہ اس میں دنیاوی، روحانی، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں ہدایات ملتی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب دنیا بھر کے انسانوں، تمام ملکوں اور ہر آنے والے دور کے لیے سرچشمہ ہدایت ہے کیونکہ اس کے بعد وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے اس کتاب کے عالم گیر ہونے کی وجوہ صرف یہی نہیں بلکہ یہ آخری الہامی کتاب ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ اس سے پہلے کے تمام پیغامات الٰہی اور واقعات اس میں شامل کر دیئے گئے ہیں تا کہ آنے والی نسلیں اور قومیں اس میں دی گئی ہدایات سے کماحقہٗ استفادہ کریں اور ماضی کے عبرتناک واقعات سے سبق حاصل کریں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو ھُدًی لِلنَّاس کہا ہے اور جس طرح عوام کو کائنات اور اپنی ذات کے بارے میں صحیح نقطہ نظر اور زندگی بسر کرنے کی واضح ہدایات دیتا ہے اسی طرح خواص اور اصحاب علم و فکر کے لیے بھی کامل ہدایت اور مکمل رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

قرآن پاک کا اصل موضوع تو انسان ہے اگر کوئی شخص اس کا بغور مطالعہ کرے تو اسے معلوم ہو گا کہ یہ کتاب کہیں اپنے اصل موضوع (انسان) سے بال برابر بھی نہیں ہٹتی۔ لیکن یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ صرف قوانین کا مجموعہ ہے بلکہ یہ تو قانون سازی کے لیے بنیادیں فراہم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اس لیے قرآن نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس میں مکمل نظام حیات کا پورا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے تا کہ اس کے ماننے والوں کو کسی مسئلے کے حل کرنے میں قطعی کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

سورہ الشوریٰ آیت 10 میں حکم الٰہی، اقامت دین اور ایمان بالکتب اور قیام نظام عدل، اجتماعی باہمی ربط و تعلق بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ج

ترجمہ: "اور جس معاملے میں بھی تمہارے مابین اختلاف ہو اس کے فیصلے کا حق اللہ ہی کو ہے۔"

خصوصیات قرآن:

قرآن حکیم کو اس کی خصوصیات کی بنا پر شریعت کا سب سے بڑا اور اولین ماخذ قرار دیا گیا ہے۔

1۔ سرچشمہ علوم:

قرآن حکیم دنیا بھر کے علوم و فنون کا سرچشمہ ہے صرف ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ پر غور کیا جائے۔ اسے اس لیے علوم کا سرچشمہ کہا گیا ہے کہ اس میں روحانی، سماجی، سائنسی اور لسانی علوم کے بے شمار مضامین ملتے ہیں جو مختلف امور میں انسان کی رہنمائی کے لیے بڑی اہمیت

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کے حامل ہیں۔ روحانی علوم میں علم توحید باری تعالیٰ، علم صفات باری تعالیٰ، علم تعلق باللہ، علم ملائکہ، علم انبیائے کرام علیہ السلام، علم آخرت اور علم کتب سماوی شامل ہیں۔

سماجی علوم میں علم سیاسیات، علم اقتصادیات، علم سماجیات، علم قانون، علم تاریخ، علم تمدن، علم جغرافیہ، علم ہندسہ، علم نفس اور علم مناظرہ قابل ذکر ہیں۔

سائنسی علوم میں علم کیمیا، طبعیات، علم نباتات، علم طبقات الارض، علم نجوم، علم الحیوانات، علم طباعت اور علم الجبال وغیرہ شامل ہیں۔ جبکہ علوم لسانیات میں علم صرف ونحو، علم معانی، علم بیان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

2- بے مثل کتاب:

اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کتاب جیسی کوئی کتاب نہیں قرآن حکیم کا اس ضمن میں دعویٰ ہے کہ اگر جن وانس جمع ہو جائیں اور کوشش کریں تو ان کے لیے ایسا کرنا انتہائی مشکل امر ہے۔

سورہ البقرہ آیت 24-23 میں اللہ تعالیٰ نے پوری دنیا کو کھلا چیلنج دیا ہے کہ ہم نے جو کتاب نازل کی ہے اگر تمہیں اس میں کوئی شک ہو تو اس جیسی کوئی ایک سورہ ہی بنالاؤ۔

3- فصاحت وبلاغت میں اول:

قرآن حکیم فصاحب وبلاغت کے اعتبار سے ایک بے مثال کتاب ہے۔ کیونکہ اس وقت جب یہ کتاب نازل ہوئی تھی بڑے بڑے ماہرین لسانیات نے اس امر کو تسلیم کیا تھا کہ فصاحت وبلاغت میں اس کتاب کا کوئی اور کتاب مقابلہ نہیں کر سکتی کیونکہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔

4- سابقہ کتب سماعی کی تصدیق:

قرآن حکیم میں نہ صرف سابقہ قوموں کے لیے مبعوث ہونے والے انبیاء کا ذکر کیا گیا ہے بلکہ سابقہ کتب کی تصدیق بھی کر دی گئی ہے کہ وہ الہامی کتب (زبور، توریت اور انجیل) تھیں سورہ المائدہ آیت 48 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ.

ترجمہ: ''اور ہم نے آپ ﷺ کی طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری جو اس سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے ان پر محافظ ہے۔''

5- حفظ قرآن:

اس کتاب کا اعجاز یہ ہے کہ دنیا میں اس وقت تک کوئی بھی ایسی آسمانی کتاب نہیں ہے جو پوری طرح اپنے ماننے والوں کے سینوں میں محفوظ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کروڑوں انسانوں کے دلوں میں محفوظ کر کے اس کتاب کو تحفظ فراہم کر دیا ہے۔

6- عالمگیر کتاب:

اس کتاب کو عالمگیر کتاب ہونے کا درجہ بھی حاصل ہے کیونکہ اس کے بعد انسانوں کی ہدایت کے لیے کوئی کتاب نازل نہیں کی جائے گی اور جب تک یہ دنیا باقی ہے یہ کتاب ایک جامع اور ابدی دستور حیات کی حیثیت سے قائم رہے گی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قرآن حکیم کا یہ دعویٰ ہے کہ اس سے پہلے کے تمام پیغامات الٰہی اس کتاب میں بھی شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مسلمان اللہ کے ان پیغامات پر بھی یقین رکھتے ہیں جو حضور ﷺ کے علاوہ دوسرے پیغمبر لائے تھے۔ سورہ البقرہ کی آیت 285 اس کا بین ثبوت فراہم کرتی ہے۔

7- **سورہ الفاتحہ۔ خلاصہ قرآن:**

سورہ الفاتحہ ایک ایسی سورہ ہے جو اگرچہ مختصر ہے اس کی کل سات آیات ہیں اور ان آیات کو خلاصہ قرآن سمجھا جاتا ہے یہ اس اعتبار سے بھی قرآن حکیم کی واحد سورہ ہے جس کی تلاوت ہر نماز میں کی جاتی ہے۔

8- **مکی اور مدنی سورتوں کی خصوصیات:**

تقریباً ایک تہائی قرآن حکیم مکی سورتوں پر مشتمل ہے ان سورتوں کے موضوع مکہ کے کفار تھے جو اسلام کے سخت مخالف تھے ان سورتوں میں احسان، استقلال اور اخلاص کی تلقین کی گئی ہے ان میں قیامت کا ذکر بھی ہے۔

دو تہائی قرآن مجید مدنی سورتوں پر مشتمل ہے جن میں مدینہ منورہ میں قائم ہونے والے مسلم معاشرے کی اجتماعی زندگی کے لیے قوانین الٰہی دیے گئے ہیں۔

9- **مکمل ضابطہ حیات:**

یہ کتاب قیامت تک آنے والی قوموں اور نسلوں کے لیے ایک رہنما اور مکمل ضابطہ حیات کا درجہ رکھتی ہے اس میں زندگی کا کوئی گوشہ اور پہلو ایسا نہیں جو بیان نہ کیا گیا ہو افراد ہو یا اقوام سب کے لیے سرچشمہ حیات ہے اس میں ایک انسان کو زندگی گزارنے کے اصول مہیا کیے گئے ہیں۔ اس کے الفاظ، عبارت، مضامین اور اس کا پیش کردہ دستور حیات شروع سے آخر تک یک رنگ اور ہم رنگ ہے۔

سورہ الانعام آیت 38 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتَابِ مِنْ شَیْءٍ

ترجمہ: ''ہم نے اس کتاب میں بیان کرنے کے لیے کوئی چیز نہیں چھوڑی۔''

10- **قرب خداوندی کا ذریعہ:**

ایک مسلمان اس کی تعلیمات پر مکمل طور پر اور قلب صمیم کے ساتھ عمل کرے تو وہ قرب خداوندی حاصل کر سکتا ہے۔

مختصر تعارف قرآن:

1-	مدت نزول قرآن	22 سال 5 ماہ اور 14 دن
2-	ابتدائی آیات قرآن	(5) سورہ العلق
3-	مکمل نازل ہونے والی سورہ	سورہ الانعام آیات 165
4-	سب سے چھوٹا حصہ نزول قرآن غیر اولی الضرر یعنی جو ضرر رسیدہ نہیں	(سورہ النساء آیت 95
5-	فترہ یعنی انقطاع وحی کے تین سال کے بعد نازل ہونے والی سورہ	سورہ المدثر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

6- مکمل آیت قرآن
مدھامتن یعنی یہ دونوں جنتیں گہری سبز ہوں گی۔ سورہ الرحمن آیت 64

7- عمومی آیات قرآنی — 6666

8- سورتوں کی تعداد — 114

9- طویل ترین سورہ قرآن — سورہ البقرہ آیات 286

10- مختصر ترین سورہ — سورہ الکوثر آیات 3

11- سات بڑی سورتوں کے لئے مستعمل نام — السبع الطول

12- سو یا کم آیات کے لیے مستعمل نام — مئین

13- مئین سے کم تعداد والی سورتوں کا مخصوص نام — مثانی

14- آخری چھوٹی سورتیں
مفصل۔ جو سورہ ق سے شروع ہو کر سورہ والناس پر ختم ہوتی ہیں۔ سورہ فاتحہ بھی شامل ہے۔

15- منازل قرآن — سات

16- پاروں کی تعداد — 30

17- رکوع — بعض کے نزدیک 540 لیکن بعض کے نزدیک 558

18- سجدہ ہائے قرآن — 14

19- سب سے بڑی آیت قرآن — آیت مدائینہ سورہ البقرہ آیت 282

20- سب سے چھوٹی آیت — حم

21- سب سے زیادہ اسماء الحسنی والی آیت — سورہ الحشر کی آخری آیت سے پہلی آیت

22- بسم اللہ سے شروع ہونے والی سورتوں کی تعداد
سوائے سورہ التوبہ 9 کے باقی سب بسم اللہ سے شروع ہوتی ہیں۔

23- سورہ جس کے متن میں بسم اللہ شامل ہے — سورہ النحل آیت 30 اس طرح کل 114 بنیں۔

24- قرآن حکیم میں دیئے گئے پیغمبروں کے نام — 26

1- حضرت آدم علیہ السلام
2- حضرت الیاس علیہ السلام
3- حضرت ایوب علیہ السلام
4- حضرت اسحٰق علیہ السلام
5- حضرت اسماعیل علیہ السلام
6- حضرت ابراہیم علیہ السلام
7- حضرت ادریس علیہ السلام
8- حضرت داؤد علیہ السلام
9- حضرت ذوالکفل علیہ السلام
10- حضرت شعیب علیہ السلام

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

-11	حضرت سلیمان علیہ السلام	-12	حضرت صالح علیہ السلام
-13	حضرت عزیر علیہ السلام	-14	حضرت عیسیٰ علیہ السلام
-15	حضرت لوط علیہ السلام	-16	حضرت زکریا علیہ السلام
-17	حضرت نوح علیہ السلام	-18	حضرت ہارون علیہ السلام
-19	حضرت ہود علیہ السلام	-20	حضرت موسیٰ علیہ السلام
-21	حضرت الیسع علیہ السلام	-22	حضرت یونس علیہ السلام
-23	حضرت یوسف علیہ السلام	-24	حضرت یحیٰ علیہ السلام
-25	حضرت یعقوب علیہ السلام	-26	حضرت محمد ﷺ

-27 مکی سورتوں کی تعداد — 86

-28 مدنی سورتوں کی تعداد — 28

-29 قرآن حکیم کی ترتیب کے لحاظ سے پہلی سورہ — فاتحہ

-30 قرآن حکیم کی ترتیب کے لحاظ سے آخری سورہ — والناس

-31 اردو کے پہلے مترجم قرآن — شاہ رفیع الدین (1776ء)

-32 قرآن حکیم کا پہلا لاطینی ترجمہ — 1143ء

-33 قرآن حکیم کا ابتدائی لفظ — اقراء

-34 دیباچہ قرآن — سورہ فاتحہ

-35 قرآن حکیم کے دو جملے جن کے حروف الٹنے سے بھی حروف وہی رہتے ہیں:

1- كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ سورہ الانبیاء آیت 33

2- سورہ المدثر آیت 3 یعنی رَبَّكَ فَكَبِّرْ

-36 قرآن حکیم میں واحد صحابی کا نام — حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ

-37 پیغمبروں کے ناموں پر سورتیں (6)

-1	سورہ یونس	-2	سورہ ہود	-3	سورہ یوسف
-4	سورہ ابراہیم	-5	سورہ محمد	-6	سورہ نوح

-38 خاتون کے نام پر واحد سورہ — سورہ مریم

-39 شہر کے نام پر سورہ — روم

-40 گائے کے نام پر مکمل سورہ — بقرہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

-41 حروف حجی سے شروع ہونے والی سورتیں 29

-42 قرآن میں لفظ اللہ تعداد 2698

-43 قرآن حکیم کی زبان

عربی۔ان جعلنا قرانا عربیا۔ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنایا (سورہ الزخرف آیت 3)

-44 کل تعداد کلمات 86430

-45 کل تعداد حروف 321265 یا 333760

-46 ملائکہ کے نام

جبرائیل علیہ السلام، میکائیل علیہ السلام، ہاروت، ماروت

-47 کفار کے نام قرآن میں رعد۔ملک الموت

-48 اشخاص کے نام بضمن واقعات عمران، تبع، طالوت، جالوت

-49 ابتدائی مقام نزول قرآن غار حرا

-50 اقسام آیات

(ا)	آیات وعدہ	1000	(س)	آیات قصص	1000
(ب)	آیات وعید	1000	(ش)	آیات تحلیل	250
(ج)	آیات نہی	1000	(ص)	آیات تحریمہ	250
(د)	آیات امر	1000	(ض)	آیات تسبیح	100
(ر)	آیات مثال	1000	(ط)	آیات متفرقہ	66
(i)	کل تعداد	5000	(ii)	کل تعداد	1666

کل میزان (i) 5000 + (ii) 1666 = 6666

-51 پہلے لفظ سے ماخوذ سورتوں کے نام: طٰہٰ، یسین اور ق

-52 قرآن حکیم میں ملائکہ کا تذکرہ: 68بار

-53 قرآن حکیم میں ملک کا تذکرہ: دس بار

-54 وہ سورتیں جن کے ناموں میں کوئی نقطہ نہیں

سورہ المائدہ، سورہ ہود، سورہ رعد، سورہ طٰہٰ، سورہ روم، سورہ ص، سورہ محمد، سورہ طور، سورہ ملک، سورہ دہر، سورہ اعلیٰ، سورہ عصر۔

-55 چیونٹی کے نام پر سورہ کا نام سورہ النمل

-56 مکڑی کے نام پر سورہ کا نام سورہ العنکبوت

-57 قرآن میں لفظ الرحمٰن 57مرتبہ آیا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

58- قرآن میں لفظ رحیم   114 مرتبہ درج ہے

59- لفظ ابلیس   11 مرتبہ آیا ہے

سورہ البقرہ آیت 34، سورہ الاعراف آیت 11، سورہ الحجر آیت 32-31، سورہ بنی اسرائیل آیت 61، سورہ الکہف 50، سورہ طہ آیت 116، سورہ الشعراء آیت 95، سورہ سبا آیت 20 اور سورہ ص آیت 75-74

2- سنت رسول ﷺ عربی:

قرآن حکیم کے بعد سنت اسلامی قوانین کا دوسرا بڑا ماخذ ہے۔ لفظ سنت کے معنی ہیں راستہ، رواج یا معمول۔ شرعی اصطلاح میں اس سے مراد آنحضرت ﷺ کے ارشادات اور افعال ہیں اور وہ کام اور باتیں بھی شامل ہیں جن کی آپ ﷺ نے منظوری دی۔

قرآن مجید کے بعد سنت کو سند کا درجہ حاصل ہے وہ اس لیے کہ حضور ﷺ نے قرآن حکیم کی جو تفسیر فرمائی اور ساری امت مسلمہ کے لیے جو ضابطہ حیات مقرر فرمایا وہ اس میں شامل ہے۔

سنت کو حدیث بھی کہتے ہیں۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جب اسلامی شرع کے قوانین کا کوئی مجموعہ مدون نہیں ہوا تھا حدیث شریف ہی قواعد اور احکامات کا سرچشمہ تھی۔ آج بھی جن ممالک میں شریعت پر کلی یا جزوی طور پر عمل ہو رہا ہے ان کے قانون میں سنت بھی داخل ہے۔

حضور ﷺ قرآن حکیم اور حدیث شریف کے مابین فرق کو خود واضح فرما دیتے تھے۔ قرآن مجید وہ کلام الٰہی ہے جو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ سے وحی کی صورت میں آپ ﷺ پر نازل ہوتا تھا جس میں معمولی تبدیلی بھی ناممکن تھی اس کے مقابلہ میں حدیث شریف حضور اکرم ﷺ کی روزمرہ زندگی کے اقوال و اعمال پر مشتمل ہے یہ اقوال و اعمال بھی اللہ تعالیٰ کی رضا و منشا کے مطابق ہوتے تھے بعض اوقات وحی الٰہی خود آنحضرت ﷺ کے لیے ہدایت ہوتی تھی۔ حضور ﷺ قرآن کی ترتیب و تدوین کی ذاتی طور پر نگرانی فرماتے تھے لیکن حدیث کے سلسلے میں آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا۔

ابتداء میں حدیث شریف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تابعین کو زبانی منتقل ہوئی اگرچہ خود آنحضرت ﷺ کے زمانے میں بھی بعض اصحاب مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کچھ احادیث لکھ لی تھیں دوسروں نے یہ کام حضور ﷺ کے وصال مبارک کے بعد کیا۔

سنت چونکہ اسلامی قانون کا دوسرا بڑا ماخذ ہے اس لیے اس کے بغیر قرآن حکیم کی تشریح مکمل نہیں ہوتی۔ سنت کا اطلاق ان امور پر بھی ہوتا ہے جو خلفائے راشدین نے کیے ہوں یا ان کے کرنے کا حکم دیا ہو۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا:

"تم پر میرے طریق کار اور میرے بعد خلفائے راشدین کے طریقے کو اختیار کرنا لازم ہے۔"

داخلی شہادت:

قرآن حکیم میں ہر مسلمان پر چونکہ اللہ تعالیٰ کے بعد حضور ﷺ کی اطاعت لازمی قرار دی گئی ہے اس لیے آپ ﷺ کے ہر فرمان کو تسلیم کرنا ایک مسلمان کے ایمان کا جزو ہے۔ حضور ﷺ کا ہر فرمان مسلمانوں کے لیے قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے سورہ النساء آیت 80 میں فرمایا:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ج

ترجمہ: "جس نے حضور ﷺ کی اطاعت کی گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی۔"

یعنی اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ کی اطاعت کو بھی لازم و ملزوم قرار دیا گیا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسلام نے زندگی گزارنے کے لیے جو ضابطے مقرر کیے ہیں ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے سورہ احزاب کی آیت نمبر 21 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

ترجمہ: ''تحقیق تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔''

چونکہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہر دور کے لیے ہیں اس لیے اس آیت مبارکہ سے ثابت ہوا کہ اطاعت رسول ﷺ ہی اسوہ حسنہ ہے اور یہی ہمارے لیے قانون بھی ہے۔

سورہ النساء کی آیت 59 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ.

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے ان کی جو صاحب امر ہوں۔''

ایک دوسرے مقام پر اسی بات کو ذرا شدت اور قدرے زور کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

سورہ آل عمران آیت 31

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ.

ترجمہ: ''(اے نبی ﷺ) کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے قصور تمہیں بخش دے گا اور اللہ بڑا غفور الرحیم ہے۔''

سرہ البقرہ آیت 151 میں فرمایا:

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ O

ترجمہ: ''جس طرح ہم نے تمہارے درمیان خود تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔''

قرآن حکیم نے جابجا سنت رسول ﷺ کے بطور ماخذ اسلامی قانون توثیق و تصدیق کی ہے۔ اس توثیق کی حیثیت مشورہ یا تلقین کی سی نہیں بلکہ اسے قانون کا درجہ حاصل ہے اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے سورہ الحشر کی آیت 7 میں فرمایا:

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ق وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ج وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ.

ترجمہ: ''جو کچھ رسول (ﷺ) تمہیں دیں اسے لے لو اور جس سے منع فرمائیں اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔''

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ حضور ﷺ جس بات کو کرنے کا حکم دیں اسے اختیار کرنے اور جس سے منع فرمائیں اس سے رک جانے میں ہی ایک مسلمان کی عافیت ہے۔ ورنہ راندہ درگاہ ہو جائے گا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سورہ النجم آیت 3 اور 4 میں اس امر کی وضاحت فرمائی گئی ہے کہ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو وحی کی جاتی ہے اس کا کوئی لفظ بھی حضور ﷺ کا اپنا نہیں ہوتا بلکہ حضور ﷺ کی زبان مبارک سے ادا کردہ تمام الفاظ رب العزت کی جانب سے ہوتے ہیں۔ لہٰذا حضور ﷺ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اللہ تعالیٰ کا ہی کلمہ ہوتا ہے اور اسے من وعن تسلیم کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ لوگ کافر ہیں جو اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت نہیں کرتے۔ سورہ آل عمران آیت 32

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ج فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ O

ترجمہ: ''کہیے کہ اطاعت کرو اللہ کی اور رسول ﷺ کی پھر وہ اگر منہ موڑتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔''

مندرجہ بالا آیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے ساتھ حضور ﷺ کی اطاعت کو بھی لازمی قرار دیا ہے اس لیے حضور ﷺ کسی مسئلے پر جو فیصلہ صادر فرمائیں اسے بلا چوں وچرا تسلیم کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے اور اس ضمن میں کسی مسلمان مرد اور عورت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ حضور ﷺ کے کسی فیصلے کو مسترد کرے یا اس میں ترمیم واضافہ کرے۔ سورہ الاحزاب کی آیت 36 اس امر کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے کافی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ج

ترجمہ: ''اور کسی مومن مرد اور مومنہ عورت کے لیے یہ گنجائش نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی امر کا فیصلہ کر دیں تو ان لوگوں کو اپنے معاملے میں اس فیصلے کے قبول وعدم قبول کا کوئی اختیار باقی رہے۔''

سورہ الاعراف آیت 158 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ ج

ترجمہ: ''پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول نبی امی پر جو اللہ اور اس کے تمام کلام پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا اتباع کرو۔''

یہاں اتباع کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ امت مسلمہ حضور ﷺ پر عمل کو نہ صرف تسلیم کریں بلکہ دل وجان سے اس پر عمل پیرا بھی ہوں۔

سورہ الاحزاب کی آیت 36 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا.

ترجمہ: ''اور جو کوئی بھی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔''

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان حضور ﷺ کے حکم کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

خارجی شہادت:

قرآن حکیم کی اندرونی شہادت کے بعد خارجی شہادت کے بارے میں سورہ النساء آیت 115 میں فرمایا:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۞

ترجمہ: ''جو شخص رسول ﷺ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو حالانکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی اور مومنین کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے تو اس کو ہم اسی طرح چلائیں گے جدھر وہ پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے۔''

اس سارے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تک اسوہ حسنہ پر عمل نہ کیا جائے اور حضور ﷺ کے ہر حکم کا اتباع نہ کیا جائے حضور ﷺ کے امر و نہی کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل نہ کیا جائے اور آپ ﷺ کے بتائے ہوئے راستہ کو اختیار نہ کیا جائے تو اسلامی تعلیمات مکمل ہی نہیں ہو سکتیں۔

سنت رسول ﷺ کی عظمت:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ''تابعین'' تبع تابعین رحمۃ اللہ علیہم، اولیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم اور مشائخ عظام رحمۃ اللہ علیہم نے حضور ﷺ کی سنت کو اپنا کر یہ ثابت کر دیا کہ حضور ﷺ کیا احکامات کو تسلیم کرنے میں انسانی فلاح و بہبود کا عنصر مضمر ہے۔ درج ذیل واقعات میں سنت رسول ﷺ کی عظمت اور اس پر عمل کے واجب ہونے کی روشن اور واضح دلیلیں ملتی ہیں۔

ایک دادی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی میراث کے بارے میں سوال کرتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کتاب اللہ میں تو اس سلسلے میں کچھ وضاحت نہیں اور مجھے یہ معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کے لیے کسی چیز کا کوئی فیصلہ کیا ہو اور میں لوگوں سے اس بارے میں سوال کروں گا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سوال کیا تو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس بات کی شہادت دی کہ حضور ﷺ نے دادی کا چھٹا حصہ قرار دیا تھا تو آپ ﷺ نے اس کے مطابق فیصلہ فرما دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے عاملوں کو وصیت فرمایا کرتے تھے کہ وہ لوگوں کے درمیان کتاب اللہ سے فیصلہ کریں اگر کوئی معاملہ اللہ کی کتاب میں نہ پائیں تو پھر سنت رسول ﷺ کے ذریعہ فیصلہ کیا جائے۔

اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو عورت کی املاص (عورت کا اپنے پیٹ کے بچے کو کسی تعدی اور زیادتی کی وجہ سے مردہ حالت میں گرا دینا ہے) کے حکم میں اشکال پیدا ہوا تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا تو محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے شہادت دی کہ حضور ﷺ نے اس معاملے میں ایک غلام یا باندی آزاد کرنے کا فیصلہ صادر فرمایا چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے مطابق فیصلہ سنا دیا۔

اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے خاوند کی وفات کے بعد عورت کے اپنے گھر میں عدت گزارنے کا مسئلہ پیش ہوا اور انہیں اس مسئلے میں اشکال پیش آیا تو انہیں فریعہ رضی اللہ عنہا بنت مالک بن سنان نے جو ابوسعید رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں خبر دی کہ حضور ﷺ نے ان کے خاوند کی وفات کے بعد انہیں حکم دیا تھا کہ وہ اپنے خاوند کے گھر میں ہی ٹھہری رہیں۔ یہاں تک کہ مقررہ عدت اپنی معیاد کو پہنچ جائے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسی کے مطابق فیصلہ سنایا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت کے عہدے پر متمکن ہوئے تو اہل مصر سے بیعت لینے کے بعد جو سرکاری حکم جاری فرمایا اس میں فرمایا:

''خبردار ہم پر تمہارا جو حق ہے وہ یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ پر عمل کریں اور اس کے احکام تم پر نافذ کریں اور سنت رسول ﷺ کا اجراء کریں اور غیر موجودگی میں تمہارے خیر خواہ رہیں اصل میں اللہ ہی مدد کرنے والا ہے اور وہی ہمارے لیے کافی ہے وہ اچھا کارساز ہے۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سنت کے بارے میں آئمہ اور فقہا کا نقطہ نظر:

تمام فقہا نے حضور ﷺ کی سنت کو اسلامی قانون کا دوسرا بڑا ماخذ بتایا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

فرض الله على الناس اتباع وحيه وسنن رسوله

ترجمہ: "اللہ نے لوگوں پر اپنی وحی اور اپنے رسول کی سنت کا اتباع فرض کر دیا۔"

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

میں کتاب اللہ سے استدلال کرتا ہوں اگر اس میں وہ مسئلہ نہ ملے تو سنت رسول ﷺ سے دلیل لیتا ہوں اگر دونوں میں نہ پاؤں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس مسئلے کے بارے میں ایک سے زائد اقوال ہونے کی صورت میں جس قول کو مناسب سمجھتا ہوں لے لیتا ہوں البتہ ان اقوال سے باہر نہیں جاتا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

ہر وہ چیز جو کتاب وسنت کے موافق ہے اسے قبول کرلو اور جو مخالف ہو اسے چھوڑ دو۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ کی پانچ بنیادیں ہیں جن میں سے اولین بنیاد نصوص پر عمل ہے (نص سے مراد قرآن وسنت ہے) نص کے مقابلے میں انہیں جو چیز بھی ملتی اسے رد کر دیتے تھے۔

اجماع

اجماع کا لغوی مطلب ہے جمع ہونا یا کسی بات پر متفق ہونا۔ لیکن شرعی اصطلاح میں اس سے مراد علمائے امت کا (یا ان کی بڑی اکثریت کا ہر زمانے میں) کسی ایسے مسئلے پر متفق ہو جانا جس کے بارے میں قرآن وحدیث میں کوئی واضح حکم موجود نہ ہو۔ اسلامی قانون میں اجماع کو قرآن اور حدیث کے بعد تیسرے بڑے ماخذ کا درجہ حاصل ہے۔

"فلسفہ شریعت اسلام" میں مسٹر محمصانی نے ان الفاظ میں اجماع کی تعریف کی ہے:

"کسی حکم شرعی پر کسی زمانہ میں مسلمان مجتہدوں کا متفق ہو جانا اجماع کہلاتا ہے۔"

جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن "قانونی لغت" (انگریزی اردو) کے صفحہ 275 پر اجماع کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"اس کے لغوی معنی عزم واتفاق کے ہیں۔ فقہی اصطلاح میں کسی معاملے میں اہل حل وعقد کے اتفاق کو اجماع کہتے ہیں۔"

اصول فقہ اسلام کی مشہور کتاب تاریخ میں لکھا ہے کہ "جو احکام صریح وحی سے ثابت ہیں وہ پیش آنے والے واقعات وحوادث کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ اگر ان کا حکم وحی صریح سے بذریعہ استنباط نہ معلوم کیا جائے تو یہ مہمل پڑے رہ جائیں گے اور دین کے کمال کا دعویٰ بے کار ہو جائے گا۔ اس بنا پر ضروری ہے کہ مجتہدین کو احکام کے استنباط کا اختیار دیا جائے۔ چنانچہ اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے مقررہ اصول وضوابط شرعی کے مطابق کسی مسئلہ کی جو اجتماعی شکل متعین ہوگی۔ اس کی حیثیت اجماع کی ہوگی۔ اجماع کے افراد کا علمی اور عملی اعتبار سے مثالی اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اجماع سے فن مخصوص کے متقی اہل علم وبصیرت افراد کا اجماع مراد لیا جائے گا نہ کہ عامۃ الناس کا اجماع۔"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسلامی انسائیکلو پیڈیا میں سید قاسم محمود لکھتے ہیں:

"علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال اپنے مشہور زمانہ چھ خطبات میں اجماع کا مندرجہ ذیل تصور پیش کیا ہے:

عجیب بات ہے کہ اس نہایت ہی اہم تصور پر اگرچہ صدر اسلام میں نظری اعتبار سے خوب خوب بحثیں ہوتی رہی ہیں لیکن عملاً اس کی حیثیت ایک خیال سے آگے نہ بڑھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ممالک اسلامیہ میں یہ تصور ایک مستقل ادارے کی حیثیت اختیار کر لیتا۔ شاید اس لیے کہ خلیفہ چہارم کے بعد جب اسلام میں مطلق العنان ملوکیت نے سر اٹھایا تو یہ اس کے مفاد کے خلاف تھا کہ اجماع کو ایک مستقل تشریعی ادارے کی شکل دی جاتی۔ اموی اور عباسی خلفاء کا فائدہ اسی میں تھا کہ اجتہاد کا حق بحیثیت افراد مجتہدین کے ہاتھ میں رہے۔ انجام کار ان سے بھی زیادہ طاقت حاصل کر لیتی۔ بہر حال یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ اس وقت دنیا میں جو نئی نئی قوتیں ابھر رہی ہیں کچھ ان کے اور کچھ مغربی اقوام کے سیاسی تجربات کے پیش نظر مسلمانوں کے ذہن میں بھی اجماع کی قدر و قیمت اور اس کے مخفی امکانات کا شعور پیدا ہو رہا ہے۔ بلاد اسلامیہ میں جمہوری روح کی نشوونما اور قانون ساز مجالس کا بتدریج قیام ایک بڑا ترقی کا قدم ہے۔"

حضور ﷺ نے بھی اجماع کو پسند فرمایا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضور ﷺ نے مشہور انصاری صحابی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ (متوفی 740) کو یمن میں دعوت دین کے لیے معلم کی حیثیت سے بھیجا۔ ازاں بعد وہ دو سال تک یمن کے حاکم (9 ہجری۔ 11 ہجری) رہے۔ حاکم بنانے سے قبل حضور ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

"اے معاذ رضی اللہ عنہ! مقدمات کا فیصلہ کیسے کرو گے؟" عرض کیا "اللہ کی کتاب سے" فرمایا "اگر اس میں حکم نہ ملے تو پھر" عرض کیا "سنت رسول اللہ ﷺ سے" فرمایا "اگر اس میں حکم نہ ملے تو پھر" عرض کیا "یا رسول اللہ اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا" اس پر فرمایا "اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول ﷺ کے نمائندے اور فرستادہ کو یہ توفیق دی کہ اللہ کا رسول ﷺ اس سے راضی ہو گیا۔"

اس حدیث نبوی ﷺ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اجماع سے اختلاف بھی سنت رسول ﷺ کی مخالفت ہے اور جو کوئی حضور ﷺ کی مخالفت کرے ظاہر ہے وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر اجماع کے واجب التعمیل ہونے پر بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مکمل اتفاق ہے اور اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کی مخالفت ملامت کی سزاوار قرار پائی۔

اجماع اور قرآن حکیم:

قرآن حکیم میں اجماع کے حق میں چند آیات بھی ملتی ہیں مثلاً سورہ یونس آیت 71

فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ.

ترجمہ: "(اے برادران قوم) پس تم ایک متفقہ فیصلہ کر لو اور اپنے شریکوں کو اکٹھا کر لو۔" سورہ النساء آیت 59

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ.

ترجمہ: "اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول ﷺ کی اور اپنے میں سے اہل اختیار کی اطاعت کرو۔"

یہاں اہل اختیار سے مراد مسلمان مجتہدین ہیں جن کا مسلمانوں میں سے ہونا ضروری ہے۔ سورہ الشوریٰ آیت 38

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ ج

ترجمہ: "اور وہ (مسلمان) اپنے معاملات باہمی مشورے سے چلاتے ہیں۔" سورہ آل عمران آیت 159

وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ ج فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ط

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ترجمہ: "اور معاملات میں آپ ان سے مشورہ کیجئے پھر جب (مشورہ کے بعد) کسی بات کا عزم کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کیجئے۔"

اجماع اور احادیث نبوی ﷺ:

حضور ﷺ نے متعدد مقامات پر اجماع کا ذکر فرمایا ہے مثلاً:

1- ان امتی لا تجتمع علی ضلالہ.

ترجمہ: "میری امت گمراہی پر متفق نہیں ہوگی۔"

2- فما رائی المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن.

ترجمہ: "جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔"

3- تیسری حدیث جو اوپر ہم نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نقل کی ہے۔

اقسام اجماع:

اجماع کی دو قسمیں ہیں یعنی

1- اجماع صریح یا نطقی 2- اجماع سکوتی

1- اجماع صریح:

اجماع صریح کا مطلب ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین رحمۃ اللہ علیہم اور مجتہدین کرام کا کسی درپیش مسئلہ کو وضاحت اور صراحت کے ساتھ بیان کرنا چونکہ اس قسم کے اجماع میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین رحمۃ اللہ علیہم اور مجتہدین اپنی رائے کا اظہار بذریعہ کلام کرتے ہیں اس لیے ایسے اجماع کو نطقی بھی کہا جاتا ہے۔

2- اجماع سکوتی:

اس سے مراد کسی زیر بحث معاملہ میں اہل نظر کے اتفاق سے کسی رائے یا فیصلے کی اشاعت ہے اور فیصلے کی نقل دوسرے مجتہدین تک پہنچے تو وہ اپنی جانب سے اس پر تنقید یا کسی قسم کا اظہار خیال نہ کریں بلکہ اس فیصلے کو من وعن تسلیم کر لیں۔ اجماع سکوتی کے شرعی مقام اور مرتبہ میں علمائے امت کا اختلاف پایا جاتا ہے ان کے علاوہ اجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اجماع تابعین رحمۃ اللہ علیہ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جانب سے کیے گئے فیصلوں کا اطلاق ہر اجماع پر ہوتا ہے۔ انہوں نے تبدیل شدہ حالات کے مطابق اپنے فیصلے صادر فرمائے لیکن انہوں نے بھی فیصلے کرتے وقت مقدمات کی نوعیت وماہیت کو مدنظر رکھا ہے۔

جدید سائنسی انکشافات نے اجماع کے عمل کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ اس ضمن میں ٹیلی فون، ٹیلی پرنٹر، فیکس، انٹرنیٹ اور مواصلاتی سیاروں کے ذریعے حاصل کی جانے والی معلومات کا تبادلہ بھی شامل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مجتہدین بھی اپنی آسانی کے لیے ان ذرائع کو استعمال کر کے کسی فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں۔

پاکستان کے آئین میں 1974ء میں پارلیمنٹ نے احمدیوں کے دونوں گروپوں (لاہوری اور قادیانی) کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر اجماع کی عمدہ مثال قائم کر دی۔ پارلیمنٹ نے یہ متفقہ فیصلہ علماء کے فتووں، مجالس مذاکروں، تحریروں اور خط وکتابت کی روشنی میں کیا تھا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قیاس

قیاس اسلامی قانون کا چوتھا ماخذ ہے۔ لغوی اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے ایک چیز کو دوسری چیز کے مقابل کر کے اندازہ اور برابر کرنا ہے۔ شرعی اصطلاح میں قیاس اس اندازے کو کہتے ہیں کہ ایک معلوم شرعی حکم کے اسباب اور علتوں کو سامنے رکھ کر کسی ایسے معاملے میں جس کے متعلق شرعی حکم موجود نہ ہو کوئی مناسب حکم دیا جائے یا فیصلہ کیا جائے۔ قیاس کا ثبوت خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے بھی ثابت ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے قیاس کو بہت زیادہ تقویت بخشی اور انہیں کو اس طریقے کا بانی کہا جاتا ہے۔

قیاس ہر شخص کے بس کا روگ نہیں بلکہ اس کے لیے قرآن وسنت کا عالم ہونا بڑا ضروری ہے۔ مسلمانوں کے ہر زمانے کے قانون دانوں کی رائے سے واقف ہو اور مختلف ادوار میں جو ملت میں فیصلے ہوئے ہیں یا جن پر اجماع منعقد ہوا ہے ان کی خبر رکھتا ہو۔ اسے عربی زبان اور عربی صرف ونحو پر مکمل عبور ہو اور کردار واطوار کے اعتبار سے منفرد حیثیت کا حامل ہو جس عالم میں یہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہوں۔ اس کا فیصلہ شرعی حیثیت رکھتا ہے۔

اسلامی انسائیکلو پیڈیا میں جناب سید قاسم محمود لکھتے ہیں:

''مخالفین قیاس خصوصاً منکرین حدیث قیاس کی عدم ضرورت پر قرآن مجید سے یہ دلیل نکالتے ہیں یعنی ''ہم نے تجھ پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں ہر چیز واضح طور پر بیان کی گئی ہے۔'' اس طرح بعض مخالفین نبی کریم ﷺ کی اس حدیث سے قیاس کی مخالفت کا جواز نکالتے ہیں ''میری امت کے لیے سب سے بڑا فتنہ یہ ہوگا کہ بعض لوگ ایسے ہوں گے جو مسائل کا فیصلہ اپنی رائے سے کریں گے وہ حرام کو حلال قرار دیں گے۔'' اس حدیث میں خواہشات نفسی پر مبنی رائے مراد ہے۔ ایسی رائے سب فقہا کے نزدیک فاسد اور باطل ہے لیکن جو قیاس قرآن وسنت کی حدود میں رہتے ہوئے کیا جائے وہ قابل قبول اور مستحسن ہے۔ ایسا قیاس اسلام کی تعلیمات کے منافی نہیں ہو سکتا۔ قیاس کو عمل میں لانے کے لیے شدت سے اس کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی ہے کہ معاشرتی ضروریات روز بروز بڑھ رہی ہیں جس سے کئی مسائل جنم لے رہے ہیں۔ دوسرے اسلامی علاقے کا پھیلاؤ بھی اس کا ایک جواز ہے عراق میں وہ لوگ جنہیں اہل الرائے کہا جاتا تھا انہوں نے متعدد مقامات کا فیصلہ قیاس کی بنیاد پر ہی کیا۔ انہوں نے قیاس کا طریقہ یہ اختیار کیا تھا مثلاً قرآن حکیم میں شراب کو انسان کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے اور حرمت کا سبب نشہ ہے۔ اس لیے انہوں نے تمام نشہ آور چیزوں جن میں شراب کے علاوہ بھنگ، چرس، افیون شامل تھیں، حرام قرار دیا اور پھر اسلامی قانون کے مطابق سزا تجویز کی۔

فقہا کی اصطلاح میں علت کے اصل اور فرع میں اشتراک کی بنا پر کسی حکم کو جو قرآن وسنت میں نہ ہو ایسے حکم کے ساتھ ملانے کو قیاس کہا جاتا ہے جو قرآن وسنت میں موجود ہو۔ قیاس کی تعریف یہ ہے:

تقدير الفرع بالاصل في الحكم والعلة

ترجمہ: ''حکم اور علت میں فرع کا اصل سے موازنہ کرنا''

قرآن وسنت میں قیاس کے بارے میں دلائل:

سورہ النساء آیت 59 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ج فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ط

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب اختیار ہیں پھر اگر تمہارے درمیان کسی مسئلہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔''

سورہ الحشر آیت 2

فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ O

ترجمہ: ''پس اے سمجھ بوجھ رکھنے والے لوگ عبرت حاصل کرو۔''

اس آیہ جلیلہ میں بصارت کی آنکھیں رکھنے والوں کے لیے عبرت حاصل کرنے کے لیے حکم دینا قیاس کو ثابت کرتا ہے۔

سورہ الجمعہ آیت 5

مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْھَا کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا ط

ترجمہ: ''جن لوگوں (یہودی) کو تورات کا حامل بنایا گیا مگر انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہیں۔''

سنت رسول ﷺ:

سنت رسول ﷺ سے بھی ہمیں قیاس کے بارے میں صریح ارشادات ملتے ہیں مثلاً

جب حضور ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی مقرر فرمایا تو آپ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

جب کوئی مقدمہ تمہارے سامنے پیش ہوگا تو کیسے فیصلے کرو گے؟

جواب دیا جیسا کہ کتاب اللہ میں ہے۔ پھر پوچھا اگر کتاب اللہ میں پاؤ تو کیا کرو گے۔ جواب دیا پھر سنت رسول ﷺ کے مطابق فیصلہ کروں گا پھر ارشاد فرمایا کہ اگر سنت میں بھی نہ پاؤ تو کیا کرو گے۔ جواباً کہا ایسی صورت میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ اس پر حضور ﷺ نے خوشی کا اظہار فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول ﷺ کے بھیجے ہوئے شخص کو توفیق دی جو اس کے رسول ﷺ کو پسند ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی قیاس کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر فیصلے صادر فرمائے۔

ارکان قیاس:

یہ ارکان تعداد میں چار ہیں یعنی:

1- اصل: مقیس علیہ بھی کہا جاتا ہے۔

2- فرع: اسے مقیس بھی کہتے ہیں۔

3- حکم: حکم سے مراد وہ فیصلہ ہے جو قرآن و سنت میں مذکور ہے۔

4- علت: وہ قدر مشترک جو اصل اور فرع دونوں میں موجود ہو۔

1- اصل:

اصل کی بھی دو شرائط ہیں:

1- اس کا حکم کسی دوسری اصل کی فرع نہ ہو بلکہ یہ حکم مستقل بالذات قرآن وسنت سے ثابت ہو۔

2- دوسری شرط اصل کے حکم کی دلیل میں فرع کا حکم شامل نہ ہو۔

2- فرع:

فرع کو مقیس بھی کہا جاتا ہے اس سے مراد وہ شے ہے، جس پر قیاس کیا جائے۔

3- حکم:

حکم سے مراد کسی معاملہ میں وہ شرعی فیصلہ ہے جو قرآن حکیم یا سنت مطہرہ سے ثابت ہو۔

4- علت:

قیاس کو سمجھنے کے لیے علت کی تفہیم از حد ضروری ہے۔ علت کی پہلی شرط یہ ہے کہ علت کا وصف ظاہر ہو۔

اجتہاد

اسلام میں اجتہاد کا کردار:

لغوی اعتبار سے اجتہاد کا مطلب ہے کوشش کرنا، صحیح رائے تلاش کرنا، پنی طرف سے زور لگانا، الغرض مسائل فقہ کا قرآن وحدیث سے استخراج کرنے کا نام اجتہاد ہے۔ اجتہاد کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ قرآن حکیم نے ناپاک چیزوں کو حرام اور پاک چیزوں کو حلال فرمایا۔ ان دونوں کے مابین مشتبہ چیزیں باقی رہیں۔ حضور ﷺ نے اپنے اجتہاد سے ان کی تصریح فرمائی کہ ہر درندہ جانور اور کنج پنجہ دار حرام ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کوہ صفا و مروہ خدا کی نشانیاں ہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اجتہاد کرتے ہوئے حکم دیا کہ چونکہ صفا کا لفظ پہلے آیا ہے اس لیے حج میں سعی کی ابتدا صفا سے کی جائے۔

اصول اجتہاد:

عبدالصمد صارم الازہری اپنی کتاب ''تاریخ الفقہ'' میں لکھتے ہیں: بعض مسائل ومعاملات کے متعلق خود آنحضور ﷺ حکم دے دیتے تھے۔ بعض میں اصحاب سے مشورہ فرماتے تھے جیسے اذان کے معاملے میں یا اسیران جنگ بدر کے معاملے میں۔ شوریٰ کی عزت ہر صحابی کے لیے نہ تھی۔ بلکہ ان حضرات سے مشورہ کیا جاتا تھا جن کا علم وعقل و تجربہ وسیع تھا۔ حاضر باشی یا تقویٰ وطہارت پر ہی اس کا انحصار نہ تھا۔ جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی اور اکثر اصحاب صحبت رسول کریم ﷺ سے اچھی طرح مستفید ہوئے۔ تو حضور ﷺ نے بعض اصحاب کو اجتہاد وفتویٰ کا مجاز کر دیا۔ ان مجتہد اصحاب کے سوا کوئی دوسرا شخص فتویٰ دینے کا مجاز نہ تھا۔ ان اصحاب کا اصول اجتہاد کتاب وسنت پر قیاس تھا۔ چونکہ رائے اور قیاس کا معاملہ تھا۔ سب کا علم وعقل یکساں نہ تھا۔ اس لیے اختلافات ہونا بھی لازمی تھا۔ بعض مسائل میں اختلاف ہو جاتا تھا۔ حضور ﷺ سن کر بعض دفعہ فریقین کے اجتہاد کو پسند فرماتے اور بعض دفعہ ایک فریق کے استنباط پر اظہار پسندیدگی فرماتے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ''علماء میری امت کے امین ہیں'' لہٰذا اس حدیث کی رو سے اجتہاد

www.kitabkhanapk.blogspot.com

کرنے کا واضح اشارہ ملتا ہے۔ اہل تشیع اسے قیاس اور اجماع سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں ان کے نزدیک امام ہی سب سے بڑا مجتہد ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں امام معصوم ہوتا ہے لہٰذا اس سے کسی قسم کی کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔

حضور ﷺ کے عہد کے چند مجتہدین:

حضور ﷺ نے ابتداء میں صرف چار حضرات حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو اجتہاد کا حکم دیا تھا۔ جوں جوں مسائل بڑھتے گئے اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا تو اس فہرست میں حضرت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ، حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت ابی درداء رضی اللہ عنہ اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ شامل کر لیے گئے۔ اجتہاد کے بارے میں مشہور حدیث حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی ہے۔

حضور ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی بنانے کا ارادہ فرمایا تو پوچھا کہ تمہارے پاس کوئی مقدمہ آئے تو کس طرح فیصلہ کرو گے۔ عرض کیا کتاب اللہ سے۔ فرمایا اگر کتاب اللہ میں کوئی حکم نہ ملے تو عرض کیا سنت رسول کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ فرمایا اگر وہاں بھی نہ ملے۔ عرض کیا پھر اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوتاہی نہ کروں گا۔ حضور ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا: اس خدا کے لیے حمد ہے جس نے رسول خدا ﷺ کے اس فرستادہ کو رسول خدا ﷺ کی مرضی کے مطابق چلنے کی توفیق دی۔ (ابوداؤد)

حضور ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح کو تحریر فرمایا: ''اے شریح، کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔ اگر وہاں نہ ہو تو سنت رسول ﷺ سے فیصلہ کرو۔ اگر ان دونوں میں بھی نہ ہو تو صلحاء کے فیصلوں کے مطابق کرو۔ اگر صلحاء کے فیصلے میں بھی نہ ہوں تو خواہ بروقت ہی خود فیصلہ کر دیا ذرا غور وفکر کے بعد کرو اور میری رائے میں تمہارے لیے ذرا غور وفکر کر لینا ہی بہتر ہے۔'' اس فرمان سے جو نکات آئے، مجتہدین کو ان کے مطابق ہی فیصلہ کرنا چاہیے۔ فیصلہ بڑے غور وفکر کے بعد ہونا چاہیے۔ تاکہ اس میں کوئی سقم نہ رہ جائے۔

اجتہاد کی اہمیت:

اجتہاد کی اہمیت کا اندازہ حضور ﷺ کی ان احادیث مبارکہ سے ہی لگایا جا سکتا ہے جو اوپر بیان کی جا چکی ہیں۔ ازاں بعد خلفائے راشدین نے بھی اجتہاد کیا۔ بنو عباس کے دور میں دینی علوم کی نشر و اشاعت کا کام سرکاری سرپرستی میں کیا جاتا تھا اور حصول اور ترویج علم کے لیے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ اس دور میں فقہ کی تدوین کا کام شروع ہوا اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس ضمن میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ اس دور میں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اجتہاد کے سلسلے میں ایسی بنیادیں قائم کر دیں اور ایسے اصول مرتب کر دیئے جن سے بعد میں پیش آنے والے مسائل اور مشکلات حل کرنے میں مدد لی جا سکے۔ صرف امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے 83 ہزار مسائل کو اپنی زبان میں بیان کیا۔ ان میں 38000 کا تعلق عبادات سے ہے جبکہ 45000 کا تعلق معاملات سے ہے۔ بعد ازاں ان شاگردوں نے جن میں امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ، امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ، حسن بن زیاد، بلال بن یحییٰ، قتیبہ بن زیاد، امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ شامل تھے، اجتہاد کو مزید آگے بڑھایا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعد امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگردوں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، داؤد ظاہری رحمۃ اللہ علیہ، ابوثور بغدادی رحمۃ اللہ علیہ، ابوجعفری ابن طبری رحمۃ اللہ علیہ، ابویعقوب بویطی، اسماعیل مزنی اور ربیع بن سلیمان مرادی کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے علاوہ ابواسحاق، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سنت نبوی ﷺ کی پیروی کرتے تھے اور رائے واجتہاد سے گریز کرتے تھے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مجتہد کے اوصاف اور اہلیت:

ہر شخص کو اجتہاد کرنے کا ہرگز حق نہیں پہنچتا بلکہ اجتہاد صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو استخراج احکام اور استدلال کے کام کو بخوبی انجام دے سکے۔ صائب الرائے، صاحب فراست، انصاف پسند، پاکیزہ اخلاق کا حامل ہو۔ احکام سمجھنے کی بصیرت رکھتا ہو، تفسیر قرآن، اسباب نزول، راویوں کے حالات، جرح وتعدیل کے طریق کار اور مقاصد شریعت کو سمجھنے کی مکمل طور پر اہلیت رکھتا ہو۔

درجات مجتہدین:

مجتہدین کی بھی درجہ بندی کردی گئی ہے۔ اس اعتبار سے مجتہدین کے چار درجے بہت مشہور ہیں جو درج ذیل ہیں:

1- مجتہد فی الشرع　　2- مجتہد فی المذہب

3- مجتہد فی المسائل　　4- مجتہد مقید

مجتہد فی الشرع:

مجتہد فی الشرع اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی خاص مسلک کا بانی ہو۔ اہل سنت والجماعت چار آئمہ کے اجتہاد کو تسلیم کرتی ہے۔ ان میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ شامل ہیں۔ امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ نے شیعہ مسلک کے لیے اجتہاد کیا۔ اس لیے اس فہرست میں ان کا نام بھی شامل ہے۔

مجتہد فی المذہب:

ایسا عالم دین جو آئمہ اربعہ میں سے کسی ایک کا مقلد ہو لیکن متعدد اصولی یا فروعی مسائل میں اپنے پیش رو امام سے اختلاف رکھتا ہوا اپنے ذاتی اجتہاد سے بھی فروعی مسائل کا استخراج کرتا ہو۔ ایسے حضرات میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد بن حسن شیبانی اور مذہب شافعی میں امام مزنی رحمۃ اللہ علیہ شامل ہیں۔

مجتہد فی المسائل:

فروعی مسائل میں اپنے اجتہاد کو بروئے کار لائے بشرطیکہ متعلقہ مذہب کے اصول ومبادی متاثر نہ ہوں۔ مذہب حنفی میں امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ اور مذہب شافعی میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا نام قابل ذکر ہے۔

مجتہد مقید:

ایسا مجتہد جو اپنے سلف صالحین کی رائے کو اہمیت دیتا ہو اور انہی کی پیروی کرتا ہو لیکن احکام کو بھی بخوبی سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہو ان میں مذہب حنفی میں کرخی، قدوری، صاحب ہدایہ اور فقہ کے چار مشہور متنوں کے مصنف شامل ہیں۔ مجتہد قرآن وسنت، اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم، آئمہ اربعہ کے اقوال کا پابند ہوتا ہے اور ایک انسان ہونے کے ناطے سے مجتہد کی رائے غلط اور صحیح بھی ہو سکتی ہے۔ شیعہ حضرات کے نزدیک اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔

کچھ تقلید کے ضمن میں:

1- حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"بے شک میں انسان ہوں غلط فیصلہ بھی دے سکتا ہوں اور صحیح بھی۔ میرے رائے پر غور کیا کرو۔ پس جو رائے کتاب وسنت کے مطابق ہو اسے اختیار کرلو ورنہ چھوڑ دو۔"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

2- حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "کسی کو جائز نہیں کہ ہمارے قول کی پیروی کرے جب تک کہ وہ یہ جان لے کہ ہم نے کس بنا پر کہا۔"

3- حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"اگر حضور ﷺ کا فرمان میرے قول کے خلاف ہو تو حضور ﷺ کا فرمان واجب التعمیل ہے۔ اس وقت میری تقلید نہ کرو۔ اگر کوئی حدیث میرے مسلک کے خلاف ہو تو حدیث کی پیروی کرو اور جان لو کہ وہی میرا مذہب ہے۔"

4- امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"نہ میری تقلید کرو نہ مالک رحمۃ اللہ علیہ کی نہ شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی نہ ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی، بلکہ انہی ماخذوں کو پیش نظر رکھو جو ان کے پیش نظر تھے یعنی قرآن وحدیث۔"

تقلید کب جائز ہے:

تفہیم فقہ (ترمیم واضافہ ڈاکٹر محمد اسلم خاکی) میں لکھا ہے:

"تقلید کا لفظ قلادہ سے نکلا ہے جس کے معنی گلے کی رسی ہے یعنی گلے میں رسی ڈال لینا یعنی بے چوں وچرا دوسرے کی رائے کی پیروی کرنا۔ تقلید صرف اس شخص کے لیے جائز ہے جو اجتہاد سے قاصر ہو۔ جیسے عوام، جہلا یا وہ طالب علم جس میں اجتہاد کی صلاحیت پیدا نہ ہوئی ہو ایسے ہی لوگوں کے متعلق قواعد عامہ میں کہا گیا ہے۔

"یعنی فتویٰ ان پڑھ کے لیے ایسا ہے جیسے اجتہاد مجتہد کے لیے۔"

عوام کے لیے تقلید کا جائز ہونا ایک معقول بات ہے کیونکہ اجتماعی اور اقتصادی زندگی کا تقاضا یہی ہے کہ بعض لوگ صنعت وحرفت کے مختلف پیشوں میں مشغول ہوں۔ پس اجتہاد کے مواقع صرف اسی شخص کو حاصل ہیں جو علم فقہ اور اصول فقہ میں مہارت تامہ رکھتا ہو لیکن جس کو یہ مہارت حاصل نہ ہو اس پر ائمہ مجتہدین کی تقلید واجب ہے۔ اس آیت پر عمل کرتے ہوئے یعنی اگر تم علم نہیں رکھتے تو اہل علم سے پوچھو۔

مذاہب اربعہ کے منضبط ہونے کے بعد بہت کم فقہاء ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے آزادانہ اجتہاد کیا بلکہ اکثر مجتہدین مذاہب اربعہ میں سے کسی نہ کسی مذہب کے مقلد بن گئے اور اسی کی مسلک پر چلنے لگے نیز اسی مذہب کے مطابق فتویٰ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلسلہ اجتہاد بالکل بند ہو گیا مگر جدید اصلاحی تحریکات جیسے وہابیہ اور سلفیہ نے اس جمود کو دور کیا۔ اس کے علاوہ اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا روح شریعت، قرآن وحدیث، نیز مذکورہ بالا دلائل عقلیہ کے بھی خلاف ہے۔

طبقہ ادنیٰ کے مجتہدین:

اصحاب التخریج، اصحاب الترجیح اور اصحاب التصحیح کا شمار طبقہ ادنیٰ کے مجتہدین میں ہوتا ہے۔

اصحاب التخریج:

اصحاب التخریج کا نام ان علماء کو دیا گیا ہے جو اعلیٰ درجے کے مجتہدین کی جانب سے طے شدہ مسائل اور معاملات کو عوام کے لیے عام فہم بناتے ہیں تاکہ بآسانی مسئلے سمجھ میں آجائیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اصحاب الترجیح:

یہ علماء کی وہ قسم ہے جو عوام کو ایک مجتہد کی صحیح اور دوسرے مجتہد کی رائے سے بہتر رائے بتا سکنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

اصحاب التصحیح:

یہ وہ حضرات ہیں جو اپنے آئمہ کی آرا کے بارے میں یہ بتانے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ کون سی رائے قوی اور کون سی ضعیف ہے چونکہ وہ تحریری طور پر ایسا کرتے ہیں اس لیے ان کی تصانیف کو بھی اہمیت دی جاتی ہے اور عوام کے نزدیک یہ لوگ مقبول بھی ہوتے ہیں۔

شیعہ حضرات ہر دور میں اپنے لیے ایک مجتہد کا تقرر کرتے ہیں۔ ایران میں ایک باقاعدہ محکمہ اس کے لیے کام کرتا ہے۔

اجتہاد بطور قانون:

سید قاسم محمود اسلامی انسائیکلو پیڈیا میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اجتہاد کو قانون کا درجہ کیسے ملتا ہے۔ اس کی متعدد صورتیں اسلامی نظام قانون میں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ تمام امت کے اہل علم کا اس پر اجماع ہو۔ دوسری یہ کہ کسی شخص یا گروہ کے اجتہاد کو قبول عام حاصل ہو جائے اور لوگ خود بخود اس کی پیروی شروع کریں جس طرح مثلاً فقہ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کو مسلمانوں کی بڑی بڑی آبادیوں نے بطور قانون مان لیا۔ تیسری یہ کہ کسی اجتہاد کو کوئی مسلم حکومت اپنا قانون قرار دے لے۔ مثلاً عثمانی سلطنت نے فقہ حنفی کو اپنا قانون ملکی قرار دیا تھا۔ چوتھی یہ کہ سیاست میں ایک ادارہ دستوری حیثیت سے قانون سازی کا مجاز ہو اور وہ اجتہاد سے کوئی قانون بنائے ان صورتوں کے ماسوا جتنے اجتہادات مختلف اہل علم کریں۔ ان کا مرتبہ فتوے سے زیادہ نہیں۔ رہے قاضیوں کے فیصلے تو وہ ان خاص مقدمات میں تو ضرور قانون کے طور پر نافذ ہوتے ہیں جن میں وہ کسی عدالت نے کیے ہوں اور انہیں نظائر کی حیثیت بھی حاصل ہوتی ہے لیکن صحیح معنوں میں وہ قانون نہیں ہوتے۔''

استحسان (حنفی مسلک):

اسلامی قوانین کی تشریح وتوضیح کے سلسلہ میں استحسان سے مراد ایسے متبادل راستوں میں اس راہ کو اختیار کرنا ہے جو مقابلتاً زیادہ سودمند ہو تاکہ بدلتے ہوئے حالات اور روزمرہ ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے۔ اس اصول کو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بالخصوص احادیث کے سلسلہ میں اپنایا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بھی استحسان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرتے۔

مصالح مرسلہ (حنبلی مسلک)

یہ استحسان کی طرح ہے کہ ایسے متبادل راستوں میں اس راہ کو اپنایا جائے جو مقابلتاً زیادہ مفید اور آسانی سے قابل عمل ہوں۔ اس اصول کو احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے رواج دیا۔

استصلاح (مالکی مسلک):

استصلاح کی نوعیت استحسان سے زیادہ مختلف نہیں یعنی دو جائز صورتوں میں سے مفید، موزوں اور زیادہ آسان راستہ کا اپنانا۔ اس اصول کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بالخصوص اہمیت دی۔ دراصل دونوں اصولوں میں افادیت کا پہلو مضمر ہے۔

www.urdukutabkhanap

استدلال (شافعی مسلک):

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلامی قانون کی تشریحات کرنے کے ضمن میں متذکرہ دونوں اصولوں کو پسند نہیں کیا۔ وہ عقل وفہم اور اسلامی قانون کی حقیقی روح کو مدنظر رکھتے ہوئے استدلال کرنے کے قائل ہیں۔

عرف:

مقامی کلچر اور رسم ورواج سے اگر اسلامی قانون اخذ کیے جائیں تو اس کو عرف کہتے ہیں۔ مصر، شام وغیرہ میں عرب علماء یہ عمل کرتے ہیں۔

-5 اسلامی فقہ:

اسلامی قانون کا آخری ماخذ فقہ کا وہ علم ہے جسے چار بزرگ فقہانے مرتب کیا۔ انہوں نے اسلامی قانون کو باقاعدہ فقہی قواعد کی رو سے مختلف ابواب اور عنوانات کے تحت ترتیب دیا۔ اسلامی قانون کی اس باضابطہ تدوین میں انہوں نے تمام تشریحات کو جمع کیا اور قیاس واستدلال کے طریقہ کار کو مدنظر رکھتے ہوئے عقل ودانش اور وقت کے تقاضوں کے مطابق ایک مکمل علم کی داغ بیل ڈالی۔ اس طرح مسلمان فقہانے دستوری نظریات کو معصر سیاسی حقائق کی روشنی میں واضح کیا جس سے اسلامی قوانین کا ایک ایسا مرتب شدہ ضابطہ تیار ہوگیا جو قانون کے طلبا کے لیے اسلامی قوانین کو سمجھنے اور مختلف معاملات پر ان کے اطلاق کے لیے آسانی پیدا کردیتا ہے۔ اسلامی قوانین کے مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ یہ قوانین کسی مخصوص زمانہ کے لیے نہیں بنائے گئے، بلکہ یہ ہر قسم کے حالات اور وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ رہتے ہیں اور ان میں نوع انسانی کے تمام مسائل کا حل موجود ہے۔ بیشتر انسانی معاملات میں انسان کو قانون سازی کا حق دیا گیا ہے، لہٰذا دورحاضر کے ایسے مسائل پر جو کہ صنعتی اور سائنسی دور کی پیداوار ہیں، اسلامی نظام حیات کی روح کے مطابق قانون سازی کی جاسکتی ہے۔ بعض مسائل پر اسلامی شریعت میں کوئی ایسی راہنمائی فراہم نہیں کی گئی اور خاموشی اختیار کی گئی ہے اور یہ خاموشی اس بات کی غماری کرتی ہے کہ قانون بنانے والے نے انسان کو ایک حد تک قانون سازی کا اختیار دیا ہے۔ اس اعتبار سے قانون ساز اسمبلیاں ایسے تمام معاملات پر قانون سازی کی مجاز ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

خلفائے راشدین کا طرز حکمرانی

خلافت راشدہ اس دور کو کہتے ہیں جس میں خلافت ان اصولوں میں قائم رہی ہو جو اسلام نے دیئے تھے۔ اسلام کا نظام حکمرانی اس میں موجود رہا اور خلیفہ نے نہایت خلوص واخلاص کے ساتھ ان مقاصد کے لئے کام کیا جو اسلامی حکومت کے مقاصد قرار دیئے تھے۔ خلافت راشدہ کی اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:

خلافت راشدہ کی خصوصیات

1- منتخب خلیفہ:

خلافت راشدہ میں خلیفہ کے انتخاب کے لئے سرکاری دباؤ نہیں ڈالا جاتا تھا اور کسی شخص کو خلیفہ بنانے کے لئے تلواریں بے نیام نہیں ہوتی تھیں بلکہ عوام اپنی رضا ورغبت سے کسی شخص پر اعتماد کا اظہار کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے انتخاب کی تجویز انصار کے اجتماع میں پیش ہوئی اور مسجد نبوی ﷺ میں سبھی لوگوں نے آپ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کبار صحابہ کے مشورہ سے تجویز کیا اور عام لوگوں سے اس انتخاب کی توثیق کرائی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے لئے ایک چھ رکنی کمیٹی بنائی گئی۔ اس فیصلے کو عوام نے تسلیم کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر صحابہ رضی اللہ عنہم نے مجبور کیا تو انہوں نے عوام سے پوچھ کر خلافت سنبھالی۔ خلفائے راشدین میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو عوام کی منشاء کے خلاف کرسی خلافت پر متمکن ہوا ہو۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے خلافت راشدہ اور بادشاہت میں فرق اس طرح واضح فرمایا

''خلافت وہ ہے جسے قائم کرنے میں مشورہ کیا گیا ہو اور بادشاہی وہ ہے جس پر تلوار کے زور سے غلبہ حاصل کیا گیا ہو۔''

2- بیت المال کو عوام کا مال سمجھنا:

شخصی حکومت میں بیت المال حکمران کا مال ہوتا ہے، لیکن خلافت راشدہ کا نظام بیت المال کو عوام کی امانت قرار دیتا ہے۔ خلیفہ کا حق اس میں صرف اتنا ہے جتنا ایک یتیم کے وارث کو یتیم کے مال پر ہوسکتا ہے۔ خلیفہ صرف گزارہ الاؤنس لینے کا مجاز تھا اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کا کوئی ذریعہ آمدن نہ ہو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عمر بھر میں تقریباً 80 ہزار درہم بیت المال سے لئے تھے لیکن وفات کے وقت وصیت کی کہ میرے ترکے میں سے یہ رقم بیت المال میں دوبارہ جمع کرا دی جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی محض گزارہ الاؤنس لیتے تھے اور وہ خلیفہ ہونے کے باوجود جیسی درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اتنے مالدار تھے کہ انہیں بیت المال سے کچھ لینے کی کبھی ضرورت پیش نہ آئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہم کے مسلک پر عمل کیا اور اسی وجہ سے عمر بھر کوئی خادم میسر نہ آیا۔ بیت المال کے بارے میں خلافت راشدہ اور بادشاہت کے طرز عمل کے فرق کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی عقیل نے جب بیت المال سے کچھ رقم مانگی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ''کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا بھائی مسلمانوں کا مال تمہیں دے کر جہنم میں جائے۔'' حضرت عقیل ناراض ہو کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس چلے گئے جنہوں نے بلاتکلف وہ رقم بیت المال سے دلوا دی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

3- کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے مطابق حکومت:

خلافت راشدہ کسی شخص کی ذاتی حکومت نہ تھی اور نہ خلیفہ کی صوابدید (Discretion) کا کوئی زیادہ دخل حکومت میں ہوتا تھا۔ بلکہ خلیفہ اور اس کے عمال کا مقصد کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق مسلمانوں کے معاملات چلانا تھا۔ ظالم کے ظلم کو روکنا اور مظلوم کی داد رسی خلیفہ کا فرض منصبی تھا۔ اس مقصد کے لئے خلیفہ اور عوام کے درمیان پردے حائل نہیں ہونے دیئے جاتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ درہ لے کر بازاروں میں نکلتے اور لوگوں کے ناپ تول کی پڑتال کرتے تو کوئی شخص ان کی طرف دیکھ کر یہ اندازہ نہ لگا سکتا تھا کہ ایک وسیع وعریض سلطنت کا سربراہ جا رہا ہے۔ خلافت کے اس مقصد کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پہلی تقریر میں واضح کر دیا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عمال کو جو خطوط لکھے ان میں بار بار ان کو اسی چیز کی طرف متوجہ کیا۔

4- قانون کی حاکمیت (Rule of Law):

خلافت راشدہ میں قانون کی حاکمیت کا تصور مکمل طور پر پایا جاتا تھا۔ قانون کی نظر میں سب مساوی تھے۔ خواہ وہ ذمی ہو یا مسلمان، نیز عدلیہ خودمختار، دیانتدار اور عاملہ کے کنٹرول سے آزاد تھی۔ مثلاً ذمی کے قتل کے عوض مسلمان قاتل کو قتل ہی کی سزا ملتی تھی۔ خلیفہ وقت اور کسی ذمی کے درمیان بھی اگر کوئی جھگڑا پیدا ہو جاتا تو خلیفہ کو عدالت میں حاضر ہو کر فریق مخالفت کے ساتھ قاضی کے سامنے کھڑا ہونا پڑتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب وہ خلیفہ تھے، اپنی زرہ حاصل کرنے کے لئے عدالت میں استغاثہ دائر کیا تو نصرانی کے ساتھ عدالت میں حاضر ہوئے اور کافی ثبوت مہیا نہ کر سکنے کی وجہ سے آپ رضی اللہ عنہ کا استغاثہ خارج کر دیا گیا۔ آج کہ مہذب و جمہوری دنیا میں بھی قانون کی حاکمیت کا تصور اس حد تک مکمل نہیں ہے کہ خود سربراہ ریاست کو بھی عدالت میں طلب کیا جا سکے۔

5- فلاحی ریاست:

خلافت راشدہ کے دور میں حکومت کا مقصد عوام کی فلاح و بہبود تھا۔ خلیفہ کا فرض تھا کہ وہ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ ''اگر دریائے دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر جائے تو اس کی ذمہ داری بھی سربراہ ریاست پر ہوگی۔''

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ عالم میں پہلی مرتبہ کسی ریاست نے عوام کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ جیسا کہ حتی نے لکھا ہے۔

> "This is the first instance in the history of the world where the government took the responsibility of feeding and clothing the entire population of the state."

وہ رات کو رعایا کے حالات سے باخبر رہنے کے لئے چکر لگاتے۔ ضرورتمند کو اناج پہنچاتے، مصیبت زدہ کی مصیبت دور کرنے کی کوشش کرتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں دولت کی فراوانی کی وجہ سے زکوۃ لینے والا نہیں ملتا تھا۔ حکومت آمد و رفت کو بہتر بنانے کے لئے راستے بناتی، پانی مہیا کرنے کے لئے نہروں کا اہتمام کرتی، زراعت کی ترقی کے لئے اقدامات کرتی، تجارت کے فروغ کے لئے ضابطے بناتی، تعلیم کے فروغ کے لئے اقدامات کئے جاتے، غرض یہ کہ عوام کا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے ہر قسم کی کوششیں کی جاتیں۔

6- اشاعت دین کا اہتمام:

انسان کی سب سے بڑی ضرورت ''ہدایت'' ہے۔ اس لئے خلافت راشدہ میں حکومت دین کی اشاعت کو حکومت کے مقاصد میں اولیت حاصل تھی۔ مساجد کا قیام، موذنوں کا تقرر ان کی تنخواہیں مقرر کرنا اور عوام کی دینی تعلیم کا بندوبست اسی سلسلے کے اقدامات تھے۔

www.urdukutabkhanapk

7- انسانی حقوق کا احترام:

خلافت راشدہ ایک دستوری حکومت تھی۔ عام لوگوں، قبائل اور اقلیتوں کے حقوق کے سلسلے میں میثاق مدینہ میں جو بنیادیں فراہم کی گئی تھیں، خلافت راشدہ میں برقرار رہیں۔ غیر مسلمانوں کو ''ذمی'' قرار دے کر ان کے حقوق کا باقاعدہ اعلان کیا گیا، اور ان کو سماجی، معاشی اور مذہبی آزادی دی گئی۔ مسلم عوام کے حقوق کا بھی تحفظ کیا گیا۔ جب حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کسی شخص کو ناحق سزا دی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''عمرو تم نے ان کو کب سے غلام بنایا ہے۔ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا۔'' حقوق انسانی میں ایک اہم حق اظہار رائے کی آزادی کا بھی ہے۔ جس کا احترام خلفائے راشدین کیا کرتے تھے۔ اسی آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے عبداللہ بن سبا نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازش کی اور خوارج نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف پروپیگنڈہ مہم چلائی۔ خلافت راشدہ کے بعد حکومت کے خلاف اظہار رائے کی اتنی آزادی نہ تھی۔

8- جمہوریت کی روح:

ساتویں صدی عیسوی میں انتخاب کا اس طرح کا نظام تو نافذ نہیں کیا جا سکتا تھا، جو آج کل ہے اور نہ ہی لوگ اپنے خلاف رائے کو برداشت کرنے کے سلسلے میں اتنے تنگ نظر تھے کہ ''خفیہ بیلٹ'' کی ضرورت پیش آئے تاہم خلافت راشدہ میں جمہوریت کی روح موجود تھی۔ یعنی خلیفہ عوام کی مرضی معلوم کر کے بنایا جاتا تھا۔ بلکہ گورنروں کا تقرر بھی عوام کی رائے سے ہوتا تھا۔ اگر عوام کسی گورنر کی شکایت کرتے تو اسے معزول کر دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات عوام کو پیغام بھیجا جاتا تھا کہ ''عامل'' کے تقرر کے لئے کسی مناسب آدمی کا انتخاب کر کے خلیفہ کو اطلاع دیں اور اس شخص کی تقرری عمل میں آتی تھی۔

حتی کے الفاظ میں

> "Even the ordinary citizen if he so desired could have a hand in administration of the state. Umar consciously initiated and encouraged democratic methods."

9- عصبیتوں سے پاک حکومت:

خلافت راشدہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس دور میں فیصلے قبائلی عصبیتوں کی بنیاد پر نہیں کئے گئے بلکہ جن لوگوں نے اس عصبیت کو بھڑکانے کی کوشش کی انہیں ناکامی ہوئی مثلاً بعض انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم نے آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد خلافت کا فیصلہ قبائلی بنیاد پر طے کرنے کی کوشش کی تو عامۃ المسلمین نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمات اسلام اور ذاتی بلندی کی بناء پر منتخب کر لیا۔ مسیلمۃ کذاب نے اپنی نبوت کو منوانے کے لئے قحطانی قبائل کے تعصب کو بھڑکا دیا، لیکن اسے شکست ہوئی اور وہی قحطانی قبائل اسلامی جنگوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ ابوسفیان نے قبائلی بنیادوں پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلاف بھڑکانا چاہا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سخت جواب دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف فتنہ انگیزی میں بنو ہاشم کے اکابرین نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دفاع کی بھرپور کوشش کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور حکومت کو بھی ''ہاشمی'' دور قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے اعزہ و اقارب کو کبھی ناجائز فائدے نہیں پہنچائے۔ الغرض امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پہلے حکمران ہیں جنہوں نے امویوں کو ''شاہی خاندان'' قرار دیا اسی وجہ سے ان کا دور خلافت راشدہ میں شامل نہیں کیا جاتا۔

تعمیرات:

خلافت راشدہ کے نصف اول میں فن تعمیر میں سادگی برقرار رہی۔ مکانات پتھروں یا اینٹوں کو گارے سے لگا کر بنائے جاتے تھے۔ مسجد نبوی بھی بہت سادی بنی ہوئی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ویسے ہی اس معاملے میں اسراف کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے مسجد نبوی کی توسیع

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سادگی کو برقرار رکھا۔ تاہم ضرورت پیش آنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی عمدہ اور مضبوط عمارت کا اہتمام فرماتے۔ عہد فاروقی میں کوفہ، بصرہ اور فسطاط وغیرہ شہر بسائے گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بانسوں کے ستون اور گھاس پھوس کی چھت کا حکم دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے جو مکانات بنوائے تھے ان میں صرف تین کمرے بنانے کی اجازت تھی۔ بعض عمال نے اپنے لئے ڈیوڑھی یا بالا خانہ تعمیر کروایا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس امتیاز کو ناپسند فرمایا اور اسے گروا دیا۔ عہد فاروقی میں مصر میں ایک قلعہ بنایا گیا جو بہت مضبوط تھا اور اس کی تعمیر میں پورا ایک سال صرف ہوا۔ کوفہ میں جو مسجد بنائی گئی وہ بلند چبوترے پر مضبوط اور وسیع تھی اور اس میں چالیس ہزار نمازی اکٹھے آسکتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے تک بہت سے غیر ملکی معماریہاں پہنچ گئے تھے جنہوں نے غیر ملکی فن تعمیر کا رواج شروع کیا چنانچہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اچھے اچھے مکانات کی تعمیر کروائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بہت سی مساجد اور بیت المال تعمیر کروائے۔ خلافت راشدہ کے بعد کے عہد میں فن تعمیر نے خوب ترقی کی لیکن وہ عظیم الشان سادگی ختم ہوتی چلی گئی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قائم رکھی تھی۔

مسجد کا مقام:

خلافت راشدہ تک مسجد اسلامی معاشرے کا ثقافتی وعلمی مرکز تھی۔ اس کی حیثیت قومی اجتماع گاہ کی تھی۔ یہاں پر مذہبی، علمی، سیاسی اور ثقافتی سرگرمیاں فروغ پاتی تھیں۔ خلافت راشدہ کے بعد شاہی دربار اور مدارس الگ ہوتے چلے گئے اور مسجد صرف نماز پڑھنے کی جگہ رہ گئی۔

تعلیم کی اشاعت:

تعلیم کی اشاعت کا اہتمام بھی خلافت راشدہ میں کیا گیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ابتدائی مدارس قائم کیے جن میں قرآن مجید، اخلاقی اشعار اور امثال عرب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ قرآن پاک جمع کر لیا گیا تھا اس لئے اب حدیث کی اشاعت کی طرف توجہ دی جارہی تھی۔ بڑے بڑے علماء، حفاظ جن میں اکثر وبیشتر صحابہ رضی اللہ عنہم تھے تعلیم وتعلم میں مشغول رہتے تھے۔ مدرسین ومعلمین باقاعدہ تنخواہیں لیتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس نظام کو برقرار رکھا بلکہ اس میں ترقی کی کوشش کی حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی علم کے قدردان تھے۔ انہوں نے اس سلسلے میں خصوصی توجہ دی۔

مذہبی آزادی:

خلافت راشدہ میں تمام مذاہب کو آزادی حاصل تھی۔ ذمی حسب منشاء پوری آزادی کے ساتھ اپنی عبادت گاہوں میں عبادت کرتے۔ بہت سے شہر فتح کرتے ہوئے اسلامی فوج کے جرنیلوں نے جو مذہبی حقوق ذمیوں کو دیئے اس کی مثال آج بھی کم ہی ملتی ہے۔

خلافت راشدہ کا نظام حکومت

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے دور خلافت میں فتنہ ارتداد اور جنگوں میں مشغولیت کی بناء پر نظام حکومت کی تدوین کے لئے خاطر خواہ اقدامات نہ کر سکے۔ دوسرے ان کا عہد حکومت انتہائی مختصر بھی تھا۔ خلافت راشدہ کے نظام کی تفصیل حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں طے ہوئیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وعلی رضی اللہ عنہ کے ادوار میں انہی خطوط پر کاروبار مملکت چلایا جاتا رہا۔ اس کی تمام تر تفصیلات کا ایک نہایت مختصر سا خاکہ درج ذیل ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مرکزی نظام

خلیفہ:

خلافت راشدہ میں خلیفہ سربراہ مملکت تھا اس وقت امام امیر المومنین خلیفہ کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ خلیفہ کے معنی خلیفۃ الرسول یعنی حضور ﷺ کے جانشین تھے۔ مذہبی امور کی سربراہی کی وجہ سے وہ امام تھا۔ بحیثیت امام مسجد نبوی میں خطبہ دیتا اور نمازوں کی امامت کرتا۔ ''اس دور میں یہ حکومت کی شان کا مظاہرہ خیال کیا جاتا تھا۔ عالم اسلامی میں گورنروں کا فرض تھا کہ وہ امامت کریں'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دارالخلافہ تبدیل کیا تو خلیفہ کوفہ کی جامع مسجد میں امامت کے فرائض سرانجام دینے لگا۔ خلیفہ اپنے خطبہ میں صرف عبادات پر ہی گفتگو نہ کرتا، ملک وملت کو درپیش مسائل پر اظہار خیال کرتا اور عوام کی رہنمائی کرتا۔ نظم ونسق کے مسائل اور اسلامی قانون کی تشریح (فقہ) بھی موضوع خطبہ ہوسکتی تھی۔ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کی یاددہانی بھی کروائی جاتی۔

امیر المومنین کا لقب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا اور ان کے بعد کے خلفاء نے بھی اسے برقرار رکھا۔ پروفیسر حسن ابراہیم حسن کے خیال میں لفظ امیر بالعموم فوج کے سربراہ کے لیے مستعمل تھا اور ''سچ پوچھیے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کی روحانی قیادت فتوحات اسلام میں کارفرما تھی۔ اس لفظ کے مفہوم پر جنگی اور انتظامی قیادت داخل ہے اور آپ رضی اللہ عنہ اس کے صحیح مصداق تھے۔'' القصہ امیر المومنین مسلمانوں کے قائد کو کہتے تھے جو دنیوی اور دینی تمام امور میں ان کا ''امام'' تھا اور اس حیثیت سے نبی ﷺ کا جانشین تھا۔

خلیفہ کو وسیع سیاسی ومذہبی اختیارات حاصل تھے لیکن اس کی ذمہ داریاں بھی بے پناہ تھیں۔ ''خلیفہ کا فرض تھا کہ وہ اسلامی قوانین کا تحفظ اور ان کا نفاذ کرے۔ عام فلاح وبہبود کی ذمہ داریاں اٹھانا بھی اس کا فرض منصبی تھا وہ مسلمانوں کا مذہبی وسیاسی مرکز تھا۔ ملک کا دفاع، داخلی امن وامان کا تحفظ، نظام عدل کو برقرار رکھنا اور اشاعت دین کے لیے اقدامات بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ لشکروں کے قائد مقرر کرتا اور ان کو ہدایات دیتا گویا وہ فوج کا سپریم کمانڈر تھا۔ صوبوں کے والی مقرر کرتا ان کے احتساب کا بندوبست کرتا ضرورت پڑنے پر ان کو معزول کرتا۔ قاضیوں کا تقرر براہ راست کرتا، دور دراز کے صوبوں میں بعض اوقات صوبائی گورنر بھی قاضیوں کا تقرر کرتے لیکن قاضی معزول بغیر کسی انتہائی معقول عذر کے نہ ہوتی اور کسی صوبائی گورنر سے اس کا اختیار نہ تھا۔ خلیفہ ہی کسی قاضی کو کسی شرعی عذر کے سبب علیحدہ کرنے کا مجاز تھا۔

خلیفہ کے اختیارات بہت وسیع تھے لیکن غیر محدود (Unlimited) نہ تھے۔ وہ اللہ جو حاکم مطلق (Absolute Sovereign) ہے خلیفہ اس کے احکام کا پابند تھا۔ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا واضح احکام کے خلاف فیصلے کرنے کا مجاز نہ تھا۔ شرعی حدود کے اندر شوریٰ کے فیصلے ماننا بھی اس کے لئے لازم تھا۔ وہ عوام کے ان حقوق کو بھی غصب نہیں کرسکتا تھا جن کی ضمانت اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے دی ہے۔ ان حقوق میں جان ومال، عزت وآبرو کی آزادی کے علاوہ اظہار رائے اور تنقید کا حق بھی شامل ہے۔

خلیفہ کی صفات:

یہ بات طے شدہ تھی کہ خلیفہ کی شخصیت علم وفضل، تقویٰ وتفقہ فی الدین (دین کی سمجھ بوجھ) کی حامل ہو۔ ''خلیفہ میں کم از کم اتنی علمی استعداد لازمی خیال کی جاتی تھی کہ وہ نئے نئے مسائل کا اپنی اجتہادی قابلیت سے فیصلہ کرسکے''۔ خلیفہ کا بلند سیرت (noble character) کا حامل ہونا اور گناہوں سے اجتناب بھی لازم تھا اور آئین اور حدود اسلام نافذ کرنے کی صلاحیت بھی ضروری تھی۔ تدبیر اور فہم کے ساتھ ساتھ فوجی بصیرت کی بھی ضرورت تھی تاکہ مجاہدین کی صحیح رہنمائی کرسکے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

شوریٰ:

خلافت راشدہ میں شوریٰ مہاجرین رضی اللہ عنہم اور انصار رضی اللہ عنہم میں سے چیدہ چیدہ صائب الرائے اصحاب پر مشتمل تھی۔ تاہم مدینہ میں موجود قبائلی شیوخ بھی مشورہ میں شامل ہوتے تھے۔ اس کے اجلاس مسجد نبوی میں ہوتے تھے۔

شوریٰ کی ایک شکل مشاورت عامہ بھی تھی یعنی اہم تر معاملات کے لئے مسجد نبوی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجلاس عام بلایا جاتا۔ دونوافل ادا کر کے مسئلہ زیر غور پر اظہار خیال ہوتا اور فیصلے ہوتے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں شوریٰ کے اجلاس باقاعدہ نہ رہے۔ تاہم تنقید ومشورہ کے حقوق برقرار تھے اس لیے خلیفہ کے سامنے سارے پہلو آتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں صوبائی گورنروں کی مجلس بھی ایک ادارے کے طور پر سامنے آئی جس میں درپیش مسائل پر فیصلے کئے گئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دارالخلافہ تبدیل کرلیا تو کوفہ میں شوریٰ بنائی۔ اس شوریٰ میں صحابہ کرام کم اور کوفہ کے اکابرین زیادہ تھے اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس وقت کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کی کثیر تعداد فوت ہو چکی تھی یا ضعف پیری کی وجہ سے امور حکومت میں حصہ لینے کی پوزیشن میں نہ تھی۔ بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم مدینہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کوفہ منتقل نہ ہوئے یا مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدل میں غیر جانبدار ہو کر خانہ نشین ہو گئے۔

کاتب:

امور حکومت سے متعلق امور کا ریکارڈ رکھتا تھا اور خلیفہ کی طرف سے خط وکتابت کرتا۔ بالعموم خلیفہ کی مہر اسی کے قبضہ میں ہوتی تھی۔

صوبائی نظام:

فاروقی عہد حکومت میں اسلامی سلطنت آٹھ صوبوں پر مشتمل تھی۔ فارس، خورستان اور کرمان کی فتح کے بعد ان کو الگ صوبے بنایا گیا۔ مصر اور فلسطین کو دو دو ذیلی صوبوں میں منقسم کیا گیا تھا۔ شام چار صوبوں کا مجموعہ تھا۔

عثمانی عہد میں شام کے چاروں صوبوں کو اکٹھا کر کے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کا گورنر بنا دیا گیا۔ اسی طرح مشرقی صوبوں پر عبداللہ بن عامر کو گورنر جنرل بنایا گیا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں آدھی سلطنت پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا قبضہ ہو گیا تھا اس لئے مصر وشام کے صوبے مرکزی حکومت سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ عراق مرکزی کی نگرانی میں آگیا اور حجاز میں گورنر مقرر کئے گئے۔

صوبائی حکام میں والی عامل قاضی کاتب دیوان اور صاحب بیت المال شامل تھے۔ صوبائی نظام کو کنٹرول کرنے کیلئے ہر صوبہ میں دارالامارت اور دارالایوان تعمیر کئے جاتے تھے۔ دارالامارہ (گورنر ہاؤس) والی کا دفتر تھا جبکہ الایوان محکمہ دفاع کا مرکز اور سیکرٹریٹ ہوتا تھا۔ ہر ضلع میں عامل خازن اور قاضی مقرر کئے جاتے تھے۔

معاشی نظام:

دور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں باقاعدہ بیت المال موجود نہ تھا بلکہ عہد نبوی کی طرح مال غنیمت اور دوسرے ذرائع سے حاصل ہونے والی رقوم کو تقسیم کر دیا جاتا تھا اور بوقت ضرورت عوام سے اپیل کر کے وسائل فراہم کئے جاتے تھے۔ ایران وروم کے خلاف جنگیں چھڑیں تو فوجی اخراجات

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نے مستقل حیثیت اختیار کر لی۔ اس لئے عہد فاروقی میں باقاعدہ بیت المال قائم کیا گیا۔ جس سے حکومتی مشینری اور دفاع کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔

آمدنی کے ذرائع میں زکوۃ مال غنیمت کا پانچواں حصہ (خمس)، عشر (زرعی پیداوار کا دسواں حصہ)، خراج (مفتوحہ علاقوں کی زمین کی آمدنی میں حکومت کا حصہ) عشور (تجارتی مال پر ٹیکس) اور جذیہ (غیر مسلموں سے ان کی حفاظت کا معاوضہ) کے علاوہ سرکاری زمیوں کی آمدن بھی شامل تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تجارت کی غرض سے پالے جائے والے گھوڑوں پر زکوۃ عائد کردی تھی لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے گھوڑوں پر زکوۃ لینے کے فاروقی فیصلے کو منسوخ کر دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق وشام میں جاگیرداری ختم کر دی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور قریش سرداروں کو عراق وشام میں زمینیں خریدنے سے منع کر دیا تاہم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے قریشی سرداروں کو مفتوحہ علاقوں میں زمینیں خریدنے کی اجازت دے دی۔ باقی تمام پہلوؤں سے فاروق اعظم کے عہد کے فیصلوں کو برقرار رکھا گیا۔

افتادہ زمین کی آبادکاری اور آبپاشی کے لئے خصوصی اقدامات کئے گئے۔ جن میں نہروں کی کھدائی اور پانی کو ذخیرہ کرنے کے لئے تالابوں کی تعمیر بھی شامل تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کام کا آغاز کیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کام کو جاری رکھا۔

فوجی نظام:

ایران وروم کے خلاف مستقل جنگوں اور وسیع حکومت کے دفاعی تقاضوں کے پیش نظر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے دفاع کا مستقل محکمہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ رضاکاروں کے ساتھ ساتھ مستقل فوج رکھی جانے لگی تھی۔ جس میں شامل مجاہدین کو تنخواہ ملتی تھی۔ فوجی چھاؤنیاں قائم کرنے کی پالیسی بھی اختیار کی گئی تاکہ مفتوحہ علاقوں کا موثر دفاع کیا جاسکتے، کوفہ، بصرہ، موصل، فسطاط، دمشق اور حمص اہم فوجی چھاؤنیاں تھیں۔ کوفہ، بصرہ اور فسطاط ان شہروں میں سے تھے جو مسلمانوں نے اس دور میں خود آباد کئے تاکہ اپنی فوجوں کو وہاں مقیم رکھا جاسکے۔ فوجی چھاؤنیوں میں فوج کے علاوہ گھوڑے اور اسلحہ کا سٹاک بھی موجود ہوتا تھا۔ سپاہیوں کو خوراک ولباس کے علاوہ تنخواہ بھی ملتی تھی اور ان کے بیوی بچوں کو وظائف بھی دیئے جاتے جو ان کی شہادت یا وفات کے بعد بھی جاری رہتے۔

"سپاہیوں کی رہائش وصحت کا اچھا انتظام کیا جاتا تھا۔ ان کے پڑاؤ اور چھاؤنیوں کے لئے ایسا مقام تلاش کیا جاتا جو صحت کے لیے مفید ہو۔ ہر لشکر کے ساتھ طبیبوں اور جراحوں کی ایک تعداد ہمیشہ موجود رہتی"۔ (حتی)

تنخواہوں، وظائف اور مال غنیمت کی تقسیم کے نظام کی کامیابی سے ولیم میور جیسا ناقد مستشرق بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اس نے لکھا:

"ایک عظیم قوم کا اپنے درمیان پوری آمدنی، مال غنیمت، فتوحات کو باہم تقسیم کرنا پہلے انسانی مساوات کی بنیاد پر، پھر فوجی اور روحانی امتیازات کی بنیاد پر، ایک ایسا قابل دید معجزہ ہے جس کی دنیا بھر میں کہیں مثال نہیں ملتی۔"

"A great nation dividing thus amongst them their whole of revenues, spoils, and conquests, first on the principle of equal brotherhood, and next on the martial and spirtual distinction is a spectacle probably without parallel in the world."

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

عدلیہ اور انصاف کا نظام:

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے عدلیہ کے ڈھانچے کو جس عمدگی سے قائم کیا اس کو باقی خلفاء کے عہد میں بھی برقرار رکھا گیا۔ قاضی کی تقرری کے لیے اعلیٰ اخلاقی معیار، قابل اعتماد کردار، ذہنی صلاحیتوں اور اسلامی قانون کے علم کو معیار بنایا جاتا۔ قاضی گورنروں کے ماتحت نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی عامل ان کو معزول کر سکتا تھا۔ عدلیہ اس حد تک آزاد، بااختیار تھی کہ خود خلیفہ کو بھی عدالت میں طلب کیا جا سکتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ اپنے زمانے میں خود عدالت میں پیش ہوئے اور قاضی وقت نے ضرورت محسوس کی تو ان کے خلاف بھی فیصلہ سنایا۔

غیر مسلموں کو شخصی قانون کے تحت اپنے مقدمات کا فیصلہ کروانے اور اپنی پنچائتوں میں فیصلے کروانے کا حق حاصل رہا۔ مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے مفتی مقرر کئے گئے جو مفت قانونی مشورے دیتے تھے۔

خلافت راشدہ کے نظام عدل کی کامیابی پر تبصرہ کرتے ہوئے حتی نے لکھا ہے کہ "پورے دور خلافت راشدہ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملی کہ کسی قاضی نے رشوت لی ہو یا جانبداری کا مظاہرہ کیا ہو اور مقدمہ بازی کی نوبت بھی کم ہی آتی تھی۔"

> "During the whole period of the pious Khilafat there was not a single complaint that a Qazi accepted only bribe or acted partialy. Litigations were very fiw."

پولیس اور جیل خانہ جات:

جرائم کی روک تھام اور مشتبہ افراد کی نگرانی کے لئے شعبہ احداث یعنی پولیس کا محکمہ بھی قائم کیا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ضرورت کے تحت اس شعبہ کو مضبوط تر بنایا۔ ان کے زمانے میں پولیس رات بھر شہروں میں پہرہ دیتی۔ مشتبہ افراد کو جیلوں میں بند کیا جا سکتا تھا۔ صاحب الشرطہ رات گشت کے علاوہ مارکیٹوں کی نگرانی کا بھی ذمہ دار تھا۔ وہ ترازو اور باٹ بھی چیک کرتا اور ملزموں کو حراست میں بند کرنا بھی اس کی ذمہ داری تھی۔

اشاعت دین اور تعلیم کا فروغ:

خلافت راشدہ میں دین کی اشاعت حکومت کے اہم مقاصد میں سے ایک مقصد تھا۔ مفتوحہ علاقوں میں مساجد کا قیام، مدارس کی تعمیر اور نماز باجماعت کا اہتمام اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ مساجد، مدارس میں قرآن وحدیث اور اسلامی قانون (فقہ) کی تعلیم دی جاتی تھی اور اسلام کی تعلیمات اور اخلاق حسنہ کے فروغ کی کوشش کی جاتی تھی۔

رفاہ عامہ:

خلافت راشدہ بنیادی طور پر رفاہی ریاست تھی جس میں عوام کی فلاح و بہبود کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ مواصلات کے نظام کو بہتر بنانے کے لئے اور سڑکوں کی تعمیر کی طرف خصوصی توجہ دی گی۔ ڈاک کا شعبہ قائم کیا گیا جس میں اطلاعات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا اہتمام ہوتا تھا۔

القصہ خلافت راشدہ کا نظام ہر لحاظ سے ترقی یافتہ تھا اور اس میں منتظم معاشرے کے قیام اور انسانوں کی بہتری کے لئے اقدامات کی پوری صلاحیت موجود تھی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا نظام حکومت

(Administration under Hazrat Umar R.A)

آنحضرت ﷺ نے اسلامی نظام حکومت عملاً قائم کر دیا تھا۔ لیکن آپ ﷺ کے زمانے میں اسلامی حکومت کی حدود صرف عرب تک محدود تھیں۔ اسلامی ریاست کے مسائل بھی محدود تھے اور اس کے لئے کسی تفصیلی ڈھانچے کی ضرورت نہ تھی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا زمانہ بھی اندرونی انتشار اور دفاع ریاست میں صرف ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اسلامی سلطنت میں شام، مصر اور عراق، ایران بھی شامل ہو گئے تو یہ دنیا کی سب سے بڑی متمدن حکومت بن گئی۔ اس وسیع و عریض سلطنت کے انتظام کے لئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک تفصیلی نظام مدون کیا جو آنحضرت ﷺ کے دیئے ہوئے اصولوں پر مبنی تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی کثیر تعداد زندہ تھی۔ انہوں نے اس نظام کی تشکیل میں آپ کی مدد کی اور ایک ایسا نظام تیار ہو گیا جو ایک طرف عقل و حکمت کے تمام تقاضے پورے کرتا تھا اور دوسری طرف اجماع امت کی وجہ سے اسے تمام عوام کا پورا اعتماد حاصل تھا۔ فاروقی عہد کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس نظام کو کم و بیش اسی طرح برقرار رکھا۔ اس لئے اسے خلافت راشدہ کا نظام حکومت بھی کہا جا سکتا ہے۔ نظام خلافت راشدہ کی تشکیل کا تجزیہ کرتے ہوئے محمد حسین ہیکل رقمطراز ہے:

''یہ نظام نہ کسی منطقی فکر آرائی کا نقطہ تھا، نہ فقہاء کی قانون سازی کا کارنامہ جنہوں نے مل بیٹھ کر اور اس کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے اسے مرتب کیا ہو اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ یا آپ ﷺ کے خلفاء نے اس کو نافذ کر دیا ہو۔ نہیں ہرگز نہیں! یہ نوزائیدہ سلطنت اپنی طفولیت سے لڑکپن اور لڑکپن سے شباب تک کے ارتقائی مرحلے بڑی تیزی سے طے کر رہی تھی۔ اس لئے والی سلطنت کا اولین فرض تھا کہ ان حالات کا لحاظ رکھے جو ارتقائی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس سلطنت میں رونما ہو رہے تھے اور سب سے پہلے اس مرکزی قوت کو منظم کرے جو اس انقلاب و ترقی کی پس پردہ کام کر رہی تھی اور مملکت کے مختلف حصوں کو ایک مضبوط لڑی میں پرو کر انہیں ناقابل شکست بنا دے۔''

خلیفہ (Caliph):

''خلیفہ'' کو نظام حکومت میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق حضور ﷺ کے جانشین بنے تو انہیں خلیفۃ الرسول کہا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فاروق ان کے جانشین اور خلیفہ ثانی تھے۔ آپ نے اپنے لئے امیر المومنین کی اصطلاح استعمال کی۔ خلیفہ انتظامیہ کا سربراہ، قانون سازی کا مرکزی کردار، عدلیہ کا نگران اور افواج کا سپریم کمانڈر تھا۔ لیکن اس کی حکومت شخصی نہ تھی اور نہ ہی خلافت موروثی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس بات کی وضاحت کی تھی کہ ''میں نے اپنے کسی بھائی بند کو خلیفہ نہیں مقرر کیا بلکہ عمر رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا ہے'' انہوں نے اپنے اس فیصلے کی باقاعدہ توثیق کروائی گویا آپ کا انتخاب عوام کی مرضی کے مطابق ہوا۔

خلیفہ کے اختیارات وسیع تھے لیکن اپنی طرف وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کا پابند تھا اور انہی کی روشنی میں تمام معاملات طے کرتا تھا۔ دوسری طرف وہ شوریٰ کے مشورے اور عوام کے فیصلوں کا بھی پابند تھا۔ الا یہ کہ وہ کسی فیصلے کو اللہ و رسول اللہ کے واضح احکام (صریح نص) سے متصادم سمجھتا ہو۔ ایسی صورت میں وہ اس کی وضاحت کر دیتا تھا۔

بیت المال خلیفہ کا ذاتی مال نہ تھا بلکہ عوام کا مال سمجھا جاتا تھا جیسا کہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واضح فرمایا تھا۔ ''مجھ کو تمہارے مال میں اسی طرح حق ہے جس طرح یتیم کے مال میں اس کے مربی کا ہوتا ہے۔ اگر میں دولت مند ہوں گا تو کچھ نہ لوں گا اور اگر صاحب حاجت ہوں گا تو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دانے سے کھانے کے لیے لوں گا۔ صاحبو! میرے اوپر تمہارے متعدد حقوق ہیں جن کا تم کو مجھ سے مواخذہ کرنا چاہیے۔ ایک یہ کہ ملک کا خراج اور مال غنیمت بے جا طور پر صرف نہ ہونے پائے، ایک یہ تمہارے روزینے بڑھاؤں اور تمہاری سرحدوں کو محفوظ رکھوں اور یہ کہ تم کو خطرات میں نہ ڈالوں۔"

بیت المال کے سلسلے میں خلیفہ کے اختیارات کا محدود ہونا صرف سیاسی نعرہ نہ تھا بلکہ عملاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ فاروق نے اس پر عمل کیا۔ مثلاً بیماری کے دوران جب ان کے لئے شہد تجویز کیا گیا اور شہد بیت المال میں موجود تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی میں عام مسلمانوں سے باقاعدہ اجازت طلب کی "اگر آپ اجازت دیں تو میں بیت المال سے تھوڑا سا شہد لے لوں۔"

شوریٰ(Consultative Body):

خلیفہ انتظامیہ کا سربراہ تھا اور فوجوں کا سپریم کمانڈر بھی لیکن وہ تمام فیصلے "شوریٰ" کے مشورے سے کرتا۔ مجلس شوریٰ میں تمام امور حکومت زیر بحث آتے تھے۔ ان میں فوج کے کمانڈروں اور صوبائی گورنروں اور عہدیداروں کی تقرریاں بھی شامل تھیں۔ وہاں خلیفہ کے اختیارات ذاتی (Discretionary) نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ شوریٰ کے مشورہ (Aid and Advice) کا پابند تھا۔ اس مجلس میں بنو اوس، بنو خزرج اور مہاجرین کی نمائندگی ہوتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں، اس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ جیسے صحابہ کرام شامل تھے۔ شوریٰ میں مہاجرین رضی اللہ عنہم اور انصار کے دونوں قبائل (بنو اوس، بنو خزرج) کی نمائندگی ہوتی تھی۔ شوریٰ کا یہ تصور آنحضرت ﷺ کی سنت ہی سے لیا گیا تھا۔ کیونکہ آپ ﷺ بھی اہم معاملات میں صحابہ سے مشورہ لیتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو باقاعدہ ایک ادارہ کی شکل دے دی۔ تاہم ارکان شوریٰ کے لیے ضروری تھا کہ وہ دین کا فہم رکھتے ہوں اور باصلاحیت ہوں۔ کبار صحابہ کی دیانتداری تو ویسے ہی شک وشبہ سے بالاتر ہوتی تھی۔ القصہ پارلیمنٹ کے ارکان کی اہلیت کا معیار مقرر تھا۔ (آج کل کی پارلیمنٹ کی طرح وہ دولت مندوں اور زمینداروں کا اجتماع نہ تھا)

مشاورت عامہ(General Consultation):

شوریٰ کی دوسری شکل مشاورت عامہ ہوتی تھی۔ زیادہ اہم مسائل پر فیصلہ کرنے کے لیے تمام مہاجرین وانصار کو مسجد نبوی میں جمع کیا جاتا تھا۔ الصلوۃ جامعہ کی خصوصی صدا دی جاتی۔ سب مسلمان مسجد میں جمع ہوتے اور دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد موضوع زیر بحث پر غور کیا جاتا تھا۔ اسلامی جنگوں میں جب کبھی بھی نازک صورت حال پیدا ہوئی مشاورت عامہ کی ضرورت محسوس کی گئی۔ شام وعراق کے بارے میں جب بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے مطالبہ کیا کہ ان ملکوں کے باشندے غلام بنائے جائیں اور زمینیں مجاہدین میں تقسیم کردی جائیں تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس پر اعتراض کیا۔ بالآخر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عام مجلس میں اس پر طویل بحث ہوئی اور فیصلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق ہوا۔ جنگ نہاوند کے موقع پر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود محاذ پر جانے کا فیصلہ کیا تو اس بڑی مجلس مشاورت نے آپ کو فیصلہ بدلنے پر مجبور کردیا۔

جمہوریت کی روح(Spirit of Democracy):

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں موجودہ دور والی جمہوریت کا تو تصور بھی نہ تھا۔ ایران وروم کی حکومتیں خالص آمرانہ (Despotic) تھیں۔ ان کے زیر اثر غسانی اور حمیری حکومتوں میں بھی کہیں جمہوری روح پیدا نہ ہوئی تھی۔ قبائلی نظام میں شیخ کی تقرری کی حد تک مشاورت عامہ کا تصور موجود تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ شوریٰ میں مشاورت کی ہدایت فرمائی۔ نبی ﷺ نے اس کی عملی تعبیر پیش کی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو اس کی اصل روح کے مطابق جاری رکھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو دستوری ادارہ کی شکل دی۔ "فوج کی تنخواہ، دفتر

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کی ترتیب، عمال کا تقرر، غیر قوموں کو تجارت کی آزادی اور ان پر محصول کی تشخیص اس قسم کے بہت سے معاملات ہیں جن کی نسبت تاریخوں میں تصریح موجود ہے کہ مجلس شوریٰ میں پیش ہو کر طے پائے۔''

جمہوریت کا دوسرا مظہر عوام کے حقوق ہیں جن کو خلافت راشدہ میں محفوظ رکھا گیا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ پر گرفت کرتے ہوئے آپ کا یہ ارشاد'' عمرو ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا تھا تو نے ان کو کب سے غلام بنا لیا'' اسی حقیقت کا مظہر ہے۔ عوام کے حقوق میں سے سب سے نازک تنقید کا حق ہوتا ہے، جس کو آج کے جمہوری قائدین ہی برداشت نہیں کرتے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خود اپنی ذات کے بارے میں بھی یہ حق برقرار رکھا۔ ایک مرتبہ آپ کو مخاطب کرتے ہوئے ایک شخص نے کئی مرتبہ کہا اتق اللہ یا عمر اے عمر رضی اللہ عنہ اللہ سے ڈر۔ حاضرین میں سے کسی نے روکنا چاہا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''اس کو کہنے دو اگر یہ لوگ نہیں کہیں گے تو یہ بے مصرف ہیں اور ہم نہ مانیں تو ہم'' اور یہ آزادی صرف مردوں تک محدود نہ تھی بلکہ عورتیں بھی یہ حق رکھتی تھیں۔ ایک مرتبہ آپ رضی اللہ عنہ مہر کی رقم محدود کرنے کے بارے میں خطاب کر رہے تھے تو ایک عورت نے ٹوک دیا ''اے عمر اللہ سے ڈر'' اور خاتون کا مسلک صحیح تھا اس لئے کہ جو پابندی نبی ﷺ نے نہیں لگائی اسے لگانے کا حق کسی اور کو حاصل نہ تھا۔

شبلی نعمانی نے بجا طور نشاندہی کی ہے کہ ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی مثال اور نمونے کے بغیر جمہوری حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اگر چہ وقت کے تقاضوں کے تحت اس کے تمام اصول و فروغ مرتب نہ ہو سکے تاہم جو چیزیں حکومت جمہوری کی روح ہیں سب وجود میں آ گئیں ہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جمہوریت مادر پدر آزاد حکومت نہ تھی، اسلامی جمہوریت تھی یعنی تمام انسان مل کر بھی اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے فیصلے بدلنے کے مجاز نہ تھے۔

کاتب (Scribe):

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اگر چہ تمام امور خلافت خود ہی سر انجام دیتے تھے لیکن خطوط کا جواب دینے اور اسی نوع کے دوسرے کاموں کے لیے آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ کو کاتب یا سیکرٹری بنا رکھا تھا۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ بہت پائے کے صحابی تھے اور خود رسول اللہ ﷺ کو بھی آپ کی تحریر بہت پسند تھی۔

صوبائی نظام (Provincial Administration)

صوبائی تقسیم:

شروع میں اسلامی سلطنت کو انتظامی سہولت کے لیے آٹھ صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا، مکہ، مدینہ، شام، جزیرہ، بصرہ، کوفہ، مصر، فلسطین لیکن مزید فتوحات حاصل ہونے پر فارس، خراسان اور آذربائیجان کو بھی صوبہ کی حیثیت دی گئی اور یہ تینوں صوبے نوشیروان کے عہد سے قائم تھے ان کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی طرح برقرار رکھا اور فلسطین و مصر کو دو دو صوبوں میں منقسم کر دیا گیا۔ مصر میں ایک خاص نظام قائم ہوا تھا۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص کو مصر کا گورنر جنرل بنایا گیا اور مصر کے دونوں صوبوں کے ڈپٹی گورنر الگ مقرر کیے گئے۔ اس طرح پوری سلطنت کو حسب ضرورت اتنے صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا کہ انتظام چلانا آسان ہو گیا۔

عامل کا تقرر (Appointment of Governors):

کسی صوبے کا حاکم یا عامل وہاں کے عوام کی مرضی کے مطابق مقرر کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوفہ، بصرہ اور شام کے عامل مقرر کرنے کے لیے وہاں کے عوام سے کہہ بھیجا کہ وہ سب سے اہل اور دیانت دار آدمی کا انتخاب کر کے بھیجیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہی کی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

رائے کے مطابق گورنر (عامل) مقرر کر دیئے۔ عامل کی تقرری کے لیے مجلس شوریٰ سے بھی منظوری لی جاتی تھی۔ چنانچہ عثمان رضی اللہ عنہ بن حنیف کی تقرری مجلس شوریٰ ہی نے کی تھی۔ اگر کسی علاقہ کے عوام اپنے گورنر کے خلاف شکایت کرتے تھے تو اسے معزول کر دیا جاتا تھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ بن یاسر جیسے معزز صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کو عوام کی شکایت کی بناء پر معزول کر دیا گیا۔

آپ رضی اللہ عنہ جب کسی شخص کو عامل مقرر فرماتے تو اسے ایک فرمان عطا کرتے جس میں اس کے حقوق و فرائض درج ہوتے۔ اس فرمان پر مہاجرین و انصار کی گواہی ثبت ہوتی۔ عامل جہاں جاتا اس فرمان کو عوام الناس کے سامنے پڑھ کر سناتا تاکہ وہ اسی کی روشنی میں اس کے طرز عمل کا جائزہ لیتے رہیں اور انحراف کی صورت میں امیر المومنین کے پاس شکایت کر سکیں۔ بالعموم آپ رضی اللہ عنہ گورنر کو مندرجہ ذیل ہدایات فرماتے:

> ''سنو میں تمہیں حاکم اور سلطان بنا کر نہیں بھیج رہا ہوں بلکہ میں تمہیں لوگوں کا قائد بنا کر بھیج رہا ہوں تاکہ وہ تمہارے نقش قدم پر چلیں۔ مسلمانوں کو ان کے حقوق ادا کرو۔ انہیں پیٹنا شروع نہ کر دینا کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان کی بے عزتی کرو اور نہ ہی ان کے بے جا تعریف کرنا مبادا کہ وہ نظم وضبط کے تقاضوں کو بھول جائیں۔ ان پر اپنے گھر کے دروازے بند نہ کرنا کہیں ایسا نہ ہو کہ ان میں سے قوی کمزور کو ہڑپ کر جائیں۔''

ہر عامل سے یہ عہد لیا جاتا کہ وہ ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوگا، باریک کپڑے نہیں پہنے گا، چھنا ہوا آٹا نہیں کھائے گا، دروازے پر دربان نہیں رکھے گا، اہل حاجت کے لئے دروازہ کھلا رکھے گا۔ جب کسی شخص کو عامل مقرر کیا جاتا تو اس کے مال واسباب کی ایک فہرست تیار کر لی جاتی۔ کسی وقت بھی اس کی جائیداد کی دوبارہ چیکنگ کی جا سکتی تھی اور اگر جائیداد میں غیر معمولی اضافہ ہوتا تو اسے ضبط کر لیا جاتا۔

عمال کا احتساب(Accountability):

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں صوبائی گورنروں کے احتساب کا معقول انتظام تھا۔ اس کی کئی صورتیں تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہر سال خود حج کی قیادت کرتے اور اعلان عام ہوتا کہ جس کو کسی سرکاری افسر یا گورنر کے خلاف شکایت ہو پیش کرے اور آپ رضی اللہ عنہ اس شکایت کا اسی وقت ازالہ کرتے۔ ایک گورنر کے خلاف جب ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ اسے بے قصور کوڑے مارے گئے ہیں تو آپ ﷺ نے اس آدمی کو بدلہ کا حق دیا۔ یہاں تک کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے دو اشرفی فی کوڑا دے کر اس قبطی کو راضی کیا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ شکایت ملی کہ انہوں نے اسیران جنگ کے ساتھ رئیس زادے اپنے لئے رکھ چھوڑے ہیں اور کاروبار حکومت زیاد بن ابیہ کے حوالے کر رکھا ہے اور ان کے پاس ایک لونڈی ہے جس کو نہایت اعلیٰ درجے کی غذا مہیا کی جاتی ہے جو عام مسلمانوں کو میسر نہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مواخذہ کیا۔ پہلا الزام غلط ثابت ہوا۔ زیادہ بن ابیہ کی قابلیت کی وجہ سے ابو موسیٰ کے طرز عمل کو تسلی بخش قرار دیا گیا تاہم لونڈی ان سے لے لی گئی۔ امیر معاویہ کا معیار زندگی بلند تر تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام کے سفر کے دوران خود اس پر گرفت فرمائی اور پوچھا۔ ''یہ کسریٰ کا سا انداز کیوں اختیار کیا ہے؟''

شعبہ تحقیقات(Investigation Department):

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک اور شعبہ کا بھی اضافہ کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے محمد رضی اللہ عنہ بن مسلمہ انصاری کو تحقیقات پر متعین فرمایا۔ جب بھی کسی گورنر کے خلاف شکایت موصول ہوتی، فوراً محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا جاتا۔ آپ جلیل المرتبت صحابی تھے۔ آپ کے سامنے غلط بیانی بہت مشکل تھی اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے معزز صحابی کو بھی تحقیقات کر کے گورنری سے معزول کیا جا سکتا تھا۔ ان کے بارے میں یہ شکایت ملی تھی کہ انہوں نے اپنے مکان کی ڈیوڑھی بنوائی ہے۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے الزام کو درست پایا اور سر عام ڈیوڑھی کو آگ لگوادی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ حاکم مصر کے بارے میں شکایت ملی کہ وہ باریک کپڑے پہنتے ہیں اور دروازے پر دربار رکھتے ہیں۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ انصاری کو بھیجا گیا۔ انہوں نے الزامات کو درست پایا اور اسی لباس میں عیاض رضی اللہ عنہ کو مدینہ لائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا باریک لباس اتروا دیا اور بالوں کا بنا ہوا کرتا پہنا کر بکریاں چرانے کا حکم دیا۔ عیاض کو انکار کی مجال تو نہ تھی لیکن بار بار یہ کہتے تھے کہ اس سے مرجانا بہتر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد یہ تھا "اس میں تمہیں شرم کیوں آتی ہے یہ تمہارا آبائی پیشہ ہے۔" عیاض نے اس واقعہ پر دل سے توبہ کی۔

صوبے کے دیگر عہدیدار (Other officials of provinces):

صوبہ میں عامل یا والی کے علاوہ مندرجہ ذیل عہدیدار ہوتے تھے۔ کتاب (میر منشی) کاتب دیوان (فوج کا ریکارڈ رکھنے والا)، صاحب الخراج (خراج اکٹھا کرنے کا ذمہ دار)، صاحب احداث (پولیس انچارج) صاحب بیت المال (افسر خزانہ) اور قاضی۔ صوبے کو اضلاع میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر ضلع میں قاضی، خزانچی اور عامل (ٹیکس وصول کرنے والا) مقرر ہوتے تھے۔ چنانچہ کوفہ میں عمار بن یاسر والی رضی اللہ عنہ، عثمان بن حنیف صاحب الخراج، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ افسر خزانہ، قاضی شریح جج یا قاضی اور عبداللہ بن خلف خزاعی کاتب دیوان تھے۔

اضلاع کا نظام (District Administration):

صوبہ جات کو اضلاع میں تقسیم کیا گیا تھا۔ بالعموم مفتوحہ علاقوں میں سابقہ اضلاع ہی کو برقرار رکھا گیا۔ مثلاً آذر بائیجان اور فارس کے صوبے 18 اضلاع میں منقسم تھے۔ جب کہ خراسان میں 16 اضلاع شامل تھے۔ اضلاع میں عامل، افسر خزانہ اور قاضی وغیرہ ہوتے ہیں اور یہ سب گورنر صوبہ کے ماتحت اور اس کے زیر حکومت کام کرتے تھے۔ بعض اوقات ایک ضلع میں کئی پرگنے ہوتے تھے جس میں سے ہر پرگنہ کا انتظام تحصیلدار کرتا تھا۔

معاشی نظام (Economic System)

بیت المال کا قیام (Establishment of public treasury):

آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیت المال قائم نہیں کیا گیا تھا بلکہ خراج اور مال غنیمت سے جتنی آمدنی ہوتی تھی وہ سب تقسیم کر دی جاتی تھی اور جب کوئی ضرورت پیش آتی تو مسلمانوں سے اپیل کر کے چندہ جمع کر لیا جاتا۔ لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ کی تجویز پر باقاعدہ بیت المال قائم کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے سادہ لیکن مضبوط عمارات تعمیر کی گئیں اور مال ضرورت کے اوقات کے لیے ان سے جمع رہنے لگا۔ بیت المال کی حفاظت کے لیے اس پر پہرہ بھی بٹھایا گیا۔ صوبہ جات کے بیت المال میں جتنی رقوم ہوتی تھیں عامل ان میں سے حسب ضرورت رکھ کر باقی مدینہ کے مرکزی بیت المال میں بھجوا دیتے تھے۔

ذرائع آمدن (Sources of Income):

بیت المال کی آمدن کے ذرائع حسب ذیل تھے:

1- خمس غنائم:

مال غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں جمع ہوتا تھا۔

2- زکوۃ:

صاحب حیثیت مسلمانوں کے مال پر اڑھائی فیصد وصول کی جاتی تھی۔ صرف سونے، چاندی اور نقد روپے پر ہی زکوۃ وصول نہیں ہوتی تھی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بلکہ تجارتی مال اور مویشیوں پر بھی زکوۃ وصول کی جاتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گھوڑوں پر بھی زکوۃ عائد کی کیونکہ ان کی وسیع پیمانے پر پرورش اور تجارت ہونے لگی تھی۔

3۔ عشر:

مسلمانوں کی زمین کی پیداوار میں اسلامی حکومت کا حصہ عشر کہلاتا ہے۔ بارانی زمین کی پیداوار میں سے دسواں حصہ لیا جاتا تھا۔ لیکن وہ زمین جنہیں کنویں وغیرہ سے سیراب کیا جائے وہاں یہ شرح 5 فیصد ہوتی تھی۔

4۔ خراج:

جن مفتوحہ علاقوں کی زمین مفتوحہ قوموں کے پاس رکھی جاتی تھی ان سے اخراج وصول کیا جاتا تھا۔ جس کی شرح معاہدہ صلح میں طے کی جاتی تھی۔ بالعموم یہ شرح پیداوار کا 1/2 یا 1/4 ہوتی تھی اور حالات کے مطابق خراج میں کمی بیشی کی جاسکتی تھی۔ اگر ان خراجی زمینوں میں سے کوئی حصہ مسلمان خرید لیں تو بھی یہ زمین خراجی ہی رہتی تھی۔ قحط سالی یا خشک سالی کی صورت میں خراج معاف ہو جاتا تھا اس کے برعکس عشر معاف نہیں ہوتا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں خراج کا نظام سب سے پہلے عراق پر نافذ کیا گیا جو شرح مقرر کی گئی وہ عادلانہ تھی۔ افتادہ زمینوں کے آباد ہونے سے آمدنی میں مزید اضافہ ہوا۔ جب عراق کا خراج اکٹھا ہو کر مدینہ پہنچتا تو امیر المومنین دس ثقہ اور معتمد اشخاص کو کوفہ و بصرہ سے طلب کرتے اور ان سے چار دفعہ قسم لے کر تصدیق کرواتے کہ مال گزاری میں کسی ذمی یا مسلمان پر ظلم نہیں ہوا ہے۔ اس دور کی خراج کی مقدار 8 کروڑ سے دس کروڑ بیس لاکھ سالانہ تک بتائی گئی ہے۔ شبلی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''یہ عجیب بات ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اگرچہ نہایت نرمی سے خراج مقرر کیا تھا لیکن جس قدر مالگزاری ان کے عہد میں وصول ہوئی زمانہ مابعد میں کبھی وصول نہیں ہوئی۔''

عراق کے علاوہ دیگر ممالک ایران، شام و مصر میں نہ زمین کی پیائش ہوئی نہ خراج کی نئی شرح مقرر ہوئی اور نہ ہی محکمہ مال کی زبان بدلی بلکہ محصول اکٹھے کرنے والے بھی مقامی لوگ ہی تھے۔ البتہ اگر کہیں ظلم روا رکھا جاتا تھا تو اسے ختم کر دیا گیا مثلاً رومی والی مصر سے جو غلہ منگواتے تھے وہ خراج کی رقم کے علاوہ ہوتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو ظلم قرار دیا اور مدینہ کو قحط کے زمانے میں بھیجا جانے والا غلہ خراج ہی کا حصہ تھا بلکہ بعد میں جب خراج صرف نقدی کی صورت میں وصول ہونے لگا تو مدینہ بھیجا جانے والا غلہ خرید کر بھیجا جاتا تھا۔ اسلامی لشکر کے لیے بھی غلہ خریدا جاتا تھا یا خراج کے طور پر وصول ہوتا تھا۔ جبراً نہیں لیا جاتا تھا۔ مصر میں لگان کی تشخیص ہر سال کی جاتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یہ رقم ایک کروڑ 20 لاکھ دینار سالانہ تھی۔ شام سے خراج کی وصولی بھی سابقہ دستور کے تحت ہی کی گئی جس کی مقدار ایک کروڑ 40 لاکھ دینار سالانہ بتائی گئی ہے۔ فارس، کرمان اور آرمینیا کے علاقوں میں خراج کی رقوم بالعموم ان معاہدات کے تحت وصول کی جاتی تھیں جو شہروں کو فتح کرتے ہوئے کئے گئے تھے۔

5۔ عشور:

عشور نام سے ایک بالکل نیا تجارتی ٹیکس بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لگایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو مسلمان تاجر غیر مسلم حکومتوں سے تجارت کرتے تھے ان سے دس فیصد ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی تجویز پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی یہ ٹیکس لگا دیا۔ موجودہ زمانے کی اصطلاح میں اس کو امپورٹ، ایکسپورٹ ڈیوٹی کہا جا سکتا ہے۔ یہ ٹیکس سال میں صرف ایک مرتبہ وصول کیا جاتا تھا۔ اور اس کے بعد سارا سال اس مال تجارت پر کوئی ڈیوٹی نہیں لی جاتی تھی۔ بالعموم اس کی شرح حربیوں (دشمن قوموں کے افراد) سے 10 فیصد ذمیوں سے 5 فیصد اور مسلمانوں سے اڑھائی فیصد تھی اور دو سو درہم سے کم کے مال پر کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

6- جزیہ:

غیر مسلم رعایا پر اسلامی ریاست کی فوج میں بھرتی ہونا لازمی نہ تھا بلکہ ان سے ایک حفاظتی ٹیکس "جزیہ" وصول کیا جاتا تھا۔ جزیہ کی شرح بالکل معمولی ہوتی تھی۔ یہ جزیہ بچوں اور بوڑھوں سے وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ اگر کوئی غیر مسلم فوجی خدمات پیش کر دے تو اس خاندان سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔

7- خالصہ زمین:

آنحضرت ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی بہت سی زمین کو "خالصہ" قرار دیا جس کی آمدن بیت المال میں جاتی تھی۔ مفتوحہ علاقوں میں شاہی خاندان کی جاگیریں، آتش کدوں کے اوقاف، لاوارث جائیدادیں نیز باغیوں اور مفروروں کی ضبط شدہ املاک بھی بیت المال کی ملکیت قرار دی گئی۔ ان زمینوں میں سے کسی ممتاز مسلمان کو زمین دی جا سکتی تھی۔ خالصہ زمین کی آمدنی حکومت کا خاصہ بڑا ذریعہ آمدن تھا۔ (تقریباً 70 لاکھ درہم سالانہ)۔

زرعی اصلاحات

1- پیمائش زمین وافتادہ زمیوں کی آبادکاری (Agricultural Reforms):

قرون وسطیٰ کے معاشی نظام میں زمین کو جو اہمیت حاصل تھی اس کے پیش نظر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پیداوار بڑھانے اور سرکاری واجبات کی تشخیص کے لیے بہت سی اصلاحات کیں۔ عراق میں زمین کی از سر نو پیمائش کروائی گئی تو کل قابل کاشت رقبہ تین کروڑ سات لاکھ جریب نکلا۔ ہر فصل کے لیے فی جریب مالیہ تشخص کر دیا گیا۔ جو زمین بے کار پڑی ہوئی تھی، اس کے متعلق اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص اسے زیر کاشت لے آئے اس کی ملکیت سمجھی جائے گی۔ اس طرح تمام زمین زیر کاشت آ گئی اور زرعی پیداوار میں خاصہ اضافہ ہوا۔ خراج کی رقم بھی ایک ہی سال میں سوا گنا ہو گئی۔

2- جاگیرداری کا خاتمہ (End of Fundalism):

شام وعراق میں جاگیرداری نظام رائج تھا۔ زمین فوجی افسروں کی ملکیت سمجھی جاتی تھی اور کاشت کاروں کی حیثیت مزارعین کی تھی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس نظام کی خرابی کو محسوس کیا اور اس کو یکسر ختم کر ڈالا۔ اس طرح ایرانی امراء کی عراقی جاگیریں اور رومی افسروں کی شام ومصر میں جاگیریں چھن گئیں۔ کاشت کار کو زمین کا مالک قرار دے دیا گیا بلکہ بعض مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ عراق وشام کی زمین مجاہدین میں تقسیم کر دی جائے بھی مسترد کر دیا گیا۔ اس طرح مسلمان جاگیردار طبقہ بھی پیدا نہ ہوا۔

3- مسلمانوں کو زمین خریدنے کی ممانعت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قریشی سرداروں کو مفتوحہ علاقوں میں زمین خریدنے سے منع کر دیا تاکہ وہ مفتوحہ علاقوں میں "شہزادوں" یا زمینداروں کی حیثیت اختیار نہ کر لیں۔ اس پابندی سے دو فوائد حاصل ہوئے۔ مسلمانوں میں شجاعت وجذبہ جہاد برقرار رہا اور ماتحت علاقوں میں بغاوت وانتشار کے امکانات کم ہو گئے۔

ولیم میور کے الفاظ میں "دوسری جگہوں پر عمر کسی کو ایک ایکڑ زمین کا مالک بننے کی بھی اجازت نہ دیتے تھے۔"

As elsewhere, Omar would not allow the Arabs to become proprieters of a single acre."

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نیز اس پابندی کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ پرانے کاشت کار جو اپنے فن کے ماہر تھے زیادہ اعتماد سے محنت کرنے لگے اور پیداوار میں اضافہ ہوا۔

۸۔ آبپاشی:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آبپاشی کی طرف بھی توجہ دی۔ نئی نہریں بنائی گئیں۔ تالاب تیار کیے گئے۔ نہروں کے پانی کی تقسیم کا از سر نو انتظام کیا گیا۔ صرف مصر میں ان تعمیرات میں مصروف مزدوروں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار بتائی جاتی ہے۔ نہروں کی تفصیل رفاہ عامہ کے کاموں میں آئے گی۔

عدالتی نظام

الگ شعبہ قضا کا قیام (Justice/Judicial System):

حضرت عمر رضی اللہ عنہ عدلیہ کی اہمیت سے واقف تھے۔ اس لیے جو علاقہ فتح ہوتا جاتا تھا وہاں قاضی مقرر کر دیے جاتے رہے۔ جب مفتوحہ علاقوں کا نظم درست ہو گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قضا کا شعبہ الگ کر دیا اور تمام اضلاع میں عدالتیں قائم کی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک فرمان جاری کیا جس میں قضا کے اصول بیان کیے گئے تھے۔ اس فرمان کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

''خدا کی تعریف کے بعد قضا ایک ضروری فرض ہے۔ لوگوں کو اپنے حضور میں، اپنی مجلس میں، اپنے انصاف میں برابر رکھو تاکہ کمزور انصاف سے مایوس نہ ہو اور زوردار کو تمہاری رورعایت کی امید پیدا نہ ہو جو شخص دعویٰ کرے اس کا ثبوت مہیا کرنے کی ذمہ داری اس پر ہے اور جو شخص الزام سے انکار کرے اس پر قسم۔ صلح جائز ہے بشرطیکہ اس سے حرام حلال اور حلال حرام نہ ہونے پائے۔ کل اگر تم نے کوئی فیصلہ کیا تو آج غور کر کے رجوع کر سکتے ہو۔ جس مسئلہ میں شبہ ہو اور قرآن و حدیث میں اس کا ذکر نہ ہو تو اس پر غور کرو، پھر غور کرو اور اس کی مثالوں اور نظیروں پر خیال کرو پھر قیاس لگاؤ۔ جو شخص ثبوت پیش کرنا چاہے اس کے لیے ایک معیاد مقرر کر دو۔ اگر وہ ثبوت دے تو اس کا حق اس کا دلاؤ ورنہ مقدمہ خارج کر دو۔ مسلمان سب ثقہ ہیں سوائے ان لوگوں کے جن پر حد جاری ہوئی ہو یا جنہوں نے جھوٹی گواہی دی ہو یا ولدیت اور وراثت میں مشکوک ہوں۔''

اس فرمان کے علاوہ بھی قاضیوں کی رہنمائی کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ مختلف معاملات پر فتاوی بھجواتے رہتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فتاوی آج بھی مختلف کتابوں میں محفوظ ہیں اور فقہا کی رہنمائی کرتے ہیں۔

مطلوبہ صفات:

انصاف کے قیام کے لیے عمدہ قانون کے علاوہ باصلاحیت اور دیانتدار قاضی بھی ضروری ہیں۔ اس لیے بالعموم قاضیوں کی تقرری براہ راست مرکزی حکومت کی طرف سے ہوتی تھی۔ قاضی ایسے شخص کو مقرر کیا جاتا تھا جو عاقل، بالغ مرد آزاد شہری ہو۔ جس کا کردار بے داغ ہو۔ جو سماعت اور بصارت میں کمزور نہ ہو اور جو اسلامی قانون سے پوری طرح واقف ہو (بوقت ضرورت وہ ماہرین فن سے مشورے لینے کا بھی مجاز تھا) وہ صالح حیثیت اور معزز آدمی ہوتا کہ اس پر دباؤ نہ ڈالا جا سکے۔ قاضی کو معقول تنخواہ بھی ملتی تھی اور اسے بلند معاشرتی مقام حاصل تھا اسے تجارت یا جز وقتی کاروبار کی اجازت نہ تھی اور اسے بغیر معقول سبب کے معزول نہیں کیا جا سکتا تھا۔

www.urdukutabkhanapk.blog

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جن حضرات کو قاضی بنایا ان کی دیانتداری، معاشرتی اور علمی مقام شک وشبہ سے بالاتر تھا۔ صحابہ کرام میں سے مدینہ کے قاضی زید رضی اللہ عنہ بن ثابت تھے جن کو حضور علیہ ﷺ نے کاتب وحی مقرر فرمایا تھا اور وہ سریانی اور عبرانی زبان کے بھی ماہر تھے۔ فقہ وقانون میں ان کا سکہ ہر جگہ مانا جاتا تھا۔ بصرہ میں کعب بن سور الازدی قاضی بنے جن کی معاملہ فہمی وذہانت مسلمہ تھی۔ فلسطین میں عبادہ رضی اللہ عنہ بن الصامت کو قاضی بنا کر بھیجا گیا جو اصحاب صفہ کے استاد تھے اور حضور علیہ ﷺ کی نگرانی میں انہوں نے قرآن حفظ کیا تھا اور اچھی طرح سمجھا تھا۔ کوفہ میں پہلے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو قاضی مقرر کیا گیا اور ان کے بعد قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ اس منصب پر فائز ہوئے جو امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے استاد تھے۔

قانون کی حکمرانی:

اگرچہ تمام قاضیوں کا تقرر امیر المومنین کی طرف سے ہوتا تھا لیکن خود امیر المومنین بھی بوقت ضرورت قاضی کی عدالت میں حاضر ہوتے تھے۔ مدینہ میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ قاضی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ میں کوئی نزاع پیدا ہوا تو آپ خود عدالت میں گئے۔ حضرت زید نے تعظیم کی تو آپ رضی اللہ عنہ نے ٹوکا کہ زید یہ پہلی ناانصافی ہے جو تم نے کی اور مقدمہ کا فیصلہ ہونے تک فریق مخالف ابن بن کعب رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے رہے۔ قانون کی نظر میں مساوات کی اس سے بہتر مثال لانا ناممکن ہے۔ آج کی جمہوری ریاستوں میں بھی سربراہ ریاست کو عدالت کے سامنے جوابدہ نہیں رکھا جاتا۔ صوبائی گورنر اور اعلیٰ افسران بھی قاضی کی عدالت میں پیش ہوتے تھے اور عدلیہ کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کر سکتے تھے۔

قانون کی حکمرانی میں یہ بھی شامل ہے کہ عدالت کے دروازے ہر شخص کے لیے کھلے رہیں۔ آج کی مہذب ریاستوں میں بھی قانون سے استفادہ کرنے کے لیے "کورٹ فیس" لگانی پڑتی ہے اور ہر شخص عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی حکومت میں قاضی کے لیے الگ عدالت کی تعمیر اس لیے نہ کی گئی کہ اس سے سائل کے راستے میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ مساجد کو عدالتیں قرار دیا گیا۔ کوئی شخص کسی بھی وقت عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا تھا۔ اور اس کے لیے نہ کورٹ فیس ادا کرنا پڑتی تھی نہ وکیل کی فیس۔ حق کی گواہی دینا ہر مسلمان پر فرض ہے اس لیے قاضی کے لیے فیصلہ کرنا زیادہ مشکل نہ تھا۔

عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی:

سربراہ مملکت یا بعض اوقات گورنر صوبہ کی طرف سے قاضیوں کے تقرر سے عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی کے اصول میں کوئی حرج واقع نہ ہوتا تھا۔ اس لیے صوبائی گورنر کو کسی قاضی کو الگ کرنے کا اختیار نہ تھا اور نہ صوبائی یا ضلعی قاضی ان کے ماتحت تھے۔ وہ براہ راست خلیفہ کے ماتحت تھے اور خود خلیفہ بھی بغیر کسی شرعی وجہ کے قاضی کو الگ نہیں کرتا تھا۔ قاضی امیر المومنین یا صوبائی گورنر کے خلاف فیصلہ دینے کے مجاز تھے۔

جسٹس امیر علی سید اس مسئلہ پر اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "نظم عدالت کا فریضہ دیوانی ججوں کے سپرد تھا، انہیں خلیفہ وقت مقرر کرتا تھا اور وہ گورنروں کے اثر سے آزاد ہوتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اولین اسلامی فرمانروا ہیں جنہوں نے اپنے ججوں کی تنخواہیں مقرر کیں اور انہوں نے ان کے فریضہ منصبی کو انتظامی کارپرداز افسروں کے فرائض سے علیحدہ قرار دیا۔"

"Justice was administered by civil judges, who were appointed by the Caliph and were independent of governors. Umar was the first ruler in Islam to fix salaries for his judges, and to make their office distinct from those of executive officers".

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قانون کی نظر میں مساوات(Equility before law):

سربراہ مملکت اور گورنر حضرات کی عدالت میں حاضری کا ذکر اوپر ہو چکا ہے لیکن وہ سب دربار رسالت کے تربیت یافتہ تھے اور اسلام کی روح انصاف کو سمجھتے تھے۔ بنوغسان کا بادشاہ جبلہ بن ایہم مسلمان ہوا تو اس نے ایک عام عرب کی پٹائی کر دی۔ مظلوم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس شکایت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا'' یہ تو تم عرب بدو کو راضی کر دیا وہ تمہاری ٹھیک اسی طرح خبر لے گا جس طرح تم نے اس کو پیٹا ہے۔'' جبلہ اس فیصلے پر سخت پریشان ہوا اور پوچھا'' کیا آپ کے نزدیک بادشاہ اور گنواروں میں کوئی فرق نہیں؟'' فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا جواب تھا'' بالکل نہیں تم دونوں کو اسلامی رشتے نے ایک سطح پر لا کھڑا کیا ہے''۔ جبلہ مرتد ہو گیا اور بھاگ کر روم چلا گیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خود اپنے بیٹے ابو شحمہ عبدالرحمٰن تک جس نے ابوسروعہ کے ساتھ مل کر شراب پی تھی، حالت بیماری میں کوڑے لگوائے یہاں تک کہ وہ کوڑوں کی تاب نہ لا کر فوت ہو گئے۔

قانون کی نظر میں مساوات کا نعرہ لگانے والے آج بھی اس طرح کے انصاف کی نظیر پیش نہیں کر سکتے۔

شخصی قانون اور پنچائتی نظام:

ذمیوں کو شخصی قانون کی سہولت میں بھی حاصل تھی اور اپنے اکثر و بیشتر مقدمات کا فیصلہ اپنے شخصی قانون (Personal Law) کے تحت ہی کرتے تھے اور اس کے لیے انہیں قاضی سے رجوع کرنے کی ضرورت نہ تھی اور اپنی پنچائتوں ہی میں تمام فیصلے کر لیتے تھے۔ یہ فاروقی نظام حکومت کی وہ صفت ہے جس کی مثال اس دور کے کسی غیر مسلم ملک میں نہیں ملتی۔ اس آزادی نے مفتوحہ ممالک کے عوام کو اسلامی حکومت کا مداح بنا دیا۔

افتاء:

''قانون سے ناواقفیت کوئی عذر نہیں'' (Ignorance of law is no excuse) کا اصول بین الاقوامی طور پر مسلمہ ہے لیکن عام لوگوں میں قانون کی واقفیت پیدا کرنے کے لیے کوئی معقول انتظام کہیں بھی موجود نہیں۔ عہد فاروقی میں اس کے لیے افتاء کا شعبہ قائم کیا گیا تھا۔ جگہ جگہ مفتی مقرر کئے جاتے تھے جو اسلامی قانون کے ماہرین ہوتے تھے کوئی شخص کسی بھی وقت مفتی کی طرف رجوع کر کے قانونی مشورے حاصل کر سکتا تھا اور اس کے لیے نہ اسے فیس ادا کرنی پڑتی تھی نہ معاوضہ، مفتی کا تقرر بھی خود خلیفہ ہی کی طرف سے ہوتا تھا۔

محکمہ پولیس (شعبہ احداث) کا قیام(Police Department):

عہد فاروقی میں دیوانی و فوجداری مقدمات کی سماعت تو قاضی ہی کیا کرتے تھے البتہ فوجداری نظام کو موثر بنانے کے لیے آپ نے پولیس کا الگ محکمہ قائم کیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو بحرین میں صاحب الاحداث مقرر کیا گیا تو انہیں ان کو دو فرائض سونپے گئے:

i. امن و امان کا قیام، گزرگاہوں کی حفاظت، مجرموں کی گرفتاری وغیرہ۔

ii. احتساب عامہ'' مثلاً دکاندار ناپ تول میں کمی نہ کریں، کوئی شخص شاہراہ پر مکان نہ بنائے، جانوروں پر زیادہ بوجھ نہ لادا جائے، شراب اعلانیہ نہ بکنے پائے اور اس قبیل کے اور بہت سے امور کی نگرانی جن کا تعلق پبلک، مفاد عامہ اور احترام شریعت سے تھا۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جیل خانہ جات کی تعمیر اور جلاوطن کی سزا(Prison and Exile):

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قیام امن کے لیے جیل خانہ جات بھی بنوائے۔ وہ مجرم جنہیں جرم سے باز رکھنا مشکل ہوتا جیل خانے بھیج دیے جاتے تھے تاکہ لوگ ان کے شر سے محفوظ ہو جائیں اور جیل میں انہیں بھی دینی اصلاح کا موقع مل سکے۔ سب سے پہلے مکہ میں صفوان بن امیہ کا مکان 4 ہزار درہم میں خرید کرا سے جیل قرار دیا گیا۔ نا قابل اصلاح قسم کے مجرمین کو جلاوطن بھی کر دیا جاتا تھا۔ مثلاً ابو محجن ثقفی کو بار بار شراب پینے کا جرم کرنے پر ایک جزیرے میں جلاوطن کر دیا گیا۔

فوجی نظام(Military System: Army Formation)

شعبہ فوج کا قیام:

نبی ﷺ کے عہد میں مسلمانوں کی تعداد محدود تھی۔ اس لیے جنگ کی صورت میں تمام مسلمان جہاد میں شریک ہوتے تھے اور اس کے لیے کسی شعبہ کی ضرورت نہ تھی۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مختصر زمانہ حکومت میں بھی یہی طریقہ جاری رہا۔ لیکن عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جنگوں کا سلسلہ بہت پھیل گیا تھا اس لیے کچھ لوگوں کو مستقل طور پر مصروف پیکار رہنا پڑتا تھا۔ چنانچہ آپ نے 15ھ میں شعبہ فوج کی باقاعدہ تشکیل کی۔ یہ شعبہ فوج کا مکمل ریکارڈ رکھتا تھا۔ فوجیوں کی تنخواہوں اور رسد اور ان کے بچوں کے لیے وظائف کا انتظام اس شعبہ کی ذمہ داری تھی۔ ''عمر اول پہلے حکمران ہیں جنہوں نے سپاہیوں کو نقد تنخواہیں ادا کرنے کا نظام رائج کیا۔''

"Umar I was the first ruler to introduce the system of paying regular salaries to the soldiers". (S.A.Q.Hussaini)

باقاعدہ اور رضا کار فوج:

اسلامی فوج دو قسم کے مجاہدین پر مشتمل تھی۔ کچھ لوگ ہمیشہ جنگی مہمات میں مصروف رہتے تھے گویا ان کی حیثیت باقاعدہ فوج کی تھی۔ اس کے علاوہ ایک کثیر تعداد ان مجاہدین کی تھی جو بوقت ضرورت میدان جنگ میں جاتے اور جہاد سے فارغ ہو کر پھر دیگر مصروفیات اختیار کر لیتے۔ یہ رضا کار فوج تھی۔ دونوں قسم کے مجاہدین کا الگ الگ اندراج ہوتا اور دونوں کو تنخواہیں ملتی تھیں۔ ہر سال کم و بیش 30 ہزار فوج بھرتی کی جاتی تھی۔ فوج میں شروع شروع میں صرف عرب بھرتی ہوتے تھے لیکن فتوحات کی وسعت اور اسلام کی اشاعت کی وجہ سے دیگر قومیں بھی فوج میں بھرتی ہونے لگیں۔ چنانچہ اسلامی لشکر میں شامی، عراقی، رومی اور یہودی بھی بھرتی ہوئے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی جاٹ قوم کے لوگ بھی اسلامی لشکر میں موجود تھے۔ اہل عرب انہیں زط کہتے تھے۔ رضا کار دستوں میں ذمی بھی بھرتی ہوتے تھے۔ چنانچہ ہزاروں مجوسی مسلمان فوج کی طرف سے لڑے اور انہیں مسلمان سپاہیوں کے برابر تنخواہیں دی گئیں۔ فوجی تربیت کے دوران نیزے، گھوڑ سواری، تیر اندازی اور ننگے پاؤں چلنے کی خاص طور پر تربیت دی جاتی تھی۔

میدان جنگ میں فوج کی تنظیم:

میدان جنگ میں فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ قلب یا مرکز، میمنہ (دایاں بازو) لیکن ان سب کے آگے ہراول دستہ (مقدمہ) ہوتا تھا اور سب کے پیچھے ساقہ فوج ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ دشمن کی دیکھ بھال کرنے کے لئے گشتی دستے (Patrolling troops) ترتیب دیے جاتے تھے اور تیر انداز الگ ہوتے تھے۔ اسلامی لشکر میں شتر سوار بھی ہوتے تھے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گھوڑسوار بھی اور پیادہ بھی۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے چھوٹے چھوٹے دستوں میں منقسم ہو کر لڑنے کا طریقہ بھی اختیار کیا۔ صحرائی علاقوں میں پانی اور چارہ کی تلاش کے لئے ایک دستہ الگ متعین کیا جاتا تھا۔

اعشاری نظام:

فوج کو بالعموم اعشاری نظام کے مطابق مرتب کیا گیا تھا دس سپاہیوں پر ''امیر العشرہ'' افسر ہوتا تھا سو پر قائد اور دس قائد پر ایک ''امیر'' کے ماتحت ہوتے تھے ایک حصہ فوج کے کمانڈر کی کمان میں ایسے کئی امیر ہوتے تھے۔ یہ سارے سپاہی کمانڈر کے حکم پر براہ راست حرکت میں آتے تھے اور ان کے چھوٹے افسران کے دل بڑھانے اور ان کی تنظیم کو قائم رکھنے کے ذمہ دار تھے ساری فوجوں کی کمان خود خلیفہ کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔

فوجی مراکز اور چھاؤنیاں (Army Camps/ Cantonments):

فوج کو ٹھہرانے اور اس کی ضروریات کا انتظام کرنے کے لئے ملک میں جا بجا فوجی مراکز قائم کئے گئے تھے عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں ایسے مراکز مدینہ، کفوہ، بصرہ، موصل، فسطاط، دمشق، حمص، اردن اور فلسطین تھے۔ کوفہ، بصرہ اور فسطاط کو تو خود مسلمانوں نے فوج کے قیام ہی کے لئے آباد کیا تھا۔ وہ چھاؤنیاں ان فوجی مراکز کے علاوہ تھیں جو مفتوحہ علاقوں کو کنٹرول میں رکھنے کے لئے بنائی گئی تھیں اور ایسی چھاؤنیوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی تھی ان فوجی مراکز میں گھوڑوں کے لئے چراہ گاہیں قائم کی جاتی تھیں۔ فوج کے لئے رسد اور اسلحہ کے ذخائر بھی یہیں رکھے جاتے تھے اور فوج کا ریکارڈ بھی انہی مراکز میں رہتا تھا۔ ہر مرکز میں چار ہزار گھوڑے ہر وقت تیار رہتے تھے جنہیں کسی بھی وقت ہنگامی صورت میں کام میں لایا جا سکتا تھا۔ ان گھوڑوں کو باقاعدہ داغ دیا جاتا تھا اور ان کی ران پر جیش فی سبیل اللہ کے الفاظ لکھے جاتے تھے اور ان کی دوڑیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔

تنخواہ و وظائف (Salaries and Stipends):

عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں فوج کا باقاعدہ شعبہ قائم ہوا تو تنخواہ بھی باقاعدہ ملنے لگی اس سلسلے میں سابقہ خدمات کو بھی ملحوظ رکھا گیا اور اس وقت کے جنگی کارناموں کو بھی سامنے رکھا گیا چنانچہ سابقہ خدمات کے صلے میں جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تنخواہیں ملتی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ تنخواہ بدری صحابہ رضی اللہ عنہ کی تھی اور ان کے بعد کے زمانے میں سلام قبول کرنے والوں کی تنخواہیں بتدریج کم ہوتی جاتی تھیں۔ اس وقت فوجی سروس میں جو لوگ تھے ان کو کم از کم 200 درہم سالانہ ملتی تھی اور زیادہ سے زیادہ کمانڈر کو 7 ہزار ملتے تھے۔ بعد میں اس شرح کو بڑھا دیا گیا اور کم از کم شرح 300 درہم زیادہ سے زیادہ دس ہزار درہم مقرر کی گئی۔ یہ تنخواہ عریف کے ذریعے تقسیم ہوتی تھی اور بالعموم یہ منصب قبیلہ کے سردار کے پاس ہوتا تھا۔ فوجیوں کو جو تنخواہ ملتی تھی اس کے علاوہ ان کی بیویوں اور بچوں کے لئے وظائف مقرر تھے جن کی مقدار خاصی ہوتی تھی۔ شہداء کی بیویوں اور بچوں کے لئے وظائف مقرر تھے جن کی مقدار خاصی ہوتی تھی۔ شہدا کی بیویوں اور بچوں کے لئے وظائف بدستور قائم رہتے تھے۔ بہادری کا مظاہرہ کرنے والوں کو ترقی بھی ملتی تھی۔

رسد:

رسد کا الگ محکمہ تھا۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ہر فوجی کو ایک ماہ کی رسد مل جاتی تھی۔ بعض اوقات پکا پکایا کھانا دینے کا طریقہ بھی اختیار کیا گیا۔ سوار کو گھوڑے کا خرچ الگ ملتا تھا۔ تنخواہ اور خوراک کے علاوہ کپڑا بھی دربار خلافت ہی سے ملتا تھا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آلاتِ حرب (Weaponary):

اسلامی لشکر فنونِ حرب میں خاصی مہارت رکھتا تھا۔ وہ تمام ہتھیار استعمال کیے جاتے تھے جو قرونِ وسطیٰ میں رائج تھے۔ تلوار، تیر کمان، ڈھال، زرہ بکتر اور اس طرح کے دوسرے ہتھیاروں کے علاوہ قلعہ شکن آلات بھی استعمال ہوتے تھے۔ سنگباری کرنے کے لئے منجنیق استعمال ہوتی تھی۔ قلعہ کے قریب پہنچ کر حملہ کرنے کے لئے دبابہ استعمال کیا جاتا تھا۔ جس میں بیٹھا ہوا آدمی قلعہ کی طرف سے ہونے والی تیراندازی و سنگباری سے محفوظ رہتا تھا۔ نقب لگانے کے آلات بھی استعمال ہوتے تھے۔

رخصت (Holidays):

ہر فوجی کو بالعموم چار ماہ کے بعد گھر جانے کے لئے رخصت مل جاتی تھی۔ کوچ کے دوران جمعہ کے دن چھٹی ہوتی تھی۔

جاسوسی اور خبر رسانی (Espionage):

اسلامی لشکر کے ساتھ جاسوسی کا بھی ایک نظام موجود تھا جو دشمن کی نقل و حرکت کے بارے میں اطلاعات بہم پہنچاتا رہتا تھا۔ بالعموم اس میں مفتوحہ قوموں کے لوگ ہی شامل ہوتے تھے۔

عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں غیر مسلموں سے سلوک

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد میں سلطنت اسلامی بہت وسیع ہوگئی تھی اور غیر مسلموں کی کثیر تعداد ملک میں موجود تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اسلامی اصولوں کی روشنی میں ان کے ساتھ جو طرزِ عمل اختیار کیا اس کا جامع مرقع وہ معاہدہ ہے جو یروشلم کا قبضہ لیتے ہوئے کیا گیا۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اس کا متن اس طرح دیا گیا ہے:

''یہ وہ امان نامہ ہے جو امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس کے باشندوں کو لکھ کر دیا اس میں ان کی جان و مال، گرجا اور صلیب کی امان دی جاتی ہے اور اس میں تندرست و بیمار غرض ان کے مذہب کے تمام لوگ شامل ہیں ان کے گرجوں کو رہائش گاہ نہیں بنایا جائے گا نہ وہ منہدم کیے جائیں گے نہ ان کا احاطہ کم کیا جائے گا۔ نہ ان کی صلیب اور نہ ان کے اموال کو نقصان پہنچایا جائے گا۔ مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہیں کیا جائے گا نہ اس کی وجہ سے انہیں کوئی ضرر پہنچایا جائے گا۔ بیت المقدس میں ان کے ساتھ یہودی نہ رہنے دیے جائیں گے۔ البتہ انہیں اہل مدین کی طرح جزیہ دینا ہوگا۔''

عام پالیسی کے خدوخال درج ذیل ہیں:

جان و مال کی حفاظت:

جب کوئی شہر فتح ہوتا تو اس کے باشندوں کو جزیہ کی ادائیگی کی شرط پر جان و مال کی امان دے دی جاتی تھی۔ چنانچہ بیت المقدس کی فتح کے موقع پر خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو معاہدہ لکھا اس میں بیت المقدس کے عیسائیوں کی جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دی گئی۔ مرجان، آذربائیجان اور دیگر شہروں کی فتح کے وقت مفتوحین کے ساتھ جو معاہدے کیے گئے ان سب میں بھی یہ شق موجود تھی۔ جزیہ دراصل اس حفاظت کا عوضانہ تھا جو مسلمانوں کی طرف سے غیر مسلموں کو حاصل ہوتی تھی۔ اس لئے انہیں ذمہ قرار دیا جاتا تھا اس کی وضاحت اس بات سے ہوتی ہے کہ جب یرموک کے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہو گئی جب مسلمانوں کو بلادِ شام خالی کرنے پڑے تو جزیہ یہ کہہ کر واپس کر دیا گیا کہ اب ہم آپ کی حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکتے اس لئے جزیہ لینے کا بھی ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔

مذہبی آزادی:

اسلام میں دوسرے مذاہب کے لوگ کو زبردستی مسلمان بنانے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ پھانسیوں کے زور سے تبدیلی مذہب کی مثالیں "مہذب یورپ" ہی کی تاریخ میں مل سکتی ہیں، دورِ اسلام میں ان کی کوئی گنجائش نہیں رہی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لا اکراہ فی الدین (مذہب کے معاملے میں کوئی جبر نہیں) پر پوری طرح عمل کیا اور جن علاقوں کو فتح کیا وہاں کے رہنے والوں کے مذہب میں کوئی مداخلت نہ کی۔ ان کے ساتھ معاہدات میں انہیں مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی۔ ان کی عبادت گاہیں برقرار رکھی گئیں۔ عیسائیوں کو صلیب نکالنے کی پوری آزادی حاصل رہی وہ بلاتکلف ناقوس بجایا کرتے تھے۔ یہی رویہ مجوسیوں کے ساتھ اختیار کیا گیا۔ ان کے مذہبی قوانین تک رائج رہے اور انہیں اپنے شخصی قانون (Personal Law) کے مطابق فیصلے کرنے کا بھی اختیار دیا گیا۔ بلکہ بعض جگہوں پر ان کے ہم مذہبوں نے ان کے ساتھ جو زیادتیاں کی تھیں ان کا مداوا بھی کر دیا گیا۔ سکندریہ کے لاٹ پادری کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ اس کے ہم مذہب رومیوں کے رویہ سے بدرجہا بہتر تھا۔ مذہبی آزادی کا حال اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عیسائی غلام کو بھی زبردستی مسلمان کرنا پسند نہ فرمایا۔

مساوات:

فاتح اور مفتوح کبھی بھی برابر نہیں سمجھے جاتے۔ جدید دور کی عالمگیر جنگوں کے بعد مفتوحین کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مفتوحین کے ساتھ مساوی رویہ عملاً بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والے تھے۔ آپ نے سماجی لحاظ سے مسلمان اور ذمی کو برابر قرار دیا اور اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کرتا تو اس کے عوض وہ بھی قتل کر دیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر جب قبیلہ بکر بن وائل کے ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کیا تو اسے مقتول کے ورثا کے حوالے کر دیا گیا جنہوں نے اسے قتل کر ڈالا۔

شام کے ایک کاشت کار نے شکایت کی کہ اسلامی لشکر کے گزرنے سے اس کی فصل تباہ ہو گئی ہے تو اسے فوراً بیت المال سے معاوضہ دلوایا گیا۔

زمین اور خراج میں روادارانہ سلوک:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ذمیوں سے زمینیں چھیننے کی بجائے انہیں زمین کا مالک قرار دیا اور نہ صرف جاگیرداری کی لعنت کو ختم کر ڈالا بلکہ خراج کی جو رقم ان سے وصول کی جاتی وہ اس سے کہیں کم تھی جو وہ جاگیردار کو حصے کے طور پر ادا کیا کرتے تھے۔ اس کی وصولی کے سلسلے میں آپ اس حد تک احتیاط برتتے تھے کہ خراج کی رقم اس وقت تک بیت المال میں داخل نہ کی جاتی جب تک معززین علاقہ قسم کھا کر اس بات کی تصدیق نہ کرتے کہ خراج اکٹھا کرتے وقت کسی پر ظلم نہیں ہوا ہے۔ بات صرف یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ آپ ذمیوں کو ان کے علاقے کے مسائل حل کرنے میں شریک مشورہ رکھتے تھے۔ مصر کے معاملات میں مقوقش سابق شاہ مصر کو اکثر پوچھا گیا۔ عراق و ایران کے ذمی سرداروں سے زمین کے بندوبست کے بارے میں مشورہ لیا گیا۔

ایفائے عہد:

بالعموم دیکھا گیا ہے کہ اقلیتوں کے ساتھ کیے گئے معاہدات کو پورا نہیں کیا جاتا اور اکثریت کے زور سے اقلیت کے حقوق غصب کر لئے جاتے ہیں۔ بسا اوقات حکومت کی طاقت کے نشے میں غیر قوموں کو تنگ کیا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں اپنے گورنروں کو مسلسل ہدایات بھیجیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کہ ذمیوں کے ساتھ کئے گئے وعدے ہر قیمت پر پورے کئے جائیں۔ یہاں تک کہ آپ نے اپنے جانشین کے نام وصیت میں بھی ذمیوں کے ساتھ کئے گئے وعدے پورے کرنے کی تاکید کی۔

بیت المال پر حق:

بیت المال کے بارے میں عام تصور یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کا مال تھا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واضح فرمایا کہ اس میں غیر مسلموں کو بھی حقوق حاصل ہیں چنانچہ آپ نے ایک مرتبہ ایک بوڑھے کو دیکھا کہ وہ بھیک مانگ رہا تھا، وجہ دریافت کی تو اس نے کہا جزیہ ادا کرنے کے لئے بھیک مانگنے پر مجبور ہوں۔ آپ اسے ساتھ لے گئے اس کا جزیہ معاف کیا اس کو بیت المال سے ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی کچھ دلوا دیا اور ساتھ ہی عُم بیت المال کو لکھ بھیجا کہ کیسے ممکن ہے کہ ہم ان کی جوانی سے فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں انہیں یوں چھوڑ دیں۔ اس کے بعد ایک مستقل اصول قرار دیا کہ نادار، بوڑھے اور اپاہج ذمی کا بھی بیت المال پر ویسے ہی حق ہے جیسا کہ مسلمان کا۔

معروف مستشرق P.K.Hitti نے بجا طور پر نشان دہی کی ہے:

"In the twentieth century, the civilized nations are lying great stress upon better treatment and safeguarding the rights of the minority. But we, while going through the pages of history, find that this was the cardinal feature of the Muslim state of very early ages. In this state, the Zimis enjoyed against the payment of land and capitation tax a wide measure of toleration."

مسلمانوں کی رواداری کے اثرات:

مسلمانوں کی اس روادارانہ پالیسی کے جو اثرات ہمارے سامنے آتے ہیں وہ خود اس بات پر گواہ ہیں کہ مسلمانوں کا رویہ منصفانہ تھا۔ اس وجہ سے حمص کے عیسائی اپنے ہم مذہبوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے زیادہ بہی خواہ تھے۔ ذمی اسلامی لشکر کے لئے پل بناتے تھے۔ ان کی راہنمائی کرتے تھے۔ ان کے لئے اپنے ہم مذہبوں کی جاسوسی کرتے تھے۔ بہت سے یہودی بھی مسلمانوں کے رویہ سے متاثر تھے۔ چنانچہ حمص کے یہودیوں نے توریت ہاتھ میں لے کر قسم کھائی تھی کہ ہم رومیوں کے لئے شہر کے دروازے نہیں کھولیں گے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی حکومت کی حدود جتنی وسیع ہوتی چلی گئیں لوگ متاثر ہو کر اسلام قبول کرتے چلے گئے۔ نیز عوام کی حمایت کی وجہ سے یہ حکومت مستحکم رہی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اہم اصلاحات:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بے شمار اصلاحات کا نفاذ کیا جن میں سے چند اہم حسب ذیل ہیں:

مجلس شوریٰ کا قیام:

اسلام عالمگیر دین ہے اس کا نظام سیاست شوریٰ پر مبنی ہے اسی بنیاد پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت اسلامیہ کو قائم کیا آپ رضی اللہ عنہ کوئی کام بھی اہل رائے صحابہ کے بغیر سرانجام نہ دیتے تھے۔

کنز العمال میں ہے کہ خاص خاص حالات میں عامۃ المسلمین کا مشورہ بھی ضروری ہوتا تھا آپ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔

لا خلافة الا عن مشورة

کہ مشورہ کے بغیر خلافت نہیں چل سکتی۔

عہدے داروں کا انتخاب:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے عمال اور عہدے داروں کا انتخاب بڑی احتیاط سے کرتے تھے آپ رضی اللہ عنہ کی نگاہ بڑی دوررس تھی جس شخص یا صحابی کو آپ نامزد کر دیتے ان کا فقید المثال نہ ملتا انہیں کارناموں کی وجہ سے آپ کی حکومت کو چار چاند لگ گئے تھے۔

آپ رضی اللہ عنہ نے ہر صوبے میں حاکم اعلیٰ یا گورنر میر منشی فوج کا اعلیٰ افسر پولیس آفیسر خزانچی اور قاضی نامزد کر رکھے تھے مگر مخصوص حالات کے لیے سپہ سالار نامزد کیا جاتا تھا اضلاع کے اندر صرف افسر خزانہ کلکٹر اور قاضی ہوتے تھے۔

عمال کے اختیارات اور اس کا محاسبہ:

عمال کے اختیارات کیا ہونے چاہئیں یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واضح کر رکھا تا کہ جب کسی کو عامل یا گورنر نامزد کرتے اس کو ایک پروانہ دیتے جس میں اس کے اختیارات کی وضاحت ہوتی تھی اور یہ پروانہ مجمع عام میں پڑھ کر سنایا جاتا تھا۔

عمال کے احتساب کے لیے آپ رضی اللہ عنہ نے قاضی کو ہدایت کی تھی کہ مقدمات میں قرآن حکیم کے مطابق فیصلہ کرو اور اگر قرآن میں صورت موجود نہ ہو تو حدیث کی جانب رجوع کرو اگر یہ نہ ہو تو اجماع کو دیکھو ورنہ اجتہاد کر لو۔

تمام عمال کو حج کے موقع پر جمع کرتے اور لوگوں سے ان کے متعلق شکایت کو سماعت کرتے اگر لوگ کسی عامل کی شکایت کرتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کا فوری طور پر تدارک کرتے۔

عمال کی تنخواہیں:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عمال کو رشوت سے بچانے کے لیے ان کی بیش قیمت تنخواہیں مقرر کیں چنانچہ اس مقصد کیلیے انہوں نے سلمان بن ربیعہ اور قاضی شریح کی تنخواہ 500-500 درہم مقرر کی تھی۔

ان احتیاطوں کے ساتھ قضاۃ کے اصل مقصد یعنی عدل وانصاف میں مساوات کیلیے عملی کوششیں کیں۔ قضاۃ کو عدل ومساوات کا سبق دینے کے لئے خود فریق مقدمہ بن کر عدالت میں جاتے تھے۔

واقعہ:

ایک مرتبہ حضرت ابی رضی اللہ عنہ بن کعب سے کچھ نزاع ہو گئی۔ ابی رضی اللہ عنہ نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے یہاں مقدمہ دائر کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدعا علیہ کی حیثیت سے پیش ہوئے۔ زید رضی اللہ عنہ نے تعظیم کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ تمہارا پہلا ظلم ہے یہ کہہ کر اپنے فریق ابی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیٹھ گے۔ زید رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دعوے سے انکار تھا۔ ابی رضی اللہ عنہ نے قاعدہ کے موافق حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے قسم لینا چاہی لیکن زید رضی اللہ عنہ بن ثابت نے آپ رضی اللہ عنہ کے رتبہ کا پاس کر کے ابی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ امیر المومنین کو قسم سے معاف رکھو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس ترجیح پر آزردہ خاطر ہوئے اور فرمایا جب تمہارے نزدیک ایک عام آدمی اور عمر رضی اللہ عنہ دونوں برابر نہ ہوں اس وقت تم منصب قضاء کے قابل نہیں ہو سکتے۔

آپ کے ایوان عدالت میں ادنی واعلیٰ اور امیر وغریب سب برابر تھے۔ ان میں سے کوئی بھی قانون کی سزا سے نہ بچ سکتا تھا۔ ارکان حکومت کو علی الاعلان سزا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ عہدہ داران حکومت کو حج کے موقع پر طلب کیا اور مجمع عام میں کھڑے ہو کر پوچھا کہ جس کو ان لوگوں سے شکایت

www.urdukutabkhanapk spot

ہو پیش کرے۔ ایک شخص نے اٹھ کر کہا کہ فلاں عامل نے مجھے سو کوڑے لگائے ہیں۔ فرمایا اٹھ کر بدلہ لو۔ عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص بھی موجود تھے انہیں یہ سرعام عمال حکومت کی توہین ناگوار ہوئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا امیر المومنین! اس طرز عمل سے تمام اعمال بددل ہو جائیں گے۔ فرمایا لیکن میں ایسا ضرور کروں گا اور مستغیث کو حکم دیا" کہ اپنا کام کرو" آخر عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص نے مستغیث کو اس پر راضی کرلیا کہ وہ سو دینار لے کر اپنے دعویٰ سے باز آجائے۔

آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے محمد کو شراب پینے کے جرم میں اسی کوڑے مارے۔ اس کے چند دنوں کے بعد وہ قضاء کر گئے۔

قدامہ بن مظعون کو جو آپ رضی اللہ عنہ کے سالے اور معزز صحابی تھے، اسی جرم میں اسی کوڑے لگوائے۔

پولیس:

قیام امن کا مدار پولیس پر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا مستقل محکمہ قائم کیا۔ پولیس کو احداث کہتے تھے۔ قیام امن کے علاوہ پولیس کے متعلق احتساب کی خدمت بھی تھی۔

جیل خانے:

عہد فاروقی سے پہلے عرب میں جیل خانوں کا رواج نہ تھا۔ غالباً اس تلافی کے لیے جرائم کی سخت سزائیں مقرر تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جیل خانے قائم کیے، مکہ میں صفوان ابن امیہ کا گھر خرید کر اسے جیل خانہ بنایا۔

اس کے علاوہ اضلاع میں بھی جیل خانوں کے نام ملتے ہیں، چنانچہ کوفہ کا جیل خانہ نرسل کا تھا۔

جیل خانہ قائم کرنے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض غیر منصوص (جو قرآن وسنت سے ثابت نہ ہوں) سزاؤں میں تبدیلیاں کیں۔ مثلاً عادی شرابیوں پر حد جاری کرنے کی بجائے قید کی سزا مقرر کی۔

محکمہ آبپاشی:

آپ رضی اللہ عنہ نے زمین اور زراعت کو ترقی دینے کے لیے نہری نظام متعارف کروایا آپ کے عہد حکومت میں بند باندھے گئے تالاب بنائے گئے اور نہروں کی مزید شاخیں کھودی گئیں۔

مقریزی کا بیان ہے کہ مصر کے اندر 120000 مزدور گورنمنٹ کی طرف سے اس کام میں لگائے گئے تھے۔

شعبہ تعلیم:

صحابہ کرام کے دور میں صرف مذہبی تعلیم دی جاتی تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی اشاعت کیلیے وسیع تر انتظام کیے عہد صدیق رضی اللہ عنہ میں آپ رضی اللہ عنہ کے اصرار پر قرآن مجید کی تدوین ہوئی اور آپ رضی اللہ عنہ کے اپنے عہد حکومت میں تمام مفتوحہ علاقوں میں مکتب کھولے گئے اور ان کے لیے تنخواہ دار معلمین مقرر کیے۔

حدیث کی خدمت:

کلام اللہ کے بعد حدیث نبوی ﷺ کا درجہ ہے، چنانچہ اس کی تلاش، حفاظت اور اشاعت کا بھی انتظام کیا، حفاظ حدیث صحابہ کو حدیث کی تعلیم دینے کے لیے مختلف مقامات پر بھیجا، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو کوفہ، معقل بن یسار رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن معقل رضی اللہ عنہ اور عمران بن

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بھیجا رضی اللہ عنہ کو بصرہ اور عبادہ رضی اللہ عنہ بن صامت اور ابودرداء رضی اللہ عنہ کو شام بھیجا اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ والئی شام کو لکھا کہ ان کے علاوہ دوسرے کی احادیث قبول نہ کی جائیں۔

آپ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں آئے دن نئے نئے مسائل پیش آتے تھے، چنانچہ جب اس قسم کی نئی صورت پیش آتی تھی تو آپ رضی اللہ عنہ صحابہ سے دریافت فرماتے تھے کہ اس کے متعلق انہیں کوئی حدیث نبوی ﷺ معلوم ہے، اس طریقہ سے حدیث کا معتد بہ حصہ جمع ہو گیا اور حدیثوں کی بڑی اشاعت ہوئی۔

اگرچہ محدثین کے نزدیک تمام صحابہ رضی اللہ عنہم عادل ہیں لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس نکتہ سے خوب واقف تھے کہ ذمسائل بشری سے کوئی انسان مستثنیٰ نہیں، اور ایک صحابی سے بھی اس طرح کی غلطی کا ہونا ممکن ہے، جس طرح ایک انسان سے، اسی لیے اشاعت حدیث کے ساتھ وہ روایات کے قبول کرنے میں بڑی احتیاط اور چھان بین سے کام لیتے تھے اور بغیر شہادت کے کسی کی روایت کو قبول نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث بیان کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس کا ثبوت دو ورنہ میں تم کو سزا دوں گا، ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کو شہادت میں پیش کیا اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوموسیٰ کو چھوڑا اسی طریقہ سے سقط (یعنی حاملہ کو ایسا صدمہ پہنچانا جس سے حمل گر جائے) کے مسئلہ میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث بیان کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمہ کی شہادت سے اسے تسلیم کیا۔

لوگوں کو کثرت روایت سے روکتے تھے، چنانچہ قرظہ بن کعب کو عراق روانہ کرتے وقت خاص طور سے ہدایت کی کہ تم ایسے ملک میں جا رہے ہو جہاں قرآن کی آواز گونجتی رہتی ہے تم ان کو قرآن سے ہٹا کر حدیث کی طرف نہ لگا دینا، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، ابودرداء رضی اللہ عنہ، انصاری اور ابومسعود رضی اللہ عنہ انصاری کو روایت حدیث سے روک دیا تھا آپ کی اس شدت احتیاط کو دیکھ کر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے حدیثیں روایت کرنا بند یا کم کر دیا تھا۔

فقہ کی خدمت:

عملی زندگی میں زیادہ تر فقہ سے کام لینا پڑتا ہے خصوصاً فاروقی عہد میں اسلامی تمدن کی ترقی سے صدہا نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں اس لیے اس زمانہ میں علم فقہ کی بڑی ترقی و اشاعت ہوئی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ فقہ کی تکمیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے ہاتھوں ہوئی۔

آپ رضی اللہ عنہ خود لوگوں کو فقہی مسائل بتاتے تھے، خطبوں اور تقریروں میں بیان کرتے تھے، فقہی مسائل کو صحابہ کے مجمع میں پیش کر کے طے کراتے تھے، اضلاع کے حکام اور افسروں کو فقہی احکام لکھ کر بھیجتے تھے، یہ احکام آج بھی تاریخوں میں موجود ہیں اسلامی حکام انتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ مذہبی معلم ہوتے تھے اس لیے حضرت عمران رضی اللہ عنہ کے تقرر میں تفقہ کا خاص لحاظ رکھتے تھے آپ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ میں نے افسروں کو اس لیے بھیجا ہے کہ وہ لوگوں کو مسائل اور احکام بتائیں۔

عمال اور حکام کے علاوہ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے لیے تمام ممالک محروسہ میں مستقل فقہاء اور معلم مقرر کیے صرف بصرہ میں دس صاحبوں کو اس کام کے لیے بھیجا تھا۔ ابن جوزی کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ ان فقہاء کی تنخواہیں بھی مقرر تھیں غرض فاروقی عہد میں تعلیم کا نہایت مکمل انتظام تھا۔

تعمیر مساجد:

مذہب کی عملی خدمت کے سلسلہ میں بکثرت مسجدیں تعمیر کرائیں۔ شام کے عمال کو حکم بھیجا کہ ہر شہر میں ایک مسجد تعمیر کی جائے کوفہ میں ہر ہر قبیلہ کی مسجد علیحدہ تعمیر کرائی۔ روضۃ الاحباب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے چار ہزار مسجدیں تعمیر کرائیں اور ان میں تنخواہ دار امام اور موذن مقرر کیے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot

تبلیغ اسلام:

بحیثیت خلیفہ رسول کے سب سے مقدم فرض اسلام کی تبلیغ تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اس کے لیے مختلف ذرائع اختیار کیے اور آپ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اسلام کی بڑی اشاعت ہوئی لیکن جبر سے نہیں بلکہ اسلام کے محاسن کی تبلیغ کے ذریعہ آپ رضی اللہ عنہ جبری اسلام کے خلاف تھے، ایک مرتبہ اپنے غلام کے سامنے اسلام پیش کیا، اس نے انکار کیا تو انہوں نے لا اکراہ فی الدین کہہ کر چھوڑ دیا۔

تبلیغ اسلام کی صورتیں:

آپ رضی اللہ عنہ نے تبلیغ اسلام کی مختلف شکلیں اختیار کیں۔

جب کسی ملک پر فوج کشی ہوتی تو سپہ سالار فوج کو تاکید کرتے کہ وہ پہلے اسلام پیش کرے چنانچہ سعد رضی اللہ عنہ بن وقاص فاتح ایران کو جو خط لکھا تھا اس میں تھا کہ میں نے تم کو حکم دیا تھا کہ جنگ سے پہلے اسلام پیش کرو۔

تبلیغ اسلام کی سب سے بڑی تدبیر یہ ہے کہ غیر مذاہب والوں کے سامنے اسلام کا ایسا عملی نمونہ پیش کیا جائے جسے دیکھ کر وہ خود اسلام کی طرف مائل ہو جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس سلسلہ میں اصلی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تعلیم وارشاد اور احتساب سے مسلمانوں کو اسلام کی صحیح تصویر بنا دیا تھا، جسے دیکھ کر غیر قومیں خود بخود اسلام کی طرف کھنچی چلی آتی تھیں۔ شام کی فتوحات میں رومیوں کا سفیر جارج اسی اثر سے مسلمان ہوا۔

مصر کے شہر شطاء کا ایک معزز رئیس مسلمانوں کے حالات ہی سن کر اسلام کا گرویدہ ہو گیا اور دو ہزار آدمیوں کے ساتھ اسلام قبول کیا۔

دمشق کی فتح کے بعد یہاں کا پادری خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ مشرف بہ اسلام ہوا۔

حرم کی توسیع:

اس سے پہلے حرم کی عمارت تنگ تھی۔ 17ھ میں اس کی عمارت کو وسیع کیا اور اس کے گرد دیوار بنا کر عام آبادی سے ممتاز کیا۔ کعبہ پر نطع کا (جو ایک معمولی کپڑا ہے) غلاف چڑھا کرتا تھا، آپ نے قباطی کا غلاف چڑھایا جو نہایت عمدہ مصری کپڑا تھا۔

مسجد نبوی ﷺ کی توسیع:

آپ رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی کی توسیع کی، ازواج مطہرات کے گھروں کو چھوڑ کر مسجد نبوی ﷺ سے متصل جتنے مکانات تھے سب کو خرید کر مسجد کی عمارت میں شامل کر دیا، پہلے مسجد کا طول سو گز تھا اس تعمیر میں بیس کا اضافہ ہوا مسجد کے گوشہ میں علیحدہ ایک چبوترہ بنوا دیا کہ جن لوگوں کو بات چیت کرنا یا شعر پڑھنا ہو وہ یہاں آکر باتیں کریں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عمومی اصلاحات:

عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مندرجہ بالا مربوط اور باقاعدہ شعبہ جات کے قیام کے علاوہ مندرجہ ذیل عام اصلاحات بھی جاری کیں۔ یہ اصلاحات عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی دور بینی تدبر معاملہ فہم اور انتظامی صلاحیتوں کا ناقابل تردید ثبوت ہیں۔

1- سنہ ہجری کا آغاز:

آپ رضی اللہ عنہ نے سنہ ہجری کی ابتداء کی اور اس کا تعین ہجرت کے سال سے کیا اسلامی سال کا آغاز یکم محرم سے ہوتا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

2- مردم شماری:

آپ رضی اللہ عنہ نے مردم شماری کروائی۔

3- نہروں کا قیام:

آپ رضی اللہ عنہ نے نہریں کھدوائیں۔ نہر ابو موسیٰ، نہر معقل، نہر سعد اور نہر امیر المومنین خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

4- نئے شہروں کا قیام:

آپ رضی اللہ عنہ نے نئے شہر کوفہ، بصرہ، فسطاط اور موصل آباد کیا۔

5- جیل خانوں کا قیام:

آپ رضی اللہ عنہ نے جیل خانے قائم کیے اور درہ کی سزا کا نفاذ کیا۔

6- محکمہ پولیس کا قیام:

آپ رضی اللہ عنہ نے راتوں کو گشت کر کے رعایا کے حالات دریافت کا طریقہ رائج کیا اور پولیس کا محکمہ قائم کیا۔

7- فوجی چھاؤنیوں کا قیام:

آپ رضی اللہ عنہ نے فوجی چھاؤنیوں کی بنیاد رکھی اور پرچہ نویس مقرر کیے۔

8- مہمان خانوں کا قیام:

آپ رضی اللہ عنہ نے مختلف شہروں میں مہمان خانے تعمیر کروائے۔

9- لاوارثوں کی پرورش:

آپ رضی اللہ عنہ نے راہ میں پڑے ہوئے (لاوارث) بچوں کی پرورش اور تربیت و پرداخت کے لیے روزینے مقرر کیے۔

10- جنگی گھوڑوں کی پرورش:

آپ رضی اللہ عنہ نے گھوڑوں کی مختلف نسلوں (اصیل، مجنس) کی تشخیص کی داغنے اور نمبر لگانے کا طریقہ رائج کیا۔

11- وظائف کا قیام:

آپ رضی اللہ عنہ نے مفلوک الحال ذمیوں اور غیر مسلموں کے وظائف اور روزینے مقرر کیے۔ اماموں اور مؤذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں۔

12- معلمین کی تنخواہیں:

آپ رضی اللہ عنہ نے مکاتب قائم کیے اور معلمین کی تنخواہیں مقرر کیں۔

13- نمازِ تراویح کا اہتمام:

آپ رضی اللہ عنہ نے نمازِ تراویح جماعت سے قائم کی۔

www.urdukitabkhanapk.blogspot.com

14- شراب نوشی کی حد:

آپ رضی اللہ عنہ نے شراب نوشی کی حد میں اسی کوڑے مقرر کیے۔

15- مساجد میں روشنی کا انتظام:

مساجد میں رات کے وقت روشنی کا انتظام کیا۔

16- عشر کی وصولی کا طریقہ:

آپ رضی اللہ عنہ نے عشر وخراج کا طریقہ قائم کیا اور تجارتی مال پر محصول مقرر کی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور مؤرخین کی آراء

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شخصیت ہر لحاظ سے بلند وبالا ہے ان کی خلافت ان کا قبول اسلام ان کی اسلامی خدمات کی ان کی شجاعت ان کی دلیری ان کے اقدامات تمام کے تمام لاجواب اور بے مثال تھے آپ کی جملہ صفات کو دیکھ کر جدید مؤرخین اور قدیم مؤرخین کے علاوہ مستشرقین بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اس لیے انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ کے اوصاف حمیدہ کو سامنے رکھتے ہوئے آپ رضی اللہ عنہ کے بارے میں تبصرہ کیا۔

سید امیر علی:

کہتے ہیں کہ" آپ رضی اللہ عنہ سخت مگر منصف مزاج انسان تھے عربوں کے کردار کو مکمل جاننے والے تھے اور متمدن عربوں کی قیادت کی صلاحیت کے مالک تھے انہوں نے عنان حکومت مضبوطی سے تھامے رکھی خانہ بدوش اور نیم مہذب قوموں کی شہری زندگی میں جانے کے بعد غیر اخلاقی حرکات میں ملوث ہونے کے رجحان کو سختی سے دبا دیا۔

آپ کی وفات کے بار میں امیر علی کہتے ہیں:

The Death of Hazrat Umar (R.A) Was a Real Calamity to Islam.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات اسلام کے لیے فی الواقع ایک عظیم سانحہ تھا۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی سیرت

خشیت الٰہی:

عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تاریخ اسلام ہی کے نہیں تاریخ عالم کے بھی مثالی حکمران ہیں۔ جس پہلو سے بھی آپ کی سیرت کا جائزہ لیا جائے بالکل بے داغ نظر آتی ہے۔ آپ احکام شریعت کے نفاذ کے بارے میں بہت سخت تھے لیکن خدا کے خوف کا یہ عالم تھا کہ فرمایا کرتے کاش! میں بھی خس وخاشاک ہوتا۔ کاش! میری ماں مجھے نہ جنتی اور میں پیدا ہی نہ ہوتا تا کہ مجھے حساب نہ دینا پڑتا۔ آخرت کے مواخذہ سے اس حد تک ڈرتے تھے کہ باوجود اس کے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے پوری زندگی خدا کے دین کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی ایک مرتبہ فرمایا "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ میں تو صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ بے مواخذہ چھوٹ جاؤں۔" نماز میں بالعموم وہ آیات تلاوت کرتے جن میں قیامت کا ذکر آتا اور پھر زار وقطار روتے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حب رسول ﷺ:

حب رسول ﷺ کا یہ عالم تھا کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے موقعہ پر آپ رضی اللہ عنہ کو یقین نہیں آتا تھا کہ واقعی آپ ﷺ وصال پا گئے ہیں۔ چنانچہ آپ پکار رہے تھے کہ جس نے کہا رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے اس کا سر تن سے جدا کر دوں گا۔ اس محبت کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کے متعلقین کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے اور وظائف وغیرہ کی تقسیم میں ان کے ساتھ ترجیحی سلوک کرتے۔ سنت کی پابندی کا احترام کرتے اور سنت سے ہٹی ہوئی بات کو خواہ وہ مباح ہی کیوں نہ ہو پسند نہ فرماتے۔

سادگی:

سادگی آپ رضی اللہ عنہ کی زندگی کا ایک ایسا پہلو تھا کہ مخالفین واحباب سبھی حیران رہتے تھے۔ ایک طرف جاہ و جلال کا یہ عالم تھا کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جیسے فاتح آپ رضی اللہ عنہ سے کانپتے تھے اور اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ عمر رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں دم مارنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے اور دوسری طرف مصر و شام اور ایران کا یہ فاتح پیوند لگا ہوا کرتہ پھٹی ہوئی پگڑی اور ٹوٹی ہوئی جوتی پہنے ہوئے ہوتا تھا۔ ایک طرف قیصر و کسریٰ کے خلاف مہمات میں ہدایات دی جا رہی ہوتی تھیں اور دوسری طرف بیوہ عورتوں کے گھر پانی بھرنے کے لئے مشک کندھوں پر ہوتی تھی اور جب تھک جاتے تو مسجد نبوی (ﷺ) کے کسی کونے میں فرش پر سو رہتے۔ بیت المقدس کے صلح نامہ کے وقت جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ رضی اللہ عنہ سے قیمتی لباس پہننے کی درخواست کی تا کہ دشمن کے سامنے سبکی نہ ہو تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''خدا نے ہمیں جو عزت دی ہے وہ اسلام کی عزت ہے اور ہمارے لئے وہی کافی ہے۔''

سخت گیری:

آپ رضی اللہ عنہ کے مزاج میں ذرا سختی تھی۔ اسلام کے قبول کرنے سے پہلے اسی مزاج کا نتیجہ تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی جان لینے کے ارادہ سے روانہ ہوئے اور بارگاہ رسالت ﷺ کے اہم رکن کی حیثیت سے لوٹے۔ اسلام کی حالت میں بھی کفار کو اپنی تلوار سے مرعوب کیا۔ اسلامی اصولوں کی مخالفت کو سختی سے دبا دیتے تھے۔ یہ حالت خلیفہ بننے کے بعد اعتدال پر آ گئی تھی اور اسی سخت مزاجی کا نتیجہ تھا کہ سبھی تسلیم کرتے تھے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں انتشار کا کوئی سوال نہیں۔ اتنی بڑی سلطنت کو مدینہ منورہ میں بیٹھ کر قابو میں رکھنا آپ رضی اللہ عنہ کے اسی مزاج کی وجہ سے ممکن ہوا کہ آپ رضی اللہ عنہ کے ماتحت لڑنے والے بڑے بڑے سردار بھی جانتے تھے کہ کوئی غلط کام کرنے کے بعد عمر رضی اللہ عنہ سے یہ توقع رکھنا کہ وہ برداشت کر جائیں گے بالکل خارج از امکان ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ اسلامی احکام کو اپنے اور اپنے خاندان پر بھی پوری طرح نافذ کرتے تھے اور کسی اور کو بھی ان کی خلاف ورزی کی اجازت نہ دیتے تھے۔

ذاتی صلاحیتیں:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ انتہائی ذہین، سلیم الطبع، بالغ نظر اور صائب الرائے تھے۔ قرآن پاک کی متعدد آیات آپ رضی اللہ عنہ ہی کی رائے کے مطابق اتریں مثلاً اذان کا طریقہ۔ عورتوں کے لئے پردے کا حکم، شراب کی حرمت وغیرہ کے احکام آپ رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق اترے۔ فصاحت و بلاغت اور خطابت میں عرب کے ممتاز ترین افراد میں سے تھے۔ شاعری سے دلچسپی تھی اگرچہ دینی خدمت کے جذبے نے اتنا غلبہ پا لیا تھا کہ اس ذوق کے اظہار کا موقعہ نہیں ملتا تھا۔ نیز قدیم جاہلی شاعری کی اصلاح کے علمبردار تھے۔ فنون سپہ گری اور بہادری میں بچپن ہی سے ممتاز تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ اپنے والد کی طرح مشہور نساب تھے یعنی قبائل کے نسب آپ کو یاد ہوتے تھے۔ زندگی کا اکثر حصہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گزار لیکن محتاط مزاجی کی وجہ سے احادیث کی روایت کم کرتے تھے۔ فقہ میں آپ رضی اللہ عنہ کا مقام بہت بلند تھا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جن تک آئمہ فقہ کے سلسلے جا کر ملتے ہیں آپ ہی کے تربیت یافتہ تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی فقہ کی صداقت کی گواہی اس واقعے سے ملتی ہے جب ایک یہودی اور ایک منافق مسلمان کا کسی چیز کے بارے میں تنازعہ ہو گیا انہوں نے آنحضرت ﷺ سے فیصلہ کروایا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے بیانات لینے کے بعد فیصلہ یہودی کے حق میں دیا۔ وہ منافق مسلمان یہودی کو لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا اور آپ رضی اللہ عنہ سے فیصلہ لینا چاہا۔ اس کا خیال تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک یہودی کے مقابلے میں مجھے ترجیح دیں گے لیکن آپ رضی اللہ عنہ کو جب معلوم ہوا کہ اس مقدمہ کا فیصلہ نبی ﷺ پہلے فرما چکے ہیں تو منافق محمد مصطفیٰ ﷺ کے فیصلے کے بعد مجھ سے فیصلہ چاہتا ہے تو فوراً تلوار اٹھا لائے اور اس کا سر قلم کر دیا۔ قرآن پاک نے سورہ نساء میں اس فیصلہ کی توثیق کی اور مستقل طور پر یہ اصول قرار پایا کہ نبی ﷺ کے فیصلے کو آخری حیثیت حاصل ہے اور جو اس فیصلے کو تسلیم نہ کرے وہ مومن نہیں ہے۔

مورخین کے تبصرے:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شخصیت اتنی بلند ہے کہ جدید مورخین اور مستشرقین بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ پر بہت دلچسپ تبصرے کئے ہیں۔ بالخصوص سید امیر علی آپ رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''وہ سخت مگر منصف مزاج تھے۔ اپنے عوام کے کردار کو مکمل طور پر جاننے والے تھے اور غیر متمدن عربوں کی قیادت کی صلاحیت کے مالک تھے۔ انہوں نے حکومت کی عنان مضبوطی سے تھامے رکھی اور خانہ بدوش اور نیم مہذب قوموں کے شہری زندگی میں جانے کے بعد غیر اخلاقی حرکات میں ملوث ہونے کے رجحان کو سختی سے دبا دیا۔

> "Stern but just, thoroughly versed in the character of his people, he was specially fitted for the leadership of unruly Arabs. He has held them with a strong hand and severely repressed the natural tendency to demoralization among nomadic tribes and semi-civilized people when coming in contact with the luxury and vices of cities."

آپ رضی اللہ عنہ کی وفات پر امیر علی کا تبصرہ یہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات اسلام کے لئے فی الواقعہ ایک سانحہ تھا۔''

> "The death of Hazrat Umar (RA) was a real calamity to Islam."

ولیم میور نے آپ رضی اللہ عنہ کی وفات پر حسب ذیل تبصرہ کیا ہے:

''اس طرح عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا جو پیغمبر (ﷺ) کے بعد اسلام کی سلطنت میں عظیم ترین تھے کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ ہی کی حکومت کے دس سالوں میں آپ رضی اللہ عنہ کی عقلمندی، صبر اور قوت سے شام، مصر اور ایران فتح ہوئے۔''

> "So died Umar next to the Prophet the greatest in the kingdom of Islam; for it was all within these ten years that, by his wisdom, patience and vigour, the domination was achieved of Syria, Egypt and Persia."

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سرکاری خطوط

(Letters of Hazrat Umar (R.A) to Particular Authorities)

-1 عمرو بن العاص (گورنر مصر) کے نام:

جب تم میرا خط حاصل کرو فوراً دشمنان خدا کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے روانہ ہو جاؤ جہاں بھی تم ان کو پاؤ اور ان سے نرمی نہ برتو۔ عوام کے معاملات میں دلچسپی لو اور پوری کوشش کے ساتھ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرو۔ لوگوں کی غلطیوں کو معاف کرو اللہ تمہاری غلطیاں معاف کرے گا۔ لوگوں کو قوانین کی پیروی کرنے کا عادی بناؤ اور جو ٹیکس جمع ہو جائے اس کا ریکارڈ رکھو۔ لوگوں میں امن و آشتی عدل کے ساتھ قائم رکھو۔ حکومت ایک عارضی شے ہے صرف اچھی یا بری شہرت باقی رہنے والی ہے۔

-2 عمرو بن العاص (گورنر مصر) کے نام:

اے گورنر تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ لگان کی شرح کو جمع کرنے کے وقت تبدیل نہیں کر سکتے، اگر وہ دفتر ریکارڈ پہلے سے طے کر دی گئی ہے۔

دیہاتوں کو حکمرانوں کے ظلم سے بچانا چاہئے چونکہ ہم اس دنیا میں تو ان کے ساتھ ظلم کر سکتے ہیں لیکن اگلی دنیا میں ہمیں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔

ہر حکمران عوام کی بھلائی کا ذمے دار ہے۔ تمہیں علم ہونا چاہئے ناانصافی اللہ کے غیظ و غضب کو دعوت دیتی ہے۔ ہم عدل پر یقین رکھتے ہیں اور ہم نے منصفانہ نظام کو قائم کرنا ہے۔ اس لئے ہم عدل کے راستے پر چل رہے ہیں اور تمہیں بھی اس راستے پر چلنا چاہیے۔ اگرچہ میں تم سے بہت دور ہوں لیکن اللہ تم سے بہت قریب ہے اور وہ تمہارے تمام اعمالوں سے بخوبی واقف ہے۔

تم نے مصری کسانوں کے اوپر نئے ٹیکس لگانے کے حوالے سے پوچھا ہے۔ ان کی کوئی بھی چیز نیلام نہ کرو اور ٹیکس کا تخمینہ ٹیکس جمع کرنے سے پہلے لگاؤ اور ٹیکس کا تخمینہ لگانے کے لیے ایماندار اور قابل آدمیوں کا انتخاب کرو۔

-3 ابوموسیٰ اشعری (گورنر کوفہ) کے نام:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام خط جس میں انہوں نے عدلیہ اور اس کے امور کو تفصیلاً ذکر کیا۔

اس خط میں فوری انصاف مہیا کرنے کا کہا گیا ہے اور اس خط کا متن درج ذیل ہے:

-1 انصاف دلانا اور انصاف کا نظام قائم کرنا اسلام میں ایک مکمل عمل رہا ہے جو کہ صدیوں سے جاری ہے۔ اس لیے جب بھی تمہیں منصف لگایا جائے تو گہرائی اور دانشمندی کے ساتھ گواہی اور ثبوت کی بنیاد پر حقوق کو سمجھو اور حقوق کو قائم کرو اور ایسے حقوق قائم نہیں کیے جا سکتے جن کے بارے میں خیالات مبہم ہوں اور ٹھوس دلائل موجود نہ ہوں۔

-2 اور اس بات کو یقینی بناؤ کہ تم دونوں فریقین کے درمیان انصاف کرو گے۔ نہ صرف اپنے فیصلوں سے بلکہ اپنی گفتار اور اپنے کردار سے، تاکہ کوئی با اثر آدمی تم سے ناانصافی کی توقع نہ کرے اور نہ ہی کوئی بے طاقت آدمی تمہارے انصاف کے تقاضوں پر سوال اٹھائے اور نہ ہی کوئی کمزور آدمی تمہارے انصاف سے مایوس ہو جائے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

-3 یاد رکھو! ثبوت مہیا کرنا مدعی کی ذمے داری ہے جبکہ عہد یا حلف اٹھانا ملزم کے اوپر ہے۔ دونوں فریقین میں صلح کروائی جا سکتی ہے بشرطیکہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہ کردیں۔

-4 تمہارے پرانے فیصلے نئے فیصلوں کو نظرثانی سے نہ روکیں اگر تم خود کو صراط مستقیم پر پاؤ۔ سچ دائمی ہے اور اسے ختم نہیں کیا جا سکتا اور ایسے فیصلوں پر نظرثانی کر لینی چاہیے جن سے سچ قائم ہو سکے۔

-5 اور جو چیز قرآن وسنت میں موجود نہیں تو تم اپنی عقل سے ایسے مسائل کو انصاف کے تقاضوں کے مطابق حل کرو۔ کوشش کرو کہ قرآن وسنت سے ایسی مثالیں ڈھونڈو۔

-6 اور اپنے خیالات اور افکار کو جن کو تم نے دریافت کیا ہے اجتہاد کے ذریعے ان میں سے ان خیالات کا انتخاب کرو جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور سچ سے قریب ترین ہے۔

-7 اور مدعی کے لیے ایک وقت متعین کرو اور اس کے دعوے کو قبول کرو اگر وہ ثبوت یا گواہی پیدا کرنے میں کامیاب رہے۔ اس سے اس کا کوئی عذر نہیں رہے گا۔

-8 تمام مسلمان بطور گواہ تمہاری نظر میں برابر ہونے چاہئیں جب تک کہ کوئی حد میں مجرم قرار نہ پایا ہو۔ اللہ تعالیٰ رازوں کی ذمے داری خود لیتا ہے اور تمہیں تمہاری ذمے داری سے نجات دے گا اگر تم فیصلوں کو شہادت اور ثبوت کی بنیاد پر جاری کرو۔

-9 غصے سے پرہیز کرو۔ اضطراب کا شکار نہ ہو۔ لوگوں کو تنگ نہ کرو اور معاملات کو حل کرنے میں لیت ولعل سے کام نہ لو۔ یاد رکھو کہ انصاف سے فیصلے کرنا اور سچ کو قائم کرنا تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت اجر ملنے کا باعث بنے گا، اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی لیکن جو کوئی بھی خود کو دوسروں کے سامنے غلط طریقے سے پیش کرے گا اللہ تعالیٰ اسے ذلیل ورسوا کرے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کوئی عمل بھی ایسا پسند نہیں کرتا جو اس کے علاوہ کسی اور کے لیے کیا جائے۔

-4 ابوعبیدہ بن جراح (سپہ سالار شام) کے نام:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے نام خط جب مسلمانوں نے شراب پر پابندی کو نظرانداز کیا اور دمشق فتح ہونے کی خوشی میں شراب نوشی کی۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس صورت حال کے متعلق لکھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواباً تحریر کیا:

''جو کوئی بھی شراب نوشی کرے اسے 80 کوڑے لگاؤ۔ مجھے اپنی ذات کی قسم کہ شاعری اور بدویانہ طرز زندگی ہی عربوں کے لیے کافی تھا۔ دمشق فتح ہونے کی خوشی میں عربوں کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے تھا۔ اس کے سامنے سربسجود ہونا اور شکرگزار ہونا چاہیے تھا۔ اگر کوئی دوبارہ شراب نوشی کرے تو اس پر حد جاری کرو۔''

-5 حضرت ابوعبیدہ بن جراح اور معاذ بن جبل کے نام:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھالی تو ابوعبیدہ بن جراح اور معاذ بن جبل نے ان کو ایک خط کے ذریعے مبارک باد دی جبکہ وہ شام کو فتح کرنے میں مصروف تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب وہ خط وصول کیا تو دونوں کو اکٹھے جواب دیا جس سے ان کی ایڈمنسٹریشن سے متعلق سوچ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور ان کے انصاف، تقویٰ اور سادگی کے بارے میں خیالات کا بھی اظہار ہو رہا ہے۔ انہوں نے تحریر کیا:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

عمر کی طرف سے جو کہ اللہ کا بندہ ہے، مسلمانوں کا رہنما ہے، ابو عبیدہ اور معاذ بن جبل کے نام

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے جو خالق اور قیوم ہے میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے خوف کی طرف دھیان دلاتا ہوں چونکہ تقویٰ دنیا و آخرت میں کامیابی کی علامت ہے۔ میں نے تمہارا خط موصول کیا جس میں تم نے لکھا کہ خلافت سے پہلے میں اپنے اطمینان نفس کے متعلق پریشان رہتا تھا یہ سچ ہے اور اس حوالے سے میں تم لوگوں کی تعریف کرنا چاہتا ہوں اور تم نے لکھا کہ میں مسلمانوں کا حاکم بن چکا ہوں تو تمام ضعیف اور جوان، دوست اور دشمن، اعلیٰ اور ادنیٰ میرے سامنے بیٹھتے ہیں اور مجھے ان سب سے انصاف کرنا ہے اور تم نے مجھے ناانصافی سے بھی خبردار کیا ہے۔

یقیناً اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر میں انصاف کے تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتا۔ تم لوگ میرے خیر خواہ ہو کہ مجھے نصیحت کی ہے کہ عنقریب میں نے اپنے تمام اعمالوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہونا ہے۔ تم نے مجھے منافقین سے باخبر رہنے کو کہا ہے لیکن میرے خیال میں منافقت قیامت کے قریب ابھرے گی۔ تم نے مجھے بطور خیر خواہ کے لکھا اور نصیحت کی ہے تاکہ مجھے رہنمائی حاصل ہو۔ تحریر کرتے رہو اور نصیحت کرتے رہو۔

-6 عتبہ بن غزوان (گورنر عراق) کے نام:

ذمی لوگوں پر ظلم کرنے سے بچے رہو۔ عہد کی پامالی سے پرہیز کرو اور یاد رکھو ظلم تمہیں عہدے / گورنری سے محروم کر سکتا ہے۔ تمہیں تمہاری وفاداری کی بنیاد پر گورنر بنایا گیا ہے اور یہ ایک امانت ہے اس امانت میں کبھی خیانت نہ کرنا۔

-7 معاویہ بن ابی سفیان (گورنر دمشق) کے نام:

نوٹ: حضرت معاویہ بن ابی سفیان، گورنر دمشق لوگوں سے فاصلہ رکھتے تھے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو انہوں نے ان کو اس انداز میں نصیحت فرمائی:

''اپنے اور لوگوں کے درمیان پردہ مت رکھو۔ غریب اور کمزور لوگوں کو اپنے پاس آنے دو اور ہمدردی کے ساتھ ان کو سنو اس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ مسافروں کا خیال رکھو اور ان کی شکایات کا جلدی ازالہ کرو۔ کیونکہ انصاف میں تاخیر انصاف نہ ہونے کے مترادف ہے۔

-8 سعد بن ابی وقاص (گورنر عراق) کے نام:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سعد بن ابی وقاص کو گورنر پر عوام کے اعتماد کے بارے میں لکھا:

''اگر تم جاننا چاہتے ہو کہ تمہیں خدا پسند کرتا ہے یا نہیں یہ معلوم کرو آیا کہ عوام تم سے خوش ہیں یا نہیں۔ یاد رکھو عوام کی خیر خواہی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا باعث بنتی ہے۔''

-9 ابو عبیدہ کے نام:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے نام جبکہ اول الذکر نے ایک سرکاری ملازم (سول سرونٹ) کی بارے میں لکھا۔

اہلیت (Qualities):

یہ بات واضح ہو جانی چاہئے کہ اگر کسی شخص کو کوئی ریاست کی ذمہ داری دی جائے تو اس میں مندرجہ ذیل خصوصیات ہونی چاہئیں۔

-1 کہ وہ عملیت پسند اور دانشمند ہو۔

www.urduku...hane...

2- اپنی ذمے داریوں سے غافل نہ ہو۔

3- وہ بے داغ کردار کا مالک ہو اور عوام میں اچھی شہرت رکھتا ہو۔

4- وہ عوام سے تعصب نہ رکھتا ہو اور ان سے کشادہ ذہن سے ملتا ہو۔

5- اگر وہ حق پہ ہے تو وہ کسی قسم کی ملامت کو ملحوظ خاطر نہ رکھتا ہو۔

10- ابوعبیدہ بن جراح (کمانڈر شام) کے نام:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے نام جس میں انہوں نے پبلک سروس، عدلیہ اور انصاف کے متعلق لکھا:

''یہ خط میں تمہارے خیر خواہ ہونے کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں۔ ابوعبیدہ مندرجہ ذیل پانچ اصولوں پر عمل کرو اس سے تمہارا دین محفوظ رہے گا اور تمہاری دنیا بھی بہتر ہو جائے گی'':

1- جب دو لوگ یا فریقین تمہیں کسی شکایت یا مسئلے کے متعلق رجوع کریں تو مدعی سے ثبوت اور ملزم سے حلف مانگو۔

2- غریبوں سے نرمی سے پیش آؤ اس سے اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوں گی۔

3- مسافر کا خیال رکھو چونکہ وہ جلد ہی اپنی منزل کو لوٹ جائے گا اور اس کے مسائل کو جلدی سے حل کرو۔

4- مدعی اور ملزم کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرو۔

5- اگر تم کسی مسئلے کے حوالے سے کسی ٹھوس فیصلے پر نہیں پہنچ سکتے کوشش کرو مدعی اور ملزم کے درمیان صلح کروا دو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرت وشخصیت اور نظام حکومت

حضرت علی رضی اللہ عنہ رقیق اور نرم دل انسان تھے کیونکہ انہوں نے حضرت محمد ﷺ کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔ اس لیے آپ رضی اللہ عنہ کی ذات خلق نبوی ﷺ کا پیکر اور اسلامی تعلیمات کی عملی تصویر تھی۔ مختصر یہ کہ آپ رضی اللہ عنہ کی سیرت کا احاطہ ان صفات سے کیا جاتا ہے۔

عبادت:

آپ رضی اللہ عنہ کا پسندیدہ مشغلہ عبادت و ریاضت تھا۔ مستدرک کے بیان کے مطابق آپ رضی اللہ عنہ بنی ہاشم میں سب سے زیادہ عبادت گزار تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قائم اللیل اور صائم النہار تھے۔

امانت و دیانت:

آپ رضی اللہ عنہ ایماندار تھے، اس لیے حضور ﷺ نے ہجرت کی رات لوگوں کی امانتیں آپ رضی اللہ عنہ کے سپرد کی تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہ اپنی ذات کے لیے ایک دانہ بھی بیت المال سے لینا حرام خیال کرتے تھے۔

ایک دفعہ آپ رضی اللہ عنہ کا بدن کانپ رہا تھا، ایک آدمی نے عرض کی، امیر المومنین! بیت المال میں آپ رضی اللہ عنہ کے اہل وعیال کا بھی حصہ ہے، تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تمہارے حصے کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، اگر میں اپنے حصے سے زیادہ لوں گا تو مسلمانوں کی حق تلفی ہوگی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

شجاعت:

آپ رضی اللہ عنہ شجاعت کے پیکر تھے، آپ رضی اللہ عنہ نے تمام غزوات میں شجاعت کے جوہر دکھائے اور مرحب جیسے نامور بہادروں کو للکارا۔

سادگی:

آپ رضی اللہ عنہ کی زندگی سادگی کا مکمل نمونہ تھی، تکلف آپ رضی اللہ عنہ کے نزدیک نام تک کو نہ تھا، اپنا سارا کام خود کرتے۔ زمانہ خلافت میں خود بازاروں میں گھومتے اور بھولے بھٹکوں کو راستہ بتاتے، کمزوروں اور ضعیفوں کی مدد کرتے۔

لباس وغذا:

آپ رضی اللہ عنہ معمولی غذا کھاتے تھے، ایک دفعہ عبداللہ نامی شخص آپ رضی اللہ عنہ کے کھانے میں شریک ہوا، کھانا بہت سادہ تھا، اس نے عرض کی، اے امیر المومنین! کیا آپ رضی اللہ عنہ کو پرندوں کا گوشت پسند نہیں ہے، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خلیفہ وقت کو مسلمانوں کے مال سے صرف دو پیالوں کا حق ہے۔ ایک خود کھائے اور دوسرا اہل وعیال کو کھلائے۔

مسند احمد میں ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ عمدہ غذاؤں سے پرہیز فرماتے، ایک مرتبہ فالودہ کا پیالہ آپ رضی اللہ عنہ کو پیش کیا گیا آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کتنا خوش ذائقہ اور خوش رنگ ہے مگر میں اپنے نفس کو ان غذاؤں کا عادی نہیں بنانا چاہتا۔

زہد:

آپ رضی اللہ عنہ کی سیرت کا نمایاں پہلو زہد ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ فقیری کو پسند فرماتے تھے۔ اسی لیے آپ رضی اللہ عنہ کے حکیمانہ اقوال زبان زد عام ہیں۔ ''دنیا مردار ہے، اور اس کے چاہنے والے کتے ہیں۔'' جب آپ رضی اللہ عنہ کوفہ میں تشریف لائے تو محل کی بجائے آپ رضی اللہ عنہ نے کھلے میدان میں قیام کیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی گھر کا سارا کام خود کرتی تھیں۔ چکی پیستے پیستے ان کے ہاتھوں پر چھالے پڑ جاتے تھے، آپ رضی اللہ عنہا کے زہد کا یہ عالم تھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جو جہیز ملا تھا اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا۔

بیت المال کی حفاظت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی بیت المال کی خود حفاظت فرماتے۔ ایک بار آپ رضی اللہ عنہ کے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے دس ہزار کی رقم لے لی۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علم ہوا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس رقم کو واپس کروایا۔

ایک دفعہ حضرت عمر بن سلمہ اصفہان کا اخراج لائے، اس میں شہد اور چربی تھی، آپ رضی اللہ عنہ کی بیٹی ام کلثوم نے اس میں سے مانگا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک ڈبہ بھیج دیا جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حساب کیا تو دو پیپے کم نکلے جب آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سختی سے پوچھا تو انہوں نے بتا دیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اسی وقت دونوں ڈبے منگوائے اور جو خرچ ہو چکا تھا اس کی قیمت ادا کر دی۔

www.urdukutabkhanapk

فوج:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فطرتاً سپاہی اور سپہ سالار تھے، اس لیے آپ رضی اللہ عنہ نے فوج کی طرف خصوصی توجہ دی، جنگ صفین میں 80 ہزار فوجی آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے چھاؤنیاں قائم کیں اور قلعے تعمیر کرائے۔

نظام خلافت کی اصلاح:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلافت کے نظام کی بھی اصلاح فرمائی، عثمانی عہد میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں، آپ رضی اللہ عنہ نے اسے دور کیا جہاں تک ممکن ہوسکتا تھا، آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہم کے نظام کو رائج کرنے کی کوشش کی۔

خلاصہ:

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پوچھنے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک حاشیہ نشین زرار ابن ازور نے آپ رضی اللہ عنہ کے مندرجہ ذیل اوصاف بیان کئے تھے۔ جو آپ رضی اللہ عنہ کی سیرت پر ایک جامع تبصرہ ہے۔ وہ بلند حوصلہ اور نہایت قوی تھے۔ فیصلہ کن بات کہتے تھے، انصاف والا فیصلہ کرتے تھے۔ ان کے ہر طرف سے علم نکلتا تھا اور حکمت ظاہر ہوتی تھی۔ دنیا اور اس کی دلفریبیوں سے ڈرتے تھے۔ رات کی تاریکی اور اس کی وحشت سے محبت کرتے تھے۔ عبرت پذیر اور بہت غور و فکر کرنے والے تھے۔ معمولی لباس اور سادہ کھانا پسند کرتے تھے۔ جب ہم کچھ پوچھتے تھے تو اس کا جواب دیتے تھے۔ اس کے باوجود ہم کو اپنے قریب رکھتے تھے اور خود ہمارے قریب رہتے تھے۔ لیکن ہم ہیبت سے ان سے گفتگو نہ کر سکتے تھے۔ وہ دینداروں کی عزت کرتے تھے، غریبوں کو مقرب بناتے تھے، ان کے سامنے طاقتور باطل میں طمع نہیں کر سکتے تھے اور کمزور انصاف سے مایوس نہیں ہوسکتا تھا۔ بعض مواقع پر اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ رات گزر رہی ہے، ستارے چمک رہے ہیں، اپنی داڑھی مٹھی میں دبائے مار گزیدہ کی طرح بے قرار اور غم رسیدہ کی طرح اشکبار کہہ رہے ہیں ''اے دنیا! کسی اور کو فریب دے تو مجھ سے لگاؤ کر رہی ہے، میری مشتاق ہے، افسوس! افسوس! میں نے تجھے تین طلاقیں دیں، تیری عمر تھوڑی اور تیرا مقصد حقیر ہے، ہائے ہائے سفر طویل، راستہ وحشت ناک اور زاد سفر تھوڑا ہے۔''

یہ اوصاف سن کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ رو پڑے اور کہا کہ خدا ابوالحسن پر رحم کرے، بخدا وہ ایسے ہی تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سرکاری خطوط

(Letters of Hazrat Ali (RA) to Particular Authorities)

مالک الاشتر (نامزد گورنر مصر) کے نام:

نوٹ: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تفصیلی مکتوب جو ان کے توقیعات/سرکاری خطوط میں سب سے زیادہ محاسن پر مبنی ہے اس میں دنیا کے تمام حکمرانوں کے لئے دستور حکمرانی، اصول حکمرانی اور بہتر طرز حکمرانی نہایت اچھے پیرائے میں بیان کئے گئے یہ خط پبلک ایڈمنسٹریشن کے حوالے سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے مندرجات پیش خدمت ہیں:

اللہ کا خوف، اس کی اطاعت کو مقدم سمجھنا اور جن فرائض و سنن کا اس نے اپنی کتاب میں حکم دیا ہے ان کی اتباع کرنا کہ انہی کی پیروی سے سعادت اور انہیں کے ٹھکرانے اور برباد کرنے سے بدبختی دامن گیر ہوتی ہے اور یہ کہ اپنے دل، ہاتھ، اپنی زبان سے اللہ کی نصرت میں لگے رہیں۔ کیونکہ خدائے بزرگ و برتر نے ذمہ لیا ہے کہ جو اس کی نصرت کرے گا وہ اس کی مدد کرے گا اور جو اس کی حمایت کے لیے کھڑا ہوگا وہ اسے عزت و سرفرازی بخشے گا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نفسانی خواہشوں کے وقت اپنے نفس کو کچلیں اور اس کی منہ زوریوں کے وقت اسے روکیں۔ کیونکہ نفس برائیوں ہی کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مالک تمہیں ان علاقوں کی طرف بھیج رہا ہوں کہ جہاں تم سے پہلے عادل اور ظالم کئی حکومتیں گزر چکی ہیں اور لوگ تمہارے طرز عمل کو اسی نظر سے دیکھیں گے جس نظر سے تم اپنے پچھلے حکمرانوں کے طور طریقے کو دیکھتے رہے ہو اور تمہارے بارے میں وہی کہیں گے جو تم ان حکمرانوں کے بارے میں کہتے تھے۔ یہ یاد رکھو کہ خدا کے نیک بندوں کا پتہ چلتا ہے اسی نیک نامی سے جو انہیں بندگان الٰہی میں خدا نے دے رکھی ہے۔ لہٰذا ہر ذخیرے سے زیادہ پسند تمہیں نیک اعمال کا ذخیرہ ہونا چاہئے۔ تم اپنی خواہشوں پر قابو رکھو، جو مشاغل تمہارے لئے حلال نہیں ان میں صرف کرنے سے اپنے نفس کے ساتھ بخل کرو نفس کے ساتھ بخل کرنا ہی اس کے حق کو ادا کرنا ہے، چاہے وہ خود اسے پسند کرے یا ناپسند۔ رعایا کے لئے اپنے دل کے اندر رحم اور لطف و محبت کو جگہ دو۔ ان کے لئے پھاڑ کھانے والا درندہ نہ بن جاؤ۔ اس لئے کہ رعایا میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو تمہارے دینی بھائی اور دوسرے تمہارے جیسی مخلوق خدا۔ ان کی لغزشیں بھی ہوں گی خطاؤں سے بھی سابقہ پڑے گا اور ان کے ہاتھوں سے جان بوجھ کر یا بھولے سے غلطیاں بھی ہوں گی۔ تم ان سے اسی طرح عفو و درگزر سے کام لینا۔ جس طرح اللہ سے اپنے لئے عفو و درگزر کو پسند کرتے ہو۔ اس لئے کہ تم ان پر حاکم ہو ہم دونوں کے اوپر اللہ حاکم ہے اور میں نے تمہیں والی بنایا ہے تاکہ تم سے ان لوگوں کے معاملات کی انجام دہی ہے اور ان کے ذریعہ تمہاری آزمائش کی ہے۔ دیکھو! خبردار اللہ کے غضب کے سامنے تم بے بس ہو اور اس کے عفو و رحمت سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ تمہیں کسی کو معاف کر دینے پر پچھتانا اور سزا دینے پر اترانا نہ چاہئے۔ غصہ میں جلد بازی سے کام نہ لو۔ جبکہ اس کے ٹال دینے کی گنجائش ہو کبھی یہ نہ کہنا کہ میں حاکم بنایا گیا ہوں، لہٰذا میرے حکم کے آگے سر تسلیم خم ہونا چاہئے کیونکہ یہ دل میں فساد پیدا کرنے، دین کو کمزور بنانے اور بربادیوں کو قریب لانے کا سبب ہے اور کبھی حکومت کی وجہ سے تم میں تمکنت یا غرور پیدا ہو تو اللہ کے ملک کی عظمت کو دیکھو اور خیال کرو کہ وہ تم پر وہ قدرت رکھتا ہے کہ جو خود تم اپنے آپ پر نہیں رکھتے۔ یہ چیز تمہاری رعونت و سرکشی کو دبا دے گی، اور تمہاری طغیانی کو روک دے گی اور تمہاری کھوئی ہوئی عقل کو پلٹا دے گی۔

خبردار! کبھی اللہ کے ساتھ اس کی عظمت میں نہ ٹکراؤ اور اس کی شان و جبروت سے ملنے کی کوشش نہ کرو، کیونکہ اللہ ہر جبار و سرکش کو نیچا دکھاتا ہے اور ہر مغرور کے سر کو جھکا دیتا ہے۔

اپنی ذات کے بارے میں اور اپنے خاص عزیزوں اور رعایا میں اپنے دل پسند افراد کے معاملے میں حقوق اللہ اور حقوق الناس کے متعلق بھی انصاف کرنا کیونکہ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ظالم ٹھہرو گے، جو خدا کے بندوں پر ظلم کرتا ہے تو بندوں کے بجائے اللہ اس کا حریف و دشمن بن جاتا ہے، جس کا وہ حریف و دشمن ہو، اس کی ہر دلیل کو کچل دے گا، اور وہ اللہ سے برسرپیکار رہے گا۔ یہاں تک کہ باز آئے اور توبہ کر لے۔ اور اللہ کی نعمتوں کو سلب کرنے والی اور اس کی عقوبتوں کو جلد بلا وادینے والی کوئی چیز اس سے بڑھ کر نہیں ہے کہ ظلم پر باقی رہا جائے کیونکہ اللہ مظلوموں کی پکار سنتا ہے اور ظالموں کے لئے موقع کا منتظر رہتا ہے۔ تمہیں سب طریقوں سے زیادہ طریقہ وہ پسند ہونا چاہئے جو حق کے اعتبار سے بہترین، انصاف کے لحاظ سے سب کو شامل اور رعایا کے زیادہ سے زیادہ افراد کی مرضی کے مطابق ہو۔ کیونکہ عوام کی ناراضگی خواص کی رضامندی کو بے اثر بنا دیتی ہے اور خواص کی ناراضگی عوام کی رضامندی کے ہوتے ہوئے نظر انداز کی جا سکتی ہے، یاد رکھو کہ رعیت میں خاص سے زیادہ کوئی ایسا نہیں کہ جو خوش حالی کے وقت حاکم پر بوجھ بننے والا مصیبت کے وقت امداد سے کترانے والا انصاف پر ناک بھوں چڑھانے والا، سوال کے موقع پر پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جانے والا، بخشش پر کم شکر گزار ہونے والا، محروم کو لئے جانے پر بمشکل عذر سننے والا اور زمانہ کی ابتلاؤں پر بے صبری دکھانے والا ہو اور دین کا مضبوط سہارا، مسلمانوں کی قوت اور دشمن کے مقابلہ میں سامان دفاع یہی امت کے عوام ہوتے ہیں۔ لہٰذا تمہاری پوری توجہ رضائے الٰہی کی جانب ہونا چاہئے۔ اور تمہاری رعایا میں تم سے سب سے زیادہ اور سب سے زیادہ تمہیں ناپسندوہ ہونا چاہئے جو لوگوں کی عیب جوئی میں زیادہ لگا رہتا ہو۔ کیونکہ لوگوں میں عیب تو ہوتے ہی ہیں۔ حاکم کے لئے انتہائی شایان

www.urdukutab apk

شان یہ ہے کہ ان پر پردہ ڈالے۔ لہٰذا جو عیب تمہاری نظروں سے اوجھل ہوں انہیں نہ اچھالنا کیونکہ تمہارا کام انہی عیبوں کو مٹانا ہے کہ جو تمہارے اوپر ظاہر ہوں اور جو چھپے ڈھکے ہوں ان کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے۔ اس لئے جہاں تک بن پڑے عیبوں کو چھپاؤ تا کہ اللہ بھی تمہارے ان عیبوں کی پردہ پوشی کرے جنہیں تم رعیت سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہو۔ لوگوں سے کینہ کی ہر گرہ کو کھول دو اور دشمنی کی ہر رسی کاٹ دو اور ہر ایسے رویہ سے جو تمہارے لئے مناسب نہیں بے خبر بن جاؤ اور چغل خور کی ہاں میں ہاں نہ ملاؤ کیونکہ وہ فریب کار ہوتا ہے اگر خیر خواہوں کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اپنے مشورہ میں کسی بخیل کو شریک نہ کرنا کہ وہ تمہیں دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے سے روکے گا اور فقر و افلاس کا خطرہ لائے گا اور نہ کسی بزدل سے مہمات میں مشورہ لینا کہ وہ تمہاری ہمت پست کردے گا اور نہ کسی لالچی سے مشورہ کرنا کہ وہ ظلم کی راہ سے مال بٹورنے کو تمہاری نظروں میں سجا دے گا۔ یاد رکھو کہ بخل بزدلی اور حرص اگرچہ الگ الگ خصلتیں ہیں مگر اللہ سے بدگمانی ان سب میں شریک ہے۔ تمہارے لئے سب سے بدتر وزیر وہ ہوگا جو تم سے پہلے بدکرداروں کا وزیر اور گناہوں میں ان کا شریک رہ چکا ہے اس قسم کے لوگوں کو تمہارے مخصوصین میں سے نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ گنہگاروں کے معاون اور ظالموں کے ساتھی ہوتے ہیں۔ ان کی جگہ تمہیں ایسے لوگ مل سکتے ہیں جو تدبیر و رائے اور کارکردگی کے اعتبار سے ان کے مثل ہوں مگر ان کی طرح گناہوں کے انبار میں دبے ہوئے نہ ہوں۔ جنہوں نے کسی ظالم کی اس کے ظلم میں مدد کی ہو اور نہ کسی گنہگار کا اس کے گناہ میں ہاتھ بٹایا ہو، ان کا بوجھ تم پر ہلکا ہوگا اور یہ تمہارے بہترین معاون ثابت ہوں گے اور تمہاری طرف محبت سے جھکنے والے ہوں گے اور تمہارے علاوہ دوسروں سے ربط ضبط نہ رکھیں گے۔ انہی کو تم خلوت و جلوت میں اپنا مصاحب خاص ٹھہرانا پھر تمہارے نزدیک ان میں زیادہ ترجیح ان لوگوں کو ہونا چاہئے کہ جو حق کی کڑوی باتیں تم سے کھل کر کہنے والے ہوں اور ان چیزوں میں کہ جنہیں اللہ اپنے مخصوص بندوں کے لئے ناپسند کرتا ہے۔ تمہاری بہت کم مدد کرنے والے ہوں چاہے وہ تمہاری خواہشوں سے کتنا ہی میل کھاتے ہوں۔ پرہیزگاروں اور راست بازوں سے اپنے کو وابستہ رکھنا۔ پھر انہیں اس کا عادی بنانا کہ وہ تمہارے کسی کارنامہ کے بغیر تمہاری تعریف کر کے تمہیں خوش نہ کریں۔ کیونکہ زیادہ مدح سرائی غرور پیدا کرتی ہے اور سرکشی کی منزل سے قریب کر دیتی ہے اور تمہارے نزدیک نیکوکار اور بدکردار دونوں برابر نہ ہوں اور اس بات کو یاد رکھو کہ حاکم کو اپنی رعایا پر پورا اعتماد اسی وقت کرنا چاہئے جبکہ وہ ان سے حسن سلوک کرتا ہو اور ان پر بوجھ نہ لادے اور انہیں ایسی ناگوار چیزوں پر مجبور نہ کرے جو ان کے بس میں نہ ہوں۔ تمہیں ایسا رویہ اختیار کرنا چاہئے کہ اس حسن سلوک سے تمہیں رعیت پر پورا اعتماد ہو سکے کیونکہ یہ اعتماد تمہاری طویل اندرونی الجھنوں کو ختم کر دے گا اور سب سے زیادہ تمہارے اعتماد کے وہ مستحق ہیں جن کے ساتھ تم نے اچھا سلوک کیا ہو اور سب سے زیادہ بے اعتماد کے مستحق وہ ہیں جن سے تمہارا برتاؤ اچھا نہ رہا ہو۔ دیکھو! اس اچھے طور طریقے کو ختم نہ کرنا کہ جس پر اس امت کے بزرگ چلتے رہے ہیں اور جس سے اتحاد و یکجہتی پیدا اور رعیت کی اصلاح ہوئی ہے اور ایسے طریقے ایجاد نہ کرنا کہ جو پہلے طریقوں کو ضرر پہنچائیں۔ اگر ایسا کیا تو نیک روش کے قائم کر جانے والوں کو ثواب تو ملتا رہے گا مگر انہیں ختم کر دینے کا گناہ تمہاری گردن پر ہوگا اور اپنے شہروں کے اصلاحی امور کو مستحکم کرنے اور ان چیزوں کے قائم کرنے میں کہ جن سے پچھلے لوگوں کے حالات مضبوط رہے تھے علماء و حکماء کے ساتھ باہمی مشورہ کرتے رہنا۔

رعایا کے طبقے:

تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ رعایا میں کئی طبقے ہوتے ہیں جن کی بہبود ایک دوسرے سے وابستہ ہوتی ہے اور وہ ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ ان میں سے ایک طبقہ وہ ہے جو اللہ کی راہ میں آنے والے فوجیوں کا ہے دوسرا طبقہ وہ ہے جو عمومی و خصوصی تحریروں کا کام انجام دیتا ہے، تیسرا انصاف کرنے والے قضاۃ کا ہے چوتھا حکومت کے وہ عمال جن سے امن اور انصاف قائم ہوتا ہے، پانچواں خراج دینے والے مسلمان اور جذیہ دینے والے ذمیوں (جزیہ گزار یعنی وہ مشرک یا اہل کتاب جو اسلامی حکومت کی امان میں رہتے ہوں اور جنہوں نے شرائط جذیہ کو قبول کر لیا ہے)، چھٹا تجارت پیشہ و اہل سیاست حرف کا ساتواں فقراء و مساکین کا وہ طبقہ ہے جو سب سے پست ہے اور اللہ نے ہر ایک کا حق متعین کر دیا ہے اور اپنی کتاب یا سنت نبوی ﷺ میں اس کی حد بندی کر دی اور وہ (مکمل) دستور ہمارے پاس محفوظ ہے۔

www.[illegible]kutabkhanapk.blogspot.com

فوج:

فوج فرمانبرواؤں کی زینت دین ومذہب کی قوت اور امن کی راہ ہیں۔ رعیت کا نظم ونسق انہی سے قائم رہ سکتا ہے اور فوج کی زندگی کا سہارا وہ خراج ہے جو اللہ نے اس کے لئے معین کیا ہے کہ جس سے وہ دشمنوں سے جہاد کرنے میں تقویت حاصل کرتے اپنی حالت کو درست بناتے اور ضروریات کو بہم پہنچاتے ہیں۔ فوج کا سردار اس کا بنانا جو اپنے اللہ کا اور اپنے رسول کا اور تمہارے امام کا سب سے زیادہ خیر خواہ ہو، سب سے زیادہ پاک دامن ہو اور بردباری میں نمایاں ہو۔ جلد غصہ میں نہ آجاتا ہو، عذر معذرت پر مطمئن ہو جاتا ہو، کمزوروں پر رحم کھاتا ہو اور طاقتوں کے سامنے اکڑ جاتا ہو، نہ بدخوئی اسے جوش میں لے آتی ہو اور نہ پست ہمتی اسے بٹھا دیتی ہو۔ پھر ایسا ہونا چاہئے کہ تم بلند خاندان، نیک گھرانے اور عمدہ روایات رکھنے والوں اور ہمت وشجاعت اور جود وسخا کے مالکوں سے اپنا ربط وضبط بڑھاؤ کیونکہ یہ لوگ بزرگیوں کا سرمایہ اور نیکیوں کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ پھر ان کے حالات کی اس طرح دیکھ بھال کرنا، جس طرح ماں باپ اپنی اولاد کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اگر ان کے ساتھ کوئی ایسا سلوک کرو کہ جو ان کی تقویت کا سبب ہو تو اسے بڑا نہ سمجھنا اور اپنے کسی معمولی سلوک کو بھی غیر اہم نہ سمجھ لینا کیونکہ اس حسن سلوک سے ان کی خیر خواہی کا جذبہ ابھرے گا اور حسن اعتماد میں اضافہ ہوگا اور اس خیال سے کہ تم نے ان کی بڑی ضرورتوں کو پورا کر دیا ہے کہیں ان کی چھوٹی ضرورتوں سے آنکھ بند نہ کر لینا۔ کیونکہ یہ چھوٹی قسم کی مہربانی بھی اپنی جگہ فائدہ بخش ہوتی ہے۔ اور وہ بڑی ضرورتیں اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں اور فوجی سرداروں میں تمہارے یہاں وہ بلند منزلت سمجھا جائے، جو فوجیوں کی اعانت میں برابر کا حصہ لیتا ہو اور اپنے روپے پیسے سے اتنا سلوک کرتا ہو کہ جس سے ان کا اور ان کے پیچھے رہ جانے والے بال بچوں کا بخوبی گزارا ہو سکتا ہو تاکہ وہ ساری فکروں سے بے فکر ہو کر پوری یکسوئی کے ساتھ دشمن سے جہاد کریں۔ اس لیے کہ فوجی سرداروں کے ساتھ تمہارا مہربانی سے پیش آنا ان کے دلوں کو تمہاری طرف موڑ دے گا۔

عدل وانصاف:

شہروں میں برقرار رہے رعایا کی محبت ظاہر ہوتی رہے اور ان کی محبت اسی وقت ظاہر ہوا کرتی ہے کہ جب ان کے دلوں میں میل نہ ہو اور ان کی خیر خواہی اسی صورت میں ثابت ہوتی ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں کے گرد حفاظت کے لئے گھیرا ڈالے رہیں۔ ان کے اقتدار کے سر پر بڑا بوجھ نہ سمجھیں اور نہ ان کی حکومت کے خاتمہ کے لئے گھڑیاں گنیں۔

لہٰذا ان کی امیدوں میں وسعتیں رکھنا انہیں اچھے لفظوں سے سراہتے رہنا اور ان میں اچھی کارکردگی دکھانے والوں کے کارناموں کا تذکرہ کرتے رہنا۔ اس لئے کہ ان کے اچھے کارناموں کا ذکر بہادروں کو جوش میں لے آتا ہے اور پست ہمتوں کو ابھارتا ہے۔ جو شخص جس کارنامے کو سرانجام دے اسے پہچانتے رہنا اور ایک کا کارنامہ دوسرے کی طرف منسوب نہ کر دینا اور اس کی حسن کارکردگی کا صلہ دینے میں کمی نہ کرنا اور کبھی ایسا نہ کرنا کہ کسی شخص کی بلندی ورفعت کی وجہ سے اس کے معمولی کام کو بڑا سمجھ لو اور کسی کے بڑے کام کو اس کے خود پست ہونے کی وجہ سے معمولی قرار دے لو۔

جب ایسی مشکلیں تمہیں پیش آئیں کہ جن کا حل نہ ہو سکے اور ایسے معاملات کو جو مشتبہ ہو جائیں تو ان میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو، کیونکہ خدا نے جن لوگوں کو ہدایت کرنا چاہی ہے ان کے لئے فرمایا ہے ”اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول ﷺ کی اور ان کی جو تم میں سے صاحبان امر ہوں۔“ تو اللہ کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی کتاب کی محکم آیتوں پر عمل کیا جائے اور رسول کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے ان متفق علیہ ارشادات پر عمل کیا جائے جن میں کوئی اختلاف نہیں۔ پھر یہ کہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرنے کے لئے ایسے شخص کو منتخب کرو جو تمہارے نزدیک رعایا میں سب سے بہتر ہو، جو واقعات کی پیچیدگیوں سے ناگواری اور گھٹن میں نہ پڑ جاتا ہو، نہ جھگڑا کرنے والوں کے رویہ سے غصہ میں آتا ہو۔ نہ اپنے کسی غلط نقطہ نظر پر اڑتا ہو، نہ حق کو پہچان کر اس کے اختیار کرنے میں طبیعت پر بار محسوس کرتا ہو، نہ اس کا نفس

www.urdukutabkhanapk.blogspot

ذاتی طمع پر جھک پڑتا ہو معاملات کی چھان بین سرسری نہ کرتا ہو اور جب حقیقت آئینہ ہو جاتی ہو تو بے دھڑک فیصلہ کر دیتا ہو۔ اسے سراہنا مغرور نہ بنائے۔ اگرچہ شک وشبہ کے موقع پر قدم روک لیتا ہو، اور دلیل وحجت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہو۔ پھر یہ کہ تم خود ان کے فیصلوں کا بار بار جائزہ لیتے رہنا۔ دل کھول کر انہیں اتنا دینا کہ جو ان کے ہر عذر کو غیر مسموع بنا دے اور لوگوں کی انہیں کوئی احتیاج نہ رہے۔ اپنے ہاں انہیں ایسے باعزت مرتبہ پر رکھو کہ تمہارے دربار میں لوگ انہیں ضرر پہنچانے کا کوئی خیال نہ کر سکیں تا کہ وہ تمہارے التفات کی وجہ سے لوگوں کی سازش سے محفوظ رہیں اس بارے میں انتہائی بالغ نظری سے کام لینا کیونکہ اس سے پہلے یہ دین بدکرداروں کے پنجے میں اسیر رہ چکا ہے۔ جس میں نفسانی خواہشوں کی کارفرمائی تھی اور اسے دنیا طلبی کا ایک ذریعہ بنا لیا گیا تھا۔

حکومتی عہدیداران:

حکومتی عہدیداران پر نظر رکھنا ان کو خوب آزمائش کے بعد منصب دینا کبھی صرف رعایت اور جانبداری کی بنا پر انہیں منصب عطا نہ کرنا۔ اس لئے کہ یہ باتیں ناانصافی اور بے ایمانی کا سرچشمہ ہیں اور ایسے لوگوں کو منتخب کرنا جو آزمودہ غیرت مند ہوں۔ ایسے خاندانوں میں سے جو اچھے ہوں اور جن کی خدمات اسلام کے سلسلہ میں پہلے سے ہوں کیونکہ ایسے لوگ بلند اخلاق اور بے داغ عزت والے ہوتے ہیں۔ حرص وطمع کی طرف کم جھکتے ہیں اور عواقب ونتائج پر زیادہ نظر رکھتے ہیں۔ پھر ان کی تنخواہوں کا معیار بلند رکھنا، کیونکہ اس سے انہیں اپنے نفوس کے درست رکھنے میں مدد ملے گی اور اس مال سے بے نیاز رہیں گے جو ان کے ہاتھوں میں بطور امانت ہوگا اس کے بعد بھی وہ تمہارے حکم کی خلاف ورزی یا امانت میں رخنہ اندازی کریں تو تمہاری محبت ان پر قائم ہوگی۔ پھر ان کے کاموں کو دیکھتے بھالتے رہنا اور سچے اور وفادار مخبروں کو ان پر چھوڑ دینا، کیونکہ خفیہ طور پر ان کے امور کی نگرانی انہیں امانت کے برتنے، رعیت کے ساتھ نرم رویہ رکھنے کے باعث ہوگی۔ خائن مددگاروں سے اپنا بچاؤ کرتے رہنا ان میں سے کوئی خیانت کی طرف ہاتھ بڑھائے اور متفقہ طور پر جاسوسوں کی اطلاعات تم تک پہنچ جائیں، تو شہادت کے لئے بس اسے کافی سمجھنا اسے جسمانی طور پر سزا دینا جو کچھ اس نے اپنے عہدہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سمیٹا ہے اسے واپس لینا، اسے ذلت کی منزل پر کھڑا کر دینا، خیانت کی رسوائیوں کے ساتھ اسے روشناس کرانا، ننگ ورسوائی کا طوق اس کے گلے میں ڈال دینا۔

مال گزاری (ٹیکس):

مال گزاری ادا کرنے والوں کا مفاد پیش نظر رکھنا، کیونکہ باج اور باجگزاروں کی بدولت ہی دوسروں کے حالات درست کئے جا سکتے ہیں۔ سب اسی خراج اور خراج دینے والوں کے سہارے پر جیتے ہیں اور خراج کی جمع آوری سے زیادہ زمین کی آبادی کا خیال رکھنا کیونکہ خراج بھی تو زمین کی آبادی ہی سے حاصل ہو سکتا ہے اور جو آباد کئے بغیر خراج چاہتا ہے وہ ملک کی بربادی اور بندگان خدا کی تباہی کا سامان کرتا ہے اور اس کی حکومت تھوڑے دنوں سے زیادہ نہیں رہ سکتی۔

اب اگر وہ خراج کی گرانباری یا کسی آفت ناگہانی یا نہری وبارانی علاقوں میں ذرائع آب پاشی کے ختم ہونے یا زمین کے سیلاب میں گھر جانے یا سیرابی کے نہ ہونے کے باعث اس کے تباہ ہونے کی شکایت کریں تو خراج میں اتنی کمی کر دو جس سے تمہیں ان کے حالات کے سدھرنے کی توقع ہو، اور ان کے بوجھ کو ہلکا کرنے سے تمہیں گرانی نہ محسوس ہو۔

کیونکہ انہیں زیر باری سے بچانا ایک ایسا ذخیرہ ہے کہ جو تمہارے ملک کی آبادی اور تمہارے قلم وحکومت کی زیب وزینت کی صورت میں تمہیں پلٹا دیں گے اور اس کے ساتھ تم ان سے خراج تحسین اور عدل قائم رکھنے کی وجہ سے مسرت بے پایاں بھی حاصل کر سکو گے اور اپنے اس حسن سلوک کی وجہ سے کہ جس کا ذخیرہ تم نے ان کے پاس رکھ دیا ہے تم آڑے وقت پر ان کے بل بوتے پر بھروسہ کر سکو گے اور رحم کے جلوس میں جس سیرت عادلانہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

انہوں نے انہیں خوگر بنایا ہے اس کے سبب سے تمہیں ان پر وثوق و اعتماد ہو سکے گا اس کے بعد ممکن ہے کہ ایسے حالات بھی پیش آئیں کہ جن میں تمہیں ان پر اعتماد کرنے کی ضرورت ہو تو وہ انہیں طیب خاطر (خوشی و رضامندی) جھیل لے جائیں گے۔ کیونکہ ملک آباد رہے تو جیسا بوجھ اس پر لادو گے وہ اٹھائے گا اور زمین کی تباہی تو اس سے آتی ہے کہ کاشت کاروں کے ہاتھ تنگ ہو جائیں اور ان کی تنگ دستی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ حکام مال و دولت کے سمیٹنے پر تل جاتے ہیں اور انہیں اپنے اقتدار کے ختم ہونے کا کھٹکا لگا رہتا ہے اور عبرتوں سے بہت کم فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

مملکت کے انتظامی معاملات:

مملکت کے انتظامی معاملات ان کے سپرد کرنا جو ان میں بہتر ہوں اور اپنے ان فرامین کو جن میں مخفی تدابیر اور مملکت کے رموز و اسرار درج ہوتے ہیں خصوصیت کے ساتھ ان کے حوالے کرنا جو سب سے زیادہ اچھے اخلاق کے مالک ہوں جنہیں کسی اعزاز کا حاصل ہونا سرکش نہ بنائے کہ وہ بھری محفلوں میں تمہارے خلاف کچھ کہنے کی جرت کرنے لگیں اور ایسے بے پرواہ نہ ہو کہ لین دین کے بارے میں جو تم سے متعلق ہوں تمہارے کارندوں کے خطوط تمہارے سامنے پیش کرنے اور ان کے مناسب جوابات روانہ کرنے میں کوتاہی کرتے ہوں اور وہ تمہارے حق میں جو معاہدہ کریں اس میں کوئی خامی نہ رہنے دیں اور نہ تمہارے خلاف کسی سازباز کا توڑ کرنے میں کمزوری دکھائیں اور وہ معاملات میں اپنے صحیح مرتبہ اور مقام سے ناآشنا نہ ہوں کیونکہ جو اپنا صحیح مقام نہیں پہچانتا وہ دوسروں کے قدر و مقام سے اور بھی زیادہ ناواقف ہوگا۔ پھر یہ کہ ان کا انتخاب تمہیں اپنی فراست، خود اعتمادی اور حسن ظن کی بنا پر نہ کرنا چاہئے کیونکہ لوگ تصنع اور حسن خدمات کے ذریعہ حکمرانوں کی نظروں میں سما کر تعارف کی راہیں نکال لیا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان میں ذرا بھی خیر خواہی اور امانت داری کا جذبہ نہیں ہوتا لیکن تم انہیں ان خدمات سے پرکھو جو تم سے پہلے وہ نیک حاکموں کے ماتحت رہ کر انجام دے چکے ہوں جو عوام میں نیک نام اور امانت داری کے اعتبار سے زیادہ مشہور ہوں ان کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کرو۔ اس لئے کہ ایسا کرنا اس کی دلیل ہوگا کہ تم اللہ کے مخلص ہو۔ تمہیں محکمہ تحریر کے ہر شعبہ پر ایک ایک افسر مقرر کرنا چاہئے جو اس شعبہ کے بڑے سے بڑے کام پھر یہ کہ اپنے منشیان دفاتر کی بابت پر نظر رکھنا اپنے سے عاجز نہ ہو اور کام کی زیادتی سے بوکھلا نہ اٹھے۔ یاد رکھو کہ ان منشیوں میں جو بھی عیب ہوگا اور تم اس سے آنکھ بند رکھو گے اس کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔

تاجران اور صناع (کاریگر):

تاجروں اور صناعوں کے خیال اور ان کے ساتھ اچھے برتاؤ کی ہدایت کرو اور تمہیں دوسروں کو ان کے متعلق ہدایت کرنا ہے خواہ وہ ایک جگہ رہ کر بیوپار کرنے والے ہوں یا پھیری لگا کر بیچنے والے ہوں یا جسمانی مشقت مزدوری یا دستکاری سے کمانے والے ہوں کیونکہ یہی لوگ منافع کا سرچشمہ اور ضروریات کے مہیا کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ان ضروریات کو خشکیوں، تریوں، میدانی علاقوں اور پہاڑوں ایسے دور افتادہ مقامات سے درآمد کرتے ہیں اور ایسی جگہوں سے جہاں لوگ پہنچ نہیں سکتے اور نہ وہاں جانے کی ہمت کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ امن پسند اور صلح جو ہوتے ہیں۔ ان سے کسی فساد اور شورش کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ یہ لوگ تمہارے سامنے ہوں یا جہاں جہاں دوسرے شہروں میں پھیلے ہوں تم ان کی خبر گیری کرتے رہنا۔ ہاں اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھو کہ ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو انتہائی تنگ نظر اور بڑے کنجوس ہوتے ہیں جو نفع اندوزی کے لئے مال روک رکھتے ہیں اور اونچے نرخ معین کر لیتے ہیں۔ یہ چیز عوام کے لئے نقصان دہ اور حکام کی بدنامی کا باعث ہوتی ہے۔ لہٰذا ذخیرہ اندوزی سے منع کرنا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے ممانعت فرمائی ہے اور خرید و فروخت صحیح ترازوؤں اور مناسب نرخوں کے ساتھ سہولت ہونا چاہئے کہ نہ بیچنے والے کو نقصان ہو اور نہ خریدنے والے کو خسارہ ہو۔ اس کے بعد بھی کوئی ذخیرہ اندوزی کے جرم کا مرتکب ہو تو اسے مناسب حد تک سزا دینا۔

www.[...]kutabkhana.pk[...]gspot

حاجت مند:

حاجت مند پسماندہ اور افتادہ لوگوں کے بارے جن کا کوئی سہارا نہیں ہوتا وہ مسکینوں محتاجوں، فقیروں اور معذوروں کا طبقہ ہے۔ ان میں کچھ تو ہاتھ پھیلا کر مانگنے والے ہیں اور کچھ کی صورت سوال ہوتی ہے اللہ کی خاطر ان بے کسوں کے بارے میں اس کے حق کی حفاظت کرنا جس کا اس نے تمہیں ذمہ دار بنایا ہے ان کے لئے ایک حصہ بیت المال سے معین کر دینا اور ایک حصہ ہر شہر کے اس غلہ میں سے دینا جو اسلامی غنیمت کی زمینوں سے حاصل ہوا ہو، کیونکہ اس میں دور والوں کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا نزدیک والوں کا ہے اور تم ان سب کے حقوق کی نگہداشت کے ذمہ دار بنائے گئے ہو۔ لہٰذا تمہیں دولت کی سرمستی ان سے غافل نہ کر دے۔ کیونکہ کسی معمولی بات کو اس لئے نظر انداز نہیں کیا جائے گا کہ تم نے بہت سے اہم کاموں کو پورا کر دیا ہے لہٰذا اپنی توجہ ان سے نہ ہٹانا اور تکبر کے ساتھ ان کی طرف سے اپنا رخ پھیرنا اور خصوصیت کے ساتھ خبر رکھو ایسے افراد کی جو تم تک پہنچ نہیں سکتے جنہیں آنکھیں دیکھنے سے کراہت کرتی ہوں گی، اور لوگ انہیں حقارت سے ٹھکراتے ہوں گے تم ان کے لئے اپنے کسی بھروسے کے آدمی کو جو خوف خدا رکھنے والا اور متواضع ہو مقرر کر دینا کہ وہ ان کے حالات تم تک پہنچاتا رہے۔ پھر ان کے ساتھ وہ طرز عمل اختیار کرنا جس سے قیامت کے روز اللہ کے سامنے حجت پیش کر سکو کیونکہ رعیت میں دوسروں سے زیادہ یہ انصاف کے محتاج ہیں اور یوں تو سب ہی ایسے ہیں کہ تمہیں ان کے حقوق سے عہدہ برآ ہو کر اللہ کے سامنے سرخرو ہونا ہے اور دیکھو یتیموں اور بوڑھوں کا خیال رکھنا، کہ جو کوئی سہارا رکھتے ہیں اور نہ سوال کے لئے اٹھتے ہیں اور یہی وہ کام ہے جو حکام پر گراں گزرا کرتا ہے۔ ہاں خدا ان لوگوں کے لئے جو عقبیٰ کے طلب گار رہتے ہیں اس کی گرانیوں کو ہلکا کر دیتا ہے وہ اسے اپنی ذات پر جھیل لے جاتے ہیں اور اللہ نے جو ان سے وعدہ کیا ہے اس کی بات پر بھروسا رکھتے ہیں۔

تم اپنے اوقات کا ایک حصہ حاجت مندوں کے لئے متعین کر دینا جس میں سب کام چھوڑ کر انہی کے لئے مخصوص ہو جانا اور ان کے لئے ایک عام دربار کرنا ان سے تواضع وانکساری سے کام لینا اور فوجیوں، نگہبانوں اور پولیس والوں کو ہٹا دینا تا کہ کہنے والے بے دھڑک کہہ سکیں کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کئی موقعوں پر فرماتے سنا ہے کہ ''اس قوم میں پاکیزگی نہیں آسکتی جس میں کمزوروں کو کھل کر طاقتوروں سے حق نہیں دلایا جاتا۔'' پھر یہ کہ اگر ان کے تیور بگڑیں یا صاف صاف مطلب نہ کہہ سکیں، تو اسے برداشت کرنا اور تنگ دلی اور نخوت کو اس کے مقابلہ میں پاس نہ آنے دینا۔ اس کی وجہ سے اللہ تم پر اپنی رحمت کے دامنوں کو پھیلا دے گا، اور اپنی فرماں برداری کا تمہیں ضرور اجر دے گا اور جو حسن سلوک کرنا اس طرح کہ چہرے پر شکن نہ آئے اور نہ دینا تو اچھے طریقے سے عذر خواہی کر لینا۔ پھر کچھ امور ایسے ہیں کہ جنہیں خود تم ہی کو انجام دینا چاہئیں۔ ان میں سے ایک حکام کے ان مراسلات کا جواب دینا ہے جو تمہارے منشیوں کے بس میں نہ ہوں اور ان لوگوں کی حاجتیں جب تمہارے سامنے پیش ہوں تمہارے عملہ کے ارکان ان سے جی چرائیں تو خود انہیں انجام دینا ہے۔ روز کا کام اسی روز ختم کر دیا کرو کیونکہ ہر دن اپنے ہی کام کے لئے مخصوص ہوتا ہے اور اپنے اوقات کا بہتر و افضل حصہ اللہ کی عبادت کے لئے خاص کر دینا۔ اگرچہ وہ تمام کام بھی اللہ ہی کے لئے ہیں جب نیت بخیر ہو اور ان سے رعیت کی خوش حالی ہو۔ ان مخصوص اشغال میں سے کہ جن کے ساتھ تم خلوص کے ساتھ اللہ کے لئے اپنے دینی فریضہ کو ادا کرتے ہو ان واجبات کی انجام دہی ہونا چاہئے جو اس کی ذات سے مخصوص ہیں۔ تم شب و روز کے اوقات میں اپنی جسمانی طاقتوں کا کچھ حصہ اللہ کے سپرد کر دو اور جو عبادت بھی تقرب الٰہی کی غرض سے بجا لانا ایسی ہو کہ نہ اس میں کوئی خلل ہو اور نہ کوئی نقص چاہے اس میں تمہیں کتنی جسمانی زحمت اٹھانا پڑے۔

نماز:

جب نماز پڑھانا تو ایسی نہیں کہ طول دے کر لوگوں کو بے زار کر دو اور نہ ایسی مختصر کہ نماز برباد ہو جائے۔ اس لئے کہ نمازیوں میں بیمار بھی ہوتے ہیں اور ایسے بھی جنہیں کوئی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ چنانچہ جب مجھے رسول اللہ ﷺ نے یمن کی طرف روانہ کیا تو میں نے آپ ﷺ سے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہدایت کیا کہ انہیں نماز کس طرح پڑھاؤں؟ فرمایا کہ جیسی ان میں سے سب سے زیادہ کمزور و ناتواں کی نماز ہو سکتی ہے، اور تمہیں مومنوں کے حال پر مہربان ہونا چاہیے۔

عوام سے روپوشی اور حقوق کی ادائیگی:

حکمرانوں کا رعایا سے چھپ کر رہنا ایک طرح کی تنگ دلی اور معاملات سے ناواقف رہنے کی وجہ ہے۔ یہ روپوشی ہوتی ہے، ان امور پر مطلع ہونے سے روکتی ہے جس کی وجہ سے بڑی چیز ان کی نگاہ میں چھوٹی اور چھوٹی چیز بڑی، اچھائی برائی اور برائی اچھائی ہو جایا کرتی ہے اور حق باطل کے ساتھ مل جل جاتا اور حکمران بھی آخر ایسا ہی بشر ہوتا ہے جو ان معاملات سے بھی ناواقف ہو سکتا ہے ایسے معاملات جو لوگ اس سے پوشیدہ رکھیں دو ہی طرح کے آدمی ہو سکتے ہیں یا تو تم ایسے ہو کہ تمہارا نفس حق کی ادائیگی کے لئے آمادہ ہے تو پھر واجب حقوق ادا کرنے اور اچھے کام کر گزرنے سے منہ چھپانے کی ضرورت کیا؟ اور یا تم ایسے ہو کہ لوگوں کو تم سے کورا جواب ہی ملنا ہے تو جب لوگ تمہاری عطا سے مایوس ہو جائیں گے تو خود ہی بہت جلد تم سے مانگنا چھوڑ دیں گے اور پھر یہ کہ لوگوں کی اکثر ضرورتیں ایسی ہوں گی جن سے تمہاری جیب پر کوئی بار نہیں پڑتا جیسے کسی کے ظلم کی شکایت یا کسی معاملہ میں انصاف کا مطالبہ۔ اس کے بعد معلوم ہونا چاہئے کہ حکام کے کچھ خواص اور سر چڑھے لوگ ہوا کرتے ہیں جن میں خود غرضی دست درازی اور بدمعاملگی ہوا کرتی ہے۔ تم کو ان حالات کے پیدا ہونے کی وجہ ختم کر کے ان گندے مواد کو ختم کر دینا چاہئے اور دیکھو اپنے کسی حاشیہ نشین اور قرابت دار کو جاگیر نہ دینا اور اسے تم سے توقع نہ بندھنا چاہئے کسی ایسی زمین پر قبضہ کرنے کی جو آبپاشی یا کسی مشترکہ معاملہ میں اس کے آس پاس کے لوگوں کے لئے ضرر کی باعث ہو، یوں کہ اس کا بوجھ دوسرے پر ڈال دے اس صورت میں اس کے خوش گوار مزے تو اس کے لئے ہوں گے نہ تمہارے لئے۔ مگر اس کا بدنما دھبہ دنیا و آخرت میں تمہارے دامن پر رہ جائے گا۔ جس پر جو حق عائد ہوتا ہو اس پر اس حق کو نافذ کرنا چاہئے۔ وہ تمہارا اپنا ہو یا بیگانہ ہو اور اس کے بارے میں تحمل سے کام لینا اور ثواب کے امیدوار رہنا چاہئے اس کی زد تمہارے کسی قریبی عزیز یا کسی مصاحب خاص پر کیسی ہی پڑتی ہو اور اس میں تمہاری طبیعت کو جو گرانی محسوس ہو اس کے اخروی نتیجہ کو پیش نظر رکھنا کہ اس کا انجام بہرحال اچھا ہوگا اگر رعیت کو تمہارے بارے میں کبھی یہ بدگمانی ہو جائے کہ تم نے اس پر ظلم و زیادتی کی ہے تو اپنے عذر کو واضح طور پر پیش کرو اور عذر واضح کر کے ان کے خیالات کو بدل دو، اس سے تمہارے نفس کی تربیت ہوگی اور رعایا پر مہربانی ثابت ہوگی اور اس عذر آوری سے ان کو حق پر استوار کرنے کا مقصد پورا ہوگا۔

صلح:

دشمن جب صلح کی دعوت دے کہ جس میں اللہ کی رضامندی ہو تو اسے کبھی ٹھکرا نہ دینا کیونکہ صلح میں تمہارے لشکر کے لئے آرام و راحت خود تمہارے فکروں سے نجات اور شہروں کے لئے امن کا سامان ہے لیکن صلح کے بعد دشمن سے چوکنا اور خوب ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دشمن قرب حاصل کرتا ہے تاکہ تمہاری غفلت سے فائدہ اٹھائے۔ لہٰذا احتیاط کو ملحوظ رکھو اور اس بارے میں حسن ظن سے کام نہ لو۔ اگر اپنے اور دشمن کے درمیان کوئی معاہدہ کرو یا اسے اپنے دامن میں پناہ دو تو پھر عہد کی پابندی کرو، وعدہ کا لحاظ رکھو اور اپنے قول و قرار کی حفاظت کے لئے اپنی جان کو سپر بنا دو۔ کیونکہ اللہ کے فرائض میں سے ایفائے عہد کی ایسی کوئی چیز نہیں کہ جس کی اہمیت پر دنیا اپنے الگ الگ نظریوں اور مختلف رایوں کے باوجود یکجہتی سے متفق ہو، مسلمانوں کے علاوہ مشرکوں تک نے اپنے درمیان معاہدوں کی پابندی کی ہے۔ اس لئے کہ عہد شکنی کے نتیجہ میں انہوں نے تباہیوں کا اندازہ کیا تھا لہٰذا اپنے عہد و پیمان میں غداری اور قول و قرار میں بدعہدی نہ کرنا، اپنے دشمن پر اچانک حملہ نہ کرنا کیونکہ یہ جرات جاہل بدبخت کے علاوہ دوسرا نہیں کر سکتا، اور اللہ نے عہد و پیمان کی پابندی کو امن کا پیغام قرار دیا ہے کہ جسے اپنی رحمت سے بندوں میں عام کر دیا ہے اور ایسی پناہ گاہ بنایا ہے کہ جس کے دامن حفاظت میں پناہ لینے اور اس کے جوار میں منزل کرنے کے لئے وہ تیزی سے بڑھتے ہیں۔ لہٰذا اس میں کوئی جعلسازی، فریب کاری اور مکاری

www.urdukutabkhanapk.blog

نہ ہونا چاہئے، اور ایسا کوئی معاہدہ نہ کرو جس میں تاویلوں کی ضرورت پڑنے کا امکان ہو، اور معاہدہ کے پختہ اور طے ہو جانے کے بعد اس کے کسی مبہم لفظ کے دوسرے معنی نکال کر فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرو اور اس عہد و پیمان خداوندی میں کسی دشواری کا محسوس ہونا تمہارے لئے اس کا باعث نہ ہونا چاہئے کہ تم اسے ناحق منسوخ کرنے کی کوشش کرو کیونکہ ایسی دشواریوں کو جھیل لے جانا جن سے چھٹکارے کی اور انجام بخیر ہونے کی امید ہو اس بدعہدی کرنے سے بہتر ہے جس کے برے انجام کا تمہیں خوف اور اس کا اندیشہ ہو کہ اللہ کے یہاں تم سے اس پر کوئی جواب دہی ہوگی اور اس طرح تمہاری دنیا اور آخرت دونوں کو تباہی ہوگی۔ ناحق خونریزیوں سے دامن بچائے رکھنا۔ کیونکہ عذاب الٰہی سے قریب اور پاداش کے لحاظ سے سخت اور نعمتوں کے سلب ہونے اور عمر کے خاتمہ کا سبب ناحق خون ریزی سے زیادہ کوئی شے نہیں ہے اور قیامت کے دن اللہ سبحانہ سب سے پہلے جو فیصلہ کرے گا وہ انہیں خونوں کا ہوگا جو بندگان خدا نے ایک دوسرے کے بہائے ہیں۔ لہٰذا ناحق خون بہا کر اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کی کبھی کوشش نہ کرنا کیونکہ یہ چیز اقتدار کو کمزور اور کھوکھلا کر دینے والی ہوتی ہے، اور اس کی بنیادوں کو ہلا دیتی ہے اور جان بوجھ کر قتل کے جرم میں اللہ کے سامنے تمہارا کوئی عذر چل سکے گا نہ میرے سامنے کیونکہ اس میں قصاص ضروری ہے اور اگر غلطی سے تم اس کے مرتکب ہو جاؤ اور سزا دینے میں تمہارا کوڑا یا تلوار یا ہاتھ حد سے بڑھ جائے اس لئے کہ کبھی چھوٹی ضرب ہلاکت کا سبب ہو جایا کرتی ہے تو ایسی صورت میں اقتدار کے نشہ میں بے خود ہو کر مقتول کا خون بہا اس کے وارثوں تک پہنچانے میں کوتاہی نہ کرنا۔

خود پسندی:

سے بچتے رہنا اور اپنی اپنی جو باتیں اچھی معلوم ہوں ان پر اترانا نہیں اور نہ لوگوں کے بڑھا چڑھا کر سراہنے کو پسند کرنا کیونکہ شیطان کو جو مواقع ملا کرتے ہیں ان میں سے یہ سب سے زیادہ اس کے نزدیک بھروسے کا ذریعہ ہے کہ وہ اس طرح نیکوکاروں کی نیکیوں پر پانی پھیر دے اور رعایا کے ساتھ نیکی کر کے کبھی احسان نہ جتاؤ جوان کے ساتھ حسن سلوک کرنا اسے زیادہ نہ سمجھنا اس سے وعدہ کر کے بعد میں وعدہ خلافی نہ کرنا کیونکہ احسان جتانا نیکی کو اکارت کر دیتا ہے اور اپنی بھلائی کو زیادہ خیال کرنا، ناحق کی روشنی کو ختم کر دیتا ہے اور وعدہ خلافی سے اللہ بھی ناراض ہوتا ہے اور بندے بھی چنانچہ اللہ سبحانہ خود فرماتا ہے۔

''خدا کے نزدیک یہ بڑی ناراضگی کی چیز ہے کہ تم جو کہو اسے کرو نہیں۔''

دیکھو وقت سے پہلے کسی کام میں جلد بازی نہ کرنا اور جب اس کا موقع آجائے تو پھر کمزوری نہ دکھانا اور جب صحیح صورت سمجھ میں نہ آئے تو اس پر مصر نہ ہونا اور جب طریق کار واضح ہو جائے تو پھر سستی نہ کرنا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھو، اور ہر کام کو اس کے موقع پر انجام دو اور دیکھو جن چیزوں میں سب لوگوں کا حق برابر ہوتا ہے اسے اپنے لئے مخصوص نہ کر لینا اور قابل لحاظ حقوق سے غفلت نہ برتنا جو نظروں کے سامنے نمایاں ہو کیونکہ دوسروں کے لئے یہ ذمہ داری تم پر عائد ہے اور مستقبل قریب میں تمام معاملات پر سے پردہ ہٹا دیا جائے گا اور تم سے مظلوم کی دادخواہی کر لی جائے گی۔ دیکھو غضب کی تندی، سرکشی کے جوش ہاتھ کی جنبش، اور زبان کی تیزی پر ہمیشہ قابو رکھو، ان چیزوں سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ جلد بازی سے کام نہ لو اور سزا دینے میں دیر کرو، یہاں تک کہ تمہارا غصہ کم ہو جائے اور تم اپنے اوپر قابو پالو، اور کبھی یہ بات تم اپنے نفس میں پورے طور پر پیدا نہیں کر سکتے جب تک اللہ کی طرف اپنی بازگشت کو یاد کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ ان تصورات کو قائم نہ رکھو۔

تمہیں لازم ہے کہ گزشتہ زمانوں کو یاد رکھو خواہ کسی عادل حکومت کا طریق کار ہو یا کوئی اچھا عمل درآمد ہو۔ رسول ﷺ کی کوئی حدیث ہو یا کتاب اللہ میں درج شدہ کوئی فریضہ ہو، تو ان چیزوں کی پیروی کرو، ان ہدایات پر عمل کرتے رہنا جو میں نے اس عہد نامہ میں درج کی ہیں اور ان کے ذریعہ سے میں نے اپنی حجت تم پر قائم کر دی ہے تاکہ تمہارا نفس اپنی خواہشات کی طرف بڑھے تو تمہارے پاس کوئی عذر نہ ہو۔

.com

عبداللہ بن عباس (والی بصرہ) کے نام:

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بصرہ وہ جگہ ہے جہاں شیطان اترتا ہے اور فتنے سر اٹھاتے ہیں۔ یہاں کے باشندوں کو حسن سلوک سے خوش رکھو اور ان کے دلوں سے خوف کی گرہیں کھول دو۔ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ تم بنی تمیم سے درشتی کے ساتھ پیش آتے ہو، اور ان پر سختی روا رکھتے ہو۔ بنی تمیم تو وہ ہیں کہ جب بھی ان کا کوئی ستارہ ڈوبتا ہے تو اس کی جگہ دوسرا ابھر آتا ہے اور جاہلیت اور اسلام میں کوئی ان سے جنگ جوئی میں بڑھ نہ سکا۔ اور پھر انہیں ہم سے قرابت کا لگاؤ اور عزیز داری کا تعلق بھی ہے کہ اگر ہم اس کا خیال رکھیں گے تو اجر پائیں گے اور اس کا لحاظ نہ کریں گے تو گنہگار ہوں گے۔ دیکھو ابن عباس! خدا تم پر رحم کرے۔ (رعیت کے بارے میں) تمہارے ہاتھ اور زبان سے جو اچھائی اور برائی ہونے والی ہو، اس میں جلد بازی نہ کیا کرو۔ کیونکہ ہم دونوں اس (ذمہ داری) میں برابر کے شریک ہیں۔ تمہیں اس حسن ظن کے مطابق ثابت ہونا چاہئے جو مجھے تمہارے ساتھ اور تمہارے بارے میں میری رائے غلط ثابت نہ ہونا چاہئے۔ والسلام۔

ایک عامل کے نام:

تمہارے شہر کے زمینداروں نے تمہاری سختی، سنگدلی، تحقیر آمیز برتاؤ، اور تشدد کے رویہ کی شکایت کی ہے۔ میں نے غور کیا تو وہ شرک کی وجہ سے اس قابل تو نظر نہیں آتے کہ انہیں نزدیک کر لیا جائے اور معاہدہ کی بناء پر انہیں دور پھینکا اور دھتکارا بھی نہیں جا سکتا۔ لہٰذا ان کے لئے نرمی کا ایسا شعار اختیار کرو جس میں کہیں کہیں سختی کی بھی جھلک ہو اور کبھی سختی کر لو اور کبھی نرمی برتو اور قرب و بعد اور نزدیکی دوری کو سمو کر بین بین راستہ اختیار کرو۔ انشاءاللہ۔

زیادہ بن ابیہ (نائب گورنر بصرہ) کے نام:

جب وہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ (والی بصرہ) کا نائب تھا۔

میں اللہ کی سچی قسم کھاتا ہوں کہ اگر مجھے یہ پتہ چل گیا کہ تم نے مسلمانوں کے مال میں خیانت کرتے ہوئے کسی چھوٹی یا بڑی چیز میں ہیر پھیر کیا ہے تو یاد رکھو کہ میں ایسی مار ماروں گا کہ جو تمہیں تہی دست، بوجھل پیٹھ والا اور بے آبرو کر کے چھوڑے گی۔ والسلام!

زیاد بن ابیہ (نائب گورنر بصرہ) کے نام:

میانہ روی اختیار کرتے ہوئے فضول خرچی سے باز آؤ، آج کے دن کل کو بھول نہ جاؤ۔ صرف ضرورت بھر کے لئے مال روک کر باقی محتاجی کے دن کے لئے آگے بڑھاؤ۔

کیا تم یہ آس لگائے بیٹھے ہو کہ اللہ تمہیں عجز و انکساری کرنے والوں کا اجر دے گا؟ حالانکہ تم اس کے نزدیک متکبروں میں سے ہو؟ اور یہ طمع رکھتے ہو کہ وہ خیرات کرنے والوں کا ثواب تمہارے لئے قرار دے گا؟ حالانکہ تم عشرت سامانیوں میں لوٹ رہے ہو، اور بے کسوں اور بیواؤں کو محروم کر رکھا ہے۔ انسان اپنے ہی کئے کی جزا پاتا ہے اور جو آگے بھیج چکا ہے وہی آگے بڑھ کر پائے گا۔ والسلام۔

عبداللہ ابن عباس (گورنر بصرہ) کے نام:

نوٹ: عبداللہ ابن عباس کہا کرتے تھے کہ جتنا فائدہ میں نے اس کلام سے حاصل کیا ہے، اتنا پیغمبر ﷺ کے کلام کے بعد کسی کلام سے حاصل نہیں کیا۔

w rdukutabkhanap ogspo

''انسان کو کبھی ایسی چیز کا پالینا خوش کرتا ہے جو اس کے ہاتھوں میں جانے والی ہوتی ہی نہیں اور کبھی ایسی چیز کا ہاتھ سے نکل جانا اسے غمگین کر دیتا ہے جو اسے حاصل ہونے والی ہوتی ہی نہیں۔ یہ خوشی اور غم بیکار ہیں۔ تمہاری خوشی صرف آخرت کی حاصل کی ہوئی چیزوں پر ہونا چاہئے اور اس میں سے کوئی چیز جاتی رہے اس پر رنج ہونا چاہیے اور جو چیز دنیا سے پالو اس پر زیادہ خوش نہ ہو اور جو چیز اس سے جاتی رہے اس پر بے قرار ہو کر افسوس کرنے نہ لگو بلکہ تمہیں موت کے پیش آنے والے حالات کی طرف اپنی توجہ موڑنا چاہیے۔''

ایک کارندے/ عامل زکوٰۃ کے نام:

ایک کارندے کے نام کہ جسے زکوٰۃ اکٹھا کرنے کے لئے بھیجا اور یہ ہدایات تحریر کیں:

''میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ وہ اپنے پوشیدہ ارادوں اور مخفی کاموں میں اللہ سے ڈرتے رہیں جہاں نہ اللہ کے علاوہ کوئی گواہ ہوگا اور نہ اس کے ماسوا کوئی نگران ہے اور تمہیں حکم دیتا ہوں کہ وہ ظاہر میں اللہ کا کوئی ایسا فرمان بجا نہ لائیں کہ ان کے چھپے ہوئے اعمال اس سے مختلف ہوں اور جس شخص کا باطن وظاہر اور کردار وگفتار مختلف نہ ہو، اس نے امانتداری کا فرض انجام دیا اور اللہ کی عبادت میں خلوص سے کام لیا اور میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ وہ لوگوں کو آزردہ نہ کریں اور نہ انہیں پریشان کریں اور نہ ان سے اپنے عہدے کی برتری کی وجہ سے بے رخی برتیں کیونکہ وہ دینی بھائی اور زکوٰۃ وصدقات کے برآمد کرنے میں معین ومددگار ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ اس زکوٰۃ میں تمہارا بھی معین حصہ اور جانا پہنچانا ہوا حق ہے اور اس میں بیچارے مسکین اور فاقہ کش لوگ بھی تمہارے شریک ہیں اور ہم تمہارا حق پورا پورا ادا کرتے ہیں تو تم بھی ان کا حق پورا پورا ادا کرو۔ نہیں تو یاد رکھو کہ روز قیامت تمہارے ہی دشمن سب سے زیادہ ہوں گے، اور وائے بدبختی اس شخص کی جس کے خلاف اللہ کے حضور فریق بن کر کھڑے ہونے والے فقیر، نادار، سائل، دھتکارے ہوئے لوگ قرض دار اور (بے خرچ) مسافر ہوں۔ یاد رکھو! کہ جو شخص امانت کو بے وقعت سمجھتے ہوئے اسے ٹھکرا دے اور خیانت کی چراگاہوں میں چرتا پھرے اور اپنے کو اور اپنے دین کو اس کی آلودگی سے نہ بچائے، تو اس دنیا میں بھی اپنے کو ذلتوں اور خواریوں میں پائے گا اور یقیناً آخرت میں بھی ذلیل اور رسوا ہوگا۔ بے شک سب سے بڑی بغاوت مسلمانوں سے بغاوت ہے اور سب سے خبیث دھوکہ مسلم حکمرانوں سے دھوکہ ہے اور یہی حقیقت بات ہے۔

عبداللہ بن عباس کو ہدایات جب ان کو بصرہ کا عامل بنایا:

لوگوں سے کشادہ چہرے کے ساتھ ملو۔ ان کو اپنے پاس آنے دو اور ہمیشہ حوصلہ افزاء احکامات جاری کرو۔ غصے سے پرہیز کرو چونکہ غصہ شیطان کی علامت ہے یاد رکھو جو چیز تمہیں اللہ کے قریب لے جائے گی وہ تمہیں جہنم سے دور لے جائے گی اور جو چیز تمہیں اللہ سے دور لے جائے گی وہ جہنم کے قریب لے جائے گی۔

قثم بن عباس (گورنر مکہ) کو خط:

حج کی تیاری کے لیے انتظامات شروع کر دو اور لوگوں کو یاد دلاؤ کہ یہ دن اللہ کے لیے وقف کرنے کے لیے ہیں اور صبح وشام بیٹھو اور ان سے ملاقاتیں جاری رکھو اور جس کو ضرورت ہو اسے قانون سکھاؤ، جاہل کو علم سکھاؤ اور علم والے سے بحث کرو۔ تمہارے اور لوگوں کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے سوائے تمہاری زبان کے اور تمہارا کوئی محافظ نہیں ہونا چاہیے سوائے تمہارے چہرے کے۔ کسی ضرورت مند شخص کو خود سے ملنے سے نہ روکو کیونکہ اگر کوئی ضرورت مند شخص اپنی ضروریات پوری کروائے بغیر تمہارے دروازے سے واپس ہو جائے اگرچہ تم بعد میں اس کی ضرورت پوری بھی کر دو تو یہ مناسب اقدام نہیں ہوگا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اور دیکھتے رہو کہ بیت المال میں اللہ کے لیے کیا کیا جمع ہوتا رہا اور ان کو ایسے لوگوں پر خرچ کرو جن کے خاندان ہوں، جو نادار ہوں، جو مفلس ہوں اور بھوکے ننگے ہوں اور جو کچھ بچ جائے وہ ہمیں بھیج دو اور اہل مکہ سے کہہ دو کہ رہائش کے لیے کرایہ نہ لگائیں چونکہ اللہ نے کہا ہے یہ تمام مقامی اور اجنبیوں کا برابر شہر ہے۔

اللہ ہمیں اور تمہیں اپنی رضامندی عطا فرمائے اور یہی حقیقت ہے۔

ایک عامل زکوٰۃ کے نام:

تمہیں جان لینا چاہئے کہ تمہارے اوپر ذمہ داری بہت قلیل اور اس کا اجر بہت کثیر ہے اور اگر چہ تم پر سزا اور نافرمانی کا خوف نہیں ہے جو کہ اللہ نے منع کی ہیں تو اس سے دور رہنے کا اجر ملے گا۔ لوگوں سے انصاف کے ساتھ پیش آؤ اور ان کی ضروریات پوری کرو چونکہ تم ان کے لیے صاحب خزانہ ہو اور معاشرے کے نمائندے ہو اور حکمران کے سفیر ہو۔ کسی کو اس کی ضروریات سے محروم نہ کرو۔ اور جب لگان لگاؤ تو لوگوں کے کپڑے جو سردیوں گرمیوں میں وہ پہنتے ہیں نہ بیچو اور نہ ہی ان کے مویشی جن سے وہ کام کرتے ہیں اور نہ ہی گلدان۔ اور درہم کے لیے کسی کو کوڑا نہ لگاؤ اور کسی کی ملکیت کو نہ چھوو چاہے وہ مسلمان ہے یا ذمی ہے جب تک کہ اس کا گھوڑا اور ہتھیار مسلمانوں کے خلاف استعمال نہ ہوں کیونکہ یہ مسلمانوں کے شایان شان نہیں کہ وہ یہ چیزیں اسلام کے دشمنوں کے ہاتھ میں رہنے دیں کہ جس سے وہ اسلام کے اوپر غلبہ حاصل کر سکیں۔

اور اچھے مشورے کو رد نہ کرو۔ فوج سے اچھا سلوک کرو اور عوام کی مدد کرو اور اللہ کے دین کو مضبوط کرو۔ اللہ کے راستے میں کوشش کرو کیونکہ یہ تم پر فرض ہے اور اللہ تم سے اور ہم سے یہ چاہتا ہے کہ ہم اس کے شکر گزار بنیں۔ اور ہم اس کے دین کے لیے نصرت کریں اور اللہ کے سوا کوئی طاقت نہیں جو کہ عظیم اور برتر ہے۔ تمہاری خوشی اچھے اعمال میں ہونی چاہئے جو تم نے آگے کے لیے بھیج دیئے ہیں اور تمہارا غم اس میں ہونا چاہئے جو تم نے پیچھے چھوڑ دیا ہے اور تمہارا دکھ اس پہ ہونا چاہئے جو آخرت کے دن ہم سب کو پیش آنا ہے۔

محمد بن ابی بکر (نامزد گورنر مصر) کے نام:

محمد بن ابی بکر رضی اللہ کے نام ہدایات جب ان کو مصر کا گورنر مقرر کیا۔

لوگوں سے انکساری سے پیش آؤ۔ خود کو نرم رکھو۔ ان سے بڑے دل سے پیش آؤ اور ان سے برابری کا سلوک رکھوتا کہ وہ تم سے ناانصافی کی توقع نہ رکھیں اور تمہیں ان کے اوپر ظالم نہیں ہونا چاہئے اللہ العظیم ایک دن ضرور تم سے اپنی مخلوق کے بارے میں پوچھے گا، تمہارے اعمال کے بارے میں چاہے وہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ، ظاہر ہوں یا مخفی۔ اگر وہ تمہیں سزا دے اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ظالم رہے اور اگر وہ تمہیں معاف کر دے یہ اس کی مہربانی ہوگی۔

جان لو کہ متقی آدمی اس دنیا اور اگلی دنیا کی خوشیوں کو ملا لیتا ہے چونکہ وہ اس دنیا کی خوشیاں لوگوں کے ساتھ ملا لیتے ہیں جب کہ دوسرے لوگ یہاں کی خوشیاں اگلی دنیا کے ساتھ نہیں ملا پاتے۔ یہ لوگ اس دنیا میں بہترین طریقے سے رہتے ہیں اور سب سے اچھی خوراک کھاتے ہیں نتیجتاً وہ سارا لطف یہاں حاصل کر چکے ہوتے ہیں آسان زندگی کے ساتھ اور اس سے وہ حاصل کر چکے ہوتے ہیں جو ایک متکبر شخص حاصل کرتا ہے۔ پھر وہ اس دنیا کو چھوڑ جاتے ہیں۔ لہٰذا متقی لوگ اس دنیا کو ترک کرنے کی وجہ سے اگلی دنیا میں کامیاب رہتے ہیں اور اللہ کے قریب رہتے ہیں۔

اے محمد بن ابی بکر! جان لو میں نے تمہیں مصر کی حکومت دی ہے جو کہ میری سب سے بڑی طاقت ہے۔ اس لیے تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم اپنے جذبات کو قابو میں رکھو اور دین کی نصرت بن کے رہو۔ اگر چہ تم صرف ایک ہی ساعت اس دنیا میں رہو اور اللہ تعالیٰ کو ناراض مت کرو، اللہ اوروں کی جگہ لے سکتا ہے لیکن کوئی اور اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ نماز کو اپنے اوقات میں ادا کرو۔ فرصت کی وجہ سے جلدی ادا نہ کرو اور نہ ہی مصروفیت کی وجہ سے دیر سے ادا کرو۔ یاد رکھو، تمہارا ہر عمل تمہاری نماز پر منحصر ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہدایت اور گمراہی کے رہنما برابر نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اللہ کے رسول ﷺ کے دوست اور دشمن برابر ہو سکتے ہیں۔ اللہ کے نبی ﷺ نے مجھے بتایا ہے "میں اپنی قوم کے متعلق ان میں ایمان لانے والے اور نہ لانے والوں کے بارے میں غمگین نہیں ہوں۔ جہاں تک ایمان لانے والوں کا تعلق ہے اللہ انہیں تحفظ دے گا اور جو ایمان نہ لانے والے ہیں اللہ انہیں ان کی بے ایمانی کی وجہ سے ذلیل کرے گا۔ لیکن میں اس آدمی کے بارے میں فکرمند ہوں جو کہ دل سے منافق ہے اور زبان دراز ہے۔ وہ ایسی بات کرتا ہے جو تمہیں بھلی لگتی ہے اور ایسے اعمال کرتا ہے جو تمہیں برے لگتے ہیں۔"

سرکاری ملازمین کی ذمے داریاں:

سید القوم خادمھم

"قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے۔"

پبلک ایڈمنسٹریشن میں تمام سرکاری ملازمین کو اعلیٰ کردار، اچھے اخلاق اور اچھے خیالات کا مالک ہونا چاہیے۔ بقول حضرت علی رضی اللہ عنہ سرکاری ملازمین میں تہذیب، تجربہ، چستی، مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت، سنجیدگی، لالچ سے پاک وغیرہ وغیرہ خصوصیات ہونی چاہئے۔ اسلام میں سرکاری ملازم نہ صرف اللہ کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے بلکہ عوام کے سامنے بھی جواب دہ ہوتا ہے۔ سرکاری ملازمین کے اہم فرائض میں سے امن وامان کی صورت حال کو قائم رکھنا، انصاف قائم کرنا، زکوۃ جمع کرنا شامل ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب خلافت سنبھالی تو یہ الفاظ کہے: "میری نظر میں طاقت ور اور کمزور دونوں برابر ہیں اور دونوں کو انصاف فراہم کرنا میری ذمہ داری ہے۔"

اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں سرکاری ملازمین کو کس حد تک جمہوری، ذمے دارانہ، جواب دہ، منصف اور قانون کی حکمرانی جیسے اصولوں کو سامنے رکھنا ہوتا ہے۔ اسلام سرکاری ملازمین کو درج ذیل ذمے داریاں تفویض کرتا ہے۔

1- مذہب اور شریعت پر عمل پیرا ہونا اور اس کو نافذ کرنا۔

2- انصاف فراہم کرنا۔

3- امن امان قائم کرنا۔

4- اسلام کا تعزیراتی نظام قائم کرنا۔

5- ریاست کی نصرت کرنا اور اس کے دفاع کو مضبوط کرنا۔

6- زکوۃ اور دوسرے لگان جمع کرنا۔

7- مظلوم کو طاقتور سے بچانا۔

8- قانون کی حکمرانی کو قائم کرنا۔

9- عوامی بہبود کے کام کرنا۔

10- تعلیمی نظام اور تعلیمی اداروں کا قائم کرنا۔

11- قیمتوں کو قابو میں رکھنا اور اجارہ دارانہ رجحانات کا قلع قمع کرنا۔

12- اخلاقی نظام کو قائم کرنا۔

13- امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر عمل پیرا ہونا۔

14- اس کے علاوہ ریاست جو بھی فرائض ذمے لگائے ان کو ادا کرنا بشرطیکہ وہ اسلام کے خلاف نہ ہوں۔

gspot.com

سرکاری ملازمین کی ذمے داریاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نظر میں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مطابق ایک سرکاری ملازم کو عوام سے رابطے میں رہنا چاہئے اور اس کا دروازہ ہمیشہ عوام وخواص کے لیے کھلا رہنا چاہئے۔ اسلام کے اندر کسی قسم کے عامرانہ، غاصبانہ اور متکبرانہ رویوں کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اسلامی طرز حکمرانی بنیادی طور پر انسانی فطرت کے قریب ترین ہے اور جس کا اولین مقصد انسانوں کی تعمیر وترقی میں مگن رہنا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب بھی کوئی گورنر لگاتے تو اسے ان الفاظ میں ہدایات جاری کرتے۔ ''اپنے لیے استقبال گاہیں نہ بناؤ تا کہ تم تک ہر کوئی رسائی حاصل کر سکے۔ زیادہ اچھا آٹا نہ کھاؤ چونکہ یہ مسلم امت کے تمام لوگوں کو مہیا نہیں اور باریک کپڑے نہ پہنو اس سے تمہارے اندر سہل پسندی پیدا ہوگی اور ترکی گھوڑے استعمال نہ کرو اس سے تمہاری اندر تکبر پیدا ہوگا۔''

سرکاری ملازمین کی ذمے داریاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نظر میں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مالک الاشتر کو درج ذیل نصیحتیں کیں جس میں انہوں نے سرکاری ملازم کی خصوصیات اور ذمے داریوں کا تعین فرمایا:

1. سرکاری ملازم کو اپنے ماتحتوں کے لیے اور عوام کے لیے ایک نمونہ ہونا چاہئے اور اس کو چاہئے کہ حکومت چلانے کے لیے اہل، قابل، متقی، حق پرست اور خدا ترس لوگوں کا انتخاب کرے۔
2. اسے انصاف کے معاملے میں غیر جانب دار ہونا چاہئے، چغل خوروں، خوشامدیوں اور بدعنوان لوگوں سے بچنا چاہئے۔ اسے چاہئے کہ وہ اپنے ماتحتوں سے ہر وقت رابطے میں رہے اور حاکمانہ فیصلے جاری کرنے سے گریز کرے۔
3. اسے بدعنوانی، ناانصافی اور عوام کے ساتھ زیادتی کے خلاف کام کرنا چاہئے اور وہ اپنے ماتحتوں کے تمام نقائص کا ذمے دار ہے اور اسے ایسی کوئی ملکیت اپنے لیے یا اپنے رشتے داروں کے لیے خاص نہیں کرلینی چاہئے جس میں اور لوگوں کا بھی حصہ ہے۔
4. انہیں چاہئے کہ وہ انصاف، سماجی مساوات اور ایمانداری کو معاشرے میں رواج دیں اور عوام کے خادم بن کر رہیں اور ریاست کے معاملات کے امین بن کر رہیں۔ انہیں چاہئے کہ عوام سے محبت کریں اور ان کے ایک خاندان کی طرح سلوک کریں نہ کہ حاکموں کی طرح۔

حاصل کلام:

ہم اپنی بات کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس بات پر منتج کرتے ہیں جو انہوں نے خلافت سنبھالتے وقت کہی۔ ''اللہ کی قسم! تم میں سے مضبوط ترین میری نظر میں کمزور ترین لوگ ہیں اور ان سے کمزور لوگوں کا حق دلا کے رہوں گا اور جو مضبوط ترین لوگ ہیں انہیں قانون پر عمل پیرا ہونا ہوگا۔''

انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا نے اس قول پر یہ تبصرہ کیا۔ ''ریاستی امور سے متعلق سرکاری ملازمین کی ذمے داریوں کے حوالے سے اس سے بہتر عام تعریف کرنا ناممکن ہوگا۔''

اسلام میں احتساب/حسبہ کا نظام:

اتق دعوة المظلوم، فإنها ليس بينها و بين الله حجاب. (رواہ الترمذی)

''مظلوم کی بددعا سے بچو کیونکہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

احتساب اسلامک پبلک ایڈمنسٹریشن میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام میں احتساب کے دو پہلو ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ سرکاری ملازمین اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہیں اور دوسرا یہ ہے کہ وہ عوام کے سامنے بھی جواب دہ ہیں۔ لہٰذا احتساب کا یہ نظریہ سرکاری ملازمین کے اوپر ایک اخلاقی اور نفسیاتی اثر رکھتا ہے جس سے وہ ایمانداری اور انصاف کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ سنت نبوی ﷺ کے مطابق کوئی بھی شخص اسلامی ریاست کے اندر احتساب سے بالاتر نہیں کیونکہ تمام لوگ قانون کے سامنے برابر ہیں۔

احتساب/حسبہ قرآن میں:

مسلمان یہ یقین رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے تمام اعمال کا آخرت میں حساب دینا ہوگا۔ اس لیے ہر مسلمان پر یہ فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرے تاکہ وہ اس کی رضا اور آخرت میں کامیابی حاصل کر سکے۔ انہی بنیادوں پر تمام افعال اور اعمال اسلامی تعلیمات کے مطابق ہونے چاہئیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا

(بنی اسرائیل:۳۶)

ترجمہ: ''بے شک کانوں اور آنکھوں اور دلوں میں سے ہر ایک کے متعلق سوال کیا جائے گا۔''

احتساب/حسبہ حدیث کی روشنی میں:

عن ابی سعید ن الخدری رضی الله عنه قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول من رأی منکم منکرا فلیغیره بیده فان لم یستطع فبلسانه فان لم یستطع فبقلبه وذلک أضعف الإیمان

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا:

میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اسے چاہیے کہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے تو اگر یہ نہ کر سکے تو اپنی زبان سے (روکے) اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو اپنے دل میں (اسے برا جانے) اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔

عن عبدالله بن عمر رضی الله عنهما ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال ألا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته فالإمام الذی علی الناس راع وهو مسئول عن رعیته والرجل راع علی أهل بیته وهو مسئول عن رعیته والمرأة راعیة علی أهل بیت زوجها وولده وهی مسئولة عنهم وعبدالرجل راع علی مال سیده وهو مسئول عنه الافکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته.

روایت ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''غور سے سنو، تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنی رعیت کی بابت جوابدہ ہے پس امام جو لوگوں پر نگران ہے اپنی رعایا کے بارے جوابدہ ہے اور مرد اپنے اہل خانہ کا نگہبان ہے اور وہ اپنی رعیت کے بارے جوابدہ ہے اور عورت اپنے خاوند کے اہل خانہ اور اس کی اولاد کی نگہبان ہے اور وہ ان کے لئے جوابدہ ہے

...kitabkhanapk.blogspot.com

اور مرد کا غلام اپنے آقا کے مال (آقا اس (کا) اور وہ جوابدہ بابت اس (کی) آگاہ رہو تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنی رعیت کے بارے جوابدہ ہے۔ (متفق علیہ)

ابن الاخوہ، مشہور مسلم عالم، احتساب سے متعلق لکھتے ہیں:

"احتساب اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے اور اس کا مقصد عوامی بہبود اور اصلاحات کے لیے کام کرتا ہے۔ ایسے معاملات میں جس کا اللہ تعالیٰ حکم کریں یا روکیں۔"

حسبہ اور محتسب:

1. انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مطابق حسبہ سے مراد عوامی جگہوں پر اور معاشرے کے اندر اخلاقی رویوں کی نگرانی کرنا ہے اور جس آدمی کو یہ ذمے داری سونپ دی جائے اسے محتسب کہتے ہیں۔ محتسب کا ادارہ اسلامی حکومت اور ایڈمنسٹریشن میں اہم اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہ ادارہ سرکاری ملازموں کی سرگرمیوں پر نظر رکھتا ہے اور ان کے غیر قانونی افعال اور ظلم و زیادتیوں سے عوام کو محفوظ رکھتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ دنیا کے پہلے محتسب تھے اور انہوں نے احتساب کا ادارہ متعارف کرایا جس کا مقصد عام طبقے کے لوگوں کو انصاف فراہم کرنا تھا۔ آپ ﷺ نے دنیا میں انصاف کا دیا جلایا۔ اگرچہ محتسب کا ادارہ انیسویں صدی میں عملاً ختم ہو گیا لیکن اس کی ضرورت ابھی بھی باقی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ محتسب کا ادارہ اسلامی تہذیب اور طرز حکمرانی میں اسلام کا بہت بڑا حصہ تھا۔
2. حضرت محمد ﷺ نے عدالت المظالم کا نظام قائم کیا جس کا مقصد عوام کو حکمرانوں کے ظلم و ستم سے بچانا تھا۔
3. اسلامی احتساب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قانون کی حکمرانی ہوتی ہے۔ جہاں اعلیٰ اور ادنیٰ، حاکم و محکوم سب لوگ برابر ہوتے ہیں۔

ایڈمنسٹریٹو احتساب (Administrative Accountability):

1. کسی بھی حکومت کی کامیابی نہ صرف اس کے ملازمین کی اہلیت پر منحصر ہوتی ہے بلکہ ان کے احتساب پر بھی۔ ایک سرکاری ملازم کو نہ صرف چست اور ذمے دار ہونا چاہئے بلکہ خود کو عوام کے سامنے احتساب کے لیے بھی پیش کرنا چاہئے۔
2. ڈاکٹر ایس۔ایم۔حیدر کہتے ہیں:

"Modern interest in administrative accountability developed as a protest to corruption and as a response to the expansion of public functions. With a switch over from a military to people's regime, a new type of service is needed that could provide integrity, political accountability and efficiency. The idea of the civil service with "negative approach" of punishment and sanctions is being replaced by the "positive civil service", a concept fully in keeping with the requirements of the people's government. The government is expected to protect its citizen against exploitation."

3. حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسلامی نظریہ احتساب کو اس طریقے سے بیان کیا جب انہوں نے مالک الاشتر کو ایک خط میں لکھا:

"Let me remind you once again that you are made responsible to guard the rights of poor people and to look after their welfare."

☆☆☆☆☆

باب 7: اسلامی ضابطہ حیات

آؤٹ لائن

- اسلامی نظام کی نمایاں خصوصیات
- سماجی نظام، سیاسی نظام، اقتصادی نظام، عدالتی نظام، انتظامی نظام
- اجماع کے اصول وضوابط
- اجتہاد کے اصول وضوابط

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسلامی ضابطہ حیات

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے اس کی خصوصیات تمام شعبہ ہائے زندگی کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، خواہ امیر ہو یا غریب شاہ ہو یا گدا بڑا ہو یا چھوٹا آقا ہو یا غلام تاجر ہو یا گنوار یا بدو ہر ایک کو دین اسلام سے رہنمائی میسر آتی ہے، اس دین پر عمل پیرا ہو کر گدا شاہ بن جاتا ہے، بدو مہذب شہری بن کر قوم کی قیادت کرنی شروع کر دیتے ہیں، جاہل راہ راست پر آجاتے ہیں اور لوگوں کو اھدنا الصراط المستقیم کا درس دینا شروع کر دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہر ایک کی زندگی کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اسلام کو مندرجہ ذیل خصوصیات کی بناء پر عالمگیر مذہب تسلیم کیا جاتا ہے:

1-	آخری دین	2-	مکمل دین	3-	محفوظ دین
4-	فطری دین	5-	جامع دین	6-	دائمی وابدی دین
7-	عالمی دین	8-	متوازن دین	9-	رہبر دین
10-	ہادی دین				

1- آخری دین:

اسلام تمام ادیان کا سردار ہے اور یہ آخری دین ہے، اس کے بعد کوئی نیا دین جاری نہیں ہوگا، بلکہ قیامت تک آنے والے انسان اس دین کی پیروی کریں گے۔

دلائل:

اس کی دلیل یہ کہ حضور ﷺ آخری نبی اور ہادی کائنات ہیں، اگر اس آخر الزمان نبی کے بعد کوئی اور نبی کائنات میں تشریف لاتا تو امید کی جا سکتی تھی کہ کوئی اور دین آئے گا اور اس کائنات میں چلے گا۔ مگر قرآن مجید نے صاف اعلان فرما دیا:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (الاحزاب:40)

ترجمہ: "محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول اور (سب) نبیوں پر مہر (آخری نبی) ہیں اور اللہ ہر شے کا جاننے والا ہے۔"

حضور ﷺ نے بھی خود فرمایا:

انا خاتم النبین لا نبی بعدی (بخاری)

میں آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

اور ایک حدیث کے اندر آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا: سارے انبیاء کی مثال ایک محل کی تھی کہ تمام دیکھنے والے اس کی حمد و مدح سرائی کرتے تھے مگر اس محل کے اندر ایک اینٹ کی جگہ خالی تھی اور ہر کوئی یہ کہتا تھا کہ اگر یہ اینٹ محل میں لگا دی جائے تو اس کی خوبصورتی نمایاں ہو جائے گی اور اس محل کی تکمیل کر رہی ہے گی، آپ ﷺ نے فرمایا: وہ محل کی آخری اینٹ میں ہوں۔

www.urdukutabkhanapk

نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی نبی ایسا نہیں جس نے دجال کے فتنے سے لوگوں کو آگاہ نہ کیا ہو اور میں آخری نبی ہوں اور میرے بعد دجال ظہور پذیر ہوگا۔

مختصر یہ کہ آپ ﷺ تمام انبیاء کے سردار ہیں اور تمام انبیاء میں سے آخری ہیں، اس لیے اسلام کا یہ دعویٰ حق ہے کہ اسلام ہی آخری دین ہے۔

2- مکمل دین:

تمام سابقہ ادیان میں سے کسی نے بھی دین کامل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا کیوں کہ ہر کام کی تکمیل کے لیے ایک مدت مدید درکار ہوتی ہے، مگر دین اسلام نے مکمل اور کامل ہونے کا دعویٰ کیا آیئے دلائل کی دنیا میں دیکھتے ہیں کہ اسلام کا یہ دعویٰ کس حد تک سچا ہے۔

دلائل:

حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے مبارک خطبہ کے اندر سوا لاکھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آخری خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کیا میں نے تم تک خدا کا دین اسلام کو پہنچا دیا ہے تو سب نے بیک زبان ببانگ دہل کہا کہ جی ہاں، آپ ﷺ نے نہ صرف دین ہم تک پہنچایا ہے بلکہ اس کے پہنچانے کا حق ادا کر دیا ہے، اس منادی اور اعتراف کا برسر عام اعلان سنتے ہی نبی اکرم ﷺ اور رہبر اعظم ﷺ نے آسمان کی جانب اپنی انگلی کو بلند کیا نیز فرمایا:

اللھم اشھد اللھم اشھد اللھم اشھد

اے اللہ گواہ رہنا، اے اللہ گواہ رہنا، اے اللہ گواہ رہنا

اس موقع پر یہ آیت مقدسہ نازل ہوئی۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا ہے۔ (مائدہ:3)

جب اعداء اسلام یہود نے اس آیت کو سنا تو کہنے لگے کہ اگر آج یہ آیت ہمارے اوپر نازل ہوتی تو ہم اس کے اترنے پر جشن مناتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہمارے لیے تو اس سے پہلے ہی اس دن دو عیدیں تھیں۔ ایک حج کا دن تھا اور دوسرا عرفہ کا۔

مختصر یہ کہ اللہ پاک نے اس دین کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے کیا اور زینہ بزینہ اس کو بلند کیا اور آخر کار نبی اکرم ﷺ پر اس دین کو مکمل کر دیا، اس دین کے اکمل اور کامل ترین ہونے کی ایک اور دلیل یہ ہے، ارشاد الٰہی ہے:

وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ

"میں ضرور تم پر اپنی نعمت پوری کروں گا۔"

ایک اور مقام پر فرمایا:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ط كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ (النحل:81)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دوسری جگہ فرمایا:

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا (الفتح:2)

مختصر یہ کہ ان دلائل کی روشنی میں یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلام ایک مکمل دین ہے۔

3- محفوظ دین:

دین اسلام وہ واحد دین ہے جو کہ محفوظ دین ہے کیونکہ اس کی تعلیمات آج تک محفوظ ہیں اور یہ ہر قسم کی تحریف لفظی و معنوی سے مبرا ہے۔
آیے دلائل کی دنیا میں دیکھتے ہیں کہ کیا اسلام محفوظ و مامون دین ہے۔

دلائل:

دین اسلام کی حفاظت خداوند کریم خود فرما رہے ہیں، اس لیے یہ دین ماجون و محفوظ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر:9)

"بے شک ہم نے اس قرآن کو نازل کیا اور ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

قرآن کریم کلام اللہ ہے اور یہ صفت دوام رکھتا ہے اس کا برملا اعلان اللہ پاک نے سورۃ البروج میں کیا ہے۔

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ O فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ O (البروج:22)

قرآن کے ساتھ ساتھ صاحب قرآن اور صاحب خلق عظیم کی حفاظت بھی لازمی تھی ورنہ اس محفوظ دین کا لوگوں تک پہنچنا ممکن نہ تھا، اس لیے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ

ترجمہ: "اے رسول ﷺ جو تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے، اس کو لوگوں تک پہنچا اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ (ﷺ) نے رسالت کا حق ادا نہیں کیا، اور اللہ آپ ﷺ کو لوگوں سے بچا لیں گے۔"

اس وعدہ کو اللہ پاک نے پورا فرما دیا اس کی وضاحت ان واقعات سے ہوتی ہے:

1- ہجرت کی رات جب 100 آدمیوں نے آپ ﷺ کے گھر کا محاصرہ کیا تو اللہ پاک نے آپ ﷺ کو بحفاظت گھر سے نکال لیا اور ان کفار مکہ کو اطلاع تک نہ ہونے دی۔

2- سراقہ بن مالک جب آپ ﷺ کے تعاقب میں نکلا تو اس کا گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر گیا، بالآخر وہ سمجھ گیا کہ آپ ﷺ آخری اور سچے نبی ہیں، جس کی بناء پر اس نے آپ ﷺ سے معافی مانگ لی۔

3- قبیلہ بنو نضیر نے جب چکی کا پاٹ گرا کر آپ ﷺ کو قتل کرنے کی مذموم حرکت کی تو آپ ﷺ کو اللہ پاک نے آگاہ کر دیا جس سے آپ ﷺ بچ گئے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

-4 جب ابولہب کی بیوی آپ ﷺ کو مارنے آئی تو اللہ نے آپ ﷺ کی حفاظت فرمائی۔

ان دلائل سے یہ ثابت ہوا کہ اسلام ہی محفوظ دین ہے کیوں کہ اسلام کی حفاظت خود خدا نے فرمائی۔

-4 فطری دین:

اسلام کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ یہ فطری دین ہے اور فطرت انسانی کی عکاسی کرتا ہے۔ اسلام کے تمام اصول ایسے ہیں جو انسانی فطرت پر مبنی ہیں۔

دلائل:

-1 جب ہم عیسائیت کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ دولت مند کا آسمانوں کی بادشاہت میں داخلہ ایسے ہی ممکن ہے جیسا کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہونا۔ عیسائیت کا یہ اصول فطرت انسانی کے منافی ہے مگر اسلام کے نزدیک جو شخص زکوٰۃ ادا کرے گا اس کے پاس اگرچہ ڈھیروں مال ہوگا تو قابل مذمت نہیں ہے۔

-2 اسی طرح جین مت کا اصول ہے کہ کسی جاندار کو ایذا نہ دی جائے حتیٰ کہ منہ پر کپڑا باندھ لیا جائے تاکہ کوئی جرثومہ اندر جا کر ہلاک نہ ہو جائے، ان کا یہ اصول خلاف فطرت ہے مگر اسلام کا سنہری اصول ہے کہ گوشت کو کھایا جائے یہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔

مختصر یہ کہ اسلام کی معاشرتی زندگی نکاح وطلاق کے احکامات عبادات کے ضابطے میں فطرت کے عین مطابق ہیں جو بھی ان اصولوں کو دل و جان سے اپنائے گا وہ اخروی زندگی میں کامیاب و کامران ہوگا۔

-5 جامع دین:

اسلام کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ جامع دین ہے اور اس میں جامعیت کے اصول جھلکتے ہیں اس دین میں کسی قسم کا کوئی سقم اور نقص نہیں ہے، اس میں نبی اکرم ﷺ کے تمام فرامین اور اللہ پاک کے تمام احکام تحریر کیے گئے ہیں۔ حضور ﷺ کی کوئی ایسی ادا نہیں جو آپ ﷺ کے جانثاروں نے تحریر نہ کی ہو۔

دلائل:

تمام سابقہ ادیان کے احکامات اس دین میں جمع ہیں، اس لیے اس دین کو جامع دین کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ پاک فرماتے ہیں:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ
بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ط لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً
وَّمِنْهَاجًا ط وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا
الْخَيْرٰتِ ط اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ

شمائل ترمذی کے اندر اس حد تک تفصیلات رقم ہیں کہ آپ ﷺ کی ریش مبارک سے ظاہر ہونے والے سفید بالوں کا بھی ذکر ہے۔

-6 دائمی وابدی دین:

دین اسلام کا ایک اہم وصف یہ بھی ہے کہ یہ دائمی دین ہے، اسلام سے قبل جتنے بھی ادیان آئے کسی نے بھی دائمی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کیوں کہ اس کی تعلیمات ابدی اور دوائی نہ تھیں مگر حضور ﷺ کو اللہ پاک نے انسانیت کی رہبری و رہنمائی کے لیے جو اصول و قوانین دیے وہ تمام کے تمام سنت دوام کے متحمل ہیں۔ اس کا اندازہ ان دلائل سے ہوتا ہے۔

حضور ﷺ نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو روانگی کے وقت ان سے پوچھا کہ لوگوں کے مسائل کیسے حل کرو گے انہوں نے کہا کہ میں کتاب اللہ سے اس کا فیصلہ کروں گا آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس مسئلے کا حل آپ کو کتاب اللہ سے نہ ملا تو پھر؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ سنت رسول ﷺ کی روشنی میں اس کا حل پیش کروں گا، آپ ﷺ نے فرمایا اگر سنت رسول ﷺ سے بھی اس کا حل نہ ملا تو پھر؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا میں اجتہاد سے کام لوں گا تو اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں کہ جس نے دین کے بارے میں اپنے پیغمبر اور اس کے قاصد کی سوچ وفکر کو ایک کر دیا۔ (سیرۃ ابن ہشام)

مختصر یہ کہ اسلام نے جو اصول دیے ہیں وہ نا قابل ترمیم ہیں، اس میں تغیر و تبدل کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیوں کہ یہ اصول ابدی ہیں۔

عالمی دین:

دین اسلام کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ہمہ گیریت کا حامل ہے، اس کو کسی خاندان کسی قبیلے کسی ملک یا کسی زبان والوں کے لیے مخصوص نہیں کیا بلکہ تمام عالم والوں کے لیے اس کو نازل کیا ہے۔ اس سے قبل تمام انبیاء کسی مخصوص علاقے یا قوم کے لیے بھیجے جاتے تھے مگر حضور ﷺ کو عالمگیر نبی بنا کر بھیجا گیا جیسا کہ فرمان الٰہی ہے کہ تمام انبیاء نے اپنی اپنی قوم کو سمجھایا:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا. وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا.

ترجمہ: "اور ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب علیہ السلام کو بھیجا۔"

علاوہ ازیں موسیٰ علیہ السلام نے خود فرمایا کہ مجھے بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی طرف بھیجا گیا۔

مگر جب رسول اکرم ﷺ کی باری آئی تاجدار انبیاء کا تذکرہ آیا تو عرش بریں سے اللہ پاک نے حکم نازل کر دیا۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

ہم نے آپ (ﷺ) کو رحمۃ اللعالمین بنا کر بھیجا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا

ہم نے آپ (ﷺ) کو تمام لوگوں کی طرف بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

اسلام کے عالمی دین ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ملاحظہ فرمائیں کہ ہادی کائنات ﷺ نے فرمایا:

علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل

کہ میری امت کے عالم بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں۔

ان دلائل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام ایک عالمگیر دین ہے اور اس کے ہر فرد کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ذمہ داری دی گئی ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

8- متوازن دین:

دین اسلام کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ یہ متوازن اور اعتدال پسند دین ہے، ایک عام آدمی جب اسلامی تعلیمات کا عمیق نظر سے مطالعہ کرتا ہے تو اس دین کو حرز جان بنا لیتا ہے۔ اسلام کے تمام احکام توازن پر مبنی ہیں مثلاً

1- اسلام خرچ میں توازن کا حکم دیتا ہے، فرمان الٰہی ہے:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً إِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ

اور اپنے ہاتھ کو روک نہ رکھیں گردن کی طرف اور نہ اس کو لوگوں کے سامنے پھیلائیں۔

دوسری جگہ فرمایا کہ مومنوں کی نشانی یہ ہے:

وَالَّذِيْنَ إِذَآ أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (فرقان:٦٧)

ترجمہ: ''اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں نہ وہ اسراف کرتے ہیں اور نہ کنجوسی کرتے ہیں بلکہ اس کے درمیان رہتے ہیں۔''

2- اسلام تمام امور میں توازن کا حکم صادر کرتا ہے، جیسا کہ حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

خير الامور اوسطها

''کہ کاموں میں میانہ روی بہترین امور میں سے ہے''

پھر فرمایا:

ما عال من اقتصد

''جس نے میانہ روی کی وہ محتاج نہیں ہوگا۔''

3- اسلام عبادات میں اعتدال کا حکم دیتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے کمرے میں چھت سے رسی باندھی ہوئی تھی جس کا دوسرا سرا وہ بالوں سے باندھ لیتی تھیں تاکہ عبادت کرتے وقت جب نیند آئے تو رسی کے تن جانے سے وہ بیدار ہو جائیں مگر حضور ﷺ نے اس رسی کو اتارنے کا حکم دیا اور فرمایا جب نیند آئے تو سو جاؤ اور طبیعت درست ہو تو عبادت کرو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ روزانہ قرآن پاک کی تلاوت فرماتے تھے مگر آپ ﷺ نے منع فرمایا اور تین دن میں اس کو ختم کرنے کا حکم دیا۔

4- اسلام کھانے میں بھی اعتدال پسندی کا حکم دیتا ہے۔ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اتنا کھاؤ جتنا تم کو اٹھالے اور اتنا نہ کھاؤ کہ تم کو اٹھانا پڑے۔

5- قرآن مجید کی تلاوت کرتے وقت بھی اعتدال سے کام لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ جیسے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی آواز پست تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز بلند تھی مگر آپ ﷺ نے فرمایا ابوبکر رضی اللہ عنہ آواز کو تلاوت کرتے وقت اونچی کر لیا کرو اور عمر رضی اللہ عنہ تم آواز کو پست کر لیا کرو۔

6- اسلام تعلقات میں بھی توازن کا حکم دیتا ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ نہ اتنا تر کرو کہ نچوڑنا پڑے نہ اتنا خشک کرو کہ توڑ لیا جائے۔

www.[…]abkha[…]pk.blogspot.com

9۔ **رہبر دین:**

اسلام تمام کائنات کے لیے رہبر دین ہے اور دنیا کے بھولے بھٹکوں کو صراط مستقیم عطا کرتا ہے۔ اور اھدنا الصراط المستقیم کا حکم ہے تاریخ عالم اس بات پر گواہ ہے کہ اسلام کی بدولت لوگ رہبر اور رہنما بن گئے یہ امتیاز اس دین کو حاصل ہے کہ وہ تمام ادیان سے بہتر رہبری و رہنمائی مہیا کرتا ہے۔

10۔ **ہادی دین:**

دین اسلام کی اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ مبنی بر ہدایت ہے، اس کی تعلیمات ہدایت پر مبنی ہیں۔ اس لیے فرمایا گیا ہے ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْن کہیں فرمایا گیا ہے: ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ. (البقرہ) کہ یہ بلاشک کتاب ہے اور متقین کے لیے اس میں ہدایت ہے۔

اسلام کے بارے مختلف مفکرین نے اپنی آراء پیش کی ہیں، ان میں سے چند ایک کا تذکرہ یہاں کرتا ہوں۔

1۔ **معین الدین ندوی اور اسلام:**

آپ فرماتے ہیں کہ اسلام سے پہلے تمام کے تمام مذاہب قومی تھے لیکن کسی خاص قوم کی اصلاح کے لیے آئے تھے، ان میں عالمگیریت نہ تھی مگر اسلام پہلا دین ہے، جو تمام عالم کی رہنمائی کے لیے آیا ہے۔

2۔ **صدر الدین اصلاحی:**

حضور ﷺ جو شریعت لے کر آئے وہ ہر پہلو سے کامل ہے جبکہ پچھلے تمام دینوں میں سے کسی کو بھی یہ شان حاصل نہ ہوئی۔

3۔ **مولانا محمد علی کہتے ہیں:**

"Islam is the last of the great religions those mighty movements which have revolutionized the world and changed the destinies of nations."

مختصر یہ کہ اسلام ہی عالمگیر مذہب ہے، اس کے مدمقابل کوئی بھی دنیا کا مذہب نہیں ہو سکتا۔

اسلام کا معاشرتی نظام

انسان ایک معاشرتی حیوان ہے، یا یوں کہیے کہ ہمیشہ سے مدنی الطبع ہے اور اپنی فطرت میں جماعتی زندگی کا محتاج ہے۔ بغیر اجتماعیت کے اس کی زندگی ناممکن ہے۔ انسان اپنی پیدائش سے لے کر موت تک معاشرے کا محتاج ہے۔

معاشرے کے یہ بے شمار روابط ہیں جو ایک انسان کو دوسرے انسانوں سے اور دوسرے انسانوں کو اس سے جوڑے ہوئے ہیں۔ انہی کی درستی پر، ایک ایک انسان کی، ایک ایک معاشرے کی اور مجموعی طور پر تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے۔ اور وہ صرف خدا ہی ہے جو انسانوں کو ان روابط کے لیے صحیح اور منصفانہ اور پائیدار اصول اور حدود بتاتا ہے۔ جہاں انسان اس کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر خود مختار ہوا اور اس نے بزعم خود انصاف کرنا چاہا تو پھر نہ تو کوئی مستقل اصول باقی رہتا ہے اور نہ انصاف وراستی۔ اس لیے کہ خدا کی رہنمائی سے محروم ہو جانے کے بعد نفسانی خواہش اور ناقص علم و تجربہ کے سوا کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہتی جس کی طرف انسان رہنمائی کے لیے رجوع کر سکے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ جس سوسائٹی کا نظام لادینیت یا مذہب سے انحراف کے اصولوں پر قائم ہوتا ہے، اس کے اصول غیر مستقل ہوتے ہیں اور روز بنتے

www.ur... anam...bl...pot.com

یا ٹوٹتے رہتے ہیں۔ انسانی تعلقات کے ایک ایک گوشے میں ظلم، ناانصافی، بے ایمانی اور آپس کی بے اعتمادی پیدا ہونے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ تمام انسانی معاملات میں انفرادی، طبقاتی، قومی اور نسلی خودغرضیاں اور انتشار رونما ہو جاتا ہے اور دو انسانوں کے تعلق سے لے کر قوموں کے تعلق تک کوئی رابطہ ایسا نہیں رہتا جس میں کجی نہ آ جاتی ہو۔

اسلام کا نظام معاشرت

اسلام اپنا ایک مضبوط اور پائیدار نظام معاشرت رکھتا ہے جس کے اصول وضوابط مستقل ومحکم ہیں، جس کا پورا مزاج عدل وانصاف سے مرکب ہے، اور جس کے تمام اجزا باہم مربوط وہم آہنگ ہیں۔ یہ نظام ایسا جامع وہمہ گیر ہے کہ زندگی کے تمام مظاہر اور ہر طرح کی سرگرمیاں اس کے دائرے میں آ جاتی ہیں۔ یہ انسان کے قلب وضمیر اور اس کے معاملات زندگی دونوں پر محیط ہے اور اپنی ہدایات اور قانون سازی میں دین اور دنیا دونوں پر حاوی ہے۔ معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ اس لیے اسلام جہاں جماعتی اور معاشرتی اصلاح کرتا ہے وہیں فرد کو بھی نظرانداز نہیں کرتا بلکہ اس کی اصلاح کو نقطۂ آغاز قرار دیتا ہے کیوں کہ وہ معاشرے کی بنیادی اکائی ہے اور اس کی اصلاح معاشرے کا سدھار ہے۔ اس لیے اس کی نظر میں فرد اور سماج دونوں کی اصلاح وتربیت یکساں اہمیت رکھتی ہے۔

انفرادی اصلاح:

اسلام ہر فرد کی جداگانہ شخصیت کا قائل ہے۔ وہ انسان کو محض نظام اجتماعی کا ایک بے جان اور معطل پرزہ یا ماحول کا ایک پر تو محض نہیں سمجھتا بلکہ اسے معاشرے کا انتہائی اہم جز اور اصل ''تاریخ ساز'' قرار دیتا ہے۔ وہ ایک طرف تو اس میں یہ احساس بیدار کرتا ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار اور اپنی پوری زندگی کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ خدا کے سامنے ہر فرد کی ذمہ داری انفرادی ہے۔ اور اس طرح خود معاشرے میں بھی ہر فرد کی شخصیت کے تحفظ اور نشوونما وارتقا کا پورا پورا موقع ہونا چاہیے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ط وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ط

ترجمہ: ''جس کسی نے نیک کام کیا تو اپنے لیے اور جس کسی نے برائی کی تو وہ اس کے آگے آئے گی۔'' (حم سجدہ۔۴۶)

ایک حدیث میں انسان کی زندگی کو اس طرح ذمہ دار بنایا گیا:

کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ (بخاری)

ترجمہ: ''تم مین سے سب گلہ بان (ذمہ دار اور نگراں) ہیں اور ہر ایک گلہ بان سے اس کے گلہ (ذمہ داری) کے بارے میں باز پرس ہوگی۔''

اور اس احساس ذمہ داری کے پیدا کرنے کے بعد دوسری طرف ضرورت اس امر کی ہے کہ بندے کا ایمان خدا، رسول ﷺ اور آخرت پر برابر تازہ کیا جاتا رہے۔ اس سلسلے میں علم دین سے واقفیت سب سے اہم ہے۔ چنانچہ اسلام حصول علم کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ حضور ﷺ کو تو یہ دعا مستقل طور پر سکھائی گئی کہ

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا

ترجمہ: ''اور کہیے (دعا کیجئے) کہ پروردگار! میرے علم میں زیادتی فرما۔'' (طٰہٰ۔۱۱۴)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اور خود حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ

طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة (ابن ماجہ)

ترجمہ: ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔''

چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دین کا اتنا علم کہ اسلام کیا ہے اور اس کے بنیادی معاملات کیا ہیں فرض عین کا درجہ رکھتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ اس علم کا حصول بھی واجب ہے جو زندگی کے قیام اور تمدن کے فروغ کے لیے ضروری ہے۔ گویا اسلام ایک فرد کو ایسے خطوط پر استوار کرتا ہے، جس پر اس کے استحکام اور عملی زندگی کی تعمیر کا انحصار ہے۔

علم دین کا ایک بڑا مقصد عملی زندگی کی اصلاح ہے۔ اس لیے اسلام ہر فرد میں جذبۂ عمل بیدار کرتا ہے، اور سعی وجدوجہد کی اہمیت اس کے سامنے پیش کرتا ہے:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى

ترجمہ: ''انسان کو وہی کچھ ملتا ہے، جس کی کوشش کرتا ہے۔''

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے ''جو کوشش کرے گا اس کو اس کی کوشش کا پھل ملے گا اور ہر کوشش کرنے والے کو کچھ نہ کچھ ملتا ہے۔'' ایک حدیث کا ارشاد ہے۔ ''کوشش کرو، اس لیے کہ اللہ نے تم پر کوشش فرض کی ہے۔'' جذبۂ عمل کو بیدار کر کے اسلام فرد میں یہ احساس بھی پیدا کرتا ہے کہ ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ اچھے اعمال کرے، کیونکہ وہ ایمان جس کے نتیجے میں اچھے اعمال (اعمال صالحہ) رونما نہ ہوں اس بیج کی طرح ہے جو بار آور نہ ہو سکے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے ''ایمان دل سے تصدیق، زبان سے اقرار اور اعضا سے عمل کا نام ہے'' اور ''اللہ ایمان کو بغیر عمل قبول نہیں کرتا اور عمل کو بغیر ایمان قبول نہیں کرتا۔'' گویا ایمان وعمل لازم وملزوم ہیں۔

فرد کی اصلاح کا ایک موثر ترین ذریعہ اور اس کی تربیت کا ایک مستقل نظام اسلامی عبادات ہیں جس کا اسلام نے ایک مفصل پروگرام دیا ہے جس میں کسی کمی بیشی کی ضرورت نہیں کیونکہ افراط وتفریط سے بچانا بھی اسلام کا ایک خاصہ ہے۔ اس کے نزدیک فرد کو نہ صرف دنیا کا ہو کر رہ جانا چاہیے اور نہ ہی راہب بن جانا چاہیے۔ دنیاداری اور دنیا سے اجتناب، دونوں سے بچنا ضروری ہے۔ اس لیے اعتدال کی راہ سب سے بہتر ہے۔ حضور ﷺ کے الفاظ ہیں ''ہر ایک کام میں اوسط درجہ (اعتدال کی راہ) بہتر ہے۔'' اسلام ہر فرد میں میانہ روی کی صفت دیکھنا چاہتا ہے۔

پھر اسلام کی نظر میں چونکہ امت مسلمہ کی حیثیت ''امۃ وسطا'' اور ''خیر امت'' کی ہے اس لیے وہ ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ اقامت دین کی جدوجہد کرے، اور اپنی زندگی کو دنیا کمانے کے بجائے دین کو قائم کرنے کے لیے وقف کر دے اور اس راہ میں جس قربانی کی بھی ضرورت پڑے اسے پیش کرنے سے بالکل دریغ نہ کرے۔

سورہ توبہ رکوع ۶ میں مومنوں کو حکم دیا گیا ہے کہ دین کی دعوت اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ

ترجمہ: ''گھروں سے نکلو اور چل پڑو خواہ تم ہلکے ہو یا بھاری ہو، اور اللہ کی راہ میں جان اور مال سے کوشش کرو۔''

یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ دین اسلام کے قیام سے دنیا میں بھی فلاح حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اسلام میں اعتدال اور زندگی کی ضروریات کی پوری رعایت موجود ہے۔

یہ وہ بنیادی باتیں ہیں جو ایک فرد کی اصلاح کے لیے اسلام کو مطلوب ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

معاشرتی اصلاح

جیسا کہ پہلے کہا گیا، اسلام انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کی تعمیر وتشکیل کے لیے بھی واضح ہدایت اور سوچا سمجھا منصوبہ دیتا ہے۔ اس کے نزدیک معاشرے کی اصلاح اتنی ہی ضروری ہے جتنی خود فرد کی اصلاح۔ اس کے برعکس جدید مغربی تحریکات کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ محض خارج میں تبدیلی کر کے نظام زندگی میں انقلاب لانا چاہتی ہیں۔ انہوں نے فرد کو نظر انداز کیا۔ نتیجتاً ان کا اصلاحی پروگرام کامیاب نہ ہو سکا۔ دوسری طرف مشرق کے مذہبی نظاموں نے صرف فرد کی اصلاح کی اور اس کی روح کو جلا بخشنے کے پروگرام بنائے لیکن اجتماعی زندگی کی درستگی سے بالکل صرف نظر کی، اور نتائج کے اعتبار سے یہ نظام بھی ناکام رہے لیکن اسلام دونوں کو یکساں اہمیت دیتا ہے۔

عمومی طور پر اسلام ایک ایسے معاشرے کا طالب ہے جو ہمہ گیر، مصنوعی اختلافات سے پاک، تعصبات ومکروہات سے منزہ، نسل، رنگ، وطن اور زبان کی حد بندیوں اور جغرافیائی سرحدوں سے پرے، مساوات، اجتماعی عدل وانصاف اور ایک عالم گیر برادری کی بنیاد پر قائم ہو اور ایک فکری، اخلاقی، نیز اصولی معاشرہ ہو جس کے افراد میں باہم ہمدردی، انسانیت، اور مساوات کا رشتہ ہو۔ اس سلسلے میں وہ حسب ذیل بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

نظام معاشرت کی بنیادیں:

ا۔ مساوات:

اسلامی معاشرے کی سب سے پہلی اور سب سے اہم خصوصیت اور اس کا سنگ بنیاد یہ ہے کہ سب انسان ایک نسل سے ہیں پوری انسانیت آدم کی اولاد ہے۔ رنگ، زبان، نسل، قبیلہ، برادری، ملک، قوم کی فطری تقسیم باہمی تعارف کے لیے ہے لیکن ان اختلافات کی وجہ سے تعصب یا تفریق یا امتیاز اور اونچ نیچ پیدا کرنا غلط ہے، کیوں کہ اسلام مساوات انسانی اور وحدت انسانی کی بنیاد پر اپنے تمام معاشرتی تعلقات استوار کرتا ہے۔ قرآن میں ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ

ترجمہ: ''ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تا کہ ایک دوسرے کی شناخت کر سکو، تم میں سب سے زیادہ باعزت اور فضیلت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔'' (الحجرات۔۱۳)

ایک دوسری جگہ ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِى خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَٰحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَآءً ۚ

ترجمہ: ''لوگو! اپنے رب سے ڈرو، وہ رب جس نے تم کو اکیلی جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کر دیا پھر ان دونوں کی نسل سے مردوں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد دنیا میں پھیلا دی۔''

ایک حدیث میں ہے ''لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے۔ اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے اور ہاں! عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سفید کو سیاہ پر اور سیاہ کو سفید پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ مگر (بجز) تقویٰ کے'' (کہ وہی وجہ امتیاز ہے) ایک دفعہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''لوگو! تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آدم علیہ السلام مٹی سے بنے تھے۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نظریہ توحید صرف نظام کائنات میں وحدت اور ایک خدا ہی کا تصور پیش نہیں کرتا بلکہ وحدت انسان کا تصور بھی اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ شان وحدت کی حامل یہ کائنات ایک ہی ارادے کا فیض ہے۔ انسان اسی کائنات کا ایک جزو ہے جو دوسرے اجزا سے مربوط ہے۔ فرد و نظام کائنات سے ہم آہنگ و مربوط ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ افراد انسانی باہم بھی ہم آہنگ اور مربوط ہو کر رہیں۔ اس بنا پر اسلام وحدت انسانیت کے نظریے کا قائل ہے کہ اس وحدت کے اگر اجزا مختلف ہیں تو یہ بھی اتفاق واتحاد ہی کی خاطر، اور متفرق ہیں تو اسی لیے کہ مجتمع ہو سکیں۔ مختلف راہیں اختیار کر کے ایک دوسرے سے تعاون سب کی منزل مقصود ہے۔ غرض، انسان بہ حیثیت ایک نوع بھی وحدت ہے اور بہ حیثیت فرد بھی۔

اسلام کے اس تصور انسانیت کے ہوتے ہوئے ظاہر ہے کہ تمام انسان صاحب عزوشرف ہیں اور سب کا سلسلہ ایک ہی ماں باپ پر منتہی ہوتا ہے۔ اس لیے نہ تو یہ جائز ہے کہ کسی کو ہدف تعریض بنایا جائے، نہ کسی قسم کا لونی، نسلی، وطنی، لسانی امتیاز کوئی حیثیت رکھتا ہے۔ شاہانہ خون کا دعویٰ آپ سے آپ باطل ہو جاتا ہے۔ ہر قسم کی عصبیت خود بہ خود ختم ہو جاتی ہے۔ ہاں آدمی کو بزرگی صرف اس وجہ سے حاصل ہوگی کہ اس کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں اور وہ خدا ترسی میں دوسروں سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

۲۔ اخوت:

تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ دین کا رشتہ تمام مسلمانوں کو ایک وحدت میں جوڑ دیتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ

ترجمہ: ''وہ لوگ جو مومن (اللہ پر ایمان رکھنے والے) ہیں آپس میں بھائی بھائی ہیں۔'' (الحجرات۔۱۰)

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص

ترجمہ: ''سب مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ۔'' (آل عمران۔۱۰۳)

ایک حدیث میں ہے۔ ''ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایسا ہے جیسے دیوار (یا بنیاد) کہ ہر جزو (اینٹ) دوسرے جزو کو تقویت پہنچاتا ہے۔'' ''تو اللہ پر ایمان رکھنے والوں کو ایک دوسرے سے رحم اور محبت اور مہربانی میں ایسا دیکھے گا کہ جیسے بدن۔ (کہ) ایک عضو (بدن کا) مریض ہو جائے تو سارے اعضا بخار اور درد و کرب کے ساتھ شب بیداری میں اس کے شریک (مبتلا) ہو جاتے ہیں۔''

اس طرح ایک عقیدے اور ایک اخلاقی ضابطے کو تسلیم کرنے والے اسلامی معاشرہ تعمیر کرتے ہیں جس میں انسان اور انسان کے ملنے کی بنیاد یہ عقیدہ و ضابطہ ہوتی ہے۔ جو انہیں تسلیم کرے تو وہ خواہ کسی نسل، کسی ملک، کسی رنگ، کسی وطن کا ہو اس معاشرے میں شامل ہوگا جس میں سب کے حقوق اور معاشرتی مرتبے یکساں ہوں گے۔ یہ معاشرہ جغرافیائی سرحدوں کو توڑ کر روئے زمین کے تمام خطوں پر پھیل سکتا ہے اور اس کی بنیاد پر ایک عالم گیر برادری قائم ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اس عقیدے اور ضابطے کو نہ مانیں یہ معاشرہ انہیں اپنے دائرے میں نہیں لیتا مگر انسانی برادری کا تعلق ان کے ساتھ قائم کرنے اور انسانیت کے حقوق انہیں دینے میں اسے کوئی تکلیف نہیں۔ ان کا علیحدہ معاشرہ بن جاتا ہے۔

۳۔ رشتۂ نکاح:

عورت اور مرد معاشرت کے دو ستون ہیں۔ دونوں کی اپنی اپنی شخصیت ہے اور دونوں سماج کے معمار ہیں۔ عورتوں اور مردوں میں قانونی مساوات ہے۔ اور دونوں کے ایک دوسرے پر کچھ حقوق و ذمہ داریاں ہیں۔ اور خاندان کے نظام میں مرد کی حیثیت قوام اور نگراں کی ہے۔ عورت اور مرد کا عام رشتہ بھائی اور بہن کا رشتہ ہے، اور وہ ایک دوسرے کے لیے اس طرح حرام ہیں جس طرح سگے بھائی بہن۔ لیکن نکاح وہ طریقہ (یا معاہدہ) ہے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جس سے یہ ایک دوسرے کے شریک زندگی ہو سکتے ہیں۔اور یہی وہ جائز اور صحت مند رشتہ ہے جس کے ذریعے یہ ایک دوسرے کے لیے حلال ہو سکتے ہیں۔اس رشتے سے خاندان کی بنیاد پڑتی ہے۔

عائلی نظام:

ان دو بنیادی اہمیت کے شعبوں کے بعد انسانی زندگی کے تمدنی ڈھانچے کی طرف آیئے،اوراس کے ایک ایک شعبے کے بارے میں اسلامی احکام وہدایات کو ملاحظہ کیجیے۔

انسانی تمدن کی بنیاد ایک مرد اور ایک عورت کی باہمی رفاقت سے وجود میں آتی ہے۔انھی دو انسانوں سے مل کر بننے والا چھوٹا سا اجتماعی دائرہ انسان کی تمدنی زندگی کی سب سے پہلی کڑی ہے۔اس اجتماعی دائرے کو،انسان کی عائلی زندگی اوراس کے لیے جو ضابطے ہوتے ہیں انھیں ''عائلی نظام'' کہتے ہیں۔اسلام نے جو عائلی نظام مقرر فرمایا ہے اس کی موٹی موٹی باتیں یہ ہیں:

مرد اور عورت کی یہ مستقل رفاقت ایک کھلے ہوئے معاہدے کے ذریعے وجود میں آتی ہے جسے شریعت کی زبان میں ''نکاح'' کہتے ہیں۔یہ نکاح ایک باحرمت رشتہ ہے جو دونوں کی مرضی سے اور پورے اعلان کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔نکاح کے بغیر مرد وزن کا تعلق بدترین معصیت اور سخت ترین سزا کے قابل جرم ہے۔یہ نکاح صرف ایک طبیعی ضرورت ہی نہیں،بلکہ ایک شرعی ضرورت بھی ہے۔

......اتزوج النساء فمن رغب عن سنتي فليس مني. (بخاری)

اس ضرورت سے اپنے کو بالا رکھنا اسلامی طریقہ نہیں ہے۔

رد رسول اللہ ﷺ علی عثمان بن مظعون التبتل. (بخاری)

معاہدہ نکاح کو قرآن نے ''پختہ عہد'' مِّيثَاقًا غَلِيظًا النساء 21:4 قرار دیا ہے۔اس معاہدے کے ذریعے دونوں اپنے اپنے اوپر بھاری ذمے داریاں اوڑھتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے اوڑھتے ہیں۔اس رشتے سے جو ایک چھوٹی سی اجتماعی وحدت بنتی ہے مرد اس کا نگران اور ناظم اعلیٰ ہوتا ہے اور عورت اس کے زیر ہدایت گھر کا نظم ونسق چلاتی ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ النساء 34:4

اس اجتماعی وحدت میں مرد کی ذمے داریاں یہ ہوتی ہیں:

۱۔ وہ عورت کے لیے اور ہونے والی اولاد کے لیے کھانے کی،کپڑے کی،رہنے سہنے کی،غرض زندگی کی ساری ضرورتیں فراہم کرے۔ ضروریات زندگی کی یہ فراہمی ہر شخص اپنی اقتصادی حالت کے مطابق کرے گا۔لِيُنْفِقْ ذُوْسَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ طلاق 7:65 یہ ذمے داری صرف اخلاقی نوعیت نہیں رکھتی،بلکہ قانونی حیثیت بھی رکھتی ہے۔یعنی اگر کوئی شخص ان میں کوتاہی دکھائے گا تو حکومت اسے ادائے فرض پر مجبور کرے گی۔

۲۔ وہ بیوی بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کا خیال رکھے اوراس کا اہتمام کرے۔يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا تحریم 6:66

غرض مرد کے اوپر یہ دوہری ذمے داری ڈالی گئی ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال کی دنیوی ضرورتوں اور اخروی فلاح،دونوں کا پورا پورا لحاظ رکھے جس کے بارے میں وہ حکومت اور آخرت دونوں جگہ جواب دہ ہوگا:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته والرجل راع فى اهله ومسئول عن رعيته (مسلم و بخاری)

عورت کی ذمے داریاں یہ ہیں کہ:

۱۔ وہ گھر کے اندرونی نظم کو سنبھالے والمرأة راعية على بيت زوجها. (بخاری و مسلم)

۲۔ شوہر کی اطاعت کرے اور اپنی عفت کو پوری طرح محفوظ رکھے۔ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ النساء4:34

اسی طرح اولاد کا بھی یہ فرض ہے کہ اپنے والدین کی اطاعت کرے اور خدمت کرے۔ ان کی نافرمانی ناقابل معافی گناہ ہے۔ كل الذنوب يغفر الله منها ماشاء الا عقوق الوالدين. (مشکوٰۃ)

جس طرح نکاح کو ایک شرعی ضرورت کہا گیا ہے، اسی طرح اس نکاح کے نتیجے میں عائد ہونے والی ان تمام ذمے داریوں کو "اللہ کی قائم کردہ حدود" کہا گیا ہے تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ البقرہ2:229 اور مرد و عورت دونوں کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ ان حدود کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھیں۔

ہر شریف اور فرض شناس انسان سے توقع یہی رکھی جاتی ہے کہ وہ ان حدود پر برابر کاربند رہے گا۔ لیکن اگر خدانخواستہ صورت حال یہ باقی نہ رہ جائے، بلکہ زوجین میں اختلاف پیدا ہو جائے اور نباہ کی کوئی امید نظر نہ آئے تو مجبوراً اس بات کی بھی اجازت ہے کہ شوہر طلاق کے ذریعے، اور عورت خلع کے ذریعے اس رشتۂ نکاح کو ختم کر دے فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ حتی کہ حکومت کو بھی اختیار ہے کہ اس شکل میں وہ آگے بڑھ کر اس رشتے کو بطور خود توڑ دے۔ کیونکہ اس کی حرمت اپنی جگہ بڑی اہم سہی مگر "حدود اللہ" کی حرمت سے زیادہ اہم کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس کی خاطر انھیں پامال کرتے رہنا کوئی عقل مندی نہیں۔

۴۔ خیر خواہانہ فضا:

معاشرے کی عام فضا خیر خواہی، تعاون، امداد، اشتراک عمل، مواخاۃ، ایثار اور بھائی چارہ کی ہونی چاہیے۔ لوگ جب آپس میں ملیں تو ایک دوسرے پر سلامتی بھیجیں۔ ہر شخص اپنے بھائی کے لیے وہی چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔ ظلم، غیبت، چغل خوری، کنبہ پروری، موٗطن، دھوکہ دہی، برا نام رکھنے، رشک، حسد، بغض، تجسس، الزام تراشی، بے حرمتی و بے عزتی کرنے اور بے جا حرف گیری وغیرہ سے سب پرہیز کریں۔ نیکیوں میں ایک دوسرے سے تعاون کریں بلکہ سبقت لے جانے کی کوشش کریں اور برائیوں سے ایک دوسرے کو روکیں۔ چنانچہ قرآن کا حکم ہے کہ

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠

ترجمہ: "بھلائی اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور ظلم اور گناہ کی باتوں میں ہرگز باہمی امداد و تعاون نہ کرو۔" (المائدہ۔۲)

اور سورۃ قصص رکوع ۸ میں ارشاد ہوا کہ

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِى الْاَرْضِ ؕ

ترجمہ: "لوگوں کے ساتھ بھلائی کرو جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے اور زمین میں طالب فساد نہ ہو۔"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ترجمہ: ''کوئی قوم کسی قوم کا مذاق نہ اڑائے ممکن ہے وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں، ممکن ہے وہ ان سے اچھی ہوں اور (اپنے مومن بھائی کو) عیب نہ لگائی اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔''

(الحجرات۔۱۱)

وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ط

ترجمہ: ''اور ایک دوسرے کے بھید نہ ٹٹولو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے۔'' (الحجرات۔۱۲)

اسی طرح حدیث میں ہے کہ ''الدین نصیحة'' (دین تو خیر خواہی کا نام ہے)۔ ''مسلمان تو وہ ہے، جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں'' (نقصان نہ اٹھائیں)۔ ''مسلمان کبھی طعنہ دینے والا، بکنے والا نہیں ہو سکتا'' وغیرہ۔ گویا اسلام معاشرے کی عام فضا کو حسنات سے بھر دینا چاہتا ہے اور اس کی نظر میں زندگی تعاون، ہمدردی اور مواخاۃ کا نام ہے۔

۵۔ ذمہ داری کا تصور:

جس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر انفرادی طور پر انجام دینا ضروری قرار دیا گیا ہے، اسی طرح اسلام ان میں اجتماعی ذمہ داری کا تصور بھی پیدا کرتا ہے اور پورے معاشرے میں یہ احساس بیدار کرتا ہے کہ وہ نیکیوں کو قائم کرنے والا، برائیوں کو روکنے والا اور ایک دوسرے کی مدد کرنے والا ہو۔ ایسی انفرادیت جس میں دوسروں کے حقوق کا خیال نہ رکھا جائے اور جو اجتماعی ذمہ داری کے تصور سے نا آشنا بھی ہو، اسلام کو مطلوب نہیں۔

حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق ''وہ مسلمان جو لوگوں میں گھل مل کر رہے اور ان کی اذیتوں پر صبر کرتا رہے، اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے (الگ تھلگ) گھل مل کر نہ رہے اور ان کی اذیتوں پر صبر نہ کرے۔'' ''تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور تم میں سے ہر ایک شخص سے اس کی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ پس امام حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس کی جائے گی اور ہر شخص اپنے اہل وعیال کا حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق دریافت کیا جائے گا اور عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا اور غلام اپنے مالک کے مال کا محافظ ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی۔''

ان عمومی ہدایات کے بعد اسلام نے انسانوں کے باہمی حقوق وفرائض کا ایک مکمل نظام بھی دیا ہے۔ جس میں بھائی بھائی کے حقوق، اہل خانہ کے حقوق، رشتہ داروں کے حقوق، اہل محلہ کے حقوق نیز غیر مسلموں اور عام انسانوں کے حقوق، حتیٰ کہ جانوروں اور درختوں کے حقوق تک کو واضح اور متعین کر دیا گیا ہے، تاکہ انسان محض جذبات کی رو میں بہہ کر نا انصافی کا مرتکب نہ ہو اور معاشرہ صحت مند بنیادوں پر قائم رہے اور ارتقا کے مدارج طے کرتا رہے۔

اسلامی نظام معاشرت کی ان بنیادوں کو سمجھ لینے کے بعد مختصراً یہ دیکھنا ہے کہ وہ کیا اصول اور طریقے ہیں جو اسلام نے معاشرے میں یگانگت اور ہم رنگی پیدا کرنے اور انسانی اجتماع کی مختلف صورتوں کو ترقی دینے کے مقرر کیے ہیں۔ اس سلسلے میں اسلام نے کچھ مستقل ادارے قائم کیے ہیں جن کا اجمالی خاکہ درج ذیل ہے:

(ا) خاندان:

یہ انسانی معاشرت کا اولین اور بنیادی ادارہ ہے، اس لیے اسلام کے معاشرتی نظام میں خاندان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ خاندان کی بنیاد ایک مرد اور عورت کی باہمی رفاقت سے وجود میں آتی ہے اور ان ہی دو انسانوں سے مل کر بننے والا چھوٹا سا اجتماعی دائرہ انسان کی تمدنی زندگی کی سب

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سے چلی آرہی ہے۔ اسلام نے نزدیک مرد اور عورت کی یہ مستقل رفاقت ایک کھلے ہوئے مستحکم معاہدے (نکاح) کے ذریعے سے وجود میں آتی ہے۔ یہ نکاح ایک ایسا باحرمت رشتہ ہے جو دونوں کی مرضی سے اور پورے اعلان کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ نکاح کے بغیر مرد وزن کا تعلق بدترین معصیت اور ایک ایسا جرم ہے جس کی سخت ترین سزا مقرر ہے۔ معاہدہ نکاح کے ذریعے سے دونوں (مرد عورت) اپنے اپنے اوپر بھاری ذمہ داریاں عائد کر لیتے ہیں اور بیوی کے لیے ان کے پابند ہو جاتے ہیں۔ اس رشتے کی وجہ سے جو ایک چھوٹی سی وحدت بنتی ہے، مرد اس کا نگراں اور ناظم اعلیٰ ہوتا ہے اور اس حیثیت سے وہ اپنے اہل وعیال کی دنیوی ضرورتوں اور اخروی فلاح دونوں کا خیال رکھنے والا ہے جس کے لیے وہ جواب دہ ہے۔ اور بیوی اس کے زیر ہدایت گھر کا نظم ونسق چلاتی ہے اور اس حیثیت سے اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ نہ صرف گھر کے اندرونی نظم ونسق کو سنبھالے بلکہ شوہر کی حقیقی رفاقت کرے اور اپنی عفت کو پوری طرح محفوظ رکھے۔

عورت اور مرد کے اس ملاپ سے ایک نئی نسل وجود میں آتی ہے۔ اس سے رشتے، کنبے اور برادری کے دوسرے تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور بالآخر یہی رشتے پھیلتے پھیلتے ایک معاشرے تک جا پہنچتے ہیں۔ نیز خاندان ہی وہ ادارہ ہے جس میں ایک نسل اپنے بعد آنے والی نسل کو انسانی تمدن کی وسیع خدمات سنبھالنے کے لیے نہایت محبت، ایثار، دل سوزی اور خیر خواہی کے ساتھ تیار کرتی ہے۔ گویا یہ ادارہ وہ تربیت گاہ ہے جہاں سے اسلام اچھے انسان تیار کرنا چاہتا ہے۔ اور اخلاق حسنہ کی ابتدائی تربیت اسی مقام پر دیتا ہے تاکہ شروع ہی سے بچے میں اسلام کا احترام پیدا ہو اور اس کی سیرت اسلامی سانچے میں ڈھل جائے۔

(ب) قرابت:

خاندان کے بعد رشتہ داری کی سرحد ہے جس کا دائرہ کافی وسیع ہوتا ہے۔ جو لوگ ماں اور باپ کے تعلق سے یا بھائی بہنوں کے تعلق سے یا سسرالی تعلق سے ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوں، اسلام ان سب کو ایک دوسرے کا ہمدرد، مددگار اور غم گسار دیکھنا چاہتا ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ رشتہ داروں سے نیک سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور حدیث میں صلۂ رحمی کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور اسے بڑی نیکی شمار کیا گیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ اسلام کے خلاف یا ناجائز کاموں میں تعاون کیا جائے اور رشتے یا قبیلے کی عصبیت یا بے جا طرف داری سے کام لیا جائے۔ خون کے رشتوں کو اسلام نے قائم رکھا ہے اور وراثت کے قانون کے ذریعے انہیں ایک مستقل مقام دے کر صحت مند و فطری احساسات کو دوام عطا کیا ہے۔

(ج) محلّہ:

رشتہ داری (قرابت) کے بعد ہمسائیگی ہے۔ قرآن کی رو سے ہمسایوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک رشتہ دار ہمسایہ، دوسرا اجنبی ہمسایہ اور تیسرا عارضی ہمسایہ، جس کے پاس بیٹھنے یا ساتھ چلنے کا آدمی کو اتفاق ہو۔ یہ سب اسلامی احکام کی رو سے رفاقت، ہمدردی اور نیک سلوک کے مستحق ہیں، اس باب میں نبی کریم ﷺ کے بہت سے ارشادات ہیں، مثلاً ''مجھے ہمسایہ کے حقوق کی اتنی تاکید کی گئی کہ میں خیال کرنے لگا کہ شاید اب اسے (بھی) وراثت میں حصہ دار بنا دیا جائے گا۔'' ''وہ شخص مومن نہیں ہے جس کا ہمسایہ اس کی شرارتوں سے امن میں نہ ہو۔'' ''وہ شخص ایمان نہیں رکھتا جو خود پیٹ بھر کر کھالے اور اس کا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا رہ جائے۔'' غرض، اسلام ان سب لوگوں کو جو ایک دوسرے کے پڑوسی ہوں آپس میں ہمدرد، مددگار، اور شریک رنج وراحت دیکھنا چاہتا ہے وہ ان کے درمیان ایسے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے کہ وہ سب ایک دوسرے پر بھروسہ کر سکیں، اور ایک دوسرے کے پہلو میں اپنی جان ومال اور آبرو کو محفوظ سمجھیں۔ اور ایسی معاشرت جس میں ایک دیوار بیچ رہنے والے دو آدمی برسوں ایک دوسرے سے ناآشنا رہیں اور جس میں ایک محلے کے رہنے والے باہم کوئی دلچسپی، کوئی ہمدردی اور کوئی اعتماد نہ رکھتے ہوں، اسلام کو مطلوب نہیں، وہ ہر محلے کو معاشرے کا ایک فعال اور مؤثر جزو مانتا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

(د) مسجد:
معاشرتی تعلقات کو استوار کرنے کے لیے مسجد کی حیثیت ایک مستقل ادارے کی سی ہے، اور اسلام کا معاشرتی پروگرام مسجد ہی کے ذریعے زیادہ کامیاب ہوسکتا ہے۔ اس سلسلے میں مسجدوں کی صحیح تنظیم کو بڑی اہمیت حاصل ہے تا کہ مطلوبہ نتائج پوری طرح حاصل ہوسکیں۔

(ہ) احترام روایات:
مسلم معاشرے کی روایات صحیحہ (عرف) کا احترام اور ان کا استحکام بھی معاشرتی پالیسی کا ایک جزو ہے، کیوں کہ اس کے ذریعے مسلم معاشرہ کبھی بھی اپنے ماضی سے نہیں کٹتا۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ روایات میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ زندگی کے ہمہ گیر تقاضوں کی بنا پر ان میں تبدیلی ضرور ہوتی ہے لیکن یہ تبدیلی مستقل اور خاموش ارتقاء کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ کسی ہیجانی اور غیر معمولی بغاوت یا ماضی سے انقطاع کے ذریعے سے نہیں۔

(و) نظام تعلیم:
معاشرے کے سدھار، اس میں اسلامی اقدار کے تحفظ اور اپنے نظام زندگی کو نئی نسلوں کی طرف منتقل کرنے میں نظام تعلیم بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور اسلامی معاشرت کا ایک بہت بڑا ستون ہے۔

(ز) حدود و تعزیرات (قانون کی حکمرانی):
معاشرے کی اصلاح کے تمام ذرائع اختیار کرنے کے بعد حدود و تعزیرات کا بھی ایک مکمل نظام رکھا گیا ہے جن کے ذریعے معاشرے کو ان افراد سے محفوظ کیا جاتا ہے جو تعلیمی، ترغیبی، اور اخلاقی ذریعے سے اصلاح نہ قبول کریں اور معاشرے کے قانون کی خلاف ورزی کریں۔ ایسے لوگوں کو اسلام قرار واقعی سزا دیتا ہے تا کہ معاشرہ ان کی فتنہ انگیزیوں سے امن میں رہے اور اس میں فساد رونما نہ ہونے پائے؛ نیز سماجی جرائم کا انسداد کیا جاسکے۔ گو کہ ایک اسلامی معاشرے میں یہ جرائم غیر معمولی طور پر بہت کم ہوں گے اس لیے ان سزاؤں کا نفاذ بھی شاذ و نادر ہی ہوگا، لیکن یہ ہر حال قانون کی گرفت اسلام میں نا قابل شکست ہے۔ اسلام کی نظر میں قانون سے بالاتر کوئی نہیں ہوتا۔ امیر و غریب اور خواص وعوام کا یہاں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اونچے سے اونچا شخص حتی کہ حکمران وقت بھی قانون کا اسی طرح محکوم ہے جس طرح ایک 'بے کس فقیر'۔ رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ قانون کی بالا دستی کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے کہ ''اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی چوری کرتی تو خدا کی قسم میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔'' (بخاری)

اسلام کا سیاسی نظام

انسان نے اپنی اجتماعی زندگی کی ترتیب و تہذیب کے لیے جو ادارے قائم کیے ہیں ان میں ریاست کا ادارہ سب سے زیادہ اہم اور بنیادی ہے۔ ریاست وہ ہیئت سیاسی ہے جس کے ذریعے سے ایک ملک کے باشندے ایک باقاعدہ حکومت کی شکل میں اپنا اجتماعی نظام قائم کرتے ہیں اور اسے قوت قاہرہ اور قوت نافذہ کا امین قرار دیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں:

> ''ریاست ایک منظم سماج کا نام ہے۔ یہ اس وقت وجود پذیر ہوتی ہے جب کہ ایک طرف افراد پر اقتدار قائم کرنے اور دوسری طرف افراد کی جانب سے اطاعت کرنے کا دوگونہ رابطہ عمل میں آجائے۔ اطاعت کے امر واقع کا ہونا اس بات کو کافی ہے کہ ریاست موجود ہوگئی۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اجتماعی زندگی کے لیے ریاست کا وجود ناگزیر ہے۔ انسان جب دوسروں سے معاملات کرتا ہے تو ان معاملات کی ضابطہ بندی کے لیے قانون کی اور اس قانون کو نافذ کرنے والے ادارے کی ضرورت پہلے ہی قدم پر محسوس ہوتی ہے۔ ریاست وہ ادارہ ہے جو معاشرتی تعلقات، معاشی لین دین اور تمدنی معاملات کی استواری کا نگراں و محافظ ہے۔ فرد کو اپنے نشوو ارتقا کے لیے ایک ایسے ماحول کی ضرورت ہے جس میں ایک طرف امن وامان قدیم ہو اور دوسری طرف وہ فرد کو ایسی تمام سہولتیں فراہم کردے جو وہ خود حاصل نہیں کر سکتا۔ دفاع، قیام نظم و قانون، حصول عدل، تعلیم وہ چیزیں ہیں جو ریاست کے ذریعے سے انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ انسانی زندگی کی تشکیل میں ریاست کا حصہ بڑا اہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان نے اپنی تہذیبی زندگی کے آغاز سفر ہی میں اس ادارے کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا اور پوری انسانی تاریخ ریاست کے استحکام، اس کی تنظیم و تہذیب اور اس کے فروغ وارتقا کی تاریخ ہے اور دور جدید میں عملی طریقوں کی ترقی اور اجتماعی زندگی میں نت نئی پیچیدگیوں کے راہ پا جانے کی وجہ سے ریاست کا دائرہ کار برابر بڑھ رہا ہے، اس کے اثر ونفوذ میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس کی قوت اور وسائل میں ترقی ہو رہی ہے۔ دنیا کے تقریباً تمام ہی ممالک میں ریاست کا کام محض امن وامان اور نظم وضبط قائم رکھنا ہی نہیں بلکہ اجتماعی عدل اور سماجی فلاح کا قیام بھی ہے۔ ریاست کا ادارہ ایک مثبت ادارہ ہے جو زندگی کے سب ہی شعبوں کو متاثر کرتا ہے، اس کے قیام وارتقا میں انسان کی اخلاقی حس اور تصور عدل کا غیر معمولی دخل رہا ہے۔ انصاف وہ محور ہے جس کے گرد سیاسی نظم کا ہر پرزہ حرکت کرتا ہے۔ چنانچہ ریاست اگر معاشی تعلقات کو ترتیب دیتی ہے تو اس لیے کہ عدل قائم ہو، قوانین بناتی یا بدلتی ہے تو اس لیے کہ وہ اصول انصاف سے زیادہ مطابقت اختیار کر لیں۔ اخلاقی احساس کا غلبہ اس درجہ ہے کہ اگر خود غرض عناصر اپنے مفاد کی بنا پر قانون بناتے ہیں تو ان پر یہی اصول اخلاق وانصاف ہی کا جامہ پہنا کر قوم کے سامنے پیش کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی آئین مملکت نے کوئی ایسی شکل اختیار کی ہے جو قوم کی آنکھ میں کھٹکتی ہو تو جلد یا بدیر انقلاب واقع ہوا اور ریاست کی بنیاد ہل گئی، نیز یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ استحکام اور صحت مند ارتقا اس وقت حاصل ہوا ہے جب آئین وقانون قوم کے اصول اخلاق اور ان کے اجتماعی ضمیر کے مطابق تھے۔

اسلام اخلاق وسیاست کے اس فطری تعلق کو ایک بنیادی حقیقت کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اس کے نظام فکر وعمل میں اس جاہلانہ تصور کے لیے کوئی گنجائش نہیں کہ دین وسیاست دو جدا چیزیں ہیں۔ ریاست کا مقصد انصاف قائم کرنا ہے اور یہ کام دین کا ہے کہ وہ ان اصول انصاف اور ضابطۂ اخلاق کو فراہم کرے جسے ریاست قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور وہ حیات انسانی کے ہر پہلو کے لیے ہدایت دیتا ہے۔ اس ہمہ گیر ہدایت کا نام شریعت ہے۔ قرآن میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم پوری شریعت کا اتباع کریں اور اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ ط

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔'' (البقرہ۔ ۲۰۸)

اہل کتاب جن احکام خداوندی کو اپنی خواہش وپسند کے مطابق پاتے، ان پر تو عمل پیرا ہو جاتے لیکن جو احکام الٰہی ان کی خواہش وپسند کے مطابق نہ ہوتے ان سے کنی کترا جاتے، اس بنا پر ان کو خدا کی جانب سے تہدید کی گئی کہ

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج

ترجمہ: ''کیا تم کتاب الٰہی کے بعض حصوں کو مانتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو؟'' (البقرہ۔ ۸۵)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پھر اس روش کی بابت اس ہلاکت خیز سزا کا اعلان فرمایا:

فَمَا جَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَیَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ

ترجمہ: ''پس تم میں سے جو شخص ایسا کرے گا اس کی سزا دنیا کی زندگی میں سوائے ذلت و نامرادی کے اور کیا ہو سکتی ہے اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو شدید ترین عذاب کی طرف لوٹایا جائے گا۔'' (البقرہ۔۸۵)

ان احکام کے بعد زندگی کے کسی بھی حصے کو اسلام کے دائرے سے باہر رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں ریاست کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا، انبیائے کرام وقت کی اجتماعی قوت کو اسلام کے تابع کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ ان کی دعوت کا مرکزی تخیل ہی یہ تھا کہ اقتدار خدا اور صرف خدا کے لیے ہو جائے اور شرک اپنی ہر جلی اور خفی شکل میں ختم کر دیا جائے۔ ان میں سے ہر ایک کی پکار یہی تھی۔

یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ ؕ

ترجمہ: ''اے برادران قوم! اللہ ہی کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی اللہ نہیں ہے۔'' (الاعراف۔۶۵)

اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ

ترجمہ: ''(سن رکھو) قانون اور حکم خدا کے سوا کسی کے لیے نہیں۔'' (یوسف۔۴۰)

اَلَا لَہُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ ؕ

ترجمہ: ''خبردار! تخلیق (کی کارفرمائی) اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کے لیے ہے۔'' (الاعراف۔۵۴)

اور ان میں سے ہر ایک نے خدا کی حاکمیت کے نمائندے کی حیثیت سے اپنی قوم سے مطالبہ کیا:

فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوۡنِ ۚ

ترجمہ: ''اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔'' (الشعراء۔۱۶۳)

خدا کے ان فرستادہ بندوں نے زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح کی جدوجہد کی تاکہ خدا کی زمین پر خدا کا دین اور اسی کا قانون جاری و ساری ہو۔ ان کی یہ جدوجہد پوری زندگی کی اصلاح کے لیے تھی اور ریاست و سیاست کی اصلاح اس کے ذرائع میں سے ایک اہم ترین ذریعہ تھی۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضور اکرم ﷺ نے باقاعدہ اسلامی ریاست قائم کی اور اسے معیاری شکل میں چلایا۔

فکر اسلامی میں ریاست کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ خود خالق ارض و سماوات اپنے نبی ﷺ کو یہ دعا سکھاتا ہے کہ:

وَقُلۡ رَّبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّاَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّاجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا

ترجمہ: ''اور (اے نبی) دعا کرو! اے پروردگار، مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا، اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔'' (بنی اسرائیل۔۸۰)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

یہ آیت ہجرت نبوی سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس تاریخی پس منظر میں اس کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اے اللہ! یا تو مجھے خود اقتدار عطا کر یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنا دے تاکہ اس طاقت سے میں دنیا کے بگاڑ کو درست کر سکوں، برائیوں کے سیلاب کو روک سکوں، نیکیوں کو قائم کر سکوں اور تیرے قانون عدل کو جاری کر سکوں۔ اس آیت کی یہی تفسیر حسن بصری اور قتادہ نے کی ہے اور اسی کو ابن جریر اور ابن کثیر جیسے جلیل القدر مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ اس کی تائید ان احادیث سے بھی ہوتی ہے:

ان الله ليزع بالسلطان مالا يزع بالقرآن (تفسیر ابن کثیر)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سدباب کر دیتا ہے جن کا سدباب قرآن سے نہیں کرتا۔''

الاسلام والسلطان اخوان توامان لا يصلح واحد منهما الا بصاحبه فالاسلام اس والسلطان حارس وما لا اس له يهدم وما لا حارس له ضائع. (کنز العمال)

ترجمہ: ''اسلام اور حکومت و ریاست دو جڑواں بھائی ہیں۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست نہیں ہو سکتا۔ پس اسلام کی مثال ایک عمارت کی ہے اور حکومت گویا اس کی نگہبان ہے۔ جس عمارت کی بنیاد نہ ہو وہ گر جاتی ہے اور جس کا نگہبان نہ ہو وہ لوٹ لیا جاتا ہے۔''

اسلام ایک قانون شہادت دیتا ہے۔ اس کا اپنا فوجداری اور دیوانی قانون ہے وہ تجارت اور معاملات کے لیے قانونی ہدایت دیتا ہے۔ وہ نکاح و طلاق، وراثت و وصیت، بیع و ہبہ کے لیے قوانین دیتا ہے۔ اگر حکومت و اقتدار اس کو حاصل نہ ہو تو اس کی شریعت کا ایک حصہ معطل، بے کار اور ناقابل عمل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اسلام اور حکومت دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست نہیں ہو سکتا۔

خود رسول اللہ ﷺ کا دنیا میں ایک بہت بڑا کام اور آپ ﷺ کی بعثت کا ایک اہم مقصد حکومت الٰہی کا قائم کرنا اور دنیا میں آسمانی نظام سیاست و اخلاق و معاشرت کا جاری کرنا تھا۔ یہ نکتہ اچھی طرح سمجھنے کے لائق ہے کہ حکومت الٰہی کے قیام اور اسلامی نظام و قوانین و حدود کے اجرا اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر اصلاح کی سب کوششیں ناکام و ناقص ثابت ہوں گی۔ صرف چند خاص لوگوں کی اصلاح ہو گی، لیکن ضرورت فضا بدلنے اور جڑ مضبوط کرنے کی ہے۔ یہی وہ نقشہ ہے جس پر رسول اللہ ﷺ نے کام کیا اور تجربہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ اور پائیدار کامیابی اسی کو ہوئی اور قیامت تک اسلام کی ترقی کا ضامن یہی نظام عمل ہو سکتا ہے۔

اسلام صرف خواص کا مذہب نہیں اور منتخب لوگوں کا اس پر عمل کرنا کافی نہیں، اسی طرح اسلام اکثر مذاہب کی طرح چند عقائد و رسوم کا نام نہیں۔ وہ زندگی کا نظام ہے۔ وہ زمانے کی فضا، طبیعت بشری کا مذاق اور سواد اعظم کا رنگ بدلنا چاہتا ہے اور اور عقائد کے ساتھ ساتھ اخلاق و معاشرت، زندگی کے مقصد و معیار، زاویہ نظر اور انسانی ذہنیت کو بھی اپنے قالب میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ اس کو مادی و سیاسی اقتدار حاصل ہو، صرف اسی کو قانون سازی اور تنقید کا حق ہو، اسی کے صحیح نمائندے دنیا کے لیے نمونہ ہوں۔ اسلام کے مادی اقتدار کا لازمی نتیجہ اس کا روحانی اقتدار اور صاحب اقتدار جماعت کے اخلاق و اعمال کی اشاعت ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ

ترجمہ: ''یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں زمین میں صاحب اقتدار کر دیا (یعنی ان کا حکم چلنے لگا) تو وہ نماز قائم کریں گے، ادائے زکوٰۃ میں سرگرم ہوں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے، برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔'' (الحج۔۴۱)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اسلام میں جس قدر اہم فریضہ ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ امت مسلمہ کے برپا کرنے کا مقصد یہی بتایا گیا کہ

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

ترجمہ: "تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے میدان میں لائی گئی ہے، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔" (آل عمران۔۱۱۰)

اور قیامت تک کے لیے مسلمانوں کا بھی یہی فرض قرار دیا گیا ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط

ترجمہ: "تم میں ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے جو بھلائی کی طرف دعوت دے، نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکے۔" (آل عمران۔۱۰۴)

لیکن یہ یاد رہے کہ اس کے لیے امر (حکم) اور نہی (ممانعت) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ امر و نہی کے لفظ میں اقتدار اور تحکیم کی شان ہے۔ یہ نہیں فرمایا گیا کہ وہ بھلائی اختیار کرنے کی درخواست وعرض کریں گے اور برائی سے باز رہنے کی التجا کریں گے۔ اس امر و نہی کے لیے سیاسی اقتدار اور مادی قوت کی ضرورت ہے اور امت کا فریضہ ہے کہ وہ اس کا انتظام کرے۔ صحیحین کی مشہور حدیث ہے:

من رای منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع، فبلسانہ، فان لم یستطع فبقلبہ و ذالک اضعف الایمان۔

ترجمہ: "تم میں (سے جو شخص کوئی بدی دیکھے، اس کو ہاتھ سے (نیکی سے) بدل دے، اگر ایسا نہ کر سکے، تو زبان سے روکے، اگر زبان سے بھی نہ روک سکے تو دل سے برا سمجھے اور یہ (آخری درجہ) ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔"

ظاہر ہے کہ "تغیر بالید" (ہاتھ سے بدل دینے اور عملی اصلاح) کے لیے قوت و اختیار کی ضرورت ہے۔ اگر یہ کچھ نہیں تو تیسرے درجے پر قناعت کرنی پڑے گی جو ایمان کا آخری درجہ ہے اور جس کے بعد، بعض روایات کے مطابق "ایک ذرہ برابر بھی ایمان نہیں رہ جاتا۔" مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ غلامی میں بدی کو دل سے برا سمجھنا اور زشت و نیک کا احساس بھی جاتا رہتا ہے۔

تھا جو نا خوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر!

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی فطرت اس بات کا مطالبہ کرتی ہے اور قرآن و حدیث کے نصوص اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ اسلام کی سربلندی کے لیے آزاد فضا حاصل کی جائے اور ریاست اور حکومت کو دین کے فروغ اور اسلام کے بتائے ہوئے مقاصد حیات کے لیے ان حدود میں رہ کر استعمال کیا جائے جو قرآن و سنت نے متعین کر دی ہیں۔ جو ریاست ان مقاصد کے حصول کے لیے کوشش کرے وہ اسلامی ریاست ہے اور ایسی ریاست کے قیام کے بغیر اسلام کا نصب العین نامکمل رہے گا۔

فقہ کے ایک بنیادی مسئلے سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے۔ اسلامی فکر کے تمام مکاتیب خیال اس امر پر متفق ہیں کہ ملت اسلامیہ کے لیے نصب امامت لازمی ہے، خلیفہ اور امام کا تقرر واجب ہے کیونکہ نظام ملت، قیام امن، حصول نفع و دفع ضرر اور نفاذ احکام شریعت، امامت و خلافت کے

www.urdu...apk.blogspot.com

...اس کے بغیر ممکن نہیں۔ علامہ ابن حزم اپنی کتاب "الفصل بین الملل والنحل" میں لکھتے ہیں:

انفق جمیع اهل السنه و جمیع الرجیة وجمیع الشیعة وجمیع الخوارج علی وجوب الامامة وان الامة واجب علیها الانقیاد لامام عادل یقیم احکام الله ویسوسهم باحکام الشریعة التی اتی بها رسول الله صلی الله علیه وسلم.

ترجمہ: "کل اہل سنت، رجیعہ، شیعہ، خوارج سب کا اتفاق ہے کہ نصب امام واجب ہے اور یہ کہ امت پر ایسے امام عادل کی اطاعت واجب ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام قائم کرے اور ان احکام شریعت کے مطابق ان کا سیاسی نظام قائم کرے جو نبی ﷺ لے کر آئے ہیں۔"

اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ رقم طراز ہیں:

"مسلمانوں پر جامع شرائط خلیفہ کا مقرر کرنا واجب بالکفایہ ہے اور یہ حکم قیامت تک کے لیے ہے۔"

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر پوری امت کا اجماع ہے۔ تمام فرقے اس پر متفق ہیں۔ اختلاف اگر ہے تو تقرر و انتخاب کی تفاصیل و جزئیات یا اس کے طریق و شرائط میں ہے لیکن نصب امامت کے وجوب پر کوئی اختلاف نہیں۔ یہ سب کی نگاہ میں لازمی و ضروری ہے۔

ہماری اب تک کی بحث سے یہ نتائج نکلتے ہیں:

(۱) ریاست کا ادارہ انسانی سماج کی ایک بنیادی ضرورت ہے اور اس کے بغیر منظم اجتماعی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) اسلام انسان کی پوری زندگی کے لیے ہدایت ہے اور اس نے اجتماعی زندگی کے لیے بھی واضح رہنمائی دی ہے۔

(۳) اسلام دین و سیاست میں کسی تفریق کا روادار نہیں۔ وہ پوری زندگی کو خدا کے قانون کے تابع کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے سیاست کو بھی اسلامی اصولوں پر مرتب کرتا ہے اور ریاست کو اسلام کے قیام اور اس کے استحکام کے لیے استعمال کرتا ہے۔

(۴) یہ روش دنیا و آخرت دونوں میں عتاب الٰہی کی موجب ہے کہ کچھ احکام الٰہی کو تسلیم کر کے اس پر عمل کیا جائے اور کچھ دوسرے اسلامی احکام سے صرف نظر اور روگردانی اختیار کی جائے، خواہ خواہش نفس کی اندرونی وحشت کی بنا پر یا کسی بیرونی دباؤ یا مرعوبیت کی بنا پر۔

(۵) اسلام اور ریاست و حکومت کا اتنا قریبی تعلق ہے اور یہ ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ اگر ریاست و حکومت اسلام کے بغیر ہوں تو وہ ظلم اور بے انصافی کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور ان کے نتیجے میں "چنگیزی" رونما ہوتی ہے۔ اور اگر اسلام ریاست و حکومت کے بغیر ہو تو اس کے ایک حصے پر عمل ہی ممکن نہیں رہتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ریاست کو اسلامی بنیادوں پر قائم کیا جائے اور حکومت اسلام کی پابند ہو اور اس کے قیام کے لیے سرگرم عمل رہے۔

آیئے اب یہ دیکھیں کہ اسلام جو ریاست قائم کرتا ہے اس کی خصوصیات کیا ہیں اور دنیا کے دوسرے سیاسی نظاموں سے کس حد تک مختلف ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسلامی ریاست کی خصوصیات

(۱) اصولی اور نظریاتی ریاست:

اسلامی ریاست کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے۔ اس ریاست کی بنیاد نہ نسل پر ہے اور نہ رنگ پر، نہ زبان پر ہے اور نہ وطن پر، نہ محض معاشی مفاد کا اشتراک اس کی اساس ہے اور نہ محض سیاسی الحاق۔ اس ریاست کی اصل بنیاد یہ ہے کہ یہ اسلامی نظریہ حیات کی علم بردار، اس کی تابع اور اس کو قائم کرنے والی ہے۔ جو ریاست خدا کی سیاسی حاکمیت کا اعلان کرے اور اس کے قانون کو نافذ کرنے والی بنے وہ اسلامی ریاست ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر ریاست کی طرح اسلامی ریاست کے لیے بھی ایک متعین علاقہ اور آبادی ہونا ضروری ہے، اور اس سرزمین کی حفاظت اور اس کے رہنے والوں کی فلاح و بہبود ہر لحہ اس کے سامنے رہتی ہے لیکن اسلامی ریاست کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک نظریاتی ریاست ہے اور ایک ایسے اصول کی داعی ہے جو تمام انسانوں کے لیے یکساں ہے۔

سورہ حج کی وہ آیت گزر چکی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

ترجمہ: ''یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں زمین میں صاحب اقتدار کر دیا تو وہ نماز قائم کریں گے، ادائے زکوٰۃ میں سرگرم رہیں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے، برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار خدا کے ہاتھ میں ہے۔'' (الحج۔۴۱)

اور ایک دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ج وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ط

ترجمہ: ''ہم نے اپنے رسول واضح نشانیاں دے کر بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) اتاری، تاکہ انسان انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے اتارا لوہا (ریاست کی قوت و جبروت) جس میں سخت خطرہ ہے اور لوگوں کے لیے بہت فوائد بھی ہیں۔ تاکہ اللہ جان لے کہ کون اس (کے دین) کی اور اس کے رسولوں کی بن دیکھے مدد کرتا ہے۔'' (الحدید۔۲۵)

اسی طرح سورۃ النور میں ارشاد ہوا ہے کہ

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط يَعْبُدُوْنَنِىْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْئًا ط وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ O وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ

ترجمہ: ''تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اس کو ان کے لیے قوت دے گا اور خوف و ہراس کے بعد ان کو امن بخشے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

شریک نہ کریں گے، اور جو اس کے بعد نافرمانی کی روش اختیار کریں گے وہ فاسق ہیں، اور (اے مسلمانو) نماز قائم کرو اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرتے رہو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔" (النور۔۵۵۔۵۶)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اسلام میں حکومت کا مقصد دین کو قائم کرنا، خدا کی کتاب کے مطابق انصاف قائم کرنا، نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا ہے۔ یہ ریاست ایک نظریاتی اور مقصدی ریاست ہے اور اس کی اصل ذمہ داری اس اصول کی سربلندی ہے جسے قائم کرنے کے لیے یہ وجود میں لائی جاتی ہے۔

اسلام میں قانون حکومت و ریاست پر فوقیت رکھتا ہے اور خود حکومت خدا کے قانون کی پابند اور اس کے تابع ہوتی ہے۔ ریاست کل اقتدارات کی حامل نہیں بلکہ یہ اپنے اختیارات خدا کے قانون سے حاصل کرتی ہے اور اس کی پابند و ماتحت ہے۔ اس میں اصول اطاعت یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت ہر اطاعت سے بلند و بالا ہے۔ ہر شخص کی بنیادی وفاداری شریعت سے ہے۔ ریاست کی وفاداری اسی وقت تک ہے جب تک وہ خدا اور رسول کی وفادار ہے اور اگر وہ ان کی بے وفائی کرے تو مسلمان ہرگز اس کی اطاعت کے پابند نہیں ہیں۔ اس اصول کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

ترجمہ: "اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی، اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔" (النساء۔۵۹)

اس آیت ربانی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) اصل اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی ہے۔ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مرکز ومحور خدا اور اس کے رسول کی فرماں برداری اور وفاداری ہے۔ دوسری اطاعتیں صرف اس صورت میں قابل قبول ہوں گی جب وہ خدا اور رسول کی اطاعت کے تحت اور تابع ہوں۔ خدا اور رسول کے احکام کے علی الرغم کسی کی اطاعت جائز نہیں۔ اسی حقیقت کو حضور ﷺ نے اس طرح واضح فرمایا ہے کہ:

لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق.

ترجمہ: "خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لیے کوئی اطاعت نہیں۔"

(۲) مسلمانوں کے اولی الامر، یعنی وہ اصحاب اقتدار جنہیں فیصلہ کن اختیار حاصل ہوں اور جو ریاست کی بنیادی پالیسی بنائیں، مسلمانوں ہی میں سے ہونے چاہئیں۔ "منکم" (تم میں سے) کا اشارہ اسی حقیقت کی طرف ہے۔ اس لیے اسلامی ریاست کے کلیدی مناصب انہی افراد کے پاس ہونے چاہئیں جو مسلمان ہیں۔

(۳) اولی الامر کی اطاعت اور ان کی فرماں برداری مسلمانوں کے لیے ضروری کی گئی ہے تاکہ زندگی کا نظام بحسن وخوبی چلے اور بے وجہ اس میں اختلال واقع نہ ہو۔ لیکن اولی الامر کی یہ اطاعت خدا اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے تابع ہے۔ اگر وہ کوئی ایسا حکم دیں جو قرآن و سنت کے خلاف ہو تو اس کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ترجمہ: "مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سنے اور مانے خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند۔ تا وقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ کچھ سننا چاہیے اور نہ ماننا چاہیے۔" (بخاری و مسلم)

(۳) اولی الامر سے بحث و مذاکرہ، ان سے اختلاف اور ان پر تنقید محاسبہ کی اجازت اور ضمانت بھی یہ آیت دیتی ہے، یہیں حق دیا گیا ہے کہ ان سے اختلاف کریں اور بالآخر فیصلہ صرف خدا اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق ہو لیکن یہ تنقید اور اختلاف حدود قانون میں رہتے ہوئے ہونا چاہیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے:

"تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر۔ تو جس نے ان کے منکرات پر اظہار ناراضگی کیا وہ بری الذمہ ہوا اور جس نے ان کو ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا وہ ماخوذ ہوگا" (مسلم)

یہ اصول وفاداری اس بات کو بالکل واضح کر دیتا ہے کہ اسلامی ریاست ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے۔ اس کا مقصد ایک نظریے کو سربلند کرنا ہے اور اس میں اطاعت ایک اصول کی ہے محض اقتدار کی نہیں۔

اسلامی ریاست کے اصولی اور نظریاتی ہونے سے چند امور پر مزید روشنی پڑتی ہے:

(الف) اسلام میں ریاست خود ایک مقصد نہیں بلکہ ایک اعلیٰ تر مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس طرح یہ شئے ریاست سے بالکل مختلف ہے جہاں ریاست خود مقصد بن جاتی ہے اور فرد کی کوئی مستقل بالذات حیثیت نہیں رہتی۔ اسلامی ریاست کا مقصد افراد کو وہ مواقع فراہم کرنا ہے جن کے ذریعے سے وہ خدا اور اس کے رسول کے احکام کو پورا کر سکیں۔ یہ ریاست خود اس بالاتر قانون کی تابع ہے یہی وجہ ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ "انا اول المسلمین" (میں اطاعت الٰہی کرنے والوں میں سب سے پہلا ہوں) اور اسلام کا قانون سربراہ مملکت پر بھی اسی طرح لاگو ہوتا ہے، جس طرح ایک عام شہری پر۔

(ب) اسلامی ریاست ایک لادینی قومی ریاست سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ لادینی ریاست وہ ریاست ہے جو اپنے معاملات اور مسلک کو مذہب اور الہامی ہدایت پر مبنی کرنے کے بجائے محض عقل و مصلحت سے اپنا کام چلاتی ہے اور کسی بالاتر قانون کی پابند نہیں ہوتی۔ ایسی ریاست مذہب کے معاملے میں غیر جانب دار بھی ہو سکتی ہے اور اجتماعی معاملات میں اس کی مخالف بھی۔ ایسی ریاست اسلام کی بالکل ضد ہے۔ اسلام دنیاوی معاملات کی اصلاح چاہتا ہے لیکن خدا کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر نہیں بلکہ اس کی روشنی میں۔

اسلام اور لادینی ریاست:

آج چونکہ لادینی ریاست کا چلن ہے اس لیے اس کے بارے میں چند باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

مغرب میں لادینی ریاست کا تخیل ایک خاص پس منظر کی پیداوار ہے۔ وہاں پاپائی نظام نے جو شکل اختیار کر لی تھی اور مذہب کے نام پر بادشاہوں سے گٹھ جوڑ کے ذریعے سے جن مظالم کو سند جواز دی گئی تھی انہوں نے ایک ردعمل پیدا کیا۔ عیسائیت کی مخالفت میں اتنی بے اعتدالی پیدا ہوئی کہ خود مذہب ہی کے خلاف بغاوت کر دی گئی اور اس بغاوت کا سیاسی مظہر لادینی ریاست تھی۔

سیکولرزم کی تحریک کا باقاعدہ آغاز ۱۸۳۲ء میں ہوا جب جیکب ہولیک نے سیاست کو مذہب سے الگ رکھنے کی یہ تحریک قائم کی۔ اس تحریک کی سربراہی اہل فکر و سیاست کے ہاتھوں میں رہی اور بہت جلد اس مسلک کو سیاسی قبولیت حاصل ہو گئی۔ مختصراً اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مذہب کا دائرہ انفرادی زندگی تک محدود رہنا چاہیے اور اسے اجتماعی اور سیاسی زندگی میں کوئی مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ شروع میں بات صرف مذہب کے معاملے میں غیر جانب داری اور فرد کی کامل آزادی کی تھی لیکن بعد میں اس تحریک کا ایک حصہ مذہب کی مخالفت اور جارحانہ مادیت یا اشتراکیت کا داعی بن گیا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مغرب میں لادینیت کے جو اثرات رونما ہوئے وہ یہ ہیں:

سیکولرازم نے تشکیک اور ذہنی پراگندگی پیدا کی ہے۔ کوئی ایک نصب العین انسان کے سامنے نہیں رہا اور ایک قسم کی بے عقیدگی انسان میں پھیل گئی ہے۔ یہ اسی ذہنی انتشار اور فکری تشتت ہی کا نتیجہ ہے کہ اشتراکیت اور فسطائیت جیسی تحریکوں نے جنم لیا اور انسان کو مادہ پرستی کی انتہا کی طرف لے گئیں۔ اشتراکیت کا مشہور نقاد آر۔ این۔ کیریو ہنٹ لکھتا ہے:

"اشتراکیت غربت و افلاس اور خوب سماجی حالات کی پیداوار نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کی اصلی کشش نچلے افلاس زدہ طبقات کے مقابلے میں اچھی تنخواہ والے مزدوروں اور تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ کارکنوں کے لیے ہے۔ یہ اس امر کا نتیجہ بھی نہیں ہے کہ عوام میں اب سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں اور بے انصافیوں کا شعور پیدا ہو گیا ہے اور نہ ہی یہ نظام پیداوار کی اکتا دینے والی یکسانی اور عدم تنوع کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے اور آخری تجزیہ ہمیں اسی نتیجہ تک لاتا ہے کہ اشتراکیت ان نظریات کے مجموعے کا نام ہے جنہوں نے ہماری زندگی کے اس خلا کو پر کیا ہے جسے منظم مذہب کے انہدام نے پیدا کیا تھا اور جو زندگی پر لادینیت کے غلبے کا لازمی نتیجہ تھا۔ اور اس نظام فکر و عمل کا مقابلہ اگر کیا جا سکتا ہے تو ایک دوسرے ہمہ گیر نظام حیات ہی سے کیا جا سکتا ہے جو کچھ دوسرے اصولوں کا علم بردار ہو۔"

اور جو حضرات اشتراکیت کی طرف نہیں گئے وہ ذہنی بے اطمینانی، روحانی اضطراب، جذباتی تلون اور بے عقیدگی کا شکار ہوئے ہیں۔

فرد کے سامنے نیا نصب العین صرف ذاتی اغراض و خواہشات کی تکمیل رہ گیا اور قومی پیمانے پر مصلحت اور موقع پرستی نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ظلم سے بھر دیا اور کوئی مستقل ضابطۂ اخلاق ملکی اور قومی زندگی کے لیے باقی نہ رہا۔ نتیجتاً گزشتہ اس صدی نے دو ایسی ہولناک عالمی جنگوں کا مشاہدہ کیا جن میں ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد انسانیت کی پوری تاریخ کی تمام جنگوں کے مجموعے، مقتولین و مجروحین کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔

اس کے عام اخلاقی اثرات بھی تباہ کن تھے۔ مستقل مزاجی، پامردی، جرأت اور سب سے بڑھ کر نیکی اور بدی میں تمیز کا مادہ ختم ہونے لگا اور مفاد پرستی، مصلحت بینی اور ابن الوقتی انفرادی اور اجتماعی اخلاق کی بنیاد بن گئے۔ اس کے نتیجے میں ہزاروں سماجی اور معاشرتی برائیاں رونما ہوئیں جو معاشرے کو سکون و اطمینان سے محروم کیے ہوئے ہیں۔

تجربے نے بتایا ہے کہ اگر خالص مادی فائدہ پیش نظر ہو اور کوئی اعلیٰ اخلاقی اور روحانی نظام موجود نہ ہو، تو محض مادی فائدہ بھی انسان کو حاصل نہیں ہوتا ہے۔ آرنلڈ ٹائن بی سیکولرزم کے نتائج کا جائزہ لے کر کھلے الفاظ میں اس کی ناکامی کا اعتراف کرتا ہے:

"یہ اب واضح ہو گیا ہے کہ اگر صرف دنیاوی خوشی کو مقصد زیست بنا دیا جائے گا تو اس میں فرد کی مادی خوشحالی اور دنیاوی سکون کا حصول بھی ناممکن ہے؛ ہاں یہ قابل فہم ہے کہ اگر سیکولرزم سے بلند و بالا کوئی روحانی مقصد سامنے رکھا جائے تو ایک ضمنی نتیجے کی حیثیت سے انسان کو دنیاوی خوشی بھی حاصل ہو جائے۔"

پھر حقیقت یہ ہے کہ سیکولرزم عملاً ناکام ہی نہیں ہوا ہے بلکہ تاریخ اب سیکولرزم سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ اگر گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو سیکولرزم آج ایک دقیانوسی اور از کار رفتہ تصور ہے اور گردش ایام کے اس کی طرف لوٹنے کا کوئی امکان نہیں، سیکولرزم کچھ خاص تاریخی عوامل کی پیداوار تھا اور ایک مخصوص فضا ہی میں وہ کام کر سکتا ہے۔ اگر وہ عوامل موجود نہ ہوں تو اس کا قائم رہنا ممکن نہیں ہے۔

سیکولرزم، جیسا کہ ہم نے اوپر کہا، اس نظام کو کہتے ہیں جس میں سیاسی اور ریاستی معاملات میں مذہب کو کوئی دخل نہ ہو لیکن اگر مزید تجزیہ کیا جائے تو یہ بات یہاں آ جاتی ہے کہ یہ مذہبی اور نظریاتی غیر جانبداری کا داعی ہے۔ انیسویں صدی کی سیاسی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot

سیکولرزم، انفرادیت، قومیت، معاشی امور میں مکمل آزادی اور ریاست کی عدم مداخلت سیاست کے بنیادی تصورات تھے۔ اور یہ تمام تصورات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ سیکولرزم اس وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب ریاست صرف ایک وفاقی ادارہ (پولیس اسٹیٹ) ہو یعنی اس کی ذمہ داری محض نظم ونسق کو قائم رکھنا اور ملک کو بیرونی حملے اور اندرونی بدامنی سے بچانا ہو۔ ایسے ہی نظام ریاست میں فرد کو پوری پوری آزادی دی جاسکتی ہے کہ وہ جس طرح چاہے زندگی گزارے اور صرف اسی صورت میں حکومت (کم ازکم نظری حد تک) مذہبی اور نظریاتی غیر جانبداری کو روا رکھ سکتی ہے۔ اور یہی تصور انیسویں صدی میں تھا، لیکن آج ریاست کا تصور بدل گیا ہے۔ آج ریاست محض ایک عظیم الشان بت نہیں، آج یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک خاص دائرے کو چھوڑ کر ملک میں جو کچھ بھی ہوتا رہے ریاست عدم مداخلت پر کاربند رہے گی۔ آج اس کے وظائف نہایت عظیم اور اس کا دائرہ کار نہایت وسیع ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے کی صورت گری کرتی ہے اور اپنی پالیسی کے ذریعے سے اس کی ضابطہ بندی کرتی ہے۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ جہالت کو ختم کرے اور علم کی شمعیں روشن کرے، غربت کو ختم کرے اور دولت کی منصفانہ تقسیم کی کوشش کرے، سماجی برائیوں سے قلع قمع کرے اور شہریوں کی اخلاقی اور معاشرتی تعلیم کا بندوبست کرے۔ بیماریوں کا علاج، مظلوموں کی دادرسی، مجبوروں کی مدد واستعانت کا اہتمام کرے۔ مختصراً، آج کی ریاست ایک فلاحی ریاست ہے اور اس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ نظریاتی غیر جانب داری برت سکے۔ اسے تو کچھ نہ کچھ اقدار کو ماننا ہوگا، کسی نہ کسی نظریے کو قبول کرنا ہوگا، خیر وشر اور فلاح وخسران کے کسی نہ کسی معیار کو اختیار کرنا ہوگا اور اس کی روشنی میں اپنی پوری پالیسی کو ترتیب دینا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی ریاست ایک نظریاتی ریاست بنتی جارہی ہے اور وہ بنیادیں جن پر سیکولرزم کا نظام فکر قائم تھا تاریخی یادوں کی حیثیت سے تو ضرور موجود ہیں لیکن دنیائے حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں۔ جن بنیادوں پر یہ قلعہ تعمیر ہوا تھا وہ گر چکی ہیں اور محض تمناؤں کے ذریعے سے اس خلا کو پر نہیں کیا جاسکتا۔ آج دنیا میں سیکولرزم کے لیے کوئی گنجائش نہیں، تاریخ اسے بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے آج کی ضرورت نظریاتی ریاست ہے جو سیکولرزم کی عین ضد ہے اور جسے اسلامی قائم کرنے کا داعی ہے۔

(ج) اسلامی ریاست ایک خالص قومی ریاست سے بھی مختلف ہے اس لیے کہ اس کی بنیاد محض قوم پر نہیں نظریہ اور اصول پر ہے اور پھر خود اس کا تصور قومیت بھی دوسروں سے مختلف ہے۔ اسلام ایک بالکل نئی طرز کی قومیت — نظریاتی قومیت — کا تصور پیش کرتا ہے اور اسلامی ریاست اس نئے تصور کی علم بردار ہوتی ہے۔ اس ریاست کے لیے جغرافیائی حدود تو ناگزیر ہیں لیکن اس کی اصل دعوت یہ ہے کہ انسانیت رنگ، نسل، زبان اور محدود وطنیت کی مصنوعی پابندیوں کو توڑ کر ایک نظریاتی قومیت اختیار کرے اور اسی بنیاد پر ایک عالم گیر ریاست قائم کرے۔ جب تک یہ نصب العین حاصل ہو جغرافیائی حد بندیوں کو گوارا کرنا ہوگا لیکن پوری امت کی وحدت یا کم ازکم اس کی ایک دولت مشترکہ کا قیام ایسی ریاست کے پیش نظر رہے گا۔ اس طرح یہ ان ریاستوں سے بھی مختلف ہوگی جو محض جغرافیائی قومیت پر مبنی ہیں اور جن کے پاس کوئی نظریہ اور دعوت نہیں۔

(د) اسلامی ریاست بلاشبہ حکومت الٰہیہ کی داعی ہے لیکن یہ پاپائی ریاست اور تھیاکریسی سے قطعاً مختلف ہے۔

اسلام اور تھیاکریسی:

تھیاکریسی وہ نظام حکومت ہے جس میں حکم رانی کے اختیارات خدا کو ہوں اور مذہبی پروہتوں کا طبقہ اس کے نمائندے کی حیثیت سے یہ کام انجام دے۔

> ”حکومت کی ایک ایسی قسم جس میں اقتدار اعلیٰ کا مرکز خدا یا خداؤں یا کسی اور کتابی قوت کو سمجھا جائے، حقیقی حکم راں پادری یا مذہبی پروہت ہوں اور قوانین کو احکام خداوندی سمجھا جائے۔“

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تاریخی حیثیت سے اس کی مثالیں یہودیوں، عیسائیوں اور بدھوں وغیرہ میں ملتی ہیں۔

اسلامی ریاست خدا کی حاکمیت اعلیٰ پر مبنی ہے لیکن یہ تھیاکریسی سے بنیادی طور پر مختلف ہے اور وجوہ اختلاف مختصراً یہ ہیں:

(۱) تھیاکریسی میں حاکمیت کے عملی اختیارات ایک مخصوص مذہبی طبقے کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں جو سیاہ و سفید کا مالک ہوتا ہے، جن کی رائے قانون ہوتی ہے، جس پر کوئی تنقید نہیں کر سکتا، جو خدا کے نام پر سارے اختیارات بلا روک ٹوک استعمال کرتا ہے اور کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا۔ اسلام میں ایسے کسی مستقل طبقے کا کوئی وجود نہیں۔ بندے اور خدا کے تعلق کو استوار کرنے کے لیے یہاں پروہتوں کے کسی واسطہ اور ذریعہ کی ضرورت نہیں۔ اسلام کی تعلیمات نہ صرف ہر مسلمان کے لیے ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہیں بلکہ ان سے واقفیت ہر مسلمان کا فرض بھی ہے۔ سیاست میں بھی نظام حکومت چلانے والے خدا اور امت دونوں کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں اسلامی ریاست کے اصحاب امر کے لیے کوئی شرط ہے تو وہ علم اور تقویٰ کی ہے اور ان کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔

(۲) اسلامی تاریخ میں ہمیں کبھی اس قسم کی پاپائیت نظر نہیں آتی جیسی یورپ یا ہندوستان، جاپان اور تبت میں ملتی ہے۔ ہمارے یہاں علماء حق کے علم بردار اور آزادی کے محافظ کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ وہ خود ظلم و ستم اور استبداد کا نشانہ بنے ہیں، ان کا ذریعہ نہیں۔ آزادی کی جدوجہد کے سرخیل علماء رہے ہیں اور عالم بننے کا راستہ ہر شخص کے لیے کھلا رہا ہے۔ نیز عام سیاسی تاریخ میں بھی کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ حکومت یورپ کے ''مذہبی دیوانوں'' کی طرح عوام کو نشانۂ ستم بناتی ہو۔ اس کا اعتراف خود مغربی مورخین کرتے ہیں کہ مذہبی حکومت کے سلسلے میں یورپ کا تجربہ اور عالم اسلامی کا تجربہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے۔ رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے:

> ''مشرق (مراد ہے عالم اسلام) میں تھیاکریسی کبھی بھی ذہنی استبداد کا موجب نہیں بنی۔ ہم یہاں ظلمت پسندی، خیالات پر قدغن، اور علم پر پابندی کی کوئی ایسی مثال نہیں پاتے جس کے لیے مغربی دنیا یونان اور روم سمیت مشہور ہے۔''

(۳) دوسرے مذاہب اور تہذیبوں میں تھیاکریسی میں نام تو خدا کا تھا لیکن چونکہ ان کے پاس زندگی کے ہمہ جہتی مسائل کے لیے کوئی واضح الہامی ہدایت موجود نہ تھی اس لیے پادریوں اور پروہتوں نے خدا کے نام پر اپنی رائے پیش کی اور خدا کے قانون کے بجائے اپنا قانون چلایا جو ان تمام کمزوریوں اور خامیوں سے آلودہ تھا جن سے انسانی قانون، خصوصیت سے جب وہ ایک طبقے کے مفاد کا محافظ بھی ہو، ہوا کرتا ہے، اسی لیے مذہبی طبقے کو تنقید سے بالا قرار دیا گیا تا کہ اس کی ہر بات بے چون و چرا تسلیم کر لی جائے خواہ وہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔ اسلام کا سیاسی نظام اس نظام سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں واضح الہامی ہدایت موجود ہے جو اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے اور جس میں ایک شوشے کا تغیر بھی واقع نہیں ہوا ہے اور نہیں کیا جا سکتا۔ اولی الامر سے اختلاف کی پوری پوری گنجائش ہے بلکہ ان پر تنقید اور محاسبہ فرض کیے گئے ہیں تا کہ وہ راہ صواب سے نہ ہٹیں۔ ہر شخص کو اپنی دلیل خدا کے کلام سے لانی ہے جو کسی کا اجارہ نہیں اور جس تک ہر شخص کی رسائی ہے۔ ضرورت صرف علم کی ہے۔ یہ چیز اسلامی نظام کو تھیاکریسی سے بالکل مختلف کر دیتی ہے۔

تھیاکریسی اور اسلام کے مزاج میں ایک اور بھی بڑا لطیف لیکن بے حد اہم فرق پایا جاتا ہے۔ تھیاکریسی کا ایک بنیادی تصور یہ رہا ہے کہ یہ دنیا ایک بری چیز ہے، اس کی زندگی ہمیں گناہ کی پاداش میں اختیار کرنی پڑی ہے، اس کی حیثیت ایک ''دارالعذاب'' کی سی ہے اور تمام انسانوں کو اس سزا کو برداشت کرنا چاہیے۔ اس تصور کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کی اصلاح اور درستگی اور اس کے مظالم کے خلاف آواز بلند کرنا یا جدوجہد کرنا ایک غیر مطلوب شے بن جاتے ہیں اور انسان ''تسلیم و رضا'' کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر بالکل مختلف ہے۔ انسان خدا کا خلیفہ بنایا گیا ہے۔ زندگی کی نعمتیں اس کے لیے فراہم کی گئی ہیں اور ریاست کا مقصد زندگی کو نیکیوں اور اچھائیوں سے بھرنا اور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ایک فلاحی معاشرہ قائم کرنا ہے۔ ضرورت صرف علم کی ہے۔ اس طرح جو نفسیاتی رویہ یہاں پیدا ہوتا ہے وہ تھیا کریسی کی بالکل ضد ہے۔ پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کا نظام تھیا کریسی سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری یہ بحث ہمیں اس نتیجے پر لاتی ہے کہ اسلامی ریاست اپنا ایک مخصوص مزاج رکھتی ہے اور وہ ایک اصولی، مقصدی اور نظریاتی ریاست ہے۔

۲۔ جمہوری ریاست:

اسلامی ریاست کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ایک شورائی اور جمہوری ریاست ہے۔ اس میں تمام انسان برابر ہیں اور رنگ نسل، نسب کسی کی بنیاد پر کسی خاص گروہ کو کوئی تفوق حاصل نہیں۔ وحدت آدم اور انسانی مساوات اس کے بنیادی اصول ہیں۔ قیادت کی ذمہ داری ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو پوری ملت کے معتمد علیہ ہوں۔ ارباب امر تمام امور سلطنت میں بنیادی پالیسی باہم مشورہ سے طے کرتے ہیں اور نظام حکومت کو جمہور کی مرضی کے مطابق چلاتے ہیں۔ نیز تمام شہریوں کے بنیادی حقوق اور ان کی ذمہ داریاں متعین ہیں۔ حکومت خدا اور اس کے رسول کی طرف سے ان حقوق کی ادائیگی کی ذمہ دار ہے اور ان میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتی۔ اسلامی ریاست کا مزاج نہ آمریت کو گوارا کر سکتا ہے اور نہ موروثی شہنشاہیت کو۔ اس کا مزاج خالص جمہوری اور شورائی مزاج ہے۔

اسلامی جمہوریت کی پہلی بنیاد انسانی مساوات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَآءً ط

ترجمہ: ''خدا نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو دنیا میں پھیلا دیا۔'' (النساء۔۱)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ط

ترجمہ: ''لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہ وقبائل بنا دیا تا کہ تم آپس میں پہچانے جاؤ۔ مگر درحقیقت معزز تو تم میں وہی ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔'' (الحجرات۔۱۳)

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ

ترجمہ: ''اور ہم نے اولاد آدم کو صاحب عزت بنایا۔'' (بنی اسرائیل۔۸۰)

اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

اللهم ربنا ورب كل شیء انا شهيد ان العباد كلهم اخوة

(احمد اور ابو داؤد)

ترجمہ: ''اے ہمارے اور ہر چیز کے رب! میں گواہی دیتا ہوں کہ سارے انسان بھائی بھائی ہیں۔''

فتح مکہ کے بعد جو خطبہ رسول اللہ ﷺ نے دیا، وہ یہ تھا:

''خوب سن رکھو کہ فخر و ناز کا ہر سرمایہ، خون اور مال کا ہر دعویٰ آج میرے قدموں کے نیچے ہے۔ اے اہل قریش! اللہ نے تمہاری جاہلیت ونخوت اور باپ دادا کی بزرگی کے ناز کو دور کر دیا۔ اے لوگو! تم

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

سب آدم (علیہ السلام) سے ہو اور آدم مٹی سے تھے۔ نسب کے لیے کوئی فخر نہیں ہے۔ عربی کو عجمی پر
عجمی کو عربی پر کوئی فخر نہیں۔ تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں اور حاکم اور محکوم، صاحب امر اور مامور میں اسلام کوئی تمیز نہیں کرتا۔ قانون سب کے لیے ایک ہی ہے۔
ایک بار ایک معزز خاتون کو چوری کی سزا میں قطع ید کی سزا دی جانے والی تھی کچھ صحابہ نے حضور ﷺ سے سفارش کی۔ آپ ﷺ نے سفارش کو غصہ سے رد کر دیا اور فرمایا:

والذی نفس محمد بیدہ لو سرقت فاطمة بنت محمد لقطعت یدھا. (مسلم)

ترجمہ: "اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں محمد کی جان ہے اگر فاطمہ بنت محمد نے بھی چوری کی ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ ضرور کاٹ دیتا۔"

یہ ہے وہ معیاری قانون اور معاشری مساوات جس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی جمہوریت کی دوسری بنیاد ارباب اختیار کا معتمد علیہ ہونا ہے۔ یعنی یہ کہ ریاست کی ذمہ داریاں ان کو سونپی جائیں جو اس کام کے اہل ہوں اور جن پر لوگوں کو اعتماد ہو۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"تمہارے بہترین امام اور قائدہ ہیں جن کو تم چاہتے ہو اور وہ تم کو چاہتے ہوں اور تم ان کو دعائیں دیتے ہو اور وہ تم کو دعائیں دیتے ہوں اور تم میں بدترین رہنما وہ ہیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو اور وہ تم کو ناپسند کرتے ہوں اور وہ تم پر لعنت بھیجتے ہوں اور تم ان پر لعنت بھیجتے ہو۔" (مسلم)

ارباب امر کے معتمد علیہ ہونے پر مسلمانوں کے تمام مکاتیب فکر متفق ہیں، البتہ ان کا انتخاب کیسے ہو، خصوصیت سے امیر یا خلیفہ کا، اس پر اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ شیعی نظریہ خلافت یہ ہے کہ خاندان نبوت کے سوا کوئی شخص خلافت کا اہل نہیں اور امامت و خلافت اللہ کی طرف سے مخصوص ہوتی ہیں اس لیے انتخاب کا سوال نہیں۔ فرقۂ زیدیہ انتخاب کے اصول کو مانتا ہے لیکن دائرہ استحقاق کو محدود رکھتا ہے۔ خوارج کا خیال تھا کہ ہر پاک برت مسلمان خلافت کا اہل ہے البتہ عام حالات میں خلیفہ کو معزول کرنا جائز نہیں۔ معتزلہ ہر فرد کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے۔ اہل سنت عمومی خلافت کے قائل ہیں البتہ خلیفہ کے لیے علم و اجتہاد، اخلاق فاضلہ، سیاسی تدبیر، فنون حرب میں مہارت وغیرہ کی شرائط مقرر کرتے ہیں۔ طریق انتخاب پر اختلاف کے باوجود تمام مکاتیب فکر کے سیاسی نظریات میں ارباب امر کا معتمد علیہ ہونا مشترک نظر آتا ہے۔

اسلامی جمہوریت کی تیسری بنیاد شوریٰ ہے۔ یعنی مسلمانوں کے یہ معتمد علیہ افراد تمام امور سلطنت کو خدا اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق مسلمانوں کے مشورے کی روشنی میں طے کریں، اللہ تعالیٰ خود اپنے نبی (ﷺ) سے فرماتا ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ج

ترجمہ: "اور ان سے معاملات میں مشورہ کرو۔"

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ شہادت دیتے ہیں کہ

مارأیت احداً اکثر مشورة لاصحابه من النبی ﷺ (بخاری و ترمذی)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ترجمہ: "میں نے نبی ﷺ سے بڑھ کر کسی کو اپنے اصحاب سے مشورہ کرنے والا نہیں دیکھا۔"

عام اولی الامر کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ

ترجمہ: "اوران کے امور آپس کے مشورے سے طے ہوتے ہیں۔" (الشوریٰ ۳۸)

خطیب بغدادی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ:

"میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! آپ کے بعد کوئی معاملہ ایسا پیش آجائے جس کے متعلق نہ قرآن میں کچھ اترا ہو اور نہ آپ سے کوئی بات سنی گئی ہو تو ہم کیا کریں؟ آپ نے فرمایا میری امت میں سے عبادت گزار اور اطاعت شعار لوگوں کو جمع کرو اور اسے آپس کے مشورے کے لیے رکھ دو، اور کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔" (روح المعانی)

آپ ﷺ کی ایک دوسری حدیث میں اسلامی معاشرے کی صحیح حالت کا نقشہ اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

"جب تمہارے حکام تم میں نیک اور صالح ہوں، تمہارے اصل ثروت تم میں فیاض ہوں اور تمہارے امور باہم مشورے سے طے ہوں۔" (صحاح)

اس لیے علمائے قانون نے یہ کہا ہے کہ شوریٰ اسلامی نظام کی روح اور اس کا ایک لازمی جزو ہے۔ چھٹی صدی ہجری کے مشہور عالم قانون عبدالحق بن غالب بن عطیہ لکھتے ہیں:

ان الشوری هی من قواعد الشرعية وعزائم الاحكام.

(بستانی. جلد اول)

ترجمہ: "شوریٰ شریعت کے قوانین اور محکم احکام میں سے ہے۔"

مشاورت کا یہ حکم ہر اہم معاملے اور اس کی ہر منزل کے لیے ہے۔ اس کی شکل کیا ہو؟ اس کا تعین ہر زمانے کے حالات کے مطابق کیا جائے گا لیکن اس کی روح یہ ہے کہ مشورہ ان لوگوں سے کیا جائے جو اہل حل وعقد ہوں، فہم وبصیرت رکھتے ہوں اور لوگوں کے معتمد علیہ ہوں۔ مسلمانوں کے تمام اجتماعی کام مشورے سے طے ہوں اور کوئی شخص اپنی من مانی نہ کرے، کوئی اجتماعی کام جتنے لوگوں سے متعلق ہو مشورہ میں ان سب کو یا ان کے نمائندوں کو شریک کیا جائے اور مشورہ آزادانہ، بے لاگ اور مخلصانہ ہو، اگر یہ چیزیں موجود ہوں تو شوریٰ کا حق ادا ہو جاتا ہے خواہ اس کی شکل کوئی بھی تجویز کی جائے۔

اسلامی جمہوریت کی آخری بنیاد شہریوں کے حقوق وفرائض کا تعین ہے اور ان حقوق میں دراندازی کا حق کسی کو نہیں ہے۔ یہ تمام حقوق خدا اور اس کے رسول ﷺ کے عطا کردہ ہیں اور کسی شرعی دلیل یا حق کے بغیر ان میں سے کسی پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی یا ان میں کوئی رد وبدل نہیں ہو سکتا۔

اسلامی ریاست اپنے شہریوں کی دو قسمیں کرتی ہے: مسلمان شہری اور غیر مسلم شہری۔ غیر مسلم شہریوں کو تمام بنیادی انسانی حقوق حاصل ہیں، انہیں مکمل مذہبی اور ثقافتی آزادی حاصل ہے، البتہ انہیں یہ حق حاصل نہیں کہ نظریاتی مملکت کے کلیدی مناصب پر فائز ہو سکیں۔ اور اسی کی مناسبت سے ان کی ذمہ داریاں بھی کم ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسلامی ریاست کے شہریوں کو یہ حقوق حاصل ہیں:

(۱) جان و مال اور ناموس کی حفاظت:

یعنی ریاست ضمانت دیتی ہے کہ اپنے شہریوں کے جان و مال اور ناموس پر نہ خود ہاتھ ڈالے گی اور نہ کسی اور کو ڈالنے دے گی۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

فذالک المسلم الذی له ذمته الله ورسوله فلاتحفروا الله فی ذمته. (بخاری)

ترجمہ: ''پس یہ وہ مسلم ہے جس کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے۔ تو خبردار، اللہ کے ساتھ اس کی دی ہوئی ضمانت میں غداری نہ کرو۔''

کل المسلم علی المسلم حرام دمه وماله وعرضه.

ترجمہ: ''مسلمان کی ہر چیز مسلمان پر حرام ہے۔ اس کا خون بھی، اس کا مال بھی اور اس کی آبرو بھی۔''

اسی طرح غیر مسلم شہریون کے باب میں بھی اصول یہ ہے: ''جو کوئی ہمارا ذمی ہو اس کا خون ہمارے خون کی طرح اور اس کی دیت ہماری دیت کی طرح اور ان کا مال ہمارے مال کی طرح ہوں گے۔''

اسی طرح تمام شہریوں کی ذاتی ملکیت کی ضمانت دی گئی ہے اور یہ قول قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا ہے کہ

ولیس للامام ان یخرج شیئاً من احد الابحق ثابت معروف

ترجمہ: ''امام (حکومت) کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی ثابت شدہ قانونی حق کے بغیر کسی شخص کے قبضے سے اس کی کوئی شے نکالے۔''

(۲) شخصی آزادی:

ہر شخص کی انفرادی آزادی محفوظ ہوگی اور اسے یہ ضمانت اس وقت تک حاصل رہے گی جب تک وہ اپنی آزادی کو دوسروں کی آزادی کے سلب کرنے یا جماعت کے کسی حقیقی مفاد کو نقصان پہنچائے یا خطرے میں ڈالنے کے لیے استعمال نہیں کرتا۔

ایک مرتبہ حضور ﷺ کے خطبے کے دوران ایک شخص نے اپنے ہمسایوں کے بارے میں پوچھا جو شبہے کی بنا پر گرفتار کر لیے گئے تھے۔ آپ ﷺ نے دو مرتبہ سوال سن کر سکوت فرمایا تا کہ اگر گرفتاری کی کوئی معقول وجہ ہو تو معلوم ہو جائے اور جب کوئی چیز سامنے نہ آئی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

خلوا له جیرانه. (ابوداؤد)

ترجمہ: ''اس کے ہمسایوں کو رہا کر دو۔''

اسلام کا یہ اصول ہے کہ

لایوسر رجل فی الاسلام بغیر عدل. (موطا)

ترجمہ: ''اسلام میں کوئی شخص بغیر عدل کے قید نہیں کیا جا سکتا۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

(۳) رائے اور مسلک کی آزادی:

اسلام ہر شخص کو اپنی آزاد رائے رکھنے کی اجازت دیتا ہے بشرطیکہ وہ اختلاف رائے کو خون ریزی اور فتنہ وفساد کا ذریعہ نہ بنا لے۔ اس کی بہترین مثال وہ رویہ ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کے مقابلے میں اختیار فرمایا جو ریاست کے وجود ہی کی نفی کرتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو پیغام بھیجا کہ:

''تم جہاں چاہو رہو، اور ہمارے اور تمہارے درمیان شرط یہ ہے کہ تم خون ریزی اور رہزنی نہ اختیار کرو اور ظلم سے باز رہو'' (نیل الاوطار جلد ۷ صفحہ ۱۳۰)

اسلام ہرگز پسند نہیں کرتا کہ دین کے معاملے میں جبر و اکراہ سے کام لیا جائے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ط

ترجمہ: ''دین کے معاملے میں زبردستی نہیں۔'' (البقرہ۔۲۵۶)

(۴) قانونی مساوات:

یعنی تمام شہری خواہ امیر ہوں یا غریب، سیاہ ہوں یا سفید، صاحب امر ہوں یا مامور، قانون کی نگاہ میں برابر ہوں گے اور سب پر ایک ہی قانون لاگو ہوگا۔

(۵) معاشرتی مساوات:

یعنی خون، رنگ، نسب، زبان، پیشہ، معاشی مقام وغیرہ کی بنا پر شہریوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ سب برابر ہیں۔ عزت و شرف اگر ہے تو صرف علم و تقویٰ کی بنا پر۔

(۶) بے لاگ اور بے معاوضہ انصاف:

یعنی اسلامی ریاست ہر شہری کو ہر قسم کے ظلم و زیادتی سے بچائے گی اور حصول انصاف کا انتظام بلا کسی معاوضہ کے کرے گی۔

(۷) فریاد، اعتراض اور تنقید کا حق:

تمام شہریوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ پوری آزادی کے ساتھ اپنی بات ارباب اختیار تک پہنچائیں، اپنی مجبوریاں اور مسائل ان کو بتائیں ان کی پالیسیوں پر اعتراض اور تنقید کریں۔ ان کی بات سنیں اور انہیں اپنی بات سنائیں۔

(۸) اجتماع، تنظیم بندی اور نقل و حرکت کی آزادی:

انہیں یہ حق بھی حاصل ہوگا کہ منظم و مجتمع ہو کر کام کریں اور بلا روک ٹوک ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوں۔

ان حقوق کے مقابلے میں شہریوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ہر صحیح بات کو قبول کریں اور اطاعت کریں۔ معروف میں عدم اطاعت کی روش اسلامی ریاست کے مزاج کے منافی ہے۔ اسی طرح ان پر ذمہ داری ہے کہ وہ ریاست کی خیر خواہی کریں۔ یعنی دیدہ و دانستہ ایسا کام نہ کریں جو ریاست کو نقصان پہنچانے والا ہو۔ تخریبی سرگرمیوں سے خود بھی کلی طور پر محترز رہیں اور دوسروں کو بھی نہ کرنے دیں۔ نیز یہ بھی خیر خواہی ہی کا ایک پہلو ہے کہ امور ریاست پر نگاہ رکھیں اور حکومت یا اس کے کارکنوں کو خدا کے راستے سے ہٹنے نہ دیں، اور اگر کوئی انحراف واقع ہو تو اس کو روکیں، ہاتھ اور زبان دونوں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ے۔ اسلامی ریاست کا شہریوں پر یہ بھی حق ہے کہ وہ اس سے تعاون کریں اور اس کی خاطر مالی اور اگر ضرورت ہو تو خود جان کی قربانی پیش کریں۔

مندرجہ بالا چار بنیادوں پر اسلام کا جمہوری نظام قائم ہے:

اسلام، اشتراکیت اور جمہوریت:

اس بحث کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام اشتراکی آمریت اور مغربی طرز کی جمہوریت دونوں سے مختلف ہے۔

ا۔ اشتراکیت مذہب کی نفی پر مبنی ہے اور اسلامی ریاست خدا کے قانون کی تابع اور اسے قائم کرنے والی ہے۔

ب۔ اشتراکیت فرد کی مستقل اور جداگانہ شخصیت کو نہیں مانتی اور اسے طبقے میں ضم کر دیتی ہے اور ریاست کو ایک طبقے کا آلۂ کار بنا دیتی ہے۔ اسلام ان میں سے کسی چیز کو بھی درست نہیں مانتا۔ وہ فرد کو بنیاد مانتا ہے اور اس کی شخصیت کو مستحکم کرنے اور نشو و ارتقا دینے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ وہ طبقات کی نفی کرتا ہے اور تمام انسانوں کو مساوی قرار دیتا ہے۔

ج۔ اشتراکیت کا نظام آمرانہ ہے جب کہ اسلام کا نظام شورائی ہے۔ اس میں تمام امور لوگوں کی مرضی کے مطابق طے ہوتے ہیں ان پر اوپر سے تھوپے نہیں جاتے۔

د۔ اشتراکیت ریاست کے اختیارات کو غیر محدود کر دیتی ہے اور شخصی اور سیاسی آزادی کی کوئی حقیقی ضمانت نہیں دیتی۔ اسلام ریاست کے اختیارات کو ایک خاص دائرے میں محدود کر دیتا ہے اور معصیت میں اطاعت کو یا حقوق انسانی کے بلاحق شرعی ختم کیے جانے کے امکان کو ختم کر دیتا ہے۔ وہ حکومت کو مسئول بناتا ہے اور اسے عوام کے مشورے کا پابند کرتا ہے۔ نیز شخصی اور سیاسی آزادی کی حقیقی ضمانت دیتا ہے۔

اسلامی ریاست ہمہ گیر تو ضرور ہے لیکن اشتراکیت کی طرح کلیت پسند نہیں ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر اسلامی ریاست اشتراکی آمریت سے بالکل مختلف ہے۔

پھر اسلامی ریاست خود مغربی جمہوریت سے بھی مختلف ہے۔ اسلام کو جمہوریت کے اس پہلو سے تو قطعاً اختلاف نہیں کہ امور سلطنت عوام کے مشورے سے ان کی مرضی کے مطابق اور ان کے اپنے نمائندوں کے ہاتھوں طے ہونے چاہئیں بلکہ وہ جمہوریت کے وکلا سے کچھ زیادہ ہی شد و مد کے ساتھ اس بات کو پیش کرتا ہے۔ نیز اسے جمہوریت کے اس پہلو سے بھی اختلاف نہیں کہ بنیادی حقوق کی ضمانت ہونی چاہیے اور قانون کی حکمرانی کے اصول پر عمل ہونا چاہیے۔ اسی طرح انسانیت نے بہت سے تجربات کی روشنی میں عوام کی مرضی کو جاننے اور اس کو موثر بنانے کے لیے جو نظام اور جو ڈھانچے وضع کیا ہے اس سے استفادہ کرنے اور اپنے حالات کے مطابق اسے ڈھالنے پر بھی اسلام کو کچھ اعتراض نہیں۔ اسلام جن چیزوں میں مغربی جمہوریت سے اختلاف رکھتا ہے وہ یہ ہیں:

ا۔ حاکمیت اعلیٰ کے اختیارات انسان کو نہیں بلکہ خدا اور اس کے قانون کو حاصل ہیں۔ انسان کی حیثیت خدا کے خلیفہ کی ہے اور اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ خدا کی ہدایت کے مطابق اپنے معاملات کو طے کرے، بنیادی قانون قرآن وسنت کا قانون ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اگر صدفی صد افراد خدا کے قانون کو بدلنا چاہیں تو بھی انہیں اس کا اختیار نہیں۔ ہاں اس قانون کے تحت معاملات کو طے کرنے کا حق ان کو حاصل ہے، یا جن امور میں یہ قانون خاموش ہے ان میں عوام اور ان کے نمائندوں کو حق ہے کہ اسلام کی روح اور عام تعلیمات کو سامنے رکھ کر قانون سازی کریں۔ نیز جن امور میں صرف اجمالی وعمومی اور اصولی رہنمائی دی گئی ہے ان میں تفصیلات طے کریں۔ اس طرح جمہور کی قانون سازی کے اختیار مطلق کے مقابلے میں اسلام ان کے محدود اختیار کا تصور پیش کرتا ہے۔ اور اس باب میں وہ مغربی جمہوریت سے مختلف ہے۔ جہاں کوئی مستقل اور اعلیٰ تر قانون موجود نہیں۔ ہمارے پاس ایک مستقل ضابطہ ہے اور ہم اپنے معاملات اس کے مطابق ہی طے کرتے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسلام اسے بھی پسند نہیں کرتا۔ وہ جو طریقہ پیش کرتا ہے وہ یہ ہے:

۲۔ جمہوریت میں ہر لحظہ مخالفت اور پارٹی بازی کی جو فضا رہتی ہے

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى ط وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ص

ترجمہ: "نیکی اور تقویٰ کے معاملات میں تعاون کرو اور برائی اور گناہ کے امور میں ہرگز تعاون نہ کرو۔" (المائدہ۔۲)

وہ تمام گروہوں اور عناصر کے درمیان خیر خواہی اور تعاون کی فضا قائم کرنا چاہتا ہے اور اس طرح یہ نظام خود جمہوریت سے بھی بہتر اور اعلیٰ تر ہے۔

۳۔ اسلام اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ لوگ عہدوں کے حریص ہوں اور ان کے لیے اپنا سب کچھ لٹاتے پھریں۔ وہ چاہتا ہے کہ ذمہ داری کے مناصب ان لوگوں کے دیے جائیں جو ان کی طمع نہ رکھتے ہوں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

"بخدا ہم کسی ایسے شخص کو اپنی حکومت کے کسی عہدے پر مقرر نہیں کرتے جس نے اس کی درخواست کی ہو یا جو اس کا حریص ہو۔" (بخاری و مسلم)

"ہمارے نزدیک تم میں سب سے بڑا خائن وہ ہے جو خود حکومت کے کسی عہدہ و منصب کا طالب ہو۔" (ابوداؤد)

اس طرح اسلام ایک اخلاقی فضا بناتا ہے۔ نیز وہ عہدہ داروں اور ارباب امر کے لیے اخلاقی صفات بھی تجویز کرتا ہے جب کہ جمہوریت ان چیزوں کی کوئی فکر نہیں کرتی۔

۴۔ جمہوریت جغرافیائی قومیت کے ساتھ وابستہ ہوگئی ہے جب کہ اسلامی ریاست ایک اصولی اور نظریاتی ہے اور اس کا پیغام عالمگیر ہے۔

مندرجۂ بالا بحث سے ہمارے سامنے اسلامی ریاست کی دوسری خصوصیت یعنی اس کا شورائی اور جمہوری کردار آ جاتا ہے اور ہمیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ریاست اشتراکی سیاست اور مغربی طرز کی جمہوری ریاست سے کن باتوں میں مختلف ہے۔

۳۔ فلاحی ریاست:

اسلامی ریاست کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک فلاحی اور خادم خلق ریاست ہے۔ اسلام کی نگاہ میں حکومت کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ امن و امان قائم کرے اور ملکی دفاع کی خدمات انجام دے، بلکہ اس کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں حقیقی اور فطری مساوات قائم کرے، ان تمام رکاوٹوں کو دور کرے جو سعی و جہد کی مساوات کی راہ میں حائل ہیں اور اپنے تمام شہریوں کی، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، بنیادی ضروریات کی فراہمی کی ضمانت دے۔ اگر اسلامی ریاست کی حدود میں کہیں بھی فقر و فاقہ، غربت و افلاس ہے، ظلم و جور ہے، تو اس کا قلع قمع کرے اور اپنی تمام قوتیں ان انسانی مسائل کو حل کرنے کے لیے وقف کر دے۔ اسلامی ریاست کا محض ایک منفی تصور نہیں رکھتا۔ اس کی قائم کردہ ریاست ایک مثبت ریاست ہے جو قیام انصاف اور ادائیگی حقوق کے ایجابی کام انجام دیتی ہے۔

معاشی زندگی کے بارے میں اسلام نے یہ اصولی ہدایت دی ہے کہ اسلامی معاشرے اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ افلاس اور غربت کو مٹانے میں اس طرح سرگرم رہیں جس طرح کفر کی ظلمتوں کو دور کرنے میں ہوں۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ "فقر انسان کو کفر کی طرف لے جا سکتا ہے، اور آپ ﷺ نے دعا فرمائی کہ "اے اللہ! مجھے کفر و فقر دونوں سے محفوظ رکھ۔"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسلام ہر فرد میں معاشی جدوجہد کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور اسے دعوت دیتا ہے کہ اپنی محنت سے روزی حاصل کرے۔ محنت کی روزی اور پاک و طیب کمائی پر قرآن و حدیث میں غیر معمولی زور دیا گیا ہے۔

اسلام نے انفرادی ملکیت کا حق دیا ہے اور انفرادی سعی و جہد کے دروازے سب کے لیے کھول دیے ہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنے کا اہتمام بھی کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ تصور بھی پیدا کیا ہے کہ یہ ملکیت ایک امانت کی طرح ہے جسے جائز اور صحیح راستوں ہی پر صرف کرنے کا اختیار ہے۔ اگر غلط اور حرام طریقوں سے خرچ کیا جائے گا تو امانت میں خیانت ہوگی۔ فرد کا اختیار محدود ہے غیر محدود نہیں۔ نیز ہر شخص کی دولت میں اس کے اپنے حق کے علاوہ خدا اور اس کے بندوں کا حق بھی ہے۔ ضروری ہے کہ ہر شخص اپنی جائز ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ریاست اور دوسرے انسانوں کے حقوق کو بھی ادا کرے اور اپنے وسائل کو ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے صرف کرے۔ جو دولت کو جمع کرتے ہیں اور انسانی بہبود کے لیے اسے خرچ نہیں کرتے یا اس میں دوسروں کے حقوق نہیں نکالتے، ان کے لیے سخت ترین وعید آئی ہے۔ ہر صاحب نصاب مسلمان پر زکوۃ فرض کی گئی ہے اور اسکا مقصد یہ ہے کہ

توخذ من اغنیاء هم فترد علی فقراء هم

ترجمہ: ''ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے محتاجوں میں تقسیم کردی جائے گی۔''

پھر اسے محض ایک خیرات نہیں بلکہ ''حق'' قرار دیا گیا ہے۔

وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ

ترجمہ: ''ان کے مالوں میں حق ہے مدد مانگنے والے کے لیے اور رزق سے محروم رہ جانے والے کے لیے۔'' (الذاریات۔۱۹)

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً

ترجمہ: ''(اے نبی) ان کے مالوں سے صدقہ وصول کیجئے۔'' (التوبہ۔۱۰۳)

اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ ان تمام افراد کی کفالت کا بندوبست کرے جو مجبور ہوں، اپاہج ہوں، لاچار ہوں، یا زور سے محروم رہ گئے ہوں۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

من مات وعلیه دین ولم یترک وفاء فعلی قضاء ہ ومن ترک مالاً فلورثته (ابوداؤد)

ترجمہ: ''جو شخص مرجائے اور اس کے ذمہ قرض ہو اور وہ اسے ادا کرنے کے قابل مال نہ چھوڑے تو اس کا ادا کرنا میرے (اسلامی ریاست کے) ذمہ ہے اور جو مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔''

من ترک دیناً اوضیاعاً فلیأتنی فانا مولاہ. (ابوداؤد)

ترجمہ: ''جو شخص قرض چھوڑے یا ایسے پس ماندگان چھوڑے جن کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو وہ میرے پاس آئے۔ میں اس کا سرپرست ہوں۔''

من ترک مالاً فلورثته ومنترک کلا فالینا. (بخاری ومسلم)

ترجمہ: ''جو مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے اور جو ذمہ داریوں کا بار چھوڑ جائے تو وہ ہمارے (یعنی حکومت کے) ذمے ہے۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

امام ابو یوسف ''کتاب الخراج'' میں ایک جلیل القدر صحابی کی زبان سے یہ اصول بیان فرمائے ہیں کہ

''خدا کی قسم ہم نے اس سے انصاف نہیں کیا اگر جوانی میں اس سے فائدہ اٹھایا اور بڑھاپے میں اس کے حال پر چھوڑ دیا۔''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حیرہ کے غیر مسلموں سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں یہ صراحت یہ موجود تھا کہ جو شخص بوڑھا ہو جائے گا یا جو کسی آفت کا شکار ہو گا یا جو مفلس ہو جائے گا اس سے جزیہ وصول کرنے کی بجائے مسلمانوں کے بیت المال سے اس کی اور اس کے کنبے کی کفالت کی جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن قیم ان تمام آیات واحادیث وآثار کی روشنی میں علما کا یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ

''اور علماء نے کہا ہے کہ حکومت جس طرح اس شخص کی وارث ہوتی ہے جس نے کوئی وارث نہ چھوڑا ہو اسی طرح وہ اس کا قرض ادا کرنے کی بھی ذمہ دار ہے جب کہ وہ قرض کی ادائیگی کے لیے کوئی شے چھوڑے بغیر مرجائے۔ نیز وہ اس کی زندگی میں اس کی کفالت کے لیے بھی ذمہ دار ہو گی جب کہ کوئی اس کی کفالت کرنے والا نہ ہو۔''

علامہ ابن حزم یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ

''اور ہر بستی کے ارباب دولت کا فرض ہے کہ وہ فقرا اور غربا کی معاشی زندگی کے کفیل ہوں اور اگر مال فئے (بیت المال کی آمدنی) سے ان غربا کی معاشی کفالت پوری نہ ہوتی ہو تو سلطان (امیر) ان ارباب دولت کو اس کفالت کے لیے مجبور کر سکتا ہے اور ان کی زندگی کے اسباب کے لیے کم از کم یہ انتظام ضروری ہے کہ ان کی ضروری حاجات کے مطابق روٹی مہیا ہو، پہننے کے لیے گرمی اور سردی دونوں لحاظ سے لباس فراہم ہو اور رہنے کے لیے ایک ایسا مکان ہو جو ان کو بارش، گرمی، دھوپ اور سیلاب جیسے حوادث سے محفوظ رکھ سکے۔''

اسلامی ریاست کی یہ حیثیت محض نظری دلائل ہی سے ثابت نہیں ہے بلکہ قرن اول میں مسلمانوں نے اس نظام کو من وعن قائم کیا تھا اور دنیا کی پہلی فلاحی اور خادم خلق ریاست بنائی تھی۔ مشہور مورخ مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''اس بات کا سخت اہتمام کیا کہ ممالک محروسہ میں کوئی شخص فقر وفاقہ میں مبتلا نہ ہونے پائے۔ یہ عام حکم تھا اور اس کی ہمیشہ تعمیل ہوتی تھی کہ ملک میں جس قدر اپاہج، مفلوج وغیرہ ہوں سب کی تنخواہیں بیت المال سے مقرر کر دی جائیں۔ لاکھوں سے متجاوز آدمی فوجی دفتر میں داخل تھے جن کو گھر بیٹھے خوراک ملتی تھی۔ ایک آدمی کو مہینے بھر کی خوراک کے لیے دو جریب آٹا کافی ہوتا تھا۔ اس لیے ہر شخص کے لیے اسی قدر آٹا مقرر تھا غربا ومساکین کے لیے بلا تخصیص مذہب حکم تھا کہ بیت المال سے ان کے روزینے مقرر کر دیے جائیں۔''

یہ نظام اپنی معیاری شکل میں مسلمانوں نے قائم کیا۔ اور یہ چیز اسلامی ریاست کی تیسری خصوصیت کو متعین کرتی ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

یہاں بھی اسلامی ریاست دنیا کی دوسری ریاستوں سے بڑی مختلف ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام عوام کی کفالت کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا۔ اس کا اصول یہ ہے کہ

جو بڑھ کر خود اٹھا لے

ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

معاشی دوڑ میں جو پیچھے رہ جائے اس کے لیے کوئی سہارا نہیں۔ کشمکش حیات میں اس کے لیے مٹ جانا ہی مقدر ہے۔ سعی وجہد اور مواقع کی مساوات بھی اس نظام میں معدوم ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ امیر کے امیر تر ہونے کے امکانات تو ہر طرف موجود ہیں لیکن غریب کے لیے غربت کے چکر سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ اس نظام میں ظلم اور استحصال کے نت نئے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں اور غیر منصوبہ بند معاشی دوڑ پوری سوسائٹی کو عدم استحکام اور افراط و تفریط کے چکر میں گرفتار کر دیتی ہے۔ اسلامی ریاست ایک منصفانہ معاشی اصول پر عمل کرتی ہے اور وہ سب کو مساوی مواقع دینے کے ساتھ ساتھ ایک ہمہ گیر پیمانے پر گرتوں کو تھامنے کا کام بھی انجام دیتی ہے۔

یہ فلاحی ریاست اشتراکیت سے بھی مختلف ہے اس لیے کہ یہ کفالت کی ضمانت تو دیتی ہے لیکن آزادی اور انفرادیت کی قیمت وصول کر کے نہیں۔ کلی قومی ملکیت اسلام کے مزاج کے منافی ہے۔ وہ مالکانہ حقوق اور آزادی جہد دینے کے بعد توازن اور انصاف قائم کرتی ہے۔

نیز جدید طرز کی ایک مخلوط اور فلاحی ریاست سے بھی مختلف ہے کہ اس میں سماجی خدمات اور بنیادی کفالت ایک حق کے طور پر کی جاتی ہے محض سیاسی احتجاج کا منہ بند کرنے کے لیے نہیں۔ یہاں اس کا حصول مطالبات اور احتجاجات پر منحصر نہیں ہے بلکہ یہ ایک بنیادی اصول ہے جسے ہر قیمت پر اور ہر حال میں پورا کرنا ہے۔ یہ سارا کام جبر اور رسہ کشی کے ساتھ نہیں بلکہ دلی تعاون اور جذبۂ عبادت کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہاں صرف معیار زندگی ہی کو بلند نہیں کیا جاتا بلکہ معیار اخلاق کو بھی بلند کیا جاتا ہے۔ یہ ایک انقلابی تصور ہے جو موجودہ دور کے تمام معاشی تصورات سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور بہتر ہے اور اخلاقی اور دنیاوی دونوں حیثیتوں سے بہت اونچا ہے۔

۴۔ معلم اور راعی ریاست:

اسلامی ریاست کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے سپرد محض معاشی کفالت کی ذمہ داریاں ہی نہیں ہیں بلکہ اخلاقی تعلیم اور تہذیب و تمدن کی ترویج بھی اس کے ذمے ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ "میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔" وہ ریاست جو آپ ﷺ کی نیابت کرتی ہے اپنے شہریوں کی بالخصوص اور تمام انسانوں کی بالعموم تعلیم و تربیت کا بندوبست بھی کرتی ہے، اور پوری دنیا کے لیے حق کی شاہد اور اسلام کی علم بردار کی حیثیت رکھتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

طلب العلم فریضة علیٰ کل مسلم ومسلمة

ترجمہ: "علم کا حصول ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔"

آپ ﷺ نے اس فریضے کی بجا آوری کے لیے ہر ممکن سہولت فراہم کی۔ اس کام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ غزوۂ بدر میں کفار کے جو قیدی گرفتار ہوئے ان میں سے بعض تعلیم یافتہ قیدیوں کا فدیہ آپ ﷺ نے یہی قرار دیا کہ مسلمانوں کے کچھ بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ بعض لوگوں کے لیے آپ ﷺ نے دوسری قوموں کی زبانیں سیکھنے کا اہتمام کیا تاکہ بین الاقوامی معاملات کے سلسلے میں وہ حکومت کو اپنی خدمات سے فائدہ پہنچا سکیں۔ بالغ عوام میں تعلیم کو پھیلانے کے لیے آپ ﷺ مختلف مقامات پر وقتاً فوقتاً تعلیمی و تبلیغی وفود بھیجتے رہتے تھے مسجد نبوی کے باہر ایک چبوترہ تھا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جسے "صفہ" کہتے ہیں اور جو اسلام کا پہلا مدرسہ بنا۔ یہاں سے تربیت دے کر لوگوں کو پورے عرب میں تعلیم کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ مدینے سے باہر کے مسلمانوں کے لیے یہ قاعدہ تھا کہ ان میں سے ہر گروہ کے لوگ اپنے میں سے باصلاحیت افراد کو مدینہ بھیجتے جہاں وہ تعلیم حاصل کرتے اور واپس جا کر اپنے اپنے علاقے میں تعلیم پھیلاتے۔ باہر سے جو وفود آپ ﷺ کے پاس آتے آپ ﷺ ان میں سے ذہین اور ذی صلاحیت لوگوں کو ان کی قوم کی تعلیم پر مقرر کرتے۔ جن لوگوں کو سرکاری عہدوں پر مقرر فرماتے ان کو علم پھیلانے کی ہدایت دیتے۔ مثلاً جب آپ ﷺ نے عمرو بن حزم کو یمن کا گورنر بنایا تو سب سے پہلے یہ ہدایت دی کہ

"وہ حق پر قائم رہیں جیسا کہ اللہ نے حکم دیا ہے، اور لوگوں کو بھلائی کی خوش خبری اور بھلائی کا حکم دیں۔ اور لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں اور ان میں اس کی سمجھ پیدا کریں اور لوگوں کو ناپاکی کی حالت میں قرآن کو ہاتھ لگانے سے روکیں اور لوگوں کی دل داری کریں یہاں تک کہ لوگ دین کا فہم پیدا کرنے کی طرف مائل ہو جائیں۔"

تعلیم کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت کو بڑھانے کے لیے سوسائٹی کے ہر شعبے میں شرف و اعزاز کا معیار علم کو قرار دیا گیا اور مسجد کی امامت سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ داروں تک کے تقرر میں جس چیز کو سب سے پہلے دیکھا جاتا تھا وہ قرآن و حدیث کا علم ہے۔ پوری اسلامی قلم رو میں بے شمار افراد کو اس کام پر مقرر کر دیا گیا تھا کہ لوگوں میں پھیل جائیں اور ان کی تعلیم کا کام انجام دیں۔ اور یہ اسی تعلیم کا فیض تھا کہ ایک طرف دین کا علم شہر شہر قریہ قریہ، محلہ محلہ اور گوشے گوشے میں پہنچ گیا اور دوسری طرف اسلامی ریاست کو ہر موقع پر ایسے باصلاحیت اور سمجھ دار کارکن میسر آئیں گے جو زندگی کے ہر شعبے کی قیادت کر سکیں۔

مسلمانوں کی پوری تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱۔ تعلیم کو ہمیشہ غیر معمولی اہمیت دی گئی اور حکومت اور اہل ثروت نے اس کیلئے کھول کر سرپرستی کی۔ یہ ریاست کی ذمہ داری تھی کہ تمام شہریوں کے لیے ضروری اور بنیادی تعلیم کا انتظام کرے۔

۲۔ تعلیم کے نظام میں اولین اہمیت علوم دین کو دی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ ان تمام علوم کی ترویج کی گئی جو دفاع دین اور قیام حیات کے لیے ضروری ہیں۔ نیز فضول اور لغو مضامین سے اجتناب کی کوشش کی گئی۔

۳۔ تعلیم ہر دور میں مفت رہی۔ مسلمانوں نے ایک دن کے لیے بھی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کو بھی فیس کے ساتھ وابستہ نہیں کیا۔ علم اور اونچے سے اونچے درجے کے علم کے دروازے ہر شخص کے لیے کھلے رہے۔

۴۔ تعلیم کے ساتھ کردار سازی اور اخلاقی تربیت ایک جزو لاینفک کی طرح موجود رہی۔

پھر یہ ریاست صرف اپنے شہریوں ہی کی تعلیم کا بندوبست کر کے مطمئن نہیں ہو جاتی بلکہ پوری دنیا کے سامنے اسلام کی دعوت کو اپنے قول و عمل اور مثال سے پیش کرتی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط

ترجمہ: "تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے میدان میں لائی گئی ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

(آل عمران۔۱۱۰)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اور امت کا یہ فرض مقرر کیا گیا ہے کہ

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط

ترجمہ: "تم کو ایسی امت بنا چاہیے جو بھلائی کی طرف دعوت دے، نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکے۔"
(آل عمران۔۱۰۴)

اور اس امت کے ذمے شہادت حق کا وہی فریضہ عائد ہوا ہے جو خود رسول اللہ ﷺ کے سپرد تھا:

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ صلے ج

ترجمہ: "تاکہ پیغمبر تمہارے بارے میں شاہد ہوں اور تم تمام انسانوں کے سامنے حق کے گواہ بنو۔" (الحج۔۷۸)

یہ بحث اسلامی ریاست کی ایک بنیادی خصوصیت پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ ریاست ایک معلم کی طرح ہے اسے اپنے تمام شہریوں کی تعلیم و تربیت کا بندوبست بھی کرنا ہے اور دنیا کے سامنے اسلام کی دعوت کو پیش بھی کرنا ہے۔ اس طرح یہ ریاست ایک طرف لوگوں کے معیار علم و اخلاق کو بلند کرتی ہے اور دوسری طرف ایک عالم گیر پیغام کی داعی ہے۔ یہ قومیت کے کسی تنگ نقطۂ نظر سے وابستہ نہیں اس کی دعوت تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اس پہلو سے یہ ریاست بالکل منفرد ہے۔

اسلامی تصور قومیت

اسلامی ریاست کی بنیادی خصوصیات کے اس مطالعے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً اسلام کے تصور قومیت پر بھی گفتگو کر لی جائے۔

مدنی اور اجتماعی زندگی کا ایک بنیادی تقاضا ہے کہ انسانوں کے درمیان اشتراک اور تعاون ہو۔ قوم سے مراد انسانوں کا وہ گروہ ہے جس میں اجتماعی وحدت پائی جاتی ہو اور جو ساتھ رہنے کا جذبہ رکھتا ہو۔ اشتراک اور اتحاد کے اس احساس کا نام قومیت ہے۔ یہ احساس ایک عصبیت پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں اپنی قوم کے افراد سے محبت اور ان افراد سے غیریت پیدا ہوتی ہے جو اس دائرے سے باہر ہوں۔ اس طرح قومی مفاد کا جذبہ رونما ہوتا ہے جو اگر تیز تر ہو جائے تو انسان سے کہلوا دیتا ہے کہ "میری قوم! خواہ حق پر ہو یا ناحق پر!"

اس وحدت و اشتراک کو پیدا کرنے والے عوامل بہت سے رہے ہیں ان میں سے اہم یہ ہیں:

نسل (Ethnicity):

یعنی ایک خاص نسل سے وابستہ ہونا۔ یہ "نسلیت" کو پیدا کرتا ہے۔ دور جدید میں صیہونیت اور نازی ازم اس کی مثالیں ہیں۔

رنگ (Color):

یعنی ایک خاص رنگ کے لوگ اپنے کو ایک قوم سمجھیں اور دوسرے رنگ کے لوگوں کو اپنی قوم میں شامل نہ ہونے دیں۔ افریقہ کا نسلی امتیاز اسی تصور پر مبنی ہے۔ یہی صورت امریکہ میں بھی ہے، خصوصیت سے جنوبی ریاستوں میں۔

زبان (Language):

زبان فکری وحدت پیدا کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے اور قومیت کی تشکیل میں ایک اہم قوت بن جاتی ہے۔ عرب قومیت کی بنیاد زبان ہی پر ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

معاشی اغراض اور نظام حکومت (Economic motives):

ایک ہی معاشی نظام یا ایک ہی سلطنت سے وابستگی بھی قومیت کا جذبہ پیدا کرنے والے عوامل رہے ہیں۔

وطن:

یعنی ایک خاص خطۂ زمین پر آباد ہونا۔ یہ وطنیت ہے اور اس وقت سب سے زیادہ چلن اسی کا ہے۔

یہ وہ بنیادی عوامل ہیں جو انسانی تاریخ میں آج تک قومیت کی تشکیل کرتے رہے ہیں۔ اسلام کا نقطۂ نظر اس باب میں یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی کلی طور پر قومیت کی بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا اور یہ سب مل کر بھی انسان کی حقیقی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے۔

نسل، رنگ، زبان یا وطن کو قومیت کی اساس بنانا غیر عقلی اور غیر فطری ہے۔ محض کسی نسل سے وابستہ ہونا انسانی اتحاد کے لیے کافی نہیں۔ خون کے رشتے کی ایک اہمیت ہے لیکن چند نسلوں کے بعد یہ رشتہ کمزور اور غیر موثر ہوتا جاتا ہے۔ پھر کون اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ کسی خاص گروہ کی رگوں میں خاص اسی نسل کا خون گردش کر رہا ہے اور کوئی دوسرا میل اس میں نہیں ہوا۔ پھر اگر نسل ہی کو لینا ہے تو اس حقیقت کو کیوں نہ ملحوظ رکھا جائے کہ تمام نسل انسانی ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہے۔ اسلام رشتۂ رحم کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا، قطع رحم کو منع کرتا ہے اور خاندان اور کنبہ کے حقوق متعین کرتا ہے لیکن اور سیاسی مرکزیت کے لیے اسے ایک بنیادی عامل تسلیم نہیں کرتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد، اور حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا دین و عقیدہ کے اختلاف کی وجہ سے اس قومیت کا جزو نہ بن سکے جس کی دعوت انبیا علیہم السلام دیتے رہے ہیں۔

رنگ کی بنیاد پر تفریق ایک سراسر غیر عقلی، غیر فطری اور غیر منصفانہ فعل ہے۔ اسی لیے حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں'' اور فرمایا کہ ''اگر ایک حبشی غلام بھی تم پر حاکم مقرر کیا جائے تو اس کی اطاعت کرو۔''

زبان و ادب قومی یک جہتی کو مضبوط کرنے میں بڑا حصہ ادا کرتے ہیں لیکن یہ بھی قومیت کی بنیاد نہیں بن سکتے۔ زبان کے اشتراک سے زیادہ ضروری چیز افکار، نظریات، عقائد اور جذبات کا اشتراک ہے جن کے اظہار کا ایک ذریعہ زبان ہے۔ اسلام کی نگاہ میں اصل چیز صحت فکر اور پاکیزگی بیان ہے، محض ایک خاص زبان و ادب کی پوجا نہیں۔ یہی حال معاشی اغراض اور سیاسی قسمت کے اشتراک کا ہے۔ یہ اپنا کوئی مستقل اور پائیدار وجود نہیں رکھتیں اور ایک پائیدار اتحاد کی بنیاد نہیں بن سکتیں۔

آخری چیز وطن کا اشتراک ہے اور بلاشبہ وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ لیکن سوچنے کی چیز یہ ہے کہ کیا محض وطن انسانی معاشرے میں قومیت کی بنیاد بن سکتا ہے؟ وطن کی اصل یہ ہے کہ ایک شخص ایک خاص علاقے میں پیدا ہوا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو جس زمین پر ایک شخص پیدا ہوتا ہے وہ ایک یا دو مربع گز سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اگر اس ایک یا دو مربع گز کو وسیع کر کے ایک ملک کی حدود تک لایا جا سکتا ہے تو آخر پوری دنیا تک اس کو وسیع کیوں نہیں کیا جا سکتا؟

وطن سے ایک حد تک لگاؤ فطری ہے اور اسلام اس کو نہیں مٹاتا لیکن زندگی کی بنیادی وفاداری اور اتحاد کی اصل بنیاد وطن کے بجائے اصول اور نظریہ، مسلک اور دین کو قرار دیتا ہے، جس کی خاطر اگر ضرورت پیش آ جائے تو وطن سے ہجرت کو بھی ضروری سمجھتا ہے۔ اقبال نے بہت صحیح کہا کہ ہجرت نبوی کے نتیجے میں اسلامی ریاست کا قیام وطنی قومیت کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔

یہ تمام عوامل قومیت کے لیے کوئی عقلی اور اصولی بنیاد فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جس قسم کی قومیت کی تشکیل کرتے ہیں وہ غیر فطری ہے، اس میں تنگ نظری اور تعصب پایا جاتا ہے اور انسانوں کے معاملات پر خاص انسانی اور اصولی نقطۂ نظر سے، حق و باطل کے اصولوں کی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

روشنی میں ظہور ہوہی نہیں سکتا۔ وہ دراصل انسانوں کو جوڑنے کے بجائے باہمی اور ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں، غلط عصبیتوں کو جنم دیتی ہیں اور انسانیت کو تباہیوں کی طرف دھکیلتی ہیں۔

اسلام ان کے مقابلے میں ایک انقلابی پیغام دیتا ہے۔ وہ تمام انسانوں کو برابر سمجھتا ہے اور اپنی قومیت کی بنیاد خود اسلام پر رکھتا ہے جو ایک عالم گیر نظریہ ہے۔ ہر وہ شخص جو اس دین کو قبول کرے ملت اسلامیہ کا جزو بن جاتا ہے اور جو اس کا باغی ہو وہ ملت کفر میں چلا جاتا ہے۔ اقبال نے صحیح کہا ہے:

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک ونسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

اسلام نے رنگ، نسل، وطن، زبان، معیشت وسیاست کی غیر عقلی تفریقوں کو اٹھا دیا اور خاص عقلی بنیادوں پر ایک نئی قومیت کی تعمیر کی۔ اس قومیت کی بنا بھی امتیاز پر تھی مگر مادی اور ارضی امتیاز پر نہیں بلکہ روحانی اور جوہری امتیاز پر۔ اس نے انسان کے سامنے ایک فطری صداقت پیش کی جس کا نام "اسلام" ہے۔ اس نے خدا کی بندگی واطاعت، نفس کی پاکیزگی وطہارت، عمل کی نیکی اور پرہیزگاری کی طرف ساری نوع انسانی کو دعوت دی۔ پھر کہہ دیا کہ جو اس دعوت کو قبول کرے وہ ایک قوم سے ہے اور جو اس کو رد کر دے وہ دوسری قوم سے ہے۔ ان دونوں قوموں کے درمیان بنائے امتیاز نسل اور نسب نہیں اعتقاد اور عمل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک باپ کے دو بیٹے اسلام اور کفر کی تفریق میں جدا جدا ہو جائیں اور دو بالکل اجنبی آدمی اسلام میں متحد ہونے کی وجہ سے ایک قومیت میں مشترک ہو جائیں۔ وطن کا اختلاف بھی ان دونوں قوموں کے درمیان وجہ امتیاز نہیں ہے۔ یہاں امتیاز حق اور باطل کی بناء پر ہے جس کا کوئی وطن نہیں۔ ممکن ہے کہ ایک شہر، ایک محلہ، ایک گھر کے دو آدمیوں کی قومیتیں اسلام اور کفر کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہو جائیں اور ایک حبشی رشتہ، اسلام میں مشترک ہونے کی وجہ سے ایک مراکشی کا قومی بھائی بن جائے۔

رنگ کا اختلاف بھی یہاں قومی تفریق کا سبب نہیں۔ یہاں اعتبار چہرے کے رنگ کا نہیں، اللہ کے رنگ کا ہے اور وہی بہترین رنگ ہے:

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫

ترجمہ: "اللہ کا رنگ (اختیار کرو) اور اللہ کے رنگ سے بہتر اور کس کا رنگ ہوسکتا ہے۔" (البقرہ۔ ۱۳۸)

ہوسکتا ہے کہ اسلام کے اعتبار سے ایک گورے اور ایک کالے کی ایک قوم ہو اور کفر کے اعتبار سے دو گوروں کی دو الگ قومیں ہیں۔

زبان کا امتیاز بھی اسلام اور کفر میں وجہ اختلاف نہیں ہے، یہاں منہ کی زبان نہیں محض دل کی زبان کا اعتبار ہے جو ساری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اس کے اعتبار سے عربی اور افریقی کی ایک زبان ہوسکتی ہے اور دو عربوں کی زبانیں مختلف ہوسکتی ہیں۔

معاشی اور سیاسی نظاموں کا اختلاف بھی اسلام اور کفر کے اختلاف میں سے نہیں ہے۔ یہاں جھگڑا دولت زر کا نہیں دولت ایمان کا ہے، انسانی سلطنت کا نہیں خدا کی بادشاہت کا ہے۔ جو لوگ حکومت الٰہی کے وفادار ہیں اور جو خدا کے ہاتھ پر اپنی جانیں فروخت کر چکے ہیں وہ سب ایک قوم ہیں خواہ کہیں رہتے ہوں او جو خدا کی حکومت کے باغی ہیں وہ ایک دوسری قوم ہیں خواہ کسی سلطنت کی رعایا ہوں۔

اس طرح اسلام نے قومیت کا جو دائرہ کھینچا ہے وہ کوئی حسی اور مادی دائرہ نہیں بلکہ ایک خالص عقلی دائرہ ہے۔ اس دائرے کا محیط ایک کلمہ ہے۔ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ اسی کلمہ پر دوستی بھی ہے اور دشمنی بھی، اسی کا اقرار جمع کرتا ہے اور اسی کا انکار جدا کرتا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اس بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام میں ملت اسلامیہ کی وحدت ایک بنیادی اصول ہے اور اگر حالات کی مجبوری کی وجہ سے ملت بہت سے ممالک میں بٹی ہوئی ہو تب بھی ہر ملک کو خالص وطنی قومیت کے مقابلے میں اسلام کی نظریاتی قومیت کو بنیاد بنانا چاہیے اور آہستہ آہستہ اتحاد اسلامی یا مسلمانوں کی دولت مشترک کو قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس طرح یہ ممکن ہے کہ بہت سی ریاستیں اسلام کی بنیاد پر قائم ہوں اور اپنے اپنے دائرے میں اس انقلابی دین کو قائم کرنے کی کوشش کریں۔

خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول

ایک اہم سوال پر بحث کی مزید ضرورت ہے یعنی وہ ملک جو اسلامی نظریے کو لے کر اٹھے اس کی خارجہ پالیسی کے اصول کیا ہوں؟ ملت اور ریاست کے تعلقات دوسرے ممالک اور اقوام سے کن بنیادوں پر استوار ہوں؟ ذیل میں ہم ان اصولوں کی مختصر تشریح کرتے ہیں:

(۱) اس سلسلے میں سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ ملت اسلامیہ اور اسلامی ریاست کی حیثیت پوری دنیا کے سامنے خدا کی شریعت کے علم بردار اور اس کے پیغام کے داعی کی ہے۔ قرآن اس کو ''امت وسط'' کہتا ہے اور اس کے منصب کو ''شہادت حق'' سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی یہ وہ امت ہے جو خدا کی طرف سے پوری انسانیت پر گواہ بنائی گئی ہے، جو اپنے قول وعمل اور پالیسی اور پروگرام کے ذریعے سے خدا کے دین کی شہادت دیتی ہے۔

اس لیے ''اسلام'' میں ''سیاست خارجہ'' کا پہلا اصول یہ قرار پاتا ہے کہ یہ اسلام کی مبلغ اور حق کی شہادت دینے والی ہے اور یہ کوئی ایسا رویہ اختیار نہیں کر سکتی جو کسی طرح اس کی حیثیت کو مجروح کرنے والا ہو۔

(۲) وطن کی محبت اور اس کے مفاد کا تحفظ اس کی دوسری بنیاد ہے۔ وطن کی محبت سے مراد یہ ہے کہ ملک اور اس کے بسنے والوں کی حقیقی خیر خواہی، ان کے مفاد کا تحفظ، ان کے حقوق کے لیے جدوجہد اس کے اولین فرائض میں سے ہوں گے۔ اسلام وطن سے سچی محبت کو ایمان کے ثمرات میں سے سمجھتا ہے۔ لیکن یہاں اسلام کے نقطۂ نظر میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ اسلام ''میرا ملک! حق یا ناحق!'' کے اصول کو صحیح نہیں سمجھتا، بلکہ وہ حق کی صورت میں ہر ممکن تعاون اور جدوجہد، اور ناحق کی صورت میں مخالفت اور درست کرنے کی کوشش فرض کرتا ہے۔

مثلاً، ایک مرتبہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا ''یارسول اللہ! جب وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد سمجھ میں آتی ہے، لیکن اگر وہ ظالم ہو تو پھر اس کی مدد کیسے کی جا سکتی ہے؟'' حضور اکرم ﷺ نے جواب دیا ''اس کی مدد اس طرح کرو کہ اس کو ظلم سے روک دو۔'' بس یہی اصول اسلام خود قومی پالیسی کے لیے بھی تجویز کرتا ہے۔

(۳) اسلام کی سیاست خارجہ کا یہ بھی ایک اہم پہلو ہے کہ وہ پوری امت مسلمہ کی وحدت کا داعی ہے، اور ریاست کو ایسی تدابیر اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے جو تمام مسلمانوں کو جوڑنے والی اور ان میں تعاون اور بھائی چارہ قائم کرنے والی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی بہت سی ریاستیں ہوں لیکن ان کو اپنی ایسی ''دولت مشترکہ'' بنانی چاہیے جو ہر حیثیت سے ان کو ایک دوسرے کا معاون و مددگار بنا دے۔ قرآن میں ہے:

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ؕ

ترجمہ: ''اور دیکھو! یہ تمہاری امت فی الحقیقت ایک ہی امت ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں پس تقویٰ اختیار کرو۔''
(المومنون۔۵۲)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص

ترجمہ: ''سب مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامو اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاؤ۔'' (آل عمران۔۱۰۳)

پھر اس کا تقاضا صرف یہی نہیں ہے کہ مسلمانوں میں عام تعاون ہو بلکہ سیاست خارجہ کا ایک خاص مقصد پورے عالم اسلام کی سیاسی آزادی ہے۔ مسلمان آزاد بنے اور صرف خدا کی غلامی کے لیے پیدا ہوا ہے اور اگر دنیا کے سینے پر ایک مسلمان بھی غیر اللہ کی غلامی میں گرفتار ہے تو سارے مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ اس کو طاغوتی نظام سے آزاد کرائیں۔ اسلامی فقہ کا ایک مسئلہ ہے کہ ''اگر ایک مسلمان عورت مشرق میں قید ہو تو اہل مغرب پر فرض ہے کہ اس کا فدیہ دے کر چھڑائیں۔ خواہ اس سلسلے میں تمام مسلمانوں کا مال ہی کیوں نہ دینا پڑے۔'' ظاہر ہے اگر ایک عورت کو غلامی اور قید سے چھڑانے کے لیے یہ مسئلہ ہے تو پورے اسلامی ممالک کو اغیار کی غلامی اور مشرق و مغرب کے استعماروں سے آزاد کرانے کے لیے ہمارا مسلک کیا ہو سکتا ہے؟

(۴) اسلام فتنہ اور فساد کو ختم کرنے اور امن قائم کرنے کے لیے آیا ہے۔ اور اس کی خارجہ پالیسی کا مقصد امن عالم کا قیام ہوگا۔ قرآن انسانی خون کے بہانے کو گناہ عظیم قرار دیتا ہے الا یہ کہ حق کے ساتھ ہو:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا ط بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْفَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ط وَمَنْ اَحْیَاهَا فَکَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ط

ترجمہ: ''جس نے سوائے اس کے قصاص لینا ہو یا ملک میں فساد پھیلانے والوں کو سزا دینی ہو، کسی انسان کو قتل کیا تو اس نے گویا تمام انسانوں کا خون کیا اور جس کسی نے کسی کی جان بچائی گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی دے دی۔'' (المائدہ۔۳۲)

پیغمبر قرآن ہر قسم کی زیادتی کی مخالفت کرتا ہے:

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ط

ترجمہ: ''اور دیکھو ایسا نہ ہو کہ ایک گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات پر ابھار دے کہ راہ انصاف سے ہٹ جاؤ۔'' (المائدہ۔۸)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا مقصد امن قائم کرنا اور انسانی زندگی کو سکون کی دولت سے مالا مال کرنا ہے لیکن اسلام نے صرف اتنی بات کہہ کر معاملے کو ختم نہیں کر دیا ہے ورنہ اس میں کوئی فرق نہ رہتا۔ اسلام نے ان اسباب کو دور کرنے کی بھی کوشش کی ہے جو امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں اس لیے کہا گیا ہے کہ طاغوت کی قوت کو ختم کرو اور زمین سے فتنے کا بالکل مٹا دو۔ تب ہی حقیقی امن قائم ہو سکتا ہے:

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ ط فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ط

ترجمہ: ''اور ان سے اس وقت تک لڑتے رہو جب تک فتنہ و فساد ختم نہ ہو جائے اور دین اللہ کے لیے خالص نہ ہو جائے۔ اگر وہ فساد سے باز آجائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی نہیں کرنا چاہیے۔'' (البقرہ۔۱۹۳)

اس طرح اسلام ان اسباب کو بھی دور کرتا ہے جو امن کو تہ و بالا کرنے والے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

(۵) اسلام جغرافیائی حدود کو انسانیت کو مستقل طور پر بانٹنے والی حدود نہیں مانتا۔ وہ ایک عالمی انسانی برادری قائم کرنا چاہتا ہے جو ایک قانون کے تابع اور ایک مرکز سے وابستہ ہو۔ اور جس میں انسانوں کو گروہوں میں تقسیم کرنے والی چیز نسل، رنگ، زبان اور وطنی حدود نہ ہوں بلکہ پوری انسانیت ایک خاندان بن جائے اور اگر کسی بنیاد پر ان میں فرق ہو تو وہ ایمان اور تقوئی ہوں، اور یہ ایسی چیزیں ہیں جو کسی قوم، رنگ یا نسل سے وابستہ نہیں بلکہ پوری انسانیت ان کے سلسلے میں برابر ہے۔ ہر شخص انہیں حاصل کر سکتا ہے۔

حدیث میں پوری انسانیت کو ''عیال اللہ'' کہا گیا ہے:

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ (بیہقی)

ترجمہ: ''ساری مخلوق عیال اللہ ہے اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس سے کرتا ہے جو عیال اللہ کو سب سے زیادہ محبوب رکھتا ہے۔''

اس طرح اسلام پوری عالمی انسانی برادری کی تنظیم کا مدعی ہے۔

(۶) عہد و پیمان کی پابندی بھی اسلام کی بین الاقوامی پالیسی کا ایک اصول ہے۔ اور اسلام اس پر سختی سے عمل کا حکم دیتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ط

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اپنے معاہدے پورے کرو۔'' (المائدہ۔۱)

صرف اس صورت میں معاہدہ توڑا جا سکتا ہے جب دوسرا فریق اس کی خلاف ورزی کرے، اس صورت میں قرآنی تعلیم یہ ہے کہ معاہدہ خلاف ورزی کرنے والے فریق کے منہ پر دے مارو، جس سے ظاہر ہے علانیہ بے تعلقی کا اعلان ہو جائے گا:

فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ط

ترجمہ: ''پس ان سے ان کا عہد ان کے وعدہ تک پورا کر دو۔'' (التوبہ۔۴)

(۷) بین الاقوامی تعلقات میں اسلام بدلہ لینے کو جائز قرار دیتا ہے لیکن یہ لازم کر دیتا ہے کہ بدلہ اتنا ہی لیا جائے جتنا حق ہے اور ذرا بھی زیادتی نہ کی جائے۔ نیز اگر درگزر اور حسن سلوک کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ خوب تر ہے:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا

ترجمہ: ''برائی کا بدلہ تو بس اس کے برابر برائی ہی ہو سکتا ہے۔'' (الشوریٰ۔۴۰)

اسلام کا معاشی نظام

آج کی دنیا میں معاشیات کی اہمیت نا قابل انکار ہے۔ یہ اہمیت صرف اس احساس کی پیداوار نہیں ہے کہ ایک فرد کے لیے معاشی آزادی کے بغیر سیاسی اور معاشرتی آزادی بے معنی ہو جاتی ہے، معاشرے کے لیے معاشی انصاف کے بغیر سکون، سلامتی اور یک جہتی کا حصول ناممکن رہتا ہے اور قوموں کے لیے معاشی استحکام کے بغیر سیاسی آزادی کو بھی برقرار رکھنا محال ہو جاتا ہے، بلکہ انسان اس حقیقت کے شعور پر بھی بے چین اور مضطرب ہے کہ دنیا میں دولت کی فراوانی، وسائل پیداوار خیر العقول ترقی اور بے مثال معاشی ارتقا کے باوجود غربت، افلاس، بے روزگاری اور معاشی اور معاشرتی ظلم کو دور دورہ ہے۔ آج بھی انسانی آبادی کا ساٹھ فیصدی حصہ نان شبینہ کا محتاج ہے۔ افلاس و نکبت اس کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اس کے پاس نہ پیٹ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

بھرنے کو روٹی ہے نہ بدن چھپانے کو لباس، اور نہ سر ڈھانپنے کو معقول مسکن! ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اور تمام ترقی کے باوجود ہم مجموعی خوش حالی سے کیوں محروم ہیں؟ معاشی ترقی حقیقی انسان فوز وفلاح کا باعث کیوں نہیں ہوئی؟ جب ہم ان مسائل پر غور کرتے ہیں تو ہمیں لازماً معاشی نظام کے مسئلے پر اور ان اصولوں پر، جن کی بنیاد پر معاشی زندگی کو مرتب کیا جاتا ہے، غور کرنا پڑتا ہے۔ یہ مسئلہ ہمیں بہ حیثیت ایک ملک کے درپیش ہے، مسلمانوں کو پوری دنیا میں بہ حیثیت ایک ملت کے بھی اس سے سابقہ ہے اور پھر پوری انسانیت بھی اس مسئلے سے دوچار ہے۔ اس لیے ہم مسلمان دنیا کی، جو معاشی اعتبار سے پس ماندہ ہے، مثال کو سامنے رکھ کر پہلے تو نوعیت مسئلہ کو واضح کریں گے اور پھر اسلام کے اصولوں پر گفتگو کریں گے۔

اصل مسئلہ

یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ آج کے انسان کا اصل مسئلہ محض صنعتی ترقی کا حصول یا پیداوار میں اضافہ ہے۔ بلاشبہ صنعتی ترقی اور معاشی پیداوار میں اضافہ بڑی ضروری چیزیں ہیں لیکن ان سے بھی زیادہ ضروری مسئلہ پورے معاشی نظام کا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ خود معاشی ترقی کا انحصار بھی اس مجموعی نظام پر ہے جس کی آغوش میں یہ پروان چڑھتی ہے۔ نظام سے ہٹ کر ترقی کا کوئی تصور مشکل ہے۔

معاشی خوش حالی کا تصور:

معاشی ترقی اور خوش حالی کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ محض پیداوار میں اضافہ ہو جائے۔ معاشی خوش حالی کا اصل مفہوم ایک بہتر اور خوش حال معاشرے کی تشکیل وتعمیر ہے۔ پروفیسر ڈی-اے-ڈیمنٹ کے الفاظ میں ''صنعتی ترقی اسی معاشرے کی خوش حالی کا باعث بن سکتی ہے جس کی زرعی بنیادیں مستحکم ہوں، بنیادی اور گھریلو حرفت مضبوط ہو اور جس میں روحانی قوت پائی جاتی ہو۔ اس کے باوجود ایک خاص مرحلے سے آگے بڑھ کر خوش حالی کی رو ماند پڑ جاتی ہے، افراد کے فطری تعلقات میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے اور معیار زندگی بڑھنے کے بجائے گھٹنے لگتا ہے۔'' ایک صحت مند نظام کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ معاشی سرگرمیوں کو مناسب حدود اور تعمیری انداز میں روبہ عمل آنے کا موقع دے لیکن اس امر پر بھی نگاہ رکھے کہ یہ سرگرمیاں زندگی کے اعلیٰ مقاصد اور اقدار کے لیے نقصان دہ نہ بننے پائیں۔

یہ بات ہمیشہ سامنے رہنی چاہیے کہ ''حقیقی معاشی ترقی ایک ایسا ہمہ پہلو، انفرادی اور سماجی عمل ہے جس کے تحت افراد کے رویے اور اعتقادات اس طور پر نئے سانچوں میں ڈھالے جاتے ہیں کہ وہ اپنی روزمرہ کی کثیر تعداد سرگرمیوں میں بھی ایک نئی آزادی محسوس کرنے لگتے ہیں اور ان میں سے کئی سرگرمیاں ایسی ہوتی ہیں جنہیں کسی بھی معاشی یا مالی اصطلاح سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا ہے۔'' اور نہ ہی انہیں پیداوار کے اعداد وشمار سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ پس ہمارا اصل کام یہ نہیں ہے کہ ہم چند جزوی اور نامکمل تبدیلیاں عمل میں لے آئیں؛ ہمارا اصل کام پورے نظام کی اصلاح وتبدیلی ہے۔ اس مسئلے کے بارے میں ہمارا رویہ حقیقت پسندانہ، انقلابی اور تخلیقی ہونا چاہیے۔ اور اسی طرح ہم کامیاب بھی ہو سکتے ہیں۔ ای-ڈی-ڈومر کے الفاظ میں ''معاشی ترقی کا انحصار معاشرے کی روح پر ہوتا ہے اور ترقی کے کسی بھی تشریحی نظریے کو اپنے اندر معاشے کے طبعی ماحول، سیاسی ڈھانچے، ترغیبات، تعلیمی نظام اور قانونی نظام کو جگہ دینی چاہیے نیز اس کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس معاشرے کے افراد کا سائنس، معاشرتی تبدیلیوں اور ارتکاز دولت کے بارے میں رویہ کیا ہے؟''

یہ سمجھنا کسی پہلو سے بھی دانش مندانہ نہیں ہے کہ ہمارا اصل مسئلہ محض صنعتی ترقی یا اس طرح کی کوئی اور چیز ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایسی معاشی ترقی حاصل کی جائے جو صحیح سمت میں ہو تیز رفتار ہو، صحیح طریقوں سے حاصل کی جائے اور صحیح نتائج بھی نکالے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ پورے نظام میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں نہ لائی جائیں، سامراجی دور کے فرسودہ معاشرتی اور اخلاقی تصورات کے مقابلے میں صحت مند

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تصورات ملک کے سامنے نہ رکھے جائیں، معاشی پالیسیوں کو بنیادی انسانی اقدار کی اساس پر استوار نہ کیا جائے، آجر اور مستاجر، محنت اور سرمائے اور زمین دار اور کاشت کار کے درمیان ان اقدار کی روشنی میں از سر تعلقات قائم نہ کیے جائیں جو ہمارے بنیادی نظریۂ حیات کا عطیہ ہیں۔ مندرجہ بالا تجربے سے جو نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

(الف) معاشی ترقی صرف بہتر معاشی نظام ہی میں ممکن ہے۔

(ب) پس ماندہ مسالک کا موجودہ نظام ناقص ہے اور ترقی کا باعث بننے کے بجائے ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اس لیے جب تک اسے تبدیل نہ کیا جائے حقیقی معاشی ترقی کی توقع عبث ہے۔

(ج) اس طرح ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس معاشی نظام کو تبدیل کر کے ایک ایسے نظام کی بنا ڈالیں جو ہماری ضروریات کو پورا کر سکے اور جو ہمارے تمدن، ہماری اقدار حیات اور ہمارے نظریۂ زندگی کے مطابق ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ نیا نظام کیسا ہو؟ ہماری یہ ضرورت اسلامی نظام معیشت ہی پوری کر سکتا ہے اور ہم آئندہ صفحات میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔ اور یہ بتائیں گے کہ اسلام نے معاشی زندگی کی ترتیب و تہذیب کے لیے کیا اصول دیے ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ ان اصولوں کو عام فہم انداز میں بیان کریں۔ ان کو معاشیات کی اصطلاحی زبان میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے لیکن عام قارئین کی سہولت کے لیے اصطلاحی زبان کے مقابلے میں عام انداز اختیار کیا گیا ہے۔

اسلام کے معاشی اصول

اسلام جو معاشی نظام پیش کرتا ہے وہ مختصراً مندرجہ ذیل اصولوں پر مشتمل ہے:

۱۔ معاشیات اور اخلاق و مذہب:

سب سے پہلے وہ فرد اور جماعت دونوں کے ذہن سے اس باطل نظریے کو ختم کرتا ہے کہ اخلاق اور مذہب کا تعلق معاشی زندگی سے نہیں اور ''تجارت تو بس تجارت ہے!'' قرآن پاک بڑے بلیغ انداز میں معیشت اور اخلاق کا تعلق بیان کرتا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِذَا نُودِىَ لِلصَّلَوٰةِ مِن يَوْمِ ٱلْجُمُعَةِ فَٱسْعَوْا۟ إِلَىٰ ذِكْرِ ٱللَّهِ وَذَرُوا۟ ٱلْبَيْعَ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ○ فَإِذَا قُضِيَتِ ٱلصَّلَوٰةُ فَٱنتَشِرُوا۟ فِى ٱلْأَرْضِ وَٱبْتَغُوا۟ مِن فَضْلِ ٱللَّهِ وَٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○

ترجمہ: ''مسلمانو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو تم اللہ کی یاد کی طرف دوڑو اور لین دین چھوڑ دو۔ اگر تم جانتے ہو تو یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ پھر جب نماز ختم ہو جائے تو تم زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کا ذکر کثرت کے ساتھ کرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔ (الجمعۃ۔ ۹۔۱۰)

قرآن پاک میں متعدد مقامات پر معاش کو ''فضل اللہ'' کہا گیا ہے اور اس سے ذہن میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ یہ سب خدا کی عنایت ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ معاشی زندگی کو بھی انسان اسی طرح خدا کی حدود کا پابند بنائے جس طرح باقی تمام زندگی کو اور ان مقاصد کی تحصیل کے لیے استعمال کرے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے اسلام نے مقرر کیے ہیں۔ مسلمان اپنی معاشی زندگی میں بھی حدود اللہ کا پابند اور ان اخلاقی ضابطوں کا احترام کرنے والا ہوتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے عائد کیے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ

ترجمہ: ''وہ لوگ جنہیں خرید وفروخت اور تجارت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔'' (النور۔۳۷)

خدا کے ذکر کا بڑا وسیع مفہوم ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر حال میں وہ خدا کو یاد رکھتے ہیں اور اس کی رضا جوئی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اسی طرح معاہدہ لکھنے اور صحیح گواہی دینے کو تقویٰ قرار دیا گیا اور ناپ تول میں کمی کو ایسا عظیم گناہ کہ اس کی وجہ سے ایک پوری قوم کا تختہ الٹ دیا گیا۔ یہ وہ بنیادی نقطۂ نظر ہے جو اسلام دیتا ہے اور جس کی بنیاد معاشیات اور اخلاق کی ہم آہنگی پر ہے۔ اس طرح اسلامی معاشیات کا انداز (Approach) اخلاقیاتی اور قدر شناسانہ (Normative) ہے۔

۲۔ معاشی جدوجہد اور اس کا مقام ومقاصد:

اسلام نے ساری زمین بلکہ پوری کائنات کو انسان کے لیے میدان عمل قرار دیا ہے اور انسان کو ترغیب دی ہے کہ وہ اپنی معاش کے حصول اور خلق خدا کے لیے فارغ البالی کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ جدوجہد کرے۔ معاشیات کی اصطلاح میں اسے پیداوار کو بڑھانے (Maximum of Production) کی پالیسی کہہ سکتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ معیشت میں اصل اہمیت نفع کی تکثیر کو حاصل ہوتی ہے جب کہ اسلامی معاشیات میں کل پیداوار کی تکثیر اور خدا کے بندوں کے لیے سامان معاش کی زیادہ سے زیادہ فراوانی کا حصول بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ط

ترجمہ: ''اور بے شک ہم ہی نے تم کو زمین پر رہنے کی جگہ دی اور اس میں تمہارے لیے سامان معاش پیدا کیے۔'' (الاعراف۔۱۰)

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ط

ترجمہ: ''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے اور اس نے تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔'' (لقمان۔۲۰)

اس بنیادی حقیقت کے اظہار کے بعد اسلام نے انسانوں کو مختلف طریقوں سے محنت، معاشی جدوجہد اور حصول رزق کی کوشش پر اکسایا ہے اور اس طرح ہر شخص کو فروغ پیداوار کے لیے سرگرم عمل کر دیا ہے۔

(الف) بے عملی، بے روزگاری اور گداگری کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا اور اس پر سخت وعید سنائی گئی۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کسی کو زیب نہیں دیتا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے، اور رزق کی تلاش نہ کرے اور یہ کہتا رہے کہ ''اللہ مجھے رزق عطا فرما۔'' تم کو (دعا کے ساتھ) اس کے لیے جدوجہد بھی کرنی چاہیے کیوں کہ تم جانتے ہو کہ آسمان تو سونا چاندی برساتا نہیں۔

ایک اور حدیث میں رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے لیے کام کرنا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ قیامت کے دن تم اپنے چہرے پر سوال کا داغ لیے ہوئے آؤ۔

(ب) پھر مثبت طور پر رزق کی جدوجہد کی ترغیب دی اور اسے ہر مسلمان پر فرض کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم فجر کی نماز پڑھ لو تو اپنی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

روزی کی تلاش سے غافل ہو کر سوتے نہ رہو۔ ایک اور حدیث میں رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ دنیا کی شرافت غنا اور فراغ دستی ہے اور آخرت کی شرافت تقویٰ و پرہیزگاری ہے اور خود قرآن پاک میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا

ترجمہ: ''اور دنیا میں جو تمہارا حصہ ہے اسے بھول نہ جاؤ۔'' (القصص۔۷۷)

نبی اکرم ﷺ نے ''کسب حلال'' کو ''فریضۃ بعد الفریضۃ'' یعنی نماز کے بعد سب سے بڑا فرض قرار دیا ہے۔ اسلام کے نقطۂ نظر پر ایک واقعے سے بڑی روشنی پڑتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے ایک صحابی کو دیکھا جو خستہ حال تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا تمہارے پاس کچھ ہے؟ انہوں نے بتایا دو درہم ہیں۔ آپ ﷺ نے ان میں سے ایک درہم کی کلہاڑی خرید دی اور لکڑیاں کاٹنے پر لگا دیا۔ اس طرح آپ ﷺ نے محنت کے پیدآور استعمال کی ترغیب دی۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ

''صنعت و حرفت کے ذریعے روزی کی تکمیل انسان پر فرض (کفایہ) ہے''

''بعض گناہوں کا کفارہ روزی کمانے میں مغموم و متفکر رہنا ہے۔''

اور پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص دنیا کو جائز طریقے سے حاصل کرتا ہے تاکہ سوال سے بچے اور اہل و عیال کی کفالت کرے اور ہمسائے کی مدد کرے تو قیامت کے دن جب وہ اٹھے گا تو اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن ہوگا۔''

ان آیات و احادیث سے محنت اور معاشی جدوجہد کی اہمیت ہمارے سامنے آتی ہے اور انہی کی روشنی میں پیداوار کو بڑھانے اور معیشت کو تقویت دینے کی پالیسی اسلام کے معاشی نظام کا ایک اہم جزو قرار پاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی فقہ میں معاشی جدوجہد کو فرض عین اور پیداوار کو فروغ دینے کی کوشش کو فرض کفایہ (ایسا فرض جو لازم تو ہر شخص پر ہو البتہ اگر کچھ لوگ اسے ادا کر دیں تو سب پر سے ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے اور اگر کوئی بھی ادا نہ کرے تو مواخذہ ہر فرد سے ہو گا۔) قرار دیا ہے۔ ردالمختار میں ہے کہ

ومن فروض الکفایة الصناعة المحتاج الیها

ترجمہ: ''ضروری صنعتوں کا قیام فرض کفایہ میں سے ہے۔''

اسی طرح المنہاج میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ

ومن فروض الکفایه الحرف والصناع ومایتم به المعاش

ترجمہ: ''فرض کفایہ میں صنعت و حرفت اور وہ تمام چیزیں جو معاش کی تکمیل کے لیے درکار ہیں شامل ہیں۔''

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور اس سلسلے میں مختلف فقہا نے جو نقطۂ نظر بیان کیا ہے اس کا خلاصہ الحسبۃ فی الاسلام میں اس طرح بیان کیا ہے کہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قال غیر واحد من الفقهاء و من اصحاب الشافعی و احمد بن حنبل وغیرهم کابی حامد الغزالی وابی الفرج الجوزی وغیرهم ان هذه الصناعات فرض علی الکفایة فانه لایتم المعاش الابها کما ان الجہاد فرض علی الکفایة

ترجمہ: ''بہت سے فقہانے جن کا تعلق شافعی ،حنبلی فکر سے ہے نیز دوسرے فقہا جیسے امام غزالی اور امام جوزی وغیرہ نے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ ان صنعتوں کا قیام فرض کفایہ میں سے ہے اس لیے کہ معاش کی تکمیل ان کے بغیر ممکن نہیں ہے اس (فرض کفایہ) کی حیثیت (ایسی ہے جیسے) جہاد کی جو فرض کفایہ ہے۔''

امام ابن تیمیہ کی دی ہوئی یہ مثال بڑی اہم ہے۔ معاش کی تکمیل انسانیت کی تکمیل کے لیے ضروری ہے اور جس طرح انسانیت کی روحانی اور اخلاقی ضرورتوں کو پورا کرنے اور اسے منکر سے بچانے، طاغوت کے غلبے سے نجات دلانے اور حقیقی رہنمائی سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کرنے کے لیے...... یعنی انسانیت کی تکمیل کے لیے...... ضروری ہے کہ جہاد کیا جائے اسی طرح انسانیت کی جسمانی اور مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے صنعت وحرفت کا قیام اور وسائل معاش کی فراہمی ضروری ہے...... اور ان دونوں کی حیثیت فرض کفایہ کی ہے۔

یہ وہ اہمیت ہے جو اسلام معاشی جدوجہد کو دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشیات کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ تمام انسانوں کے لیے معاشی سہولتیں فراہم کی جائیں، قدرت نے جو وسائل ودیعت کیے ہیں ان کو ترقی دی جائے، پیداوار کو امکانی حد تک بڑھایا جائے اور رزق کے خزانوں کو چند ہاتھوں میں اس طرح مرکوز نہ ہونے دیا جائے کہ دوسروں پر اس کے دروازے بند ہو جائیں۔ اسے علم معاشیات کی اصطلاح میں پیداوار کی تکثیر اور وسائل پیداوار کی بہترین تقسیم کہا جا سکتا ہے۔

غربت کے انسداد کا مسئلہ بھی اسلام کی معاشی پالیسی میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام کے معاشی نظام کے مثبت معاشی مقاصد میں غربت کا انسداد اور تمام انسانوں کو معاشی جدوجہد کے مساوی مواقع فراہم کرنا بھی شامل ہے۔ اسلام کا سب سے اہم مقصد کفر کا استیصال ہے اور چونکہ فقر وفاقہ انسان کو کفر کی طرف لے جاتے ہیں اس لیے اسلام ان کو اپنا بنیادی مخالف سمجھتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''ابن آدم کا بنیادی حق یہ ہے کہ اس کے لیے ایک گھر ہو جس میں وہ رہ سکے، کپڑا ہو جس سے وہ اپنے جسم کو ڈھانپ سکے، اور کھانے کے لیے اور پینے کے لیے پانی ہو۔ (ترمذی)

اسلام اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ سب کو حصول رزق کے مواقع دے اور پھر مثبت طور پر ایسی پالیسیاں بنائے جن سے غربت وافلاس ختم ہوں اور انسانوں کو ان کی بنیادی ضرورتیں لازماً حاصل ہوں۔

اسلام تنگی کو دور کرنے کا طریقہ حصول رزق کی کوشش اور پیداوار بڑھانے کے ذرائع کی طرف رجوع قرار دیتا ہے اور محض غربت، افلاس، معیار زندگی کے گرنے کے خطرے اور قلت وسائل کے واویلے سے انسان کشی اور نسل کشی کی پالیسی کی اجازت نہیں دیتا۔ معاشی مسئلے کا اصل حل معیشت کو فروغ دینا ہے، انسان کی قطع وبرید نہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا

ترجمہ: ''اور تم اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم ہی ان کو رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی۔ ان کو مار ڈالنا بڑی خطا ہے۔'' (بنی اسرائیل۔۳۱)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اسلام آبادی کے حقیقی مسئلے کا حل اضافۂ پیداوار کی شکل میں تجویز کرتا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

''رزق کا دروازہ عرش تک کھلا ہوا ہے اور اسباب معیشت غیر محدود ہیں۔''

''عورت کو گھر میں خالی بیٹھے رہنے کی جگہ چرخہ کاتنا اچھی کمائی کا مشغلہ ہے۔''

''رسول اللہ ﷺ نے مال داروں کو حکم دیا کہ بکریاں پالیں اور غریبوں کو حکم دیا کہ مرغیاں پالیں تا کہ فراغی حاصل کریں۔''

اس طرح اسلام ہر فرد اور پوری قوم کی توجہ کو معاشی وسائل کی ترقی اور پیداواری امکانات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے پر مرکوز کرتا ہے۔ وہ ایک طرف معاشرے میں انصاف اور آزادی کو قائم کرتا ہے اور دوسری طرف غربت وافلاس کا خاتمہ کر کے بہتر معاشی زندگی کا قیام ممکن بناتا ہے۔ یہاں بھی اس کا مزاج مغرب کی تمام معاشی تحریکات سے مختلف ہے۔

۳۔ حلال وحرام کی تمیز:

اسلام پیداوار کے اضافے اور معیشت کے ہمہ جہتی فروغ کی پالیسی اختیار کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی شرط بھی لگاتا ہے کہ آمدنی جائز ذرائع سے حاصل کی جائے گی۔ ہر نفع کو جو حرام ذرائع سے حاصل ہو وہ دوزخ کی آگ قرار دیتا ہے۔ قرآن وحدیث میں رزق حلال کی جتنی اہمیت بیان کی گئی ہے وہ اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں صرف جائز اور حلال رزق کے فروغ کی کوششیں ہوں گی اور ان تمام ذرائع کا کلی انسداد کیا جائے گا جو حرام ہیں اور جن کو شریعت ناروا اور ناجائز قرار دیتی ہے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا صلے ز

ترجمہ: ''اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے حلال اور پاک چیزیں کھاؤ۔'' (البقرہ۔۱۶۸)

رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

''بہترین عمل حلال روزی کمانا ہے۔''

''حلال روزی کا طلب کرنا ایسا ہے جیسے خدا کی راہ میں بہادروں سے لڑنا اور جو شخص حلال روزی حاصل کرنے کی کوشش کر کے تھک کر رات کو سو جائے تو خدا اس سے راضی ہے۔''

اور حرام سے کمائی ہوئی روزی کے متعلق فرمایا:

''حرام روزی سے پرورش پایا ہوا گوشت اس کا زیادہ مستحق ہے کہ آگ میں ڈالا جائے۔''

یہ ایک ایسا اصول ہے جس سے آج کے دور کی معاشیات بالکل ناآشنا ہے۔ چونکہ اسلام کا اصل مقصد صرف وسائل معاشی کی فراوانی نہیں بلکہ ان کا منصفانہ اور مصلحانہ استعمال ہے اس لیے اس نے معاشی جدوجہد کو حلال وحرام کا پابند کیا ہے۔ خالص معاشی نقطۂ نظر سے یہ وہ چیز ہے جو معاشیات کو محض افادی سطح سے بلند کر کے اصلاحی اور فلاحی سطح پر لے آتی ہے اور اس طرح ایک کی معاشی جدوجہد دوسرے کے لیے معاشی تکلیف یا معاشرہ کے لیے ظلم فساد کا ذریعہ نہیں بن پاتی۔ اسلام نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے اگر ان کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیزیں ہیں جو یا تو فرد یا معاشرے کی جسمانی اور اخلاقی زندگی کو مجروح کرتی ہیں اور یا انسانوں کے درمیان حقیقی معاشی تعاون، مساوات، آزادی جدوجہد، عدل وانصاف اور قسط وتوازن کا قیام مشکل کر دیتی ہیں۔ خالص معاشی اصطلاح میں اس کا فائدہ یہ ہے کہ اسلامی معیشت میں صرف کی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تکثیر (Maximisation of consumption) کی جگہ اس کی انسب سطح کا حصول (Optimisation) پیش نظر رہتا ہے اور ایک حقیقی فلاحی معیشت ظہور میں آتی ہے۔

۴۔ حرمت سود:

اسلام کے بنیادی معاشی اصولوں میں سے ایک حرمت سود ہے۔ جو معاشی ظلم کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

اسلام نے سود کو اس کی ہر شکل میں حرام قرار دیا ہے۔ سود مفرد ہو یا مرکب، ذاتی قرضوں پر لیا جائے یا تجارتی اور پیداواری قرضوں پر، حرام ہے، اور اس کے لینے والے کو خدا اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ص وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

ترجمہ: ''اے ایمان والو! سود کے کئی کئی حصے بڑھا چڑھا کر نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔''
(آل عمران۔۱۳۰)

ایک حدیث میں رسول کریم ﷺ نے سود کھانے والے پر، سود کا کاغذ لکھنے والے پر اور سود کے گواہوں پر لعنت بھیجی ہے اور ان سب کو برابر قرار دیا ہے۔ اسلام میں سود کی ممانعت محض اخلاقی بنیادوں ہی پر نہیں بلکہ اس کے خطرناک اقتصادی، سماجی اور سیاسی مضمرات کی بنا پر بھی ہے۔ سود کی لعنت متعدد قدیم معاشروں کی تباہی کا باعث بنی ہے اور آج بھی جدید سرمایہ دارانہ معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ اس کی بنیاد استحصال اور ظلم پر ہے اور اس کی وجہ سے ملک کی معیشت پر چند سرمایہ داروں کا اقتدار مسلط ہو جاتا ہے جو صحت مند معاشی جدوجہد کو ختم کر دیتا ہے اور معیشت میں عدم استحکام کا باعث ہوتا ہے۔

۵۔ تجارتی اخلاقیات کا ضابطہ:

اسلام نے تجارت اخلاقیات کا ایک ضابطہ پیش کیا ہے تاکہ اہل تجارت اس کا اتباع کریں۔ یہ ضابطۂ اخلاق تجارتی لین دین میں دیانت داری اور خدا ترسی کے جذبات کو فروغ دیتا ہے تجارت کے معاملے میں قرآن کی اصولی ہدایت یہ ہے کہ

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ قف

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اپنے اموال کو آپس میں باطل کی راہ سے نہ کھاؤ بلکہ باہمی رضامندی کے ساتھ تجارت کی راہ سے نفع حاصل کرو۔'' (النساء۔۲۹)

اس آیت ربانی کے ذریعے سے قرآن کریم نے معیشت کے ان تمام ذرائع کو ممنوع کر دیا ہے جو ظلم و زیادتی اور دوسروں کی حق تلفی پر مبنی ہوں۔ معیشت اور تجارت کا دائرہ وہ دائرہ ہے جس میں انسان نے نت نئے ظلم کیے ہیں اور خصوصیت سے اہل سرمایہ اور اہل قوت نے دوسرے فریق پر جو کمزور اور غریب ہو، اکثر اپنی مرضی مسلط کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انتفاع (Exploitation) کے یہ سارے دروازے بند کر دیے اور فرمایا کہ معاشی معاملات کی بنیاد باہمی رضامندی اور تجارت کے حصول پر ہونی چاہیے۔ تجارت میں امانت و دیانت کی اہمیت واضح کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''امانت دار تاجروں کا حشر صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مختصراً اسلام کے اصول تجارت حسب ذیل ہیں:

(ا) باہمی رضامندی:

تجارت باہمی رضامندی سے ہونی چاہیے۔ دونوں فریق اپنی آزاد مرضی سے کسی جبر یا زبردستی کے بغیر اپنے معاملات کو طے کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں تجارت کی بنیاد "تعاون باہمی" پر ہے اور تجارت کی وہ تمام شکلیں جن میں دوسرے فریق کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کچھ خاص شرائط یا معاملات اس پر تھوپ دیے جاتے ہیں، وہ ناجائز ہیں۔ اس سے یہ بھی مستنبط ہوسکتا ہے کہ ایسی اشتہار بازی یا نفسیاتی حربوں کا ایسا استعمال جو عقل وفکر کو معطل کردے اور ایک شخص اپنی مرضی کے خلاف محض نفسیاتی شعبہ بازی کی وجہ سے کسی چیز کی خرید پر مجبور ہو جائے، اسلام کے مطابق نہیں۔ اسی طرح آزاد منڈی کو کمزور یا مظلوم کرنے والی وہ تمام قوتیں بھی اسلامی معیشت میں کوئی راہ نہیں پاتیں جن کی وجہ سے جدید دنیا کا منڈی کا نظام درہم برہم ہے اور شدید قسم کی دقتوں اور خامیوں میں مبتلا ہو گیا ہے۔

(ب) دیانت:

دوسرا اصول یہ ہے کہ تجارت دیانت کے ساتھ ہو۔ اس میں کسی قسم کا دھوکہ یا بدمعاملگی نہ ہو۔ مال کی اصل کیفیت لوگوں کے سامنے رکھ دی جائے۔ اور ان کو غلط فہمی میں رکھ کر خرید پر مجبور نہ کیا جائے۔ اسی طرح جان بوجھ کر دوسرے کو نقصان پہنچانا، معاملے پر معاملہ کرنا، خیانت یا وعدہ خلافی کرنا، یہ سب اسلام کی نگاہ میں ممنوع ہیں۔ اسی طرح ناپ تول میں درست ہونا تجارتی دیانت کا ایک اہم پہلو ہے۔

(ج) جائز اور مباح کی تجارت:

تیسرا اصول یہ ہے کہ تجارت صرف ان اشیا میں کی جائے جو جائز یا مباح ہوں۔ وہ تمام اشیا جن کا استعمال معصیت کی تعریف میں آتا ہے، یعنی شراب، بت، اصنام، خنزیر وغیرہ، ان کی تجارت بھی اسلام میں ممنوع ہے۔

(د) ذخیرہ اندوزی کی ممانعت:

پھر اسلام میں اس بات کی بھی ممانعت ہے کہ ضروریات زندگی کو روک رکھا جائے تاکہ ان کے دام بڑھ جائیں اور اس طرح سے منافع میں اضافہ ہو۔ ذخیرہ اندوزی اور احتکار کو اسلام نے سختی سے منع کیا ہے اور ایسا کرنے والے پر رسول خدا ﷺ نے لعنت بھیجی ہے۔

(ہ) جوا اور سٹہ وغیرہ کی ممانعت:

اسلام نے تجارت کی وہ تمام شکلیں بھی بند کر دی ہیں جن میں کسی دوسرے سے ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہو یا جن میں مناسب محنت کیے بغیر دولت ہاتھ آ رہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سٹہ، لاٹری اور جوئے کی ساری صورتیں اسلام میں ممنوع ہیں۔

(و) اہل تجارت کا ذاتی اخلاق:

اسلام کی تمام تعلیمات کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل تجارت میں اعلیٰ اخلاق کردار ہونا چاہیے تاکہ وہ تجارت کا حق ادا کرسکیں اور اسلام کے سچے سفیر بن سکیں۔ ان میں خصوصیت سے دیانت اور خوش اخلاقی ہونی چاہیے

انہیں قوم اور خصوصیت سے اپنے صارفین کی خدمت کے جذبے سے کام کرنا چاہیے اور اپنے کاروبار میں پوری محنت اور دل جمعی سے کام کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ مفید مقاصد کے لیے استعمال کرسکیں۔ پھر سب سے بڑھ کر وہ مستقل مزاجی اور اعتدال کے ساتھ کام کریں اور بہت جلدی دولت جمع کرنے کی ہوس سے بچے رہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

معاش اور اخلاق میں یہی وہ حسین توازن ہے جو اسلام کے معاشی نظام کا امتیاز ہے۔

۶۔ اسراف کی بندش:

طلب حلال کے ساتھ ساتھ اسلام انسان کو جائز مصارف پر دولت خرچ کرنے کی ترغیب بھی دیتا ہے لیکن اسراف سے روکتا ہے اس وجہ سے دولت کا بے جا استعمال اور اس کا ضیاع رک جاتا ہے اور وہ تعمیری اور پیداواری مقاصد میں استعمال ہونے لگتی ہے:

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ج

''کھاؤ اور پیو مگر اسراف نہ کرو۔'' (الاعراف۔۳۱)

اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو جائز ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے محنت کرتا ہے وہ اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے اور جو محض آن بان دکھانے کے لیے دولت کماتا ہے وہ شیطان کی راہ میں کام کرتا ہے۔

۷۔ ارتکاز دولت کی ممانعت:

پھر اسلام نے دولت کے ارتکاز (ایک یا چند مقامات پر اس کا جمع ہونا) کو بھی پسند نہیں کیا ہے اور اس بات کا انتظام کیا ہے کہ مختلف معاشرتی، اداراتی، قانونی اور اخلاقی تدابیر سے دولت کی تقسیم زیادہ سے زیادہ منصفانہ ہو اور پورے معاشرے میں گردش کرے۔

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ط

ترجمہ: ''ایسا نہ ہو کہ یہ (مال و دولت) تمہارے دولت مندوں ہی میں گردش کرتا رہے۔'' (الحشر۔۷)

حضور ﷺ کا ارشاد ہے

اقسموا المال بين الفرائض على كتاب الله

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق اچھا مال ان لوگوں میں تقسیم کرو جن کا حق مقرر کیا گیا ہے۔ (ابوداؤد)

دولت کی تقسیم کے لیے مندرجۂ ذیل صورتیں تجویز کی گئی ہیں:

(ا) زکوٰۃ:

''زکوٰۃ ہر صاحب نصاب مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے یہ کوئی خیرات نہیں بلکہ فقرا و مساکین کا ''حق'' ہے۔

زکوٰۃ دولت کی تقسیم میں غیر فطری عدم مساوات کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعے سے امیروں کی دولت غریبوں کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ معاشی بحران کے جس چکر میں سرمایہ دارانہ دنیا گرفتار ہے اس کو دور کرنے میں بھی زکوٰۃ بڑی مفید و معاون ہو سکتی ہے۔ تجارتی چکر، سرمایہ کاری اور قوت صرفہ میں عدم توازن کی بنا پر رونما ہوتا ہے لیکن زکوٰۃ جہاں ایک طرف پیداواری عمل کو تیز کرتی ہے وہیں دوسری طرف عوام میں قوت خرید کا اضافہ بھی کرتی ہے اس طرح یہ معیشت میں معاشی توازن قائم کرنے کا آلہ بن جاتی ہے۔

(ب) صدقات واجبہ:

بہت سے ایسے صدقات مقرر کیے گئے ہیں جو مختلف مواقع پر ہر صاحب حیثیت مسلمان کو ادا کرنے ہوتے ہیں جیسے صدقہ فطر وغیرہ۔ یہ بھی مندرجہ بالا مقصد پورا کرتے ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

(ج) انفاق:

اسلام ہر مسلمان میں انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا کرتا ہے، مال سے محبت کو کم کرتا ہے اور خدا کی راہ میں خرچ کر کے دنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

(د) قانون وراثت:

اسلام نے وراثت کا جو قانون تجویز کیا ہے وہ اس طرح کا ہے کہ متوفی کا ترکہ پورے خاندان میں ایک مناسب ترتیب کے ساتھ تقسیم ہو جاتا ہے اور ساری جائداد مغربی ممالک کی طرح کسی ایک وارث کو نہیں ملتی۔ اس طرح دولت کے ارتکاز کے بجائے اس کی منصفانہ تقسیم رونما ہوتی ہے۔

(ز) حق سویٰ الزکوٰۃ:

زکواۃ اور صدقات واجبہ کے علاوہ بھی اگر ضرورت محسوس ہو تو حکومت کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ لوگوں سے مزید مال بطور ٹیکس لے اور اسے استحکام ریاست، قیام انصاف اور فلاح عامہ کے لیے صرف کرے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے "بے شک مال میں زکوٰۃ کے سوا اور بھی حق ہے۔" (ترمذی)

(ح) العفو:

اسلام نے انسان کو صرف انفاق ہی کی ترغیب نہیں دی بلکہ اس میں یہ جذبہ بھی پیدا کیا کہ اس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ جو بھی ہو اسے خدا کی راہ میں اور دوسروں کی بہتری کے لیے خرچ کر دے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۵ قُلِ الْعَفْوَ ط

ترجمہ: "وہ پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں کہہ دیجئے العفو (یعنی جو اپنی ضرورت سے زائد ہو)۔" (البقرہ۔۲۱۹)

اس طرح اسلام پورے معاشرے میں دولت کی منصفانہ تقسیم روبہ عمل لاتا ہے۔ اس کی پالیسی کے دو بنیادی اصول فروغ پیداوار اور دولت کی منصفانہ تقسیم ہیں۔ وہ ان میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔

۸۔ ملکیت و تصرف کا حق:

اسلام تمام زمین اور وسائل فطرت کو اصلاً خدا کی دین اور اس کی ملکیت قرار دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام معاشی معاملات میں انسان کو اس عظیم تر ملکیت کے تصور کے تحت، انفرادی ملکیت و تصرف کا حق دیتا ہے۔ یہی وہ شکل ہے جس میں انسان کی معاشی آزادی محفوظ رہ سکتی ہے اور اچھے اخلاق پروان چڑھ سکتے ہیں لیکن یہ حق غیر محدود نہیں ہے یعنی اگر ملکیت آلہ ظلم بن جائے یا دوسروں کے حقوق پر اس کا غلط اثر پڑ رہا ہو تو ریاست کو مداخلت کا بھی حق ہے۔ دراصل اسلام ملکیت کے اس محدود حق کا ایک امانت کی شکل دیتا ہے اور اس میں تصرف کے اختیار کو بہت سی قانونی اور اخلاقی پابندیوں سے محدود کرتا ہے۔

۹۔ عدل اجتماعی کی ضمانت:

اسلام ریاست کے معاشی وظائف کا بھی ایک مثبت تصور پیش کرتا ہے اور سماجی فلاح اور معاشی انصاف کے قیام کو اس کی اولین ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ زکوٰۃ سماجی فلاح کی ایک اسکیم ہے جس کے نظام کو ریاست کے ہاتھوں قائم کیا جاتا ہے، معاشی قانون سازی اور عدلیہ کی طاقتوں کے ذریعہ ریاست عدل اجتماعی قائم کرتی ہے۔ جس کا کوئی وارث نہیں اس کی ریاست وارث ہے اور جس کا کوئی ولی نہیں،

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اس کی ریاست ولی ہے۔ ناداروں، اپاہجوں اور محتاجوں کی مدد ریاست کا فرض ہے اور یہ بھی اس کی ذمہ داری ہے کہ تمام شہریوں کو ان کی بنیادی ضرورتیں فراہم کرے۔

السلطان ولی لمن لا ولی له

''حکومت ہر اس شخص کی ولی (دست گیر و مددگار) ہے، جس کا کوئی ولی نہ ہو۔'' (بخاری)

ایک اور حدیث میں ہے:

''یعنی جس مرنے والے نے ذمہ داریوں کا کوئی بار (مثلاً قرض یا بے سہارا کنبہ) چھوڑا ہو وہ ہمارے ذمے ہے۔''

ایک خلیفہ راشد نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے:

''خدا کی قسم اگر میں زندہ رہا تو صفا کی پہاڑیوں میں جو چرواہا اپنی بکریاں چراتا ہے اس کو اس مال میں سے حصہ پہنچے گا اور اس کے لیے اس کو کوئی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔''

اور یہ کہا:

''خدا کی قسم اگر اہل عراق کی بیواؤں کی خدمت کے لیے زندہ رہ گیا تو ان کو اس حال میں چھوڑ جاؤں گا کہ میرے بعد ان کو کسی اور امر کی مدد کی احتیاج باقی نہ رہے گی۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس بات کو اس طرح ادا کیا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے دولت مند لوگوں پر ان کے اموال میں اتنی مقدار مقرر کی ہے جو غربا کے لیے کافی ہو سکے۔ اس کے باوجود اگر وہ بھوکے، ننگے اور تنگ دست ہوں تو یہ صرف دولت مندوں کی عدم توجہی اور بخل کی وجہ سے ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ ان امرا سے قیامت کے دن محاسبہ کرے گا۔''

ان احکام کے مطابق نظام قائم ہوتا ہے اس میں زمین اپنے خزانے اگل دیتی ہے اور آسمان اپنی نعمتوں کی بارش کرنے لگتا ہے اور افلاس و تنگ دستی ختم ہو جاتی ہے۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

''اے لوگو! صدقہ دو کیوں کہ تم پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ آدمی صدقہ کے لیے پھرے گا مگر وہ کسی ایسے شخص کو نہ پائے گا جو اسے قبول کرے۔'' (یعنی اس کا حاجت مند ہو)

حاصل کلام:

یہ ہے اسلام کا معاشی نظام...... اور درحقیقت انسانیت کی نجات انہی اصولوں میں مضمر ہے۔ اس کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مرکزی محور انسان اور اس کی معاشی اور اخلاقی فلاح ہے...... وہ معاشی ترقی کو اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ سماجی انصاف، آزادی اور اخلاقی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ترقی کو اولین اہمیت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے اس کا معاشی نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے اپنے مقصد اپنے مزاج اور اپنے اصولوں کے اعتبار سے مختلف ہے اور ہر حیثیت سے ان سے اعلیٰ اور برتر ہے۔

قانونی وعدالتی نظام

اسلامی نظام قانون کی بنیادی چیزیں یہ ہیں:

۱۔ قانون کے اصل سرچشمے دو ہیں: قرآن اور سنت۔ ان کے اندر جس قدر قوانین واضح شکل میں موجود ہیں، وہ قطعی اور اٹل ہیں، اور ہمیشہ کے لیے واجب التسلیم اور واجب الاطاعت ہیں۔ ان میں کبھی کوئی معمولی ردوبدل بھی نہیں ہوسکتا۔ نہ کوئی خلیفہ نظم حکومت چلانے میں ان سے بال برابر انحراف کرسکتا ہے، نہ کسی حاکم کے لیے جائز ہے کہ معاملات کا فیصلہ ان سے ہٹ کر کرے۔ ایسا کرنا اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھنا ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ المائدہ ۵:۴۴

۲۔ جن مسائل اور معاملات کے بارے میں واضح احکام قرآن وسنت میں موجود نہ ہوں، ان کے لیے حالات زمانہ اور ضروریات وقت کے مطابق، قوانین وضع کیے جائیں گے۔ یہ قانون وہ لوگ وضع کریں گے جو اپنے علم وتقویٰ، اپنی دینی بصیرت، اپنی قانونی مہارت اور مقتضیات زمانہ سے اپنی گہری واقفیت کی بنا پر اس کے اہل ہوں گے...... یہ قانون سازی جس طرح عام نہ ہوگی، بلکہ صرف انہی امور میں ہوسکے گی جن کے بارے میں کتاب وسنت کے واضح احکام موجود نہ ہوں اسی طرح آزادانہ بھی نہ ہوگی، بلکہ دین کے مزاج اور شریعت کے متعینہ مقاصد کے تحت ہی ہوگی، اور کتاب وسنت کے واضح احکام کو سامنے رکھ کر انھی کی بنیاد پر کی جائے گی۔

اس طرح قوانین بنائے جانے کو ''قیاس'' کہتے ہیں۔ قیاسی احکام وقوانین کی حیثیت قطعی اور اٹل اور ناقابل اختلاف احکام شریعت کی نہیں ہوتی، بلکہ ان میں اختلاف بھی ہوسکتا ہے اور تبدیلی کی ضرورت بھی پیش آسکتی ہے۔ اختلاف اس لیے ہوسکتا ہے کہ یہ انسانی فہم ورائے کا معاملہ ہے جس میں اختلاف کا ہونا فطری بات ہے۔ تبدیلی کی ضرورت اس لیے پیش آسکتی ہے کہ قیاس اور اجتہاد میں زمانے کے حالات اور اس کے تقاضوں کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہوتا ہے اور یہ حالات اور تقاضے برابر بدلتے رہتے ہیں۔ البتہ ایسا قیاس جس پر پوری ملت کے اصحاب علم واجتہاد متفق ہوگئے ہوں ناقابل اختلاف ہوتا ہے، اور اس کی حیثیت بھی ابدی قانون کی سی ہوجاتی ہے۔ اس اتفاق رائے کو ''اجماع'' کہتے ہیں۔

اس طرح اسلامی قانون کے سرچشمے پانچ ہوجاتے ہیں: قرآن، سنت، قیاس، اجماع اور اجتہاد۔

۳۔ مقننہ انتظامیہ سے قطعاً آزاد ہوگی۔ قانون سازی پر انتظامیہ کے کسی اثر واقتدار کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ قانون سازوں کے سامنے صرف اللہ ورسول ﷺ کے منشا کی اپنے بس بھر، ٹھیک ٹھیک ترجمانی ہوتی ہے۔ اسلام میں قانون سازی کا مطلب یہ جاننے اور بتانے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ اگر اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے فلاں معاملہ یا مسئلہ پیش ہوتا تو اس کا فیصلہ یا جواب ہمارے اندازے کے مطابق یہ ہوتا۔

۴۔ مقننہ کی طرح عدلیہ بھی انتظامیہ سے یکسر آزاد ہوگی۔ قاضیوں اور ججوں کا تقرر اگرچہ بلاواسطہ یا بالواسطہ حکومت ہی کرے گی، لیکن جب ایک قاضی کا تقرر ہوگیا تو اب وہ عدالت کی کرسی پر حکومت کا نہیں بلکہ خدا اور رسول ﷺ کا نائب ہوتا ہے اور اس کے لیے احکام شریعت کے سوا اور کوئی چیز قابل لحاظ نہیں رہ جاتی۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

۵۔ قانون کی طاقت ناقابل شکست ہے۔ کوئی بھی قانون سے بالاتر نہیں ہوتا۔ نہ امیر وغریب اور خواص وعوام کا یہاں کوئی امتیاز ہے۔ اونچے سے اونچا شخص، حتی کہ خلیفۂ وقت بھی قانون کا اسی طرح محکوم ہے۔ جس طرح ایک بےکس فقیر۔ اگر کسی معاملے میں خلیفہ مدعی یا مدعا علیہ ہو تو عدالت میں اسے بھی اسی طرح اور اسی حیثیت سے حاضر ہونا ہوگا جس طرح اور جس حیثیت سے دوسرے لوگ حاضر ہوا کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر قانون کسی مقدمے میں اسے مجرم قرار دیتا ہے تو اسے بھی متعینہ سزا لازماً بھگتنی پڑے گی۔ رسول خدا ﷺ کے یہ الفاظ قانون کی بالادستی کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے کہ "اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) بھی چوری کرتی تو خدا کی قسم میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔" وایم اللہ لو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت یدھا. (بخاری)

جن جرائم کی سزائیں کتاب وسنت کے اندر قطعی انداز میں اور واضح طریقے پر مقرر کر دی گئی ہیں ان کے نفاذ کو خلیفہ بھی نہیں روک سکتا۔ چوری کا جرم ثابت ہو جانے کے بعد ہاتھ کٹ کر رہے گا۔ زانی کو سنگ ساری کی یا سو کوڑوں کی سزا مل کر رہے گی۔ زنا کی جھوٹی تہمت لگانے والے کو اسی (۸۰) درے کھانے ہی پڑیں گے، قاتل کو اگر مقتول کے وارثوں نے معاف نہیں کر دیا ہے تو اسے موت کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔ یہاں "رحم کی درخواست" سننے کا کسی گورنر اور کسی سربراہ مملکت کا یارا نہیں۔

۶۔ تعزیرات (یعنی فوج داری جرائم کی سزائیں) صرف اسی حال میں نافذ کی جائیں گی جب کہ معاشرہ اور ماحول فی الواقع اسلامی ہو اور حالات معمول پر ہوں۔ جب تک معاشرہ عملاً اسلامی رنگ کا نہ ہو یا حالات ایسے غیر معمولی ہو گئے ہوں جن میں ارتکاب جرم کے قوی محرکات ابھر آئے ہوں، سزاؤں کا نفاذ رکا رہے گا۔ جیسا کہ قحط کے زمانے میں خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چوری کی سزا موقوف کر دی تھی۔

۷۔ انصاف ہر شخص کو مفت ملے گا۔ یہاں کورٹ فیس نام کی کوئی چیز انصاف کے معاوضے کے طور پر وصول نہ کی جا سکے گی۔

اسلام کا اخلاقی نظام

جو علم بھلائی اور برائی کی حقیقت کو ظاہر کرے، انسانوں کو آپس میں کس طرح معاملہ کرنا چاہیے، اس کو بیان کرے، لوگوں کو اپنے اعمال میں کس منتہائے نظر اور مقصد عظمیٰ کو پیش نظر رکھنا چاہیے، اس کو واضح کرے، نیز مفید اور کارآمد باتوں کے لیے دلیل راہ بنے، بلکہ مختصر الفاظ میں جو فضائل و رذائل کا علم بخشے اور یہ بتائے کہ انسان کس طرح فضائل سے مزین اور رزائل سے محفوظ رہ سکتا ہے اس کو "علم اخلاق" کہتے ہیں۔

لیکن بہ ادنیٰ غور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمام انسانی اعمال اس قسم کے نہیں ہیں کہ ان کے اچھے یا برے ہونے کا حکم دیا جا سکے۔ مثلاً سانس لینا، دل کا حرکت کرنا، تاریکی سے روشنی میں اچانک آ جانے سے پلک جھپکنا وغیرہ ایسے اعمال ہیں جو انسان سے غیر ارادی طور پر صادر ہوتے ہیں اس لیے ان امور کے پیش نظر انسان کو نہ نیکوکار کہہ سکتے ہیں اور نہ غلط کار۔ اور نہ اس سلسلے میں اس سے کوئی محاسبہ کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں یہ اعمال علم اخلاق کا موضوع نہیں ہو سکتے۔ البتہ انسان سے جو اعمال ارادی طور پر انجام پاتے ہیں اور وہ ان کو ان کے نتائج وثمرات پر غور کرنے کے بعد کرتا ہے، مثلاً شفاخانے کی تعمیر یا اپنے دشمن کے قتل کا ارادہ اور اس کی تدابیر میں کامیابی وغیرہ۔ چونکہ یہ "ارادی اعمال" رہیں اس لیے ان پر ہی اچھے یا برے ہونے کا حکم لایا جا سکتا ہے۔ انسان اس قسم کے اعمال کے لیے خدا اور مخلوق کے سامنے جواب دہ ہے، اور یہی علم اخلاق کا موضوع قرار پاتے ہیں۔

ہر ایک علم کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے اندر شغف رکھنے والے کو ان امور کے بارے میں جن پر اس علم میں بحث ہوتی ہے قائدانہ نظر عطا کرتا ہے۔ چنانچہ علم اخلاق کی بھی یہی شان ہے کہ جو شخص اس کے ساتھ شغف رکھتا ہے یہ اس کو اعمال کے کھرے کھوٹے کی پرکھ پر قدرت عطا کرتا ہے۔ اور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ان کی صحیح اور پائیدار تقویم پر اسے ایسا حاوی کر دیتا ہے کہ ان سے متعلق حکم نافذ کرنے میں وہ لوگوں کے رجحانات اور تقلیدات کے زیر اثر نہیں رہتا بلکہ اپنے فیصلے میں علم الاخلاق کے نظریات، قواعد و قانون اور قیاسات سے مدد حاصل کرتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ علم اخلاق کی غرض صرف نظریوں اور قاعدوں کی معرفت تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کے مقاصد عملی میں یہ بھی شامل ہے کہ ہمارے ارادے میں تاثیر اور ہدایت کارفرما ہو کہ یہی تاثیر ارادے کو عمل خیر پر آمادہ کرتی ہے اور ہم میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہم اپنی حیات کی تشکیل کریں، اپنے اعمال کو پاک اور عمدہ بنائیں، اور حیات انسانی کے لیے ایک اعلیٰ مثال قائم کر دیں، یعنی اپنے اندر حسن عمل، حسن کمال، اور اخوت و مواسات عامہ جیسے فضائل پیدا کریں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ''تاثیر'' کو ہر موقع پر کامیابی حاصل نہیں ہوتی اور فطرت انسانی اس سے متاثر نہیں ہوتی۔

علم اخلاق کا اصل وظیفہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کے سامنے خیر و شر اور نیکی و بدی کو واضح کر دیتا ہے اور اس طرح نیکی اور سچائی کی راہ کو آسان کر دیتا ہے۔ اس کا کام جبری طور پر صالح بنا دینا نہیں، انسان کو صالحیت کی راہ دکھانا ہے جس پر چلنے یا نہ چلنے کا انحصار فرد کے ارادے پر ہے۔ یہ علم ایک طبیب کی طرح انسان کو اچھے اور برے میں امتیاز کرا دیتا ہے اور اس کی چشم عبرت و بصیرت کو کھول دیتا ہے تاکہ انسان خیر و شر اور اس کے آثار و لوازم کو جان لے۔ اب آگے اس کی قوت ارادی کا کام ہے جو علم اخلاق کے اوامر (احکام) کے اختیار اور اس کے نواہی (ممنوعات) سے پرہیز پر آمادہ کر سکے۔

انسان کے اندر اخلاقی حس ایک فطری حس ہے جس کی بنا پر انسان بعض صفات کو پسند اور بعض کو ناپسند کرتا ہے۔ یہ انفرادی طور پر انسانوں میں کم و بیش ہو سکتی ہے لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ مجموعی طور پر انسانیت کے شعور نے اخلاق کے بعض اوصاف پر خوبی کا اور بعض پر برائی کا ہمیشہ یکساں حکم لگایا ہے۔ سچائی، انصاف، پاس عہد اور امانت کو ہمیشہ سے انسانی اخلاقیات میں تعریف کا مستحق سمجھا گیا اور کبھی کوئی ایسا دور نہیں گزرا جب جھوٹ، ظلم، بدعہدی اور خیانت کو پسند کیا گیا ہو۔ ہمدردی، فیاضی اور فراخ دلی کی ہمیشہ قدر کی گئی اور خودغرضی، سنگ دلی، بخل اور تنگ نظری کو کبھی عزت کا مقام حاصل نہیں ہوا۔ صبر و تحمل، استقلال و بردباری، اولوالعزمی و شجاعت ہمیشہ سے وہ اوصاف رہے ہیں جو داد کے مستحق سمجھے گئے اور بے صبری، چھچھورا پن، تلون مزاجی، پست حوصلگی اور بزدلی پر کبھی تحسین و آفریں کے پھول نہیں برسائے گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی اخلاقیات دراصل وہ عالم گیر حقیقتیں ہیں جن کو سب انسان جانتے چلے آ رہے ہیں۔ نیکی اور بدی کوئی ڈھکی چھپی چیزیں نہیں ہیں کہ انہیں کہیں سے ڈھونڈ نکالنے کی ضرورت ہو۔ وہ تو انسان کی جانی پہچانی چیزیں ہیں جن کا شعور آدمی کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اپنی زبان میں نیکی کو ''معروف'' اور بدی کو ''منکر'' کہتا ہے۔ یعنی نیکی وہ چیز ہے جسے سب انسان بھلا جانتے ہیں اور منکر وہ جسے کوئی خوبی اور بھلائی کی حیثیت سے نہیں جانتا۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید دوسرے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے کہ فالھمھا فجورھا وتقواھا (سورۃ الشمس)، یعنی نفس انسان کو خدا نے برائی اور بھلائی کی واقفیت الہامی طور پر عطا کر رکھی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر برائی اور بھلائی جانی اور پہچانی چیزیں ہیں اور دنیا ہمیشہ سے بعض صفات کے نیک اور بعض کے بد ہونے پر متفق ہی ہے تو پھر دنیا میں مختلف اخلاقی نظام اور نظریے کیوں ہیں؟ اور اخلاق کے معاملے میں آخر اسلام کا وہ خاص عطیہ کیا ہے جسے اس کی امتیازی خصوصیت کہا جا سکے۔

اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے جب ہم دنیا کے مختلف اخلاقی نظاموں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پہلی نظر میں جو فرق ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ مختلف اخلاقی صفات کو زندگی کے مجموعی نظام میں سمونے، اور ان کی حد، ان کا مقام اور ان کا مصرف تجویز کرنے اور ان کے درمیان تناسب قائم کرنے میں، یہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پھر زیادہ گہری نگاہ سے دیکھنے پر اس فرق کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دراصل وہ اخلاقی حسن و قبح کا معیار تجویز کرنے اور خیر و شر کے علم کا ذریعہ متعین کرنے میں مختلف ہیں اور ان کے درمیان اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ قانون کے پیچھے وہ قوت نافذہ کون سی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ہے جس کے زور سے وہ جاری ہو اور وہ کیا محرکات ہیں جو انسان کو اس قانون کی پابندی پر آمادہ کریں لیکن جب ہم اس اختلاف کا کھوج لگاتے ہیں تو آخر کار یہ حقیقت ہم پر کھلتی ہے کہ وہ اصلی چیز جس نے ان سب اخلاقی نظاموں کے راستے الگ کر دیے ہیں یہ ہے کہ ان کے درمیان کائنات کے تصور، کائنات کے اندر انسان کی حیثیت اور انسانی زندگی کے مقصد میں اختلاف ہے اور اسی اختلاف نے جڑ سے لے کر شاخوں تک ان کی روح، ان کے مزاج اور ان کی شکل کو ایک دوسرے سے مختلف کر دیا ہے۔

کائنات کے متعلق اسلام کا تصور یہ ہے کہ اس دنیا کا ایک خالق و حاکم ہے۔ وہی ہم سب انسانوں کا آقا ہے۔ وہ حکیم ہے، قادر مطلق ہے، کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے، سبوح وقدوس ہے، اور اس کی خدائی ایسے طریقے پر قائم ہے جس میں نیز ھا نہیں ہے۔ انسان اس کا بندہ اور نائب ہے لہٰذا انسان کا فرض ہے کہ اپنی زندگی کا نظام خدا کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق ڈھالے۔ انسان اپنی زندگی کے پورے کارنامے کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے اور اسے یہ جواب دہی اپنی مکمل ترین شکل میں آخرت میں کرنی ہے۔ چنانچہ انسان کی تمام سعی و کوشش اس مقصد پر مرکوز ہونی چاہیے کہ وہ آخرت کی جواب دہی میں اپنے خدا کے حضور کامیاب ہو۔ دنیا کی موجودہ زندگی دراصل امتحان کی مہلت ہے۔ اس امتحان میں انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ شریک ہے۔ اس کی تمام قوتوں اور قابلیتوں کا امتحان ہے۔ زندگی کے ہر پہلو کا امتحان ہے۔ پوری کائنات میں جس چیز سے جیسا کچھ بھی اس کو سابقہ پیش آتا ہے، اس کی بے لاگ جانچ ہوتی ہے کہ انسان نے اس کے ساتھ کیسا معاملہ کیا۔ اور جانچ وہ ہستی کرنے والی ہے جس نے کائنات کی ہر چیز کو انسان کی خدمت گزاری کے لیے مسخر کر دیا ہے اور جس نے خود انسان کو اس کے دل و دماغ پر اور دست و پا پر اختیار بخشا ہے اور اس ہستی کو انسان کی حرکات وسکنات ہی کا نہیں، اس کے خیالات اور ارادوں تک کا پورا پورا علم ہے اور ان کی ہر تفصیل اس ہستی کے پاس محفوظ ہے۔

مقصد:

یہ تصور کائنات وانسان اس اصلی بھلائی کو متعین کرتا ہے جس کا حصول انسانی سعی وعمل کا مقصود ہونا چاہیے اور وہ ہے خدا کی رضا۔ یہی وہ معیار ہے جس پر اسلام کے اخلاقی نظام میں کسی طرزِ عمل کو پرکھ کے فیصلہ کیا جاتا ہے کہ وہ خیر ہے یا شر۔ اس کے تعین سے اخلاق کو وہ محور مل جاتا ہے جس کے گرد پوری اخلاقی زندگی گھومتی ہے اور اس کی حالت بے لنگر جہاز کی سی نہیں رہتی کہ ہوا کے جھونکے اور موجوں کے تھپیڑے اسے ہر طرف دوڑاتے پھریں۔ اس کی بنا پر انسان کے سامنے ایک مرکزی مقصد آ جاتا ہے۔ جس کی روشنی میں زندگی میں اخلاقی صفات کی مناسب حدیں، مناسب جگہیں اور مناسب عملی صورتیں مقرر ہو جاتی ہیں اور ہمیں وہ مستقل اقدار ہاتھ لگ جاتی ہیں جو تمام بدلتے ہوئے حالات میں اپنی جگہ قائم رہ سکیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رضائے الٰہی کے مقصود قرار پا جانے سے اخلاق کو ایک بلند ترین غایت مل جاتی ہے جس کی بدولت اخلاقی ارتقا کے امکانات لامتناہی ہو سکتے ہیں اور کسی مرحلے پر بھی اغراض پرستوں کی آلائشیں اس کو ملوث نہیں کر سکتیں۔

ماخذ:

معیار دینے کے ساتھ اسلام اپنے اسی تصور کائنات وانسان سے ہم کو اخلاقی حسن وقبح کے علم کا ایک مستقل ذریعہ بھی دیتا ہے۔ اس نے ہمارے علم اخلاق کو محض عقل یا خواہشات یا تجربے یا علوم انسانی پر منحصر نہیں کر دیا ہے کہ ہمیشہ ان کے بدلتے ہوئے فیصلوں سے ہمارے اخلاقی احکام بھی بدلتے رہیں اور انہیں کوئی پائیداری نصیب ہی نہ ہو سکے، بلکہ وہ ہمیں ایک معین ماخذ دیتا ہے یعنی خدا کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت، جن سے ہم کو ہر حال اور ہر زمانے میں اخلاقی ہدایات ملتی ہیں اور یہ ہدایات ایسی ہیں کہ خانگی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر بین الاقوامی سیاست کے بڑے سے بڑے مسائل تک زندگی کے ہر پہلو اور شعبے میں وہ ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ ان کے اندر معاملاتِ زندگی پر اخلاق کے اصولوں کا وسیع ترین انطباق پایا جاتا ہے جو کسی مرحلے پر کسی دوسرے ذریعے علم کی احتیاج ہمیں محسوس نہیں ہونے دیتا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

قوت نافذہ:

پھر اسلام کے اسی تصور کائنات وانسان میں وہ قوت نافذ بھی موجود ہے جس کا قانون اخلاق کی پشت پر ہونا ضروری ہے، اور وہ ہے خدا کا خوف، آخرت کی باز پرس کا اندیشہ، اور ابدی مستقبل کی خرابی کا خطرہ۔ اگر چہ اسلام ایک طاقتور رائے عام بھی تیار کرنا چاہتا ہے جو اجتماعی زندگی میں اشخاص اور گروہوں کو اصول اخلاق کی پابندی پر مجبور کرنے والی ہو اور ایک ایسا سیاسی نظام بھی بنانا چاہتا ہے جس کا اقتدار اخلاقی قانون کو بزور نافذ کرے، لیکن اس کا اصل اعتماد اس خارجی دباؤ پر نہیں ہے بلکہ اس اندرونی دباؤ پر ہے جو خدا اور آخرت کے عقیدے میں مضمر ہے۔ اخلاقی احکام دینے سے پہلے اسلام آدمی کے دل میں یہ بات بٹھاتا ہے کہ تیرا معاملہ اس خدا کے ساتھ ہے جو ہر وقت، ہر جگہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ تو دنیا بھر سے چھپ سکتا ہے مگر اس سے نہیں چھپ سکتا۔ دنیا بھر کو دھوکہ دے سکتا ہے مگر اسے دھوکہ نہیں دے سکتا، دنیا بھر سے بھاگ سکتا ہے مگر اس کی گرفت سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتا۔ دنیا محض تیرے ظاہر کو دیکھتی ہے مگر وہ تیری نیتوں اور ارادوں تک کو دیکھ لیتا ہے۔ دنیا کی تھوڑی سی زندگی میں تو چاہے کچھ کرے بہر حال ایک دن تجھے مرنا ہے اور اس عدالت میں تجھے حاضر ہونا ہے جہاں وکالت، رشوت، سفارش، جھوٹی شہادت، دھوکہ اور فریب کچھ نہ چل سکے گا اور تیرے مستقبل کا بے لاگ فیصلہ ہو جائے گا۔ یہ عقیدہ دل میں جاگزیں کر کے اسلام گویا ہر آدمی کے دل میں پولیس کی ایک چوکی بٹھا دیتا ہے جو اندر سے اس کو احکام کی تعمیل پر مجبور کرتی ہے۔ خواہ باہر ان احکام کی پابندی کرانے والی کوئی پولیس، عدالت اور جیل موجود ہو یا نہ ہو۔ اسلام کے قانون اخلاق کی پشت پر اصل قوت یہی ہے جو اسے نافذ کراتی ہے۔ رائے عام اور حکومت کی طاقت اس کی تائید میں موجود ہو تو نور علی نور، ورنہ تنہا یہی ایمان مسلمان افراد اور مسلمان قوم کو سیدھا چلا سکتا ہے، بشرطیکہ واقعی ایمان دلوں میں جاگزیں ہو۔

محرکات:

اسلام کا یہ تصور کائنات وانسان وہ محرکات بھی فراہم کرتا ہے جو انسان کو قانون اخلاق کے مطابق عمل کرنے کے لیے ابھارتے ہیں۔ انسان کا اس بات پر راضی ہو جانا کہ وہ خدا کو اپنا خدا مانے اور اس کی بندگی کو اپنی زندگی کا طریقہ بنائے اور اس کی رضا کو اپنا مقصد زندگی ٹھہرائے، یہ اس بات کے لیے کافی محرک ہے کہ وہ ان احکام کی اطاعت کرے جن کے متعلق اسے یقین ہو کہ خدا کے احکام ہیں۔ اس محرک کے ساتھ آخرت کا یہ عقیدہ بھی ایک طاقت ور محرک ہے کہ جو شخص احکام الٰہی کی اطاعت کرے گا اس کے لیے ابدی زندگی میں ایک شاندار مستقبل یقینی ہے، خواہ دنیا کی اس عارضی زندگی میں اسے کتنی ہی مشکلات، نقصانات اور تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑے اور اس کے برعکس جو یہاں سے خدا کی نافرمانیاں کرتا ہوا جائے گا، اسے ابدی سزا بھگتنا پڑے گی، چاہے دنیا کی چند روزہ زندگی میں وہ کیسے ہی مزے لوٹ لے۔ یہ امید اور یہ خوف اگر کسی کے دل میں جاگزیں ہو تو اس میں اتنی زبردست قوت محرکہ موجود ہے کہ وہ ایسے مواقع پر بھی اسے نیکی پر ابھار سکتی ہے جہاں نیکی کا نتیجہ دنیا میں سخت نقصان دہ نکلتا ہوا نظر آتا ہے اور ان مواقع پر بھی بدی سے دور رکھ سکتی ہے جہاں بدی نہایت پر لطف اور نفع بخش دکھائی دے۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اپنا تصور کائنات، اپنا معیار خیر وشر، اپنا ماخذ علم اخلاق، اپنی قوت نافذہ اور اپنی قوت محرکہ الگ رکھتا ہے۔ ان ہی چیزوں کے ذریعے سے معروف اخلاقیات کے مواد کو اپنی قدروں کے مطابق ترتیب دے کر زندگی کے تمام شعبوں میں جاری کرتا ہے۔ اسی بنا پر یہ کہنا صحیح ہے کہ اسلام اپنا ایک مکمل اور مستقل بالذات اخلاقی نظام رکھتا ہے۔

اسلامی تصور کی امتیازی خصوصیات:

اس نظام کی امتیازی خصوصیات یوں تو بہت سی ہیں مگر ان میں تین سب سے نمایاں ہیں جنہیں اس کا خاص عطیہ کہا جاسکتا ہے:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

(۱) پہلی خصوصیت یہ ہے کہ رضائے الٰہی کو مقصود بنا کر اخلاق کے لیے ایک ایسا بلند معیار فراہم کرتا ہے جس کی وجہ سے اخلاق ارتقا کے امکانات کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ پھر ایک ماخذ علم متعین کر کے اخلاق کو وہ پائیداری اور استقلال بخشتا ہے جس میں ترقی کی گنجائش تو ہے مگر تلون اور بے رنگی کی گنجائش نہیں ہے۔ نیز خوف خدا کے ذریعے سے اخلاق کو وہ قوت نافذہ دیتا ہے جو خارجی دباؤ کے بغیر انسان سے اس کی پابندی کراتی ہے اور خدا و آخرت کے عقیدے سے وہ قوت محرکہ فراہم کرتا ہے جو انسان کے اندر خود بخود قانون اخلاق پر عمل کرنے کی رغبت اور آمادگی پیدا کرتی ہے۔

(۲) دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ خواہ مخواہ کی اپج سے کام لے کر نرالے اخلاقیات نہیں پیش کرتا اور نہ انسان کے معروف اخلاقیات میں سے بعض کو بلاوجہ گھٹانے اور بعض کو بلاسبب بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ان ہی اخلاقیات کو لیتا ہے جو معروف ہیں، جن کو انسانیت کے اجتماعی ضمیر نے قبول کیا ہے اور ان میں سے بھی محض چند کو نہیں، بلکہ سب کو لیتا ہے۔ پھر زندگی میں پورے توازن اور تناسب کے ساتھ ایک ایک کا محل، مقام اور مصرف تجویز کرتا ہے اور ان کے انطباق کو اتنی وسعت دیتا ہے کہ انفرادی کردار، خانگی معاشرت، شہری زندگی، ملکی سیاست، معاشی کاروبار، بازار، مدرسہ، عدالت، پولس لائن، چھاؤنی، میدان جنگ، صلح کانفرنس، بین الاقوامی معاملات، غرض زندگی کا کوئی پہلو اور شعبہ ایسا نہیں رہ جاتا جو اخلاق کے ہمہ گیر اثر سے بچ جائے، ہر جگہ، ہر شعبہ زندگی میں وہ اخلاق کو حکم داں بناتا ہے اور اس کی کوشش یہ ہے کہ معاملات زندگی کی باگیں خواہشات، اغراض اور مصلحتوں کی بجائے اصول اخلاق کے ہاتھوں میں ہوں۔

(۳) تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانیت سے ایک ایسے نظام زندگی کے قیام کا مطالبہ کرتا ہے جو معروف پر قائم اور منکر سے پاک ہو، اس کی دعوت یہ ہے کہ جن بھلائیوں کو انسانیت کے ضمیر نے ہمیشہ بھلا جانا ہے انہیں قائم کرے اور پروان چڑھائے، اور جن برائیوں کو انسانیت ہمیشہ سے برا سمجھتی چلی آئی ہے اس کی بیخ کنی کرے۔ اس دعوت پر جنہوں نے لبیک کہا ان کو جمع کر کے اس نے ایک امت بنائی جس کا نام امت مسلمہ ہے۔ اور ان کو ایک امت بنانے کی واحد غرض یہی ہے کہ وہ معروف کا جاری و قائم کرنے اور منکر کو دبانے اور مٹانے کے لیے منظم سعی کرے۔ اب اگر اسی امت کے ہاتھوں معروف دبے اور منکر قائم ہونے لگے تو یہ ماتم کا مقام ہے، خود اس امت کے لیے بھی اور ساری دنیا کے لیے بھی۔

اسلامی نظام اخلاق کے متعلق قرآن وحدیث کی تعلیمات

کسی شخص کی روح میں پاکیزگی ہے یا گندگی، اس بات کی پہلی اور سب سے عام کسوٹی اس کے اخلاق ہوتے ہیں۔ باطن جس طرح کا ہوگا اخلاق بھی ویسے ہی ظہور میں آئیں گے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ عام طور سے انسان کے اخلاق ہی اس کی انسانیت کے آئینہ دار مانے جاتے ہیں۔ اس لیے فطری ترتیب کے لحاظ سے روحانی نظام کے بعد اخلاقی نظام ہی کا نمبر آنا چاہیے۔ جہاں تک دین کا تعلق ہے، اس کا فیصلہ بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس نے حسن اخلاق کو بڑی زبردست اہمیت دی ہے، اتنی کہ ایک پہلو سے گویا وہی حاصل دین ہے۔ نبی ﷺ کے الفاظ سنیے، فرماتے ہیں:

بعثت لاتمم حسن الاخلاق. (مشکوۃ بحوالہ موطا)

میں اس لیے بھیجا گیا ہوں تا کہ حسن اخلاق کی تکمیل کروں۔

البر حسن الخلق (مسلم)

نیکی حسن خلق کا نام ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

یہی وجہ ہے کہ اخلاقیات کے باب میں اسلام نے بڑی تفصیل اور بڑی تاکید سے کام لیا ہے۔ ان وجوہ سے اسلامی نظام کے دوسرے اجزاء سے پہلے اسی جز کا مطالعہ کیا جانا مناسب ہوگا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے اسلامی اخلاقیات کی حیثیت جان لینی چاہیے یعنی یہ کہ کیا اسلام میں اچھے اخلاق اور برے اخلاق طے شدہ ہیں؟ اور اگر طے شدہ ہیں تو کیا ہمیشہ کے لیے طے شدہ ہیں یا حالات زمانہ کی بنا پر ان میں کوئی تغیر بھی ہو سکتا ہے؟ ان سوالوں کا جواب یہ ہے کہ اچھے اور برے اخلاق کا فیصلہ کرنے والی اسلام میں ایک متعین اتھارٹی ہے، اور وہ ہے اللہ ورسول ﷺ کی اتھارٹی۔ اچھا اخلاق وہی چیز ہوتی ہے جسے اللہ و رسول ﷺ نے اچھا اخلاق قرار دے رکھا ہو۔ اسی طرح برا اخلاق صرف وہ چیز ہوتی ہے جسے اللہ ورسول ﷺ نے برا اخلاق فرمایا ہو۔ اس لیے اس کے یہاں اچھے اور برے اخلاق کا مسئلہ ایک طے شدہ مسئلہ ہے۔ کسی انسانی عقل یا تجربے کا محتاج یا منتظر بالکل نہیں ہے۔ ویسے تو جہاں تک عام جائزے کا تعلق ہے نظر یہی آئے گا کہ معروف اخلاقیات ہمیشہ سے اور ہر معاشرے میں رائج رہی ہیں، اور وہ صرف اسلام ہی کی کوئی خاص چیز نہیں ہیں۔ مگر اس کے باوجود اسلامی اخلاقیات اور عام و معروف اخلاقیات دونوں کو ایک سمجھ لینا بڑی بھاری غلطی ہوگی۔ کیونکہ اسلام نے کسی طرز عمل کو اچھا اخلاق یا برا اخلاق اس لیے نہیں کہا ہے کہ لوگ اسے ایسا ہی کہتے اور سمجھتے چلے آئے ہیں یا عقل و تجربے سے اس کی یہی حیثیت متعین ہوگئی ہے، بلکہ خود اپنے اصولوں کی بنا پر کہا ہے۔ چنانچہ جہاں بے شمار اسلامی اخلاقیات بعینہ وہی ہیں جو عام طور پر تسلیم شدہ چلی آ رہی ہیں، وہیں بہت سی چیزیں اس کے یہاں ایسی بھی ملیں گی جو اس کے نزدیک تو خیر اور حسن خلق ہیں، مگر دوسرے انھیں ایسا نہیں مانتے۔ اسی طرح کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جن کو وہ شر اور بد خلقی کہتا ہے، مگر کتنے ہی لوگ اسے بھلائی کا درجہ دیتے ہیں۔ یہ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ اخلاق کے بارے میں اسلام کا اپنا مخصوص معیار بھی ہے اور اپنا ایک مستقل نظام بھی، اور اچھے یا برے اخلاق کا تمام تر فیصلہ شریعت اپنے اصول اور مزاج کے مطابق خود کرتی ہے۔ اب چونکہ اسلامی اخلاقیات کی ایک مستقل بنیاد ہے، اور وہ سب کی سب اسلام کے بنیادی اصولوں کا راست ثمرہ ہیں، اس لیے وہ مستقل اور ناقابل تغیر بھی ہیں۔ حالات زمانہ کا کوئی تقاضا ایسا نہیں ہو سکتا جس کے لیے ان کا ایک شوشہ بھی اپنی جگہ سے ہٹا دیا جا سکتا ہو۔ سچائی اور دیانت داری ہر حال میں بہترین انسانی صفت رہے گی۔ انصاف اس وقت بھی ضروری ہوگا جب کہ اپنا نقصان ہو رہا ہو، وعدہ خلافی کسی دشمن سے بھی روا نہیں۔ غرض یہ اخلاقیات ہر حال میں اپنی جگہ قائم رہنے والی ہیں اور اسلامی اخلاقی قدریں کسی حالت میں بھی بدلنے والی چیز نہیں۔

یہ ہے اسلامی اخلاقیات کی حیثیت۔ اسے ذہن میں رکھ کر اب ان کے جائزے کی طرف آئیے اور دیکھیے کہ وہ کیا ہیں؟ پہلے ان اخلاقیات کو لیجیے جن کا تعلق انسان کی عام زندگی سے ہے اور جو بنیادی نوعیت کی ہیں، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ القصص 77:28

لوگوں کے ساتھ بھلائی کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی ہے۔

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ آل عمران 134:3

(ان متقیوں کے لیے) جو غصے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ الحج 38:22

بلاشبہ اللہ کسی دغاباز اور ناشکرے کو پسند نہیں کرتا۔

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا بنی اسرائیل 26:17

اور فضول خرچی نہ کرو۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ط إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ لقمان 18:31

لوگوں سے باتیں کرتے وقت اپنے گالوں کو ٹیڑھا نہ رکھ، نہ زمین پر اترا کر چل۔ کوئی شک نہیں کہ اللہ کسی مغرور اور شیخی باز کو بالکل پسند نہیں کرتا۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ O ہمزہ 1:104

ہلاکت ہے ہر طعنہ دینے والے اور عیب لگانے والے کے لیے۔

نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

بلاشبہ سچائی نیکی کی طرف اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور جھوٹ بدی کی اور بدی جہنم کی راہ دکھاتی ہے۔ (بخاری و مسلم)

تھوڑی سی ریا بھی شرک ہے۔ (مشکوٰۃ)

ظلم کرنے سے بچو، کیونکہ ظلم قیامت کے دن اندھیاریوں کی شکل اختیار کرلے گا۔ (مسلم)

چار خصلتیں جس کے اندر ہوں گی وہ پکا منافق ہوگا۔ اور جس کے اندر ان میں سے کوئی ایک ہوگی اس کے اندر نفاق کی ایک صفت ہوگی۔ (وہ چار خصلتیں یہ ہیں) جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرجائے۔ بات کرے تو جھوٹ بولے۔ وعدہ کرے تو پورا نہ کرے۔ جھگڑے تو گالیوں پر اتر آئے۔ (مسلم)

نرمی اختیار کرو، درشتی اور بدکلامی سے دور رہو۔ (مسلم)

چغلی کھانے والا جنت سے محروم رہے گا۔ (مسلم)

اللہ اس شخص پر رحم نہ کرے گا جو دوسرے لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔ (بخاری)

دغاباز، بخیل اور احسان جتانے والے جنت میں نہ جائیں گے۔ (ترمذی)

اسلام کی ان عام اور بنیادی قسم کی اخلاقی تعلیمات کے بعد ان اخلاقیات کی طرف آیئے جن کی تلقین اس نے زندگی کے مخصوص دائروں کو سامنے رکھتے ہوئے کی ہے:

ا۔ انسانی زندگی کا سب سے پہلا دائرہ اس کی گھریلو زندگی ہے، جہاں اس کا اپنی بیوی اور اپنے بچوں سے ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔ ہر شخص کو اپنے اہل وعیال کے ساتھ فطری طور پر بڑی گہری محبت ہوتی ہے، اور اس لیے وہ عموماً ان کے ساتھ ایثار اور قربانی کا سلوک بھی لازماً کرتا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ یہ سلوک محض ایک تقاضائے فطرت ہی نہیں بلکہ ایک دینی فریضہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ النساء 19:4

اپنی عورتوں کے ساتھ بھلے طریقے سے رہو سہو۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

خیارکم خیارکم لنسائکم. ترمذی

تم میں سب سے اچھے لوگ وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے حق میں اچھے ہوں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

استوصوا بالنساء خیرا۔ بخاری ومسلم

عورتوں کے معاملے میں اچھے رویے کی وصیت قبول کرو۔

۲۔ گھریلو زندگی کے آگے خاندانی زندگی کا دائرہ آتا ہے۔ جہاں انسان کا واسطہ ماں باپ اور بھائی بہن وغیرہ قریبی رشتہ داروں سے پیش آتا ہے۔ والدین کے ساتھ جس رویے کے اختیار رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اس کا اندازہ صرف اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم اپنی بندگی کے حکم کے ساتھ ساتھ دیا ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا النساء:4:36

اور فرمایا کہ:

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا بنی اسرائیل:
24:17

ان کے لیے فروتنی کے بازوؤں کو رحم وشفقت سے جھکا دو اور دعا کرو کہ پروردگار! ان پر رحمت نازل فرما، جس طرح کہ انھوں نے (رحمت وشفقت کے ساتھ) مجھے بچپن میں پالا تھا۔

نبی ﷺ نے اس سلسلے میں جو کچھ فرمایا ہے اس میں سے صرف ایک دو ارشادات سنیے:

تمہارے والدین تمہاری جنت اور دوزخ ہیں۔ (ابن ماجہ بحوالہ مشکوۃ)

جو نیکوکار اولاد اپنے والدین پر محبت اور شفقت کی نظر ڈالتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ایسی ہر نظر کے بدلے اسے ایک مقبول حج کا ثواب عطا فرماتا ہے۔ (بیہقی، بحوالہ مشکوۃ)

حد یہ ہے کہ اگر والدین، خدانخواستہ، کافر ہوں، کافر ہی نہیں بلکہ سخت قسم کے دشمن اسلام کافر ہوں، تو بھی ان کی خدمت اور دلداری کے حقوق اپنی جگہ باقی ہی رہیں گے، اور ضروری ہے کہ ان حقوق کو پورا کیا جائے:

وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا لقمان:15:31

رہے دوسرے رشتے دار تو ان کے بارے میں بھی قرآن حکیم نے عام اور ہمہ گیر حسن سلوک کی ہدایت فرما رکھی ہے۔ چنانچہ سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا کے بعد ہی وَّبِذِي الْقُرْبٰى کے الفاظ آئے ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح والدین کے ساتھ ان کے مرتبے کے مطابق حسن سلوک کرنا چاہیے اسی طرح رشتے داروں کے ساتھ بھی کرنا چاہیے۔ ان میں جو رشتے دار جتنا ہی زیادہ قریب کا رشتہ رکھتا ہو گا اس کے حقوق بھی اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔ امک ثمہ اباک ثمہ ادناک ثم ادناک. (بخاری) اور ایک مومن کا فرض ہے کہ انھی کے مطابق ان سے سلوک کرے۔

رشتے داروں کے ساتھ اچھے سلوک کو اصطلاح میں "صلہ رحمی" کہا جاتا ہے جس کے معنی ہیں خونی رشتوں کو جوڑے رکھنا اور اس کی پاسداری کرنا۔ قرآن حکیم نے صلہ رحمی کو انسانیت اور دینداری کا ایک بنیادی پتھر قرار دیا ہے اور اس کی بار بار تلقین کی ہے۔

رسول خدا ﷺ فرماتے ہیں کہ صلہ رحمی ایمان کے لوازم میں سے ہے:

من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیصل رحمہ (بخاری)

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

جو کوئی اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔

لا یدخل الجنۃ قاطع (بخاری)

رحمی رشتے کاٹنے والا جنت میں داخل نہ ہو سکے گا۔

- اس کے بعد پڑوس اور محلے کا دائرہ آتا ہے۔ پڑوسیوں کے بارے میں ایک مسلمان کو جس طرح پیش آنا چاہیے اس کی وضاحت کے لیے دو حدیثیں کافی ہیں۔

آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ:

مازال جبریل یوصینی بالجار حتی ظننت انہ سیورثہ. (بخاری)

جبریل مجھے پڑوی کے حق میں برابر وصیت کرتے رہے یہاں تک کہ مجھے خیال ہوا ہو چلا کہ وہ اسے وارث بنا دیں گے۔

لا یدخل الجنۃ من لا یامن جارہ بوائقہ. (مسلم)

جس شخص کا پڑوسی اس کی ایذاؤں سے محفوظ نہ ہو وہ جنت میں نہ جائے گا۔

- اب اور آگے معاشرتی زندگی کا بڑا پھیلا ہوا دائرہ ہوتا ہے جس کے اندر انسان کو مختلف قسم کے لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ان لوگوں سے اس کا جو رویہ ہونا چاہیے اصولی طور پر اس کا تعین قرآن مجید کے یہ الفاظ کرتے ہیں:

وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ط (النساء:4:36)

اور اللہ نے حکم دیا ہے اچھا سلوک کرنے کا والدین کے ساتھ، نیز رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں، رشتے دار پڑوسیوں، اجنبی ہمسایوں، پہلو میں بیٹھنے والوں، مسافروں اور غلاموں کے ساتھ۔

انسانی تعلقات کی رو سے لوگوں کی جتنی قسمیں ہو سکتی تھیں، اس آیت نے ان میں سے ایک ایک کا نام لے کر گنا دیا ہے اور سب کے بارے میں یہ جامع ہدایت کر دی ہے کہ ان کے ساتھ ایک مسلمان کا رویہ لازماً ''احسان'' اور بھلائی کا ہونا چاہیے۔

- عام معاشرتی زندگی کے بعد حکومتی دائرہ آتا ہے۔ اسلامی سوسائٹی ہر فرد کی سیاسی اور انتظامی پہلو سے بھی ایک متعین حیثیت ہوتی ہے۔ یا تو وہ صاحب امر ہے اور حاکم کا مقام رکھتا ہے، تو اپنی رعایا کے ساتھ اس کا جو رویہ ہونا چاہیے اس کی وضاحت اس ارشاد نبوی ﷺ سے ہوتی ہے:

ما من امیر یلی امور المسلمین ثم لا یجھد لھم ولا ینصح لھم الا لم یدخل معھم الجنۃ (مسلم)

جو کوئی امیر مسلمانوں کے معاملات کا ذمے دار ہوتے ہوئے بھی ان کے لیے مشقتیں نہیں جھیلتا اور نہ ان کی خیر خواہی کرتا ہے، وہ ان کے ساتھ جنت میں نہ جائے گا۔

اور اگر وہ رعایا ہے تو اسے اپنے حاکم کے ساتھ جو طرز عمل اختیار کرنا چاہیے اس کا تعین یہ حدیث کرتی ہے:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

الدین النصیحۃ قلنا لمن؟ قال اللہ ولرسولہ ولائمۃ المسلمین وعامتھم۔

(آپ ﷺ نے فرمایا) دین خیر خواہی اور وفاداری کا نام ہے۔ پوچھا گیا، کس کی وفاداری کا: فرمایا: اللہ کی، اس کے رسول ﷺ کی، مسلمانوں کے امرا کی اور سارے اہل اسلام کی۔

یعنی دین داری اور خدا پرستی کے تقاضوں میں یہ بات بھی لازماً شامل ہے کہ امراء کا رویہ اپنی رعایا کے ساتھ اور رعایا کا رویہ اپنے امراء کے ساتھ دونوں کا خیر خواہی اور خلوص کا ہو۔

۶۔ سب سے آخری دائرہ ایک مسلمان کی زندگی کا وہ ہے جو مسلم معاشرے سے باہر کا ہوتا ہے اور جو غیر مسلموں کے ساتھ معاملات اور تعلقات کی بنا پر وجود میں آتا ہے۔ یہاں اسے جس اخلاقی روش کا پابند رہنا چاہیے اس کا بنیادی اصول اس آیت میں موجود ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ ز وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا قف ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ز (المائدہ 8:5)

اے ایمان والو! اللہ کے (دین کے) لیے کھڑے ہونے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو، اور کسی گروہ کی دشمنی تمھیں انصاف سے ہرگز باز نہ رکھنے پائے۔ عدل کرو، یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے۔

یہ ہیں وہ بنیادی خطوط جس پر اسلام انسان کی اخلاقی زندگی تعمیر کرتا ہے۔ انھیں دیکھ کر ہر شخص محسوس کرے گا کہ مسلمان کی زندگی کا بند بند اخلاق کے مستحکم ضابطوں سے کسا ہوا ہے۔

اخلاقی صفات

روئیے تو ہر عمل صالح، اگر وہ خالص خدا کی رضا کے لیے کیا جائے اسلام کے نزدیک عبادت کا درجہ رکھتا ہے، اور عبادت ہی کہلانے کا مستحق ہے۔ لیکن مسلمان مفکرین نے عوام کے لیے بات کو آسان اور قابل فہم بنانے کے لیے عبادت کا لفظ صرف ان اعمال صالحہ کے لیے مخصوص کر دیا ہے جن کے ذریعے سے بندہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی معبودیت کا اعتراف کرتے ہوئے، اس کے سامنے اپنی بندگی اور اپنے عجز و نیاز کا اظہار کرتا ہے۔

اعمال صالحہ کی دوسری قسم وہ ہے جس سے پیغمبرانہ دعوت و اصلاح کا اظہار ہوتا ہے۔ یعنی ایسے اعمال جو دراصل انبیا علیہم السلام کے ہیں اور دوسرے لوگ ان کو انبیا ہی کے مقصد کو پھیلانے کے لیے کرتے ہیں جیسے تبلیغ دین اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر (نیکی کو قائم کرنا اور برائی سے روکنا)۔

اعمال صالحہ کی تیسری قسم وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی نیابت کا رنگ ہے۔ ایسے ہی اعمال فنی اصطلاح میں اخلاق کہلاتے ہیں، مراد یہ ہے کہ جب انسان اپنے ہم جنسوں اور دوسری مخلوقات سے پیش آئے تو اس حیثیت سے کہ وہ کائنات کے مالک و آقا کا نمائندہ ہے اور ایک نمائندہ کا چونکہ یہ فرض ہوتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے وہ اپنے کو اسی رنگ میں پیش کرے جو خود مالک کا رنگ ہے، اس لیے انسان کو وہ تمام صفات اپنے اندر پیدا کرنی چاہئیں جو خدا کی صفات ہیں مثلاً رحم ایک صفت ہے جو دراصل اللہ تعالیٰ میں ہے، اور وہ اس کی وجہ سے رحمان اور رحیم ہے۔ پھر بندوں کو بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ وہ اپنے اندر رحم کی صفت پیدا کریں اور ہر قابل رحم مخلوق کے ساتھ رحم کا معاملہ کریں۔ اسی طرح خطا اور قصور معاف کرنا، اور دوسروں کے عیب چھپانا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور بندوں کو بھی حکم ہے کہ وہ بھی اپنے اندر یہ صفت پیدا کریں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اخلاق کی تعریف سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اخلاق کا تعلق خدا اور بندے کے باہمی رشتے سے نہیں بلکہ ان تعلقات سے ہے، جو انسانوں اور انسانوں کے درمیان قائم ہوتے ہیں۔ معاشی لین دین ہو یا سیاسی معاملات، سماجی برتاؤ ہو یا افراد خاندان سے سلوک، اسلام سب کو اخلاقی اصولوں کے مطابق انجام دینے کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن وسنت میں معاملات ومعاشرت سے متعلق بالتفصیل ان صفات کا ذکر ہے جو خدا کو پسند یا ناپسند ہیں۔ ان سب کا احاطہ کرنا اس مختصر باب میں مشکل ہے، اس لیے صرف چند اہم صفات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

پسندیدہ صفات

صبر:

اسلام کو جو انفرادی اور اجتماعی نیکیاں انسانوں میں مطلوب ہیں ان میں ایک صبر ہے۔ اردو میں صبر کے معنی بہت محدود ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ صبر کا مطلب بس یہ ہے کہ موت، بیماری اور فقر وتنگ دستی جیسی مصیبتوں کو اس طرح برداشت کر لیا جائے کہ شور وفغاں اور شکوہ وشکایت کا اظہار نہ ہو اور کوئی ظالم اگر ظلم کرے تو اس کا انتقام نہ لیا جائے اور نہ نالہ وفریاد کی جائے، مگر قرآن کی زبان میں صبر کے معنی اس سے بہت زیادہ وسیع وعمیق ہیں۔ مختصر الفاظ میں اس حقیقت کو کچھ اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ کسی نیک کام کے لیے صدموں، تکلیفوں اور ناگواریوں کو برداشت کرنا اور ناموافق حالات میں بھی حق اور سچائی پر مضبوطی سے جمے رہنا اور نیکی کے راستے پر چلتے رہنا صبر ہے، قرآن پاک نے صبر کو ایک ذریعۂ قوت قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ "اے ایمان والو! (مشکلوں اور تکلیفوں میں) صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔"

سچائی اور راست بازی:

قرآن مجید سے جن اخلاقی صفات کی بہت زیادہ اہمیت وفضیلت معلوم ہوتی ہے ان میں ایک سچائی اور راست بازی بھی ہے۔ سچائی کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ زبان سے غلط اور خلاف واقعہ بات نہ کہی جائے، بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں دل کی سچائی اور عمل کی سچائی بھی شامل ہے۔ دل کی سچائی کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا نفاق اور کوئی دغا اور فریب نہ ہو۔ اور عمل کی سچائی کا مطلب یہ ہے کہ جو عقیدہ اور قول ہو وہی عمل بھی ہو اور ظاہر وباطن میں پوری یکسانیت ہو۔ جن بندوں کا حال یہ ہو وہی قرآن کی اصطلاح میں "صادق" ہیں۔ قرآن وسنت میں صدق کو مومن اور منافق کے درمیان وجہ امتیاز قرار دیا گیا ہے۔

عدل وانصاف:

جن اخلاقی اور معاشرتی امور پر اسلام نے سب سے زیادہ زور دیا ہے ان میں سے ایک عدل وانصاف بھی ہے۔ یہ دراصل سچائی اور راست بازی ہی کی ایک شکل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کے ساتھ بلا رورعایت وہ معاملہ کیا جائے اور اس کے بارے میں وہ خدا لگتی بات کہی جائے جس کا وہ مستحق ہے۔ اس عدل وانصاف پر دنیا کا نظام قائم ہے۔ جس قوم اور جس سماج میں عدل وانصاف نہ ہو وہ خدا کی رحمت سے محروم رہے گا اور دنیا میں اس کا انجام بہت ہی برا ہوگا۔ قرآن پاک، کتاب ونبوت کا مقصد ہی یہ بتاتا ہے کہ لوگوں کے درمیان میزان قائم ہو۔ اور میزان سے مراد عدل وانصاف ہی کے قوانین ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہدایت کی گئی ہے کہ معاملات میں عدل وانصاف کو اور سچی خدا لگتی بات کہنے کو اپنا اصول اور نصب العین بنالو اور پوری دیانت داری اور خدا ترسی کے ساتھ اس فرض کو ادا کرو خواہ اس سے تم کو یا تمہارے اعزا واقربا کو کتنا ہی نقصان پہنچے، لیکن حق وانصاف کے معاملہ میں کسی کی جانب داری نہ کرو اور نہ کسی غریب کی غربت وناداری پر ترس کھا کر اس کی بے جا حمایت کرو۔ انصاف اور سچائی سب سے مقدم ہے۔ غریبوں کی غربت بھی اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ دیکھنے والا ہے اور وہی سب کا حقیقی والی ہے، حتیٰ کہ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف سے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

معاملہ کرو، محض ان کی دشمنی کی بنا پر ان سے بے انصافی کا معاملہ روا نہ رکھا جائے اور ان کے حقوق پامال نہ کیے جائیں کیوں کہ اسلام کی اجازت نہیں دیتا۔ اپنوں سے انصاف کی تلقین تو سب نے کی ہے لیکن یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ وہ دشمنوں کے ساتھ بھی عدل وانصاف کی تاکید کرتا ہے۔

امانت:

سچائی اور راست بازی ہی کی ایک شکل امانت بھی ہے۔ امانت سے مراد محض اس قدر نہیں کہ کسی نے جو چیز کسی کے پاس رکھ دی ہو وہ مطالبے پر جوں کی توں واپس کر دی جائے، بلکہ تمام حقوق وفرائض کا دیانت داری کے ساتھ ادا کرنا اور ہر قابل لحاظ بات کا لحاظ رکھنا بھی امانت کے مفہوم میں شامل ہے۔ یہاں تک کہ کوئی شخص کسی معاملے میں مشورہ لے تو پوری خیر خواہی سے مشورہ دینا اور اس سے متعلق تمام رازوں کو محفوظ رکھنا بھی امانت ہی ہے۔ قرآن پاک میں امانت کے وصف کو اختیار کرنے کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔

عفوودرگزر:

مسلمان کو عفوودرگزر کی بھی تعلیم دی گئی ہے۔ عفو سے مراد یہ ہے کہ دوسرے کی خطا اور قصور کو معاف کر دیا جائے اور انتقام کی طاقت رکھتے ہوئے بھی بخش دیا جائے لیکن اس کے معنی ی نہیں کہ ایک گال پر تھپڑ کھانے کے بعد دوسرا گال بھی پیش کر دیا جائے۔ اس سے تو شر پسند عناصر کی اور بھی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ عفو صرف اس صورت میں مناسب ہے جب کہ غلطی کرنے والا کسی حد تک اپنی غلطی پر نادم ہو۔ بعض لوگ عفوودرگزر کو اپنے رعب وعزت کی کمی کا باعث تصور کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انتقام سے فوری دھاک تو بیٹھ سکتی ہے مگر پائیدار عزت عفوودرگزر سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

رواداری:

عفوودرگزر ہی سے ملتی جلتی ایک صفت رواداری ہے۔ رواداری سے مراد یہ ہے کہ باہمی تعلقات میں خیر خواہی سے کام لیا جائے اور دوسرے کی معمولی غلطیوں اور خطاؤں پر گرفت نہ کی جائے۔ رواداری کی بنا پر معاشرے میں اخوت اور بھائی چارہ کے جذبات پرورش پاتے ہیں۔

احسان:

اپنی نوعیت کے لحاظ سے عفو اور رواداری دراصل احسان کی مختلف شکلیں ہیں۔ احسان کے معنی یہ ہیں کہ کسی کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جائے جو اس کے لیے فائدہ مند ہو اور یہ برتاؤ عقلاً اور شرعاً صحیح ہو۔ احسان کی بے شمار صورتیں ہیں مثلاً ضرورت مندوں اور رشتہ داروں کی مالی امداد کرنا، کسی کو مصیبت سے نجات دلانا، کسی کے حق کو خوبی اور سخاوت سے ادا کرنا، احسان کی یہ شکل فضل کہلاتی ہے، یعنی کسی کے حق کو نہ صرف پورا کرنا بلکہ اس سے کچھ زیادہ ادا کرنا یا کسی سے اپنا حق وصول کرتے ہوئے رعایت کرنا یا اس کو بالکل چھوڑ دینا۔ پھر احسان صرف حقوق العباد کے ادا کرنے ہی میں محدود نہیں ہے، بلکہ حقوق اللہ کی ادائیگی میں بھی یہ مطلوب ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ احسان اسے کہتے ہیں کہ سارے حقوق وفرائض اس طرح ادا کیے جائیں جیسا کہ ان کے ادا کرنے کا حق ہے۔

مساوات:

معاشرتی محاسن میں مساوات کا بڑا اونچا مقام ہے۔ اسلام میں مساوات سے دو باتیں مراد ہیں۔ ایک قانونی مساوات اور دوسرے معاشرتی مساوات۔ قانونی مساوات کے تحت تمام افراد ملت کے لیے ایک ہی قانون ہے۔ غلام ہو یا آقا، امیر ہو یا غریب، عالم ہو یا جاہل سب کے لیے قانون کی پابندی یکساں ضروری ہے، کسی کو کسی بنا پر کوئی برتری اور فوقیت حاصل نہیں۔ پھر اسی قانونی مساوات سے مراد یہ بھی ہے کہ ہر ایک کو ترقی کے، خواہ وہ معاشی ہو یا علمی یا معاشرتی، یکساں مواقع حاصل ہوں۔ معاشرتی مساوات سے مراد یہ ہے کہ نشست وبرخاست میں، عبادت میں، سماجی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

تقریبات میں یا عام اجتماعی زندگی میں کسی کو اولیت وفضیلت حاصل نہیں۔ امیر وغریب مسجد میں شانہ بہ شانہ کھڑے ہوں گے، تقریبات میں ایک دوسرے کے قریب بیٹھیں گے، دعوتوں میں ایک ہی پلیٹ سے کھائیں گے، اسلام میں نہ اونچ نیچ ہے، نہ برتری وکمتری۔

اخوت:

پھر اسلام صرف اسی پر بس نہیں کرتا کہ اونچ نیچ کے امتیازات کو صرف منفی انداز سے ختم کرے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایجابی طور پر اس بات کی تعلیم بھی دیتا ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور اس لحاظ سے ان کے تعلقات ایسے ہونے چاہئیں جیسے بھائیوں بھائیوں کے ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ ان میں باہم شفقت اور ترحم ہو اور آپس میں ان کا معاملہ نرمی اور فروتنی کا ہو، ہر ایک دوسرے کا خیر خواہ، خدمت گزار، اور ایاز مند ہو۔ اور جو چیزیں تعلقات کو خراب کرنے والی اور دلوں میں کدورت پیدا کرنے والی ہو سکتی ہیں مسلمان ان سب سے اجتناب کریں۔ اخوت کے یہ تعلقات ایک جانب تو ملت اسلامیہ کو بہ حیثیت ایک قوم کے مستحکم کرتے ہیں اور دوسری جانب ایک پر امن اور صالح معاشرہ کے ضامن ہیں۔

تقویٰ:

اخلاقی محاسن جن میں سے جن چند کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اسلام کے نزدیک صرف اس صورت میں قابل ستائش ہیں جب ان سے خدا کی رضا مقصود ہو۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور مقصود ہے تو ان محاسن کے بہتر معاشرتی اور سماجی نتائج تو یقیناً قوانین نفسیات وعمرانیات کے تحت نکلیں گے، لیکن آخرت میں ان سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اسلامی اخلاقیات کی بنیاد خوف خدا ہے۔ یہی خوف خدا جب انسان اپنی پوری زندگی پر محیط کر لیتا ہے، اور جب وہ ہر قدم اٹھانے سے پہلے یہ سوچتا ہے کہ کہیں یہ خدا کو ناپسند تو نہیں تو اس کا یہ وصف تقویٰ کہلاتا ہے۔ تقویٰ کے دو لوازم ہیں۔ ایک تو ہر شعبۂ زندگی میں خدا کی مکمل اطاعت اور دوسرے اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے ہوئے مزید نیکی کرنے کی مسلسل کوشش۔ قرآن پاک میں جہاں تقویٰ ونیکی کی تعلیم دی گئی ہے وہیں متقی لوگوں کے لیے آخرت کی زندگی میں فوز وفلاح کی بشارت بھی سنا دی گئی ہے۔ اس کے برکلاف وہ لوگ جو خدا کی نافرمانی کرتے ہیں ان کے لیے جہنم کی وعید ہے۔

قرآن وسنت میں جہاں پسندیدہ اخلاق کا ذکر ہے وہاں ناپسندیدہ اوصاف بھی گنا دیے گئے ہیں تاکہ انسان ان سے بچ کر اپنی آخرت کی زندگی بہتر بنا سکے۔

صفات مذمومہ

صفت محمودہ کی طرح صفات مذمومہ کی بھی ایک طویل فہرست ہے، جن میں غرور وتکبر، بخل، عیب جوئی، چغل خوری، خیانت، جھوٹ، فحش کلامی، خود پسندی، شہرت طلبی، تنگ نظری، تنگ ظرفی، حرص وطمع، تصنع اور نقالی، اسراف وتکلف، مایوسی اور پست ہمتی، غیبت، کینہ، حسد، وعدہ خلافی، رشوت، فساد ونفاق، ذخیرہ اندوزی، حیلہ سازی، گروہی اور قبائلی عصبیت، احسان فراموشی اور غضب وچیرہ دستی وغیرہ شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سب پر حاصل بحث اس مختصر باب میں ممکن نہیں، صرف چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حرص:

حرص کی تین قسمیں ہیں:

(۱) دولت کی حرص (۲) منصب وریاست کی حرص اور (۳) شہرت کی حرص

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اور ان سب میں دولت کا لالچ ایک عجیب بلا اور حیرت ناک بیماری ہے جو نفس انسانی کو ہر آرام و راحت سے محروم کر دیتی ہے۔ اعصاب اور جسم (اور روح) تھک جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "اور مال" اور "اور دولت" کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک انسان اور اس کی خواہشوں کے درمیان قبر کی مٹی حائل نہیں ہو جاتی۔

دولت کی حرص آنے والی نسلوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ آنے والے معاشی خوش حالی کی وجہ سے جد و جہد ترک کر دیتے ہیں اور اگر وہ نااہل ہوئے تو خون جگر اور محنت و مشقت سے حاصل کردہ دولت لے کر ایسے کاموں میں صرف کرتے ہیں جن سے باپ دادا کا نام بدنام ہوتا ہے۔

حکومت و ریاست کی حرص کی راہ میں کتنے انسانوں کا خون بہایا گیا ہے اور کتنی عزتیں اس میں راہ میں روندی گئی ہیں اور کتنی آبادیاں ویران ہوئی ہیں۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک بیشتر بڑی جنگیں حکومت و ریاست کے حصول کے لیے لڑی گئی ہیں اور اس حرص کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ انسان جو کچھ حاصل کر لیتا ہے، ہر بار اس سے بلند تر منصب ریاست کے حصول کے لیے "جائز و ناجائز" کی تمیز کو ترک کر کے قدم اٹھاتا ہے۔ کوئی عہدہ — پھر وزارت — پھر کسی مملکت کی فرماں روائی اور اس کے بعد ساری دنیا پر تصرف کی خواہش اور پھر معاذ اللہ خدائی کی تمنا — "فرعونیت" اس کے سوا اور کیا ہے؟ — ہر قسم کے ظلم، خون ریزی، تکبر، نخوت اور ایسے ہی دوسرے عمل جو دین اور دیانت کی ضد ہیں، حرص ریاست سے پیدا ہوتے ہیں — اسی سے زمین پر فساد پیدا ہوتا ہے اور فساد پیدا کرنے والوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔ جنت انہی کو ملے گی جو حرص ریاست میں مبتلا ہو کر اللہ کی زمین کو فساد کا گہوارہ نہیں بناتے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ

ترجمہ: "آخرت کا یہ گھر ہم انہی لوگوں کے لیے خاص رکھیں گے جو زمین میں نہ اپنا اقتدار اور اپنی کبریائی چاہیں گے اور نہ فساد۔" (القصص۔۸۳)

ظلم:

"ظلم" ایک قبیح فعل ہے اور اس کی بنیاد انسانوں کو تکلیف دینے کا مذموم جذبہ ہے۔ دوسروں کا بلا سبب شرعی (یعنی قصاص، حد اور تعزیر کے جواز اور محل کے بغیر) قتل کرنا، مارنا اور قید کرنا بھی ظلم نہیں ہے بلکہ ہر وہ فعل جس سے دوسروں کے حقوق پامال ہوں اور ان کو بلا سبب صدمہ یا تکلیف پہنچے ظلم ہے۔ ظلم نے کتنے ہی گھروں کو ویران کیا ہے، کتنے ہی خاندانوں اور نامیوں کے نام کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ عادل مطلق ہے اور اس کے انصاف کا تقاضا صرف یہی نہیں ہے کہ وہ خود ظلم نہ کرے بلکہ اس کے انصاف بے کراں کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ہر ظالم کو اپنے "قانون مکافات عمل" کے تحت سزا دے اور ہر مظلوم کو ظالم سے نجات دلائے، چنانچہ فرمایا ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ؕ

ترجمہ: "اے پیغمبر، یہ نہ سمجھیے کہ اللہ ظالموں کے عمل سے غافل ہے۔" (سورۂ ابراہیم۔۴۲)

وہ ظلم کو فراموش نہیں کرتا اور نہ غفلت برتتا ہے، کوئی ظلم اس کے علم کی حد سے باہر نہیں ہے۔

ظلم وہی لوگ کرتے ہیں جو قدرت، قوت، ثروت، امارت اور ریاست حاصل کرنے کے بعد خدا اور اس کے قانون کو بھلا دیتے ہیں۔ لیکن جو لوگ خدا کو پہنچانتے ہیں، اس کے قہر اور انتقام سے ڈرتے ہیں، اس کے قانون مکافات کو تسلیم کرتے ہیں، اسے ہمیشہ حاضر و ناظر جانتے ہیں، وہ ظلم و تعدی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بندگان خدا ان کے ساتھ چھوٹے سے چھوٹے ظلم (حتیٰ کہ کلمہ بد) کو بھی خدا معاف نہیں کرتا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

دروغ گوئی:

جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ ہے۔ جو دروغ گو کو لوگوں کی نظروں میں ذلیل وخوار، بے منزلت اور بے اعتبار بناتا ہے۔ جھوٹے کی گفتگو اور کردار پر کوئی اعتماد نہیں کرتا۔ احادیث میں جھوٹ کی بار بار اور شدت کے ساتھ مذمت کی گئی ہے اور اس سے بڑی سختی کے ساتھ روکا گیا ہے۔ اور جھوٹ کو کفر کے گیٹ کا ایک فرد قرار دیا گیا ہے۔

جھوٹ کا سلسلہ بہت طویل ہے، دوکان دار جھوٹ بولتا ہے، خریدار جھوٹ بولتا ہے، تعمیرات کا کام کرنے والے ٹھیکیدار جھوٹ بولتے ہیں اور خدا کے نام پر، خدا کی جھوٹی قسمیں کھا کر دروغ بیانی سے کام لیتے ہیں۔ جب تک جھوٹ کو اس کی تمام شکلوں میں اور بالکل جڑ سے ختم نہ کر دیا جائے، معاشرے میں امن اور نیکی کا چلن نہیں ہو سکتا۔

غیبت:

غیبت اصلاح شرع میں یہ ہے کہ ''کسی مسلمان کے بارے میں اس کے پیٹھ پیچھے ایسی بات کہی جائے جسے اگر وہ سنتا تو آزردہ ہوتا اور اسے برا معلوم ہوتا۔''

جو آیات اور بہت سی احادیث غیبت کے بارے میں آئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ غیبت ایک بڑا گناہ ہے اور اس کا عذاب بہت شدید ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ۝

ترجمہ: ''ہر ایسے شخص کے لیے بڑی خرابی ہے جو (پس پشت) عیب نکالنے والا ہو اور (روبرو) طعنہ دینے والا ہو۔''

(الھمزہ۔ ۱)

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ ''ھماز مشاء بنمیم۔'' ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِيۡنَ يُحِبُّوۡنَ اَنۡ تَشِيۡعَ الۡفَاحِشَةُ فِى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ۙ فِى الدُّنۡيَا وَ الۡاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝

ترجمہ: ''(یعنی) جو لوگ ایمان لانے والوں کے کسی برے کام کو فحش کرنے کو عزیز رکھتے ہیں اور اسے بیان کرتے ہیں ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔''

ان کے علاوہ اس ضمن کی دوسری آیات اور احادیث انسان کو اس گناہ کی اہمیت اور برائی سے آگاہ کرتی ہیں۔ ایک حدیث ہے کہ

الغیبۃ اشد من الزنا

ترجمہ: ''غیبت زنا سے زیادہ سخت گناہ ہے۔''

ہر مسلمان اور صاحب ایمان کا فرض ہے کہ اس گناہ کی شدت کے پیش نظر خود بھی غیبت سے بچے اور دوسروں کو بھی اس سے روکے۔ چنانچہ صاحب معراج السعادۃ نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی غیبت سنتا ہے اور (اس کی پیٹھ پیچھے) اس کی حمایت نہیں کرتا تو خدا اسے دنیا اور آخرت میں ذلیل کرے گا۔

ناپسندیدہ اخلاقی صفات کے اس بیان کے بعد ہم اپنی بحث کو ان چند حقوق و فرائض کے ذکر پر ختم کرتے ہیں جو اجتماعی اخلاق کے نقطۂ نظر سے بڑے اہم ہیں۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اجماع

اجماع سے مراد اسلامی قوانین کے اصولوں پر مسلمان فقہا کا اتفاق رائے ہے۔ اس بات میں فقہا میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا تمام فقہا میں کسی مسئلہ پر اتفاق رائے ہونا ضروری ہے یا ان کی اکثریت کا اتفاق رائے ہی اجماع کے لیے کافی ہے؟ اسی طرح اس مسئلہ پر بھی فقہا کے مختلف مکاتب فکر میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا ایک نسل کا کسی مسئلہ پر اجماع آئندہ نسلوں پر بھی لاگو ہوتا ہے یا نہیں؟

بقول کرخی ''ایسے معاملات جنہیں قیاس کے ذریعہ طے نہیں کیا جس سکتا ان پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع تمام نسلوں پر لازم ہوتا ہے، لیکن جن معاملات میں قیاس سے ابہام دور کیا جا سکتا ہے ان مسائل پر ان کا اجماع لازم نہیں آتا۔'' واضح رہے کہ اجماع کسی مسئلہ پر عوام کے متفق ہونے کو نہیں کہتے، بلکہ اس سے مراد علمائے قانون کا اتفاق رائے ہے۔ دور حاضر کے بعض مفکرین اجماع کو تمام امت کے اتفاق رائے سے تعبیر کرتے ہیں اور اس لحاظ سے موجودہ قانون ساز اسمبلیوں کو اجماع کا اختیار دینے کے حق میں ہیں۔

اجماع کی تعریف

اس کا لغوی مطلب ہے جمع ہونا یا کسی بات پر متفق ہونا۔ لیکن شرعی اصطلاح میں اس سے مراد علمائے امت کا (یا ان کی بڑی اکثریت کا ہر زمانے میں) کسی ایسے مسئلے پر متفق ہو جانا جس کے بارے میں قرآن وحدیث میں کوئی واضح حکم موجود نہ ہو۔ اسلامی قانون میں اجماع کو قرآن اور حدیث کے بعد تیسرے بڑے ماخذ کا درجہ حاصل ہے۔

''فلسفہ شریعت اسلام'' میں مسٹر محمصانی نے ان الفاظ میں اجماع کی تعریف کی ہے:

''کسی حکم شرعی پر کسی زمانہ میں مسلمان مجتہدوں کا متفق ہو جانا اجماع کہلاتا ہے۔''

جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن ''قانونی لغت'' پر اجماع کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''اس کے لغوی معنی عزم واتفاق کے ہیں۔ فقہی اصطلاح میں کسی معاملے میں اہل حل وعقد کے اتفاق کو اجماع کہتے ہیں۔''

اصول فقہ اسلام کی مشہور کتاب تاریخ میں لکھا ہے کہ ''جو احکام صریح وحی سے ثابت ہیں وہ پیش آنے والے واقعات وحوادث کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ اگر ان کا حکم وحی صریح سے بذریعہ استنباط نہ معلوم کیا جائے تو یہ مہمل پڑے رہ جائیں گے اور دین کے کمال کا دعویٰ بے کار ہو جائے گا۔ اس بنا پر ضروری ہے کہ مجتہدین کو احکام کے استنباط کا اختیار دیا جائے۔ چنانچہ اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے مقررہ اصول وضوابط شرعی کے مطابق کسی مسئلہ کی جو اجتماعی شکل متعین ہوگی۔ اس کی حیثیت اجماع کی ہوگی۔ اجماع کے افراد کا علمی اور عملی اعتبار سے مثالی اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اجماع سے فن مخصوص کے متقی اہل علم وبصیرت افراد کا اجماع مراد لیا جائے گا نہ کہ عامۃ الناس کا اجماع۔''

اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں سید قاسم محمود لکھتے ہیں:

''علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال اپنے مشہور زمانہ چھ خطبات میں اجماع کا مندرجہ ذیل تصور پیش کیا ہے:

عجیب بات ہے کہ اس نہایت ہی اہم تصور پر اگرچہ صدر اسلام میں نظری اعتبار سے خوب خوب بحثیں ہوتی رہی ہیں لیکن عملاً اس کی حیثیت ایک خیال سے آگے نہ بڑھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ممالک اسلامیہ میں یہ تصور ایک مستقل ادارے کی حیثیت اختیار کر لیتا۔ شاید اس لیے کہ خلیفہ چہارم کے بعد جب اسلام میں مطلق العنان ملوکیت نے سر اٹھایا تو یہ اس کے مفاد کے خلاف تھا کہ اجماع کو ایک مستقل تشریحی ادارے کی شکل دی جاتی۔ اموی

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اور عباسی خلفاء کا فائدہ اسی میں تھا کہ اجتہاد کا حق بحیثیت افراد مجتہدین کے ہاتھ میں رہے۔ انجام کار ان سے بھی زیادہ طاقت حاصل کر لیتی۔ بہر حال یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ اس وقت دنیا میں جو نئی نئی قوتیں ابھر رہی ہیں کچھ ان کے اور کچھ مغربی اقوام کے سیاسی تجربات کے پیش نظر مسلمانوں کے ذہن میں بھی اجماع کی قدر و قیمت اور اس کے مخفی امکانات کا شعور پیدا ہو رہا ہے۔ بلاد اسلامیہ میں جمہوری روح کی نشو ونما اور قانون ساز مجالس کا بتدریج قیام ایک بڑا ترقی زا قدم ہے۔''

حضور ﷺ نے بھی اجماع کو پسند فرمایا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضور ﷺ نے مشہور انصاری صحابی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ (متوفی 740) کو یمن میں دعوت دین کے لیے معلم کی حیثیت سے بھیجا۔ ازاں بعد وہ دو سال تک یمن کے حاکم (9 ہجری۔11 ہجری) رہے۔ حاکم بنانے سے قبل حضور ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

''اے معاذ رضی اللہ عنہ! مقدمات کا فیصلہ کیسے کرو گے؟'' عرض کیا ''اللہ کی کتاب سے'' فرمایا ''اگر اس میں حکم نہ ملے تو پھر'' عرض کیا'' یا رسول اللہ ﷺ سنت نبوی ﷺ سے'' فرمایا'' اگر اس میں حکم نہ ملے تو پھر'' عرض کیا'' یا رسول اللہ اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا'' اس پر فرمایا'' اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول ﷺ کے نمائندے اور فرستادے کو یہ توفیق دی کہ اللہ کا رسول ﷺ اس سے راضی ہو گیا۔''

اس حدیث نبوی ﷺ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اجماع سے اختلاف بھی سنت رسول ﷺ کی مخالفت ہے اور جو کوئی حضور ﷺ کی مخالفت کرے ظاہر ہے وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر اجماع کے واجب التعمیل ہونے پر بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مکمل اتفاق ہے اور اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کی مخالفت ملامت کی سزاوار قرار پائی۔

اجماع اور قرآن حکیم:

قرآن حکیم میں اجماع کے حق میں چند آیات بھی ملتی ہیں مثلاً

سورہ یونس آیت 71

فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ.

ترجمہ: ''(اے برادران قوم) پس تم ایک متفقہ فیصلہ کر لو اور اپنے شریکوں کو اکٹھا کر لو۔''

سورہ النساء آیت 59

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ.

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول ﷺ کی اور اپنے میں سے اہل اختیار کی اطاعت کرو۔''

یہاں اہل اختیار سے مراد مسلمان مجتہدین ہیں جن کا مسلمانوں میں سے ہونا ضروری ہے۔

سورہ الشوریٰ آیت 38

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪

ترجمہ: ''اور وہ (مسلمان) اپنے معاملات باہمی مشورے سے چلاتے ہیں۔''

سورہ آل عمران آیت 159

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ترجمہ: "اور معاملات میں آپ ان سے مشورہ کیجئے پھر جب (مشورہ کے بعد) کسی بات کا عزم کرلیں تو اللہ پر بھروسہ کیجئے۔"

اجماع اور احادیث نبوی ﷺ:

حضور ﷺ نے متعدد مقامات پر اجماع کا ذکر فرمایا ہے مثلاً:

1- ان امتی لا تجتمع علی ضلالہ.

ترجمہ: "میری امت گمراہی پر متفق نہیں ہوگی۔"

2- فما رائی المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن.

ترجمہ: "جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔"

اقسام اجماع:

اجماع کی دو قسمیں ہیں یعنی

1- اجماع صریح یا نطقی　　2- اجماع سکوتی

1- اجماع صریح:

اجماع صریح کا مطلب ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین رحمۃ اللہ علیہم اور مجتہدین کرام کا کسی درپیش مسئلہ کو وضاحت اور صراحت کے ساتھ بیان کرنا چونکہ اس قسم کے اجماع میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین رحمۃ اللہ علیہم اور مجتہدین اپنی رائے کا اظہار بذریعہ کلام کرتے ہیں اس لیے ایسے اجماع کو نطقی بھی کہا جاتا ہے۔

2- اجماع سکوتی:

اس سے مراد کسی زیر بحث معاملہ میں اہل نظر کے اتفاق سے کسی رائے یا فیصلے کی اشاعت ہے اور فیصلے کی نقل دوسرے مجتہدین تک پہنچے تو وہ اپنی جانب سے اس پر تنقید یا کسی قسم کا اظہار خیال نہ کریں بلکہ اس فیصلے کو من وعن تسلیم کرلیں۔ اجماع سکوتی کے شرعی مقام اور مرتبہ میں علمائے امت کا اختلاف پایا جاتا ہے ان کے علاوہ اجماع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اجماع تابعین رحمۃ اللہ علیہ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جانب سے کیے گئے فیصلوں کا اطلاق ہر اجماع پر ہوتا ہے۔ انہوں نے تبدیل شدہ حالات کے مطابق اپنے فیصلے صادر فرمائے لیکن انہوں نے بھی فیصلے کرتے وقت مقدمات کی نوعیت و ماہیت کو مدنظر رکھا ہے۔

جدید سائنسی انکشافات نے اجماع کے عمل کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ اس ضمن میں ٹیلی فون، ٹیلی پرنٹر، فیکس، انٹرنیٹ اور مواصلاتی سیاروں کے ذریعے حاصل کی جانے والی معلومات کا تبادلہ بھی شامل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مجتہدین بھی اپنی آسانی کے لیے ان ذرائع کو استعمال کر کے کسی فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں۔

پاکستان کے آئین میں 1974ء میں پارلیمنٹ نے احمدیوں کے دونوں گروپوں (لاہوری اور قادیانی) کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر اجماع کی عمدہ مثال قائم کردی۔ پارلیمنٹ نے یہ متفقہ فیصلہ علماء کے فتووں، مجالس مذاکروہ، تحریروں اور خط و کتابت کی روشنی میں کیا تھا۔

چونکہ اجماع اجتہاد کی ایک قسم ہے۔ اس حوالے سے اجماع کی چند تجاویز جو موجودہ زمانے کی ضروریات ہیں، ہم اگلے عنوان (اجتہاد) میں بحث کریں گے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اجتہاد

اسلام میں اجتہاد کا کردار:

لغوی اعتبار سے اس کا مطلب ہے کوشش کرنا، صحیح رائے تلاش کرنا، اپنی طرف سے روز لگانا، الغرض مسائل فقہ کا قرآن وحدیث سے استخراج کرنے کا نام اجتہاد ہے۔ اجتہاد کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ قرآن حکیم نے ناپاک چیزوں کو حرام اور پاک چیزوں کو حلال فرمایا۔ ان دونوں کے مابین مشتبہ چیزیں باقی رہیں۔ حضورﷺ نے اپنے اجتہاد سے ان کی تصریح فرمائی کہ ہر درندہ جانور اور کنج پنجہ دار حرام ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کوہ صفا و مروہ خدا کی نشانیاں ہیں۔ چنانچہ حضورﷺ نے اجتہاد کرتے ہوئے حکم دیا کہ چونکہ صفا کا لفظ پہلے آیا ہے اس لیے حج میں سعی کی ابتدا صفا سے کی جائے۔

ایک ملک میں مروجہ قوانین کو شرعی قوانین سے ہم آہنگ کرنا، نئے پیدا شدہ مسائل کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حل کرنے کے سلسلے میں، اجتہاد کرنے کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں اور یہ کام سرکاری، غیر سرکاری اور نجی تینوں حیثیتوں، سے ممکن ہے۔ غیر سرکاری یا نجی حیثیت سے جاری کیے گئے فتاویٰ یا اجتہاد کو ضروری نہیں کہ ایک حکومت تسلیم کر کے نافذ کرے۔

اصول اجتہاد:

عبدالصمد صارم الازہری اپنی کتاب ''تاریخ الفقہ'' میں لکھتے ہیں: بعض مسائل و معاملات کے متعلق خود آنحضورﷺ حکم دے دیتے تھے۔ بعض میں اصحاب سے مشورہ فرماتے تھے جیسے اذان کے معاملے میں یا اسیران جنگ بدر کے معاملے میں۔ شوریٰ کی عزت ہر صحابی کے لیے نہ تھی۔ بلکہ ان حضرات سے مشورہ کیا جاتا تھا جن کا علم وعقل و تجربہ وسیع تھا۔ حاضر باشی یا تقویٰ و طہارت پر ہی اس کا انحصار نہ تھا۔ جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی اور اکثر اصحاب صحبت رسول کریمﷺ سے اچھی طرح مستفید ہوئے تو حضورﷺ نے بعض اصحاب کو اجتہاد وفتویٰ کا مجاز کر دیا۔ ان مجتہد اصحاب کے سوا کوئی دوسرا شخص فتویٰ دینے کا مجاز نہ تھا۔ ان اصحاب کا اصول اجتہاد کتاب وسنت پر قیاس تھا۔ چونکہ رائے اور قیاس کا معاملہ تھا۔ سب کا علم وعقل یکساں نہ تھا۔ اس لیے اختلافات ہونا بھی لازمی تھا۔ بعض مسائل میں اختلاف ہو جاتا تھا۔ حضورﷺ سن کر بعض دفعہ فریقین کے اجتہاد کو پسند فرماتے اور بعض دفعہ ایک فریق کے استنباط پر اظہار پسندیدگی فرماتے۔ حضورﷺ نے فرمایا ''علماء میری امت کے امین ہیں'' لہٰذا اس حدیث کی رو سے اجتہاد کرنے کا واضح اشارہ ملتا ہے۔ اہل تشیع اسے قیاس اور اجماع سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں ان کے نزدیک امام ہی سب سے بڑا مجتہد ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں امام معصوم ہوتا ہے لہٰذا اس سے کسی قسم کی کوئی غلطی نہیں ہوسکتی۔

حضورﷺ کے عہد کے چند مجتہدین:

حضورﷺ نے ابتداء میں صرف چار حضرات حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو اجتہاد کا حکم دیا تھا۔ جوں جوں مسائل بڑھتے گئے اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا تو اس فہرست میں حضرت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ، حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت ابی درداء رضی اللہ عنہ اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ شامل کر لیے گئے۔ اجتہاد کے بارے میں مشہور حدیث حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

حضور ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی بنانے کا ارادہ فرمایا تو پوچھا کہ تمہارے پاس کوئی مقدمہ آئے تو کس طرح فیصلہ کرو گے۔ عرض کیا کتاب اللہ سے۔ فرمایا اگر کتاب اللہ میں کوئی حکم نہ ملے تو عرض کیا سنت رسول کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ فرمایا اگر وہاں بھی نہ ملے۔ عرض کیا پھر اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوتاہی نہ کروں گا۔ حضور ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا: اس خدا کے لیے حمد ہے جس نے رسول خدا ﷺ کے اس فرستادہ کو رسول خدا ﷺ کی مرضی کے مطابق چلنے کی توفیق دی۔ (ابوداؤد)

حضور ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح کو تحریر فرمایا: ''اے شریح، کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔ اگر وہاں نہ ہو تو سنت رسول ﷺ سے فیصلہ کرو۔ اگر ان دونوں میں بھی نہ ہو تو صلحاء کے فیصلوں کے مطابق کرو۔ اگر صلحاء کے فیصلے میں بھی نہ ہوں تو خواہ بروقت ہی خود فیصلہ کر دیا ذرا غور و فکر کے بعد کرو اور میری رائے میں تمہارے لیے ذرا غور و فکر کر لینا ہی بہتر ہے۔'' اس فرمان سے جو نکات آئے، مجتہدین کو ان کے مطابق ہی فیصلہ کرنا چاہیے۔ فیصلہ بڑے غور و فکر کے بعد ہونا چاہیے۔ تاکہ اس میں کوئی سقم نہ رہ جائے۔

اجتہاد کی اہمیت (Importance of Ijtihad)

اسلامی قانون کو ہر دور کے حالات اور تقاضوں سے ہم آہنگ رکھنے کے سلسلہ میں اجتہاد کی اہمیت محتاج وضاحت نہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ سے ہی قانون نکات کی تشریح کے لیے اجتہاد کیا جاتا رہا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جنہیں امام المجتہدین بھی کہا جاتا ہے، اجتہاد کی اہمیت پر خصوصی توجہ دی۔ اپنے دور خلافت میں آپ رضی اللہ عنہ نے اسلام کی روح کو مدنظر رکھتے ہوئے نئے فیصلے بھی کیے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ''جب کوئی حل طلب معاملہ درپیش ہو تو سب سے پہلے میں کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتا ہوں، لیکن واضح حل نہ ہونے کی صورت میں نبی کریم ﷺ کے اقوال سے راہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طریق کار کو مدنظر رکھتے ہوئے جو بات مجھے مناسب معلوم ہو، اسے اپنا لیتا ہوں اور کسی دوسرے کا اتباع نہیں کرتا۔ جہاں تک دوسرے فقہا کی تقلید کا معاملہ ہے مجھے بھی اجتہاد کا اسی طرح حق ہے جس طرح انہیں حاصل تھا۔''

تاریخ فقہ اسلامی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فقہ کے چار مکاتیب فکر کے قیام کے کچھ عرصہ بعد اجتہاد کے دروازے بعض وقتی مجبوریوں کے باعث بند کرنا پڑے۔ اسی وجہ سے اسلامی قانون چند صدیوں تک جمود کا شکار رہا۔ اگرچہ اس دوران میں بھی مختلف مکاتیب فقہ سے تعلق رکھنے والے علما نے فقہ کی کتابیں تدوین کیں، لیکن عام طور پر ہر ایک نے کسی ایک امام کی تقلید کرتے ہوئے مسائل کا حل پیش کیا۔

اجتہاد کی اہمیت کا اندازہ حضور ﷺ کی ان احادیث مبارکہ سے ہی لگایا جا سکتا ہے جو اوپر بیان کی جا چکی ہیں۔ ازاں بعد خلفائے راشدین نے بھی اجتہاد کیا۔ بنو عباس کے دور میں دینی علوم کی نشر و اشاعت کا کام سرکاری سرپرستی میں کیا جاتا تھا اور حصول اور ترویج علم کے لیے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ اس دور میں فقہ کی تدوین کا کام شروع ہوا اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس ضمن میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ اس دور میں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اجتہاد کے سلسلے میں ایسی بنیادیں قائم کر دیں اور ایسے اصول مرتب کر دیے جن سے بعد میں پیش آنے والے مسائل اور مشکلات حل کرنے میں مدد لی جا سکے۔ صرف امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے 83 ہزار مسائل کو اپنی زبان میں بیان کیا۔ ان میں 38000 کا تعلق عبادات سے ہے جبکہ 45000 کا تعلق معاملات سے ہے۔ بعد ازاں ان شاگردوں نے جن میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ، حسن بن زیاد، بلال بن یحیٰ، قتیبہ بن زیاد، امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ شامل ہیں۔ اجتہاد کو مزید آگے بڑھایا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعد امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگردوں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، داؤد ظاہری

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

رحمۃ اللہ علیہ، ابوثور بغدادی رحمۃ اللہ علیہ، ابوجعفری ابن طبری رحمۃ اللہ علیہ، ابویعقوب بویطی، اسماعیل مزنی اور ربیع بن سلیمان مرادی کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے علاوہ ابواسحاق، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سنت نبوی ﷺ کی پیروی کرتے تھے اور رائے و اجتہاد سے گریز کرتے تھے۔

مجتہد کے اوصاف

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اجتہاد کرنے کی اہلیت کے پہلو پر اسلاف نے بہت زور دیا ہے، کیونکہ یہ نہایت حساس مسئلہ ہے۔ مختصر طور پر ان اوصاف کی ذیل میں وضاحت کر دی گئی ہے:

☆ پہلی شرط یہ ہے کہ مجتہد کے لیے متقی ہونا ضروری ہے۔ یعنی ایسا شخص ارکان اسلام کی پابندی کرتا ہو۔ کبائر سے مجتنب رہے۔

☆ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ شریعت کی حقیقی روح اور مقاصد کا علم رکھتا ہو۔ باعلم اور صاحب بصیرت ہو۔ واضح ہو کہ اسلاف کے علمی ورثہ کی وجہ سے اس سلسلہ میں کافی رہنمائی موجود ہے۔

☆ اسلامی قانون کے بنیادی ماخذوں یعنی قرآن وسنت کی تعلیمات پر عبور رکھتا ہو۔ رہنمائی کے لیے اسلاف نے اصول تفسیر وحدیث وضع کر دیے ہیں، جس سے قرآن وسنت کی غرض وغائیت کو جاننا آسان ہو گیا ہے۔

☆ فقہ اور اصول فقہ کا علم رکھتا ہو۔ یہ علم بھی پورے طور پر مرتب و مدون شدہ صورت میں موجود ہے۔

☆ ناسخ ومنسوخ کا علم رکھتا ہو۔ مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ مختلف ومتضاد احکام کی حامل نصوص کے پس پشت باریک بینیوں پر نظر رکھتا ہو۔

☆ اجماع جو شریعت کا ایک اجتہادی ماخذ ہے اس کی تاریخ پر عبور رکھتا ہو۔

☆ نوعیت مسئلہ سے پورے طرح واقفیت رکھتا ہو اور جس شعبہ زندگی سے اس کا تعلق ہے اس کے تمام پہلوؤں سے اسے آگاہی حاصل ہو۔ اس دور میں نئے مسائل کی اہمیت بڑھ گئی ہے، کیونکہ سائنسی، تمدنی اور معاشی ترقی نے ایسی ایسی پیچیدہ شکلیں پیدا کر دی ہیں جنہیں اہل اختصاص یعنی ماہرین ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے لیے اجتہادی نظر وبصیرت کی ضرورت ہے تاکہ مسائل کی تہ تک پہنچا جا سکے۔

☆ مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ عربی زبان میں مہارت رکھتا ہو، کیونکہ اسی زبان میں شریعت کے مصادر موجود ہیں۔ محض ترجمہ پر انحصار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ الفاظ کی روح اور اصل مقصد کو جاننے کے لیے زبان پر عبور حاصل ہونا ضروری ہے۔

یہاں اس بات کی نشاندہی کرنا ضروری ہے کہ جہاں ایک طرف دورِ حاضر نے نت نئے پیچیدہ حل طلب مسائل پیدا کر رکھے ہیں وہاں تحقیق وتجسس کے لیے وافر سہولتیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً رسل ورسائل کی ترقی اور اس کی نئی نئی شکلیں، کمپیوٹر کا استعمال، لاتعداد ڈکشنریوں اور انسائیکلوپیڈیاز کی جدید لائبریریوں میں موجودگی کے باعث جو معلومات ماضی میں سالوں کی محنت سے حاصل ہوتی تھیں اب وہ لمحوں میں مل جاتی ہیں۔ اس اعتبار سے اجتہادی عمل آسان ہو گیا ہے۔

اجتہاد کا ارتقاء:

دور نبوی ﷺ اور خلافت راشدہ کے بعد چار مشہور آئمہ کرام نے اجتہاد کو ترویج دی جن کے نام یہ ہیں:

1-	امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ	2-	امام مالک رحمۃ اللہ علیہ
3-	امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ	4-	امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ

اگرچہ ان لوگوں نے اجتہاد کو اسلام کے اصولوں کی استنباط کے لیے ایک مستقل اور مؤثر ذریعہ بنایا لیکن بعد میں ان کے پیروکاروں نے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اجتہاد کے بند ہونے کی وجوہات

منٹگمری واٹ نے اجتہاد کے سلسلے کے بند ہونے کی تین وجوہات بتائی ہیں، جو کہ یہ ہیں:

What held that Ijtihad was abandoned was in order to guard against the constant pressures of the rulers to interpret law to suit their will the jurists refused and further interpretation.

اقبال نے یہ تین وجوہات بتائیں۔

(i) Firstly, the sudden rise of rationalism created considerable fears in the orthodox circles, that unrestricted use of reason in matters of faith would disintegrate the stability of Islam as a social policy.

(ii) Secondly, the rise of mysticism which preached renunciation and asceticism did a great harm to Islam.

(iii) Finally, the sack of Baghdad marked the destruction of the centre of Muslim intellectual life.

For the fear of further disintegration which is only natural in such a period of political decay, the conservation thinkers of Islam focused all their efforts on the one point of preserving a uniform social life for the people by a jealous exclusion of all innovations in the law of Shariat as expounded by the early doctors of Islam.

اجتہاد کا دائرہ کار **(Scope of Ijtihad):**

Goldziher نے اجتہاد کا دائرہ کار یوں بتایا ہے۔

Fiqh is 'like the jurisprudential of the Romans, rerumdevinarumatquehumana tumnotitia and in its widest sense it covers all aspects of religious, political and civil life. In addition to the laws regulating ritual and religious observances, as far as concerns performance and abstinence, it includes the whole field of family law, the law of inheritance, of property and of contract, in word, provisions for all the legal questions that arise in social life, it also includes criminal law and procedure and finally constitutional law and law regulating the administration of the state and conduct of war."

درجات مجتہدین:

مجتہدین کی بھی درجہ بندی کردی گئی ہے۔ اس اعتبار سے مجتہدین کے چار درجے بہت مشہور ہیں جو درج ذیل ہیں۔

1- مجتہد فی الشرع
2- مجتہد فی المذہب
3- مجتہد فی المسائل
4- مجتہد مقید

مجتہد فی الشرع:

مجتہد فی الشرع اس شخص کا کہا جاتا ہے جو کسی خاص مسلک کا بانی ہو۔ اہل سنت والجماعت چار آئمہ کے اجتہاد کو تسلیم کرتی ہے۔ ان میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ شامل ہیں۔ امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ نے شیعہ مسلک کے لیے اجتہاد کیا۔ اس لیے اس فہرست میں ان کا نام بھی شامل ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

مجتہد فی المذہب:

ایسا عالم دین جو آئمہ اربعہ میں سے کسی ایک کا مقلد ہو لیکن متعدد اصولی یا فروعی مسائل میں اپنے پیش رو امام سے اختلاف رکھتا ہو اور اپنے ذاتی اجتہاد سے بھی فروعی مسائل کا استخراج کرتا ہو۔ ایسے حضرات میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد بن حسن شیبانی اور مذہب شافعی میں امام مزنی رحمۃ اللہ علیہ شامل ہیں۔

مجتہد فی المسائل:

فروعی مسائل میں اپنے اجتہاد کو بروئے کار لائے بشرطیکہ متعلقہ مذہب کے اصول و مبادی متاثر نہ ہوں۔ مذہب حنفی میں امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ اور مذہب شافعی میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا نام قابل ذکر ہے۔

مجتہد مقید:

ایسا مجتہد جو اپنے سلف صالحین کی رائے کو اہمیت دیتا ہو اور انہی کی پیروی کرتا ہو لیکن احکام کو بھی بخوبی سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہو ان میں مذہب حنفی میں کرخی، قدوری، صاحب ہدایہ اور فقہ کے چار مشہور متنوں کے مصنف شامل ہیں۔ مجتہد قرآن و سنت، اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم، آئمہ اربعہ کے اقوال کا پابند ہوتا ہے اور ایک انسان ہونے کے ناطے سے مجتہد کی رائے غلط اور صحیح بھی ہو سکتی ہے۔ شیعہ حضرات کے نزدیک اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔

کچھ تقلید کے ضمن میں:

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "کسی کو جائز نہیں کہ ہمارے قول کی پیروی کرے جب تک کہ وہ یہ نہ جان لے کہ ہم نے کس بنا پر کہا۔"

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"بے شک میں انسان ہوں غلط فیصلہ بھی دے سکتا ہوں اور صحیح بھی۔ میری رائے پر غور کیا کرو۔ پس جو رائے کتاب و سنت کے مطابق ہو اسے اختیار کر لو ورنہ چھوڑ دو۔"

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"اگر حضور ﷺ کا فرمان میرے قول کے خلاف ہو تو حضور ﷺ کا فرمان واجب التعمیل ہے۔ اس وقت میری تقلید نہ کرو۔ اگر کوئی حدیث میرے مسلک کے خلاف ہو تو حدیث کی پیروی کرو اور جان لو کہ وہی میرا مذہب ہے۔"

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"نہ میری تقلید کرو نہ مالک رحمۃ اللہ علیہ کی نہ شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی نہ ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی، بلکہ انہی ماخذوں کو پیش نظر رکھو جو ان کے پیش نظر تھے یعنی قرآن و حدیث۔"

تقلید کب جائز ہے:

تفہیم فقہ (ترمیم و اضافہ ڈاکٹر محمد اسلم خاکی) میں لکھا ہے:

"تقلید کا لفظ قلادہ سے نکلا ہے جس کے معنی گلے کی رسی ہے یعنی گلے میں رسی ڈال لینا یعنی بے چوں و چرا دوسرے کی رائے کی پیروی کرنا۔ تقلید صرف اس شخص کے لیے جائز ہے جو اجتہاد سے قاصر ہو۔ جیسے عوام، جہلا یا وہ طالب علم جس میں اجتہاد کی صلاحیت پیدا نہ ہوئی ہو ایسے ہی لوگوں کے متعلق قواعد عامہ میں کہا گیا ہے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

''یعنی فتویٰ ان پڑھ کے لیے ایسا ہے جیسے اجتہاد مجتہد کے لیے۔''

عوام کے لیے تقلید کا جائز ہونا ایک معقول بات ہے کیونکہ اجتماعی اور اقتصادی زندگی کا تقاضا یہی ہے کہ بعض لوگ صنعت وحرفت کے مختلف پیشوں میں مشغول ہوں۔ پس اجتہاد کے مواقع صرف اسی شخص کو حاصل ہیں جو علم فقہ اور اصول فقہ میں مہارت تامہ رکھتا ہو لیکن جس کو یہ مہارت حاصل نہ ہو اس پر آئمہ مجتہدین کی تقلید واجب ہے۔ اس آیت پر عمل کرتے ہوئے یعنی اگر تم علم نہیں رکھتے تو اہل علم سے پوچھو۔

مذاہب اربعہ کے منضبط ہونے کے بعد بہت کم فقہاء ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے آزادانہ اجتہاد کیا بلکہ اکثر مجتہدین مذاہب اربعہ میں سے کسی نہ کسی مذہب کے مقلد بن گئے اور اسی کے مسلک پر چلنے لگے نیز اسی مذہب کے مطابق فتویٰ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلسلہ اجتہاد بالکل بند ہو گیا مگر جدید اصلاحی تحریکات جیسے وہابیہ اور سلفیہ نے اس جمود کو دور کیا۔ اس کے علاوہ اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا روح شریعت، قرآن وحدیث، نیز مذکورہ بالا دلائل عقلیہ کے بھی خلاف ہے۔

طبقہ ادنیٰ کے مجتہدین:

اصحاب التخریج، اصحاب الترجیح اور اصحاب التصحیح کا شمار طبقہ ادنیٰ کے مجتہدین میں ہوتا ہے۔

اصحاب التخریج:

اصحاب التخریج کا نام ان علماء کو دیا گیا ہے جو اعلیٰ درجے کے مجتہدین کی جانب سے طے شدہ مسائل اور معاملات کو عوام کے لیے عام فہم بناتے ہیں تاکہ بآسانی مسئلے سمجھ میں آجائیں۔

اصحاب الترجیح:

یہ علماء کی وہ قسم ہے جو عوام کو ایک مجتہد کی صحیح اور دوسرے مجتہد کی رائے سے بہتر رائے بتاسکنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

اصحاب التصحیح:

یہ وہ حضرات ہیں جو اپنے آئمہ کی آرا کے بارے میں یہ بتانے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ کون سی رائے قوی اور کون سی ضعیف ہے چونکہ وہ تحریری طور پر ایسا کرتے ہیں اس لیے ان کی تصانیف کو بھی اہمیت دی جاتی ہے اور عوام کے نزدیک یہ لوگ مقبول بھی ہوتے ہیں۔

شیعہ حضرات ہر دور میں اپنے لیے ایک مجتہد کا تقرر کرتے ہیں۔ ایران میں ایک باقاعدہ محکمہ اس کے لیے کام کرتا ہے۔

اجتہاد بطور قانون:

سید قاسم محمود اسلامی انسائیکلو پیڈیا میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اجتہاد کو قانون کا درجہ کیسے ملتا ہے۔ اس کی متعدد صورتیں اسلامی نظام قانون میں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ تمام امت کے اہل علم کا اس پر اجماع ہو۔ دوسری یہ کہ کسی شخص یا گروہ کے اجتہاد کو قبول عام حاصل ہو جائے اور لوگ خود بخود اس کی پیروی شروع کریں جس طرح مثلاً فقہ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کو مسلمانوں کی بڑی بڑی آبادیوں نے بطور قانون مان لیا۔ تیسری یہ کہ کسی اجتہاد کو کوئی مسلم حکومت اپنا قانون قرار دے لے۔ مثلاً عثمانی سلطنت نے فقہ حنفی کو اپنا قانون ملکی قرار دیا تھا۔ چوتھی یہ کہ سیاست میں ایک ادارہ دستوری حیثیت سے قانون سازی کا مجاز ہو اور وہ اجتہاد سے کوئی قانون بنائے ان صورتوں کے ماسوا جتنے اجتہادات مختلف اہل علم کریں۔ ان کا مرتبہ فتوے سے زیادہ نہیں۔ رہے قاضیوں کے فیصلے تو وہ ان خاص مقدمات میں تو ضرور قانون کے طور پر نافذ ہوتے ہیں جن میں وہ کسی عدالت نے کیے ہوں اور انہیں نظائر کی حیثیت بھی حاصل ہوتی ہے لیکن صحیح معنوں میں وہ قانون نہیں ہوتے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اجتہاد اور موجودہ دور:

موجودہ دور میں ہم اس قدر مسائل میں الجھے ہوئے ہیں کہ ہمیں ہر لحہ شریعت کے حکم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ان حالات میں ہمیں شریعت کا حکم معلوم کیے بغیر خود کو مسائل کے حوالے نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس طرح ہم نہ صرف مذہب سے دور ہو جائیں گے بلکہ حالات کا مقابلہ کرنے کی بجائے اسلامی روش سے بھی ہٹ جائیں گے۔ لہٰذا ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اجتہاد کی ضرورت کو پیش نظر رکھے اور کبھی اس سے روگردانی نہ کرے کیونکہ اجتہاد کے بغیر ایک مسلمان اپنے اسلامی تشخص کو قائم نہیں رکھ سکتا۔

اجتہاد اور اس کی شکلیں:

درحقیقت ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی قانون کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ہر شعبہ زندگی سے متعلق مسائل کا واضح حل اسلامی قانون کی روح کے مطابق پیش کیا جائے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اجتہاد کے دروازے کھلے ہوں۔ جس طرح ماضی میں مجتہد حضرات نے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق اجتہاد کیا اسی طرح دور حاضر کے مستند علما کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اسلام کی تعلیمات کے بنیادی تقاجوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلامی قانون کی تشریح وتوضیح کریں۔ تاہم اجتہاد کرتے ہوئے ہمیں بڑی احتیاط سے آگے بڑھنا ہوگا اور میانہ روی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا ہوگا۔ ایک طرف تو ایسے لبرل نظریات اور نقطہ نظر سے پرہیزگاری لازمی ہے جو اسلام میں ہر نئی بات شامل کر دینا جائز سمجھتا ہے اور اس کا انداز فکر ہی معذرت خواہانہ ہے۔ ایسا رویہ اسلام کے مخصوص مزاج اور طرزِ فکر سے متصادم ہے جب کہ دوسری طرف ایسا انتہائی غیر لچک دار رویہ بھی مناسب نہ ہوگا جس سے عصری تقاضوں سے یکسر چشم پوشی کر لی جائے۔ وقت اور زمانہ کے تقاضوں کو بہر حال مدنظر رکھنا ہوگا۔ انسانی معاشرہ اور اس کے حالات وکیفیات تغیر پذیر ہیں اور قانون سازی معاشرتی مسائل کے حل کے لیے ہی کی جاتی ہے، لہٰذا قانون اور حالات میں ہم آہنگی برقرار رکھنا وقت کا اہم تقاضا ہے۔

درج ذیل جدید طریقے دیئے جاتے ہیں جو کہ مختلف فورمز پر مسلم علماء اور مستشرقین نے تجویز کیے ہیں، جن کا مقصد اسلام کو جدید خطوط کے ہم آہنگ کرنا ہے۔

a- شورائی اجتہاد **Parliament as Ijtihadi Legislative Body (Iqbal):**

Iqbal watched the religious and political developments in Turkey during the early twentieth century with great interest and anxiety. The Turkish experiment made him evolve a thesis that a National Legislative Assembly is a competent body to exercise Ijtihad in matters of religion and politics in a Muslim society.

> "Let us now see how the Grand National Assembly has exercised this power of Ijtihad in regard to the institution of Khilafat. According to Sunni law the appointment of an Imam or Khalifa is absolutely indispensable. The first question that arises in this connection is this: Should the Caliphate be vested in a single person? Turkey's Ijtihad is that according to the spirit of Islam the Caliphate or Imamat can be vested in a body of persons or an elected Assembly. The religious doctors of Islam in Egypt so far as I know, have not yet expressed themselves on this point. Personally I believe the Turkish view is perfectly sound".

And he concludes his remarks about the Turkish experiment by saying: "The truth is that among the Muslim nations of today, Turkey alone has shaken off its dogmatic slumber, and attained to self-consciousness".

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

b- عالمی اجتہاد کونسل World Islamic Ijtihad Council (Dr. Hamidullah):

Stressing the need of establishing an institutional mechanism for carrying out Ijtihad regarding changing requirements of time, Dr. Hamidullah opined that a World Ijtihad council should be formed in capital of an Islamic country which should be represented by Muslim scholars from across the globe. The proposed council may carry out independent reasoning for dealing with issues relating to economic, political, social, scientific, gender, etc. with which the Muslims are generally faced. He further suggested that the council may be assisted by various professional committees on economic, scientific, business, etc. subjects who may give expert opinion to the council.

c- اسلامی قانون وفقہ:

Academy of Islamic Jurisprudence (International Islamic Collegium):

This tendency from individual to collective Ijtihad was taken up by the Ijtihad session of the International Islamic Collegium in 1958. It was suggested that an academy for Islamic jurisprudence should be established. It should include the most competent jurists from every Muslim country, whose minds were open to doubt in matters of economics, sociology, law, medicine, etc. An academy of this type staffed by full time paid scholars, with upto-date facilities for research should be given the power to interpret the law in accordance with the demands of modern time.

d- فقہ کی تدوین:

Codification of the Opinions of Jurists Adaptable to Contemporary Conditions of Life (Anderson):

Anderson has pointed out that a codification of the opinions of the jurists, which are adaptable to contemporary conditions of life although heterogeneous in nature is a useful and beneficial effort, but it is theoretically unsatisfactory. That is to say the progressive elements from all schools of Muslim jurisprudence should be codified into a compact code of legal principles which are workable in modern times.

e- اندھی تقلید کو ترک کرنا Saying no to Blind Following (Taqlid):

The best course in his view would be to accord frank and unqualified recognition to Ijtihad even though it would entail repudiation of the binding and sanctified influence of the great jurists of the past. An additional endeavour will be needed to evolve a doctrine the some precepts of the predecessors were of temporary utility and that a change in circumstances has made such a change in law inevitable.

As per Iqbal, there is no room for Taqlid (Blind following) which is contrary to religion. He believed that the completion or finality of the Quranic message did not mean that the details which were worked out to implement the fundamentals of Islam in the past, under different political and socio-economic conditions, were to be binding for all times to come. Ijtihad, he believed was an integral part of the principle of movement. It gives Islamic doctrines their dynamic nature and universal application.

☆☆☆☆☆